

دُنیا کی بہترین کہانیوں کا انتخاب

ڈائجسٹ

ماہ نامہ

سب رنگ

فروری 2010ء



PP

Pakistanipoint.com

عشق کا شین

علیم الحق حق کی یادگار تخلیق

اندرونی صفحات میں ملاحظہ کیجیے

الشیر
پاکستان

14 اپنا اپنا رنگ

مشورے اور تبصرے، شکایتیں اور حکایتیں
سب رنگ کے رنگوں میں شامل، قارئین کے رنگ

117 فتنہ بدوش ہادی محمد

لبے سنہرے بالوں، جھیل سی گہری آنکھوں
اور فرہنگی مسکراہٹ کا شکار ایک شخص کی بے چارگی

143 بد صورت مخلوق طاہر محمود

اے حسن پرنازاں ایک مخلوق کی خود ساختہ کاپیا
کائنات میں جیسے اُن کے سوا کچھ رکھا ہی نہ تھا

برطولا 229

ایلو و خجک کے دل دادہ ایک بڑبڑلے اور اس کے حقیقت شناس دوست کے شرقی مہم جوئی کا دلچسپ مآل

18 ساتواں پتھر

زندگی گزارنے والوں کے لیے ایک زعمہ انسان کی زوداد۔ عالمی ادب سے منتخب شاعر کا رمانول

127

ایک مسافر کہتا ہے کہ میں نے کافرانوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے گناہوں کو بھول جاتے ہیں اور اللہ کے فضل سے ان کو جہنم بھیج دیا جاتا ہے۔

پریم کہانی 150
یعقوب جمیل

اس کہانی کا مصنف 'کہانی کے کچھ کرداروں سے ملنا چاہتا تھا... وہ مل بھی لیا اور اُسے پتا بھی نہ چلا!

گنجی چڑیا 247

ایک غریب الوطن کی کیفیات ایک چڑیا اُس کے لیے رہنا تھی چڑیا... جواپنا وطن بھی نہیں چھوڑتی!

61

بچوں کی ٹوشیوں کے فقیقی محاذ ہائی کا احوال
اولی ٹوشیاں ہاس کے لے ہائی مشیتہ کہتی تھیں

مرن بیل 133

ایک تناور درخت کے سہارے پہلے پھولتی،
نازکی ٹہلی کا احوال اردو ادب کا عصر دوسری کہانی

جانی وندیم / مامون

والدین سے بچوں کو متعلّم والے مہربانی خواص پر
تفہیم کرنے والے لایک ماہرین اور ناکامی!

گناہِ محبت 256 عافیہ

آخری صفحات کا توشہ خاص۔ ایک سیاہ کار کا
فسانہ کوئی اسے روشن کرنے کی کوشش تو کرتا!

شاہ نظر 68

ماضی کا خزانہ... عکس گشتہ اور فراموش کردہ
آواز کے اور آواز تھے، سسکی خیز اور محزون آئینہ واقعات

137

رجائیت پسند بیوی کے کوئی شوہر کا قصہ نہ تو تحریریں
جو شاذ و نادر کسی جاتی ہیں تیسری منتخب کہانی

عشق کا شین 168

ان خبروں میں سے کسی ایک کو اگر کسی نے
چاہا تو اس کا پتہ ملی ہے اگلا کیا تھا ہے

000 کتارے

لطائف اور خاکے اقتباسات اور اقوال
یارانِ سب رنگ کو شاورانِ سب رنگ کا تحفہ

[illegible][illegible]

عزیز قارئین!
السلام علیکم

یقین ہے، مزاج ہے، خیر نہیں ہوں گے۔ خاص شاعر کے پسندیدگی کا بے حد شریہ۔ محبتوں، دعاؤں اور عنایتوں کا یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تو وہ وقت دور نہیں جب انشا اللہ سب رنگ اپنا ہی عبور کیا ہو اور سب رنگ میں ایک بار پھر عبور کرے گا جس کی گرد کو بھی کوئی دوسرا نہیں پہنچ سکا۔ مسلسل محنت، لگن اور صادق طلب کے ساتھ اللہ کی رضا بھی حاصل ہو جائے تو کچھ بھی ناممکن نہیں رہتا۔ پھر بدخواہوں کی بدخواہیاں کچھ بگاڑ پاتی ہیں اور نہ ایک میلروں کی شاطرانہ چالیں۔ کسی کی بددلتی اور بدفطرتی، دوسرے کو اتنا نقصان نہیں پہنچا پاتی جتنا کہ خود بددلتی اور بدفطرت شخص کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اور وہ خود فحش کا بار، اس دباؤ کو اپنے مقدمہ... یا آزمائش پر محمول کرتے ہوئے ہر ایک کو اپنے دکھ بھرے فسانے سناتا ہے، اسے پیچھو لے پھوڑتا اور حقائق سے آنکھیں پڑاتا رہتا ہے۔ بہر حال، خود کردہ راجا علاج نیست انکار اپنا منت کرنے والوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر، ہم شکر کرنے کی توفیق عطا ہونے کی دعا کرتے ہیں اور آپ کے خطوط کی روشنی میں گزشتہ شمارے کا جائزہ لیتے ہیں۔

اپنی مقبول یادِ ایدہ احمد صدیقی کا عالم شوق، راولپنڈی کی منت سے، ”انتہائی محترم راشد صاحب، السلام علیکم۔ دیکھا محبوب کو ترستے رہے، پورا دہر خزاں خزاں لگا اور کہتے رہے۔

بے دم ہوئے بیمار دوا کیوں نہیں دیتے (سب رنگ)
تم اچھے مسیحا ہو شفا کیوں نہیں دیتے (سب رنگ)
دسمبر کے بعد جنوری 2010ء میں چند روز بھی صبر کا دامن نہ تمام کے گوشخوش ہونے کے
دیکھیے پاتے ہیں عفا کیوں سے کیا فیض
اک برہنہ نے کہا تھا کہ یہ سال اچھا ہے
اور واقعی دل کی گہرائیوں میں ”سب رنگ“ آکر تازہ گیا۔ قارئین جو دل و جان سے ”سب رنگ“ کو چاہتے ہیں اور اسرا نامہ آنے پر گنگنا رہے ہیں
تیرے دم سے ہے گلستاں میں بہاروں کو قرار
تیرے لوٹ آنے کی ہم کیوں نہ تمنا کرتے
اور کیوں نہ ہو کہ آشتی سروں نے کی دہائیوں تک لوہے سے جواہی تک دے دی اور بہت سے جواہی سے بڑھا پے میں بھی اس حبیبت نے مثال کے لیے راہ
میں آنکھیں بچھائے ہوئے ہیں۔

”سب رنگ“ کی محبت میں ہم آشتی سروں نے
وہ قرض اتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے
اور پھر ناخون رگوں میں کیا گردش کرنے لگا کہ کوئی دلہن کی طرح حیران و پریشان کر کے دشمنوں کو فوں کے ساتھ رکھ دیا۔ ویسے تو ”سب رنگ“ کہہ رہا ہے۔
میں اکیلی ہی چلی تھی چاہب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا
اور آخر میں عرضِ خدمت کروں گا کہ ہمارا دل دار کیسے چلتے سورج کے مانند چمکا۔

ڈوبتے چاند کے پہلے آنسو کلی کلی پر شبنم تھے
چڑھتا سورج دیکھتے دیکھتے ہر گوشے میں پھیل گیا
کتنی ہی دیر، کتنی لمبے تو ناکمل دیکھتے گزے اور پھر فرست تو ایسی لگی جیسے بہار میں بارش کا پہلا قطرہ کہ دل میں اترا ترستی۔ پھر صمد بقی اور ذیشان حیدری کاوش کو سراہتے ہوئے فرست کے بعد ”رنگ اپنا اپنا“ پر چلیے۔ ہاں، نفسی علی کا تبصرہ دودھ شائع ہونے سے ہم اضافی تیرے سے محروم رہ گئے۔ خیر، ممتاز علی کو پڑے ہوئے ناظم بخاری کے موتی بننے لگے۔ سچی، سچی انداز ہے آپ کا۔ وہاں بھی لکھتا ہوں مگر دوسرے انداز سے۔ باقی آپ بھی موتی بنھتے ہیں، پسندیدگی کے لیے جدول سے شکر گزار ہوں۔ مرنے والی علی آپ کی اونٹنی کہانی کا انتظار رہے گا۔ رانا عبدالمجید کی جاسوسی دستیں والی تجویز کی میں بھی بھرپور تائید کرتا ہوں۔ منظوم تبصرہ بے حد اچھا تھا۔ رانا بشیر احمد کی دعائیں خوب تھیں اور ”عشق کا شین“ کا تو تجزیہ یہ کہ ڈیڑا جیسے بی انجی ڈی کا مقابلہ لکھ رہے ہوں۔ واہ صاحب واہ۔ گہرائی لیے جو تبصرہ خوب تھا۔ کہانیوں میں کسی کی تعریف کروں۔ ہاں رنجی شیل کا ”دکھ نامہ“ بھی پڑھا۔ بجا کہا ہے اور اس دفعہ کی کہانی تو دم بخود کر گئی۔ یہ اندازِ تحریر تو کئی اچھے قد آور ادیبوں کا بھی شیوہ رہا ہے پھر اعجاز کیوں؟ بیوقوف جمیل اور احمد صغیر صدیقی کی کہانیاں بھی میگزین کے مزاج کے مطابق ہوتی ہیں۔ ”سب رنگ“ میں بہترین سے بہترین کہانی لاتے ہیں۔ ایک اور دھماکا جو مجھ کی سری کہانی کی شکل میں ہوا۔ بے حد دل چسپ اور سبق آموز۔ واہ سنا تیکم کی ”چلتی پھرتی چھاؤں“ تو یوزی ہی دل گداز داستان ثابت ہوئی۔ خواندہ منت رنگ تو میرے تھے۔ ”ساتواں پتھر“ مسلسل قاری کو اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے اور

کہانی کا ہادوسہ پڑھ کر بول رہا ہے۔ کس کہانی کی تعریف کروں۔ اور پھر آخری صفحات، واقعی خاص شاعر کا مجموعہ ثابت ہونے کے کامر تا پرتی پوری طرح ”پتھر“ لے کر چھائی ہوئی ہیں۔ آخر میں ایک بڑے روزنامہ کے مشور کا نام لگا کر 15 نومبر 09ء کے شمارے میں ادیبوں کی کمی کی وجہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ”ایک ناول کے علاوہ کوئی اور ناول نہ لکھا گیا جو کسی ایک دور کی نسل کے لیے کو آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ رکھنا ہو یا پھر بھٹے جالنگوس اور نازی گریٹس وہ جھلکیاں نظر آتی ہیں جو کسی کو ایک بڑا ادیب ثابت کرتی ہیں۔ ایسا ادیب جس کی تحریروں سے پورا معاشرہ متاثر ہوتا ہے۔ ایسی تحریروں جن کا انتظار کیا جاتا ہے۔“ یہ سب رنگ کے لیے بڑے ہی فخر اور اعزاز کی بات ہے۔ جی تو چاہتا ہے کہ دفتر کے دفتر سیاہ کردوں۔ دریاے شوق کو ہر گھٹانے پر آمادہ مگر خط کی طوالت کہیں آپ کو تا کر نہ گزرے اور پھر مرداد کے الفاظ میں کہتے لگیں۔

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانے میں
ہاں پھلے جیسے نوشادی خانہ آبادی کے رنگ میں رنگ دیا ہے۔ دعاؤں سے قارئین ضرور نواز دیے۔ تمام احباب مجلس کو آداب... بھی مقبول صاحب! آپ کے خطوط آپ کی مقبولیت میں اضافے کا سبب بن جائیں گے۔ اور آپ کے خطوط کے سحر سے نگلیں سے تو آپ کو مبارک باد اور دعا میں دیں گے۔ دوسرا نظم یہ ہو گا کہ اسرا نامہ شاعر اسب رنگ اور مغزو... اور خرما ہو جائے گا۔ جب آپ سے ناز پر دروہوں گے ناز برداریاں کریں گے تو اسرا ہو جائی ہے۔ بہر حال اللہ آپ کو خوش رکھے آپ کی سب رنگ کے ناز اٹھاتے رہیے۔

ناظم بخاری کا سر... میں اس سے، ”بے حد محترم مدیر صاحب، السلام علیکم۔ کیسے ہیں آپ؟ امید ہے کہ بفضلِ خدا خیریت ہوں گے۔ چند دنوں بعد اپنی ایک اہل کار تجر پر مجیب کے ساتھ حاضر ہوا ہوں۔ سر! یہ کوئی خاص کہانی نہیں ہے اور نہ ہی اس کا آئینہ یا کوئی خاص تھا۔ واصل میں لکھنا کوئی اور تحریر چاہتا تھا اور تحریر یہ کہانی ہوئی۔ خیر... اس بات کا تو مجھے نہیں ہے کہ یہ ”سب رنگ“ کے کڑے معیار و حراز پر تو پوری نہیں اترے گی۔ مگر شاید... ”سب رنگ“ میں کہیں نہ کہیں اس کے لیے کچھ کھل آئے۔ جائز، آپ اپنے حقیقی وقت میں سے کچھ وقت اس تحریر کے لیے بھی نکال کر اسے پڑھ لیجیے۔ اگر یہ تحریر قابلِ اشاعت نہ بھی ہو تو یہ بھی جائز اپنے قیمتی مشوروں سے غور کرنا ہے گا۔ مزید کیا تحریر کروں؟ صرف اتنا ہی کہ بہت سی دعا میں آپ کے لیے، بہر حال شملک صاحب کے لیے اور اس ادارے کے لیے کہ خدا ہمیشہ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور مزید ترقی و خوش حالی عطا کرے“ آمین۔“

سید شاہد علی شاہ، لاہور سے رقم طراز ہیں۔ ”مدیر محترم ”سب رنگ“ ڈائجسٹ، آداب عرض۔ دو ماہی شمارے کے سرورق پر دو گلاب جلوہ گر ہیں۔ دونوں کی دل فریبی صاحب، دونوں کی نازی کی مسلم پختگیوں کی تاثیر البتہ جدا جدا ہوگی۔ ایک کی پیش آنکھیں، دوسرے کی مہک آفریں، ذکرِ صاحب کے لیے... نعرہ خستین، ان کے لیے بول بھلیاں میں پہلے ہی قدم پر دو بخاری بھائی جو کلام ملے۔ ناظم بخاری صاحب تو ہم مرسلہ گلوں کے بھی ناظم اعلیٰ ہیں کہ سب کے خطوط کا حساب لگاتے اور سب مرابط داد و تحسین سے بھی نواز رہے ہیں۔ ناظم بھائی! آپ کی ڈیڑا نوازی ہے، ہم جو نالسا ہمارے ہالکے کہتے ہیں، لکھ دیتے ہیں لیکن آپ کا شمارہ ان کا علاوہ غم فرمائی کی طرف ہے تو وہ اپنے بس کی بات نہیں۔ یوں تو شاید ہر قاری کے اندر ہی ایک لکھاری بھی کہیں موجود ہوتا ہے لیکن اظہار اور بیان کی قوت کسی میں کم اور کسی میں بالکل نہیں ہوتی۔ اور مستند لکھاری ہونے کے لیے چند شرائط لازم ہیں، ہم ان سے محض نہیں۔ یوں بھی لکھاری بننے سے قاری ہوتا نہیں ہے۔ قلم کار اپنے دنوں کا سکون اور اوتوں کی تندرید پر یاد کر کے تخیلات کے پیرائے ترتیب دیتا ہے، انھیں کہانی کی صورت بنیگا کرتا ہے۔ پھر ان کی اشاعت کے لیے بہن کرتا ہے اور قاری چند گھنٹے مطالعے کے بعد لکھاری کی قوتوں، مہینوں، بسا اوقات برسوں کی محنت پر خطِ منتخبع بھیج دیتا ہے۔ سو قاری ہونے میں زیادہ تر ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ مرسلہ لکھیے اور شائع ہونے پر بغلیں بجائیے۔ اپنے برادر سید مرتضیٰ علی واسطی کو بھی لکھیے۔ اچھی صرف قاری ہیں، باقاعدہ لکھاری نہیں۔ مگر ایک ہی سنیے پر دودھ بار چسپ رہے ہیں۔ ہم دعا گو ہیں وہ بڑے لکھاری ہیں اور یہ رنجی شیل صاحب کو دیکھیے، کچھ دھڑلے سے ہم بے وسیلہ مرسلہ لکھوں گی کہ ان کی قوتوں میں براہِ بیان ہیں اور شکوہ کنایاں ہیں۔ لکھاری ہو کر بھی عام قاری بننے کی کوشش لکھاری کو تو اپنا دل اتنا... بڑا کرنا پڑتا ہے آکا ش بھٹا بڑا... کس کی سب آگاہیاں، نکالیں، نظر بغل و قلعہ بندی، تنقید، تنقید، تمام مخالف عناصر ایک کتے کی صورت سا جائیں اور معدوم ہو جائیں۔ قاری ڈاکٹر ذکیہ کر کے، اس میں بے وسلی کہاں۔ جناب سید طبیب عارف نے امرتیل بارے ہماری تکرار پر سوالیہ نشان لگایا ہے۔ ضعیف بھائی اچھا جلد دل میں بندہ امرتیل بھولا ہو کر کے ایک اثر و باطن کے شاعری کے گلدستہ آٹھ تو برس سے ہماری الماری میں محفوظ ہے۔ اسے ہم بعد خوشی آپ کو دینا پسند کرتے ہیں۔ ضعیف بھائی بعض تحریریں خونِ جگر کی قلم کار لکھیں جاتی ہیں۔ انھیں کم سے کم ان کی انگوٹھ سے تو پڑھا جائے، اور پڑھا جائے تا ہے۔ ہم نے پڑھا ہے، ہمیں یہ اعزاز حاصل ہے۔ یہ وہ کم ترین خراج ہے جو ایک قلم کار کو کم سے کم دینا ہوتا ہے۔ ہمارے ہوائی ادا کر سکتے ہیں۔ ہماری مثال تو یوں بھی اب واسطی شام کے سایوں جیسی ہے اور تیزی سے زب دلتے موسموں کا ہوا تھا۔ سو گدھا لائے جاتے ہیں کسی تو فریاد سرا ہوگی۔ جب تک مہلت حاصل ہے تب تک آس باقی یازی گڑاں بار پھر دھکا دینے والا موڑ مڑی ہے۔ ہاں، مولوی قاسم کا شاعر نام و ہوا اور لڑکی تک قلیطے والوں کی رسائی، دونوں ہی انکھیں میں ڈالنے والی باتیں ہیں لیکن بہر حال، بارزماں کی منزل قریب تر ہے اور اس لیے ہم ان کی ہماری خواہش ہیں۔ اور وصال کا وہی لہر اس داستان کا حاصل ہوگا جس کے انتظار میں ہم دونوں نے 35 سال تک انگوٹھ کی لڑیاں دیکھ کر لکھاں چالی۔ ”عشق کا شین“ کا شہر ہمارے قلم خیال آرائی اعلیٰ ہر ایک ادھار دی۔ جناب علیہم حق کی محبت کا لہر اور خیر و عافیت کے لیے دل سے دعا گو ہیں۔ چلتے چلتے کہ ہمارے قلم خانہ رنگ کی تیسری ڈش پہنچ گئے۔ گاڈ آفد خاصیت ناخیر سے پکھا اور اس کہانی کا آخری صفحہ آخری

سطور پڑتے جیسے منہ میں کڑواہٹ گھل گئی۔ جگ ہے انسان کو حیوان بنا دیتا تھا جتنا ہے لیکن اسے مطلق بننے دینا نہیں لگتی۔ انسانی، معاشرتی اور مذہبی اقتدار کے منہ پر یہ کہانی ایک زمانے داغ ہے۔ اس شاعر کی کہانی ”مورگی بہت سال پہلے بھی پرچی تھی“ ”سب رنگ“ میں شائع ہونے سے پہلے ”عشق کا شین“ کسی دوسرے رسالے یا کتاب کی صورت میں شائع ہو چکی ہے؟ سرفراز خان آفریدی صاحب کے بچے کو اللہ پاک مکمل شفا اور صحت عطا فرمائے۔ رانا بشیر احمد صاحب کو ایک بھر پور تبرہ لکھنے پر ولی مبارک باد تمام قارئین، خصوصاً صاحب لیاقت علی ذکی صاحب کی خدمت میں اور ادارہ ”سب رنگ“ کے تمام کارپردازان کو ہمارا سلام پہنچے۔

سرفراز خان آفریدی کا مکتوب، بیوہ چشمہ کالونی، میانوالی سے۔ ”مدیر گرامی“، آداب۔ ذہنہ نصیب، طلب نامیہ سرکار دہلی جنوری کے دوسرے نمبر میں منظر میں۔

سردیوں کی بجائے شہادت میں غلوں کی قمارت کے انتظار کے بعد جب اپنے محبوب پر چپے کو پایا تو اس کے بعد زندگی بھر تھا، نہ سوچا تھا۔ میرے ہاتھوں میں بہت ویو (سب رنگ) تھا۔ مدیر گرامی! آپ نے بدخواہوں کے شادیانے بجانے کا اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ ”ہیں تو یا قہیں“ جتنی دعا میں صرف دریاں ہو گئیں۔ ”ہیں تو ذرا بھر بھی بدگمانی نہ ہوئی۔ بلکہ وصل سے ہم کنار ہوتے ہی لاجات جاں“ ”مسل“ میں ”بدل“ کہئے۔ اللہ کرے ”سب رنگ“ اپنی بدادوست کی مدافعت تادیہ کرے۔ چار پختہ کہانیاں کوئی تاثر قائم نہ کر سکیں۔ یا نچوہیں کہانی ”رنگ“ کے عنوان سے سامنے آئی۔ اور پہلی کہانیوں کے پیدا کردہ عمل کے ذریعہ روکیا۔

مدیر گرامی! بدخواہوں سے زیادہ قویہ کے مستحق آپ کے بھی خواہ ہیں۔ مختصر کہانیوں پر تھوڑی توجہ دیں۔ ”ہیں آپ کی مشکلات کا اندازہ بدیہی طور پر ہے۔“ ”چلتی پھرتی چھاؤں“ میں صنف نازک کی مخصوص ناسل جیانی چلت پھرت پھڑ پھڑاتی ہوئی محسوس ہوئی اور بس۔ خواندہ صنف رنگ میں پہلی کہانی میں انگریزی کی لفظ ”فونیکس“ استعمال ہوا ہے۔ اس کا انگریزی میں صحیح تلفظ ”فکس“ ہے اور اردو میں اس کے لیے عمدہ ترجمہ ”فکس“ کے نام سے موجود ہے۔ کیا یہ اچھا ہوتا کہ کسی لفظ استعمال کیا جاتا۔ وقت کی کمی کی بنا پر قطعاً خط میں، میں اشفاق صاحب کے افسانے پر میرے حاصل بحث چاہتے ہوئے بھی نہیں کر سکا اور اب تو حزمہ واسطی صاحب کی ایک جست نے گرد یا قصہ تمام سلسلے اور کہانیاں اب تک نہیں پڑا۔ یہاں کہ ”بازی گر“ تو کمال کا ڈھلا ہوا اسٹک ہے۔ ”سورق پر“ ”عشق کا شین“ کی بھرپور قسط کی سرخی بھی نظر آتی اور آپ کا کہا، ساتواں پتھر کے بارے میں ویسے ہی کمال ہے۔ ”یہ خوب صورت لب جموت کیسے بولیں گے اس لیے جسکے لے کر پڑھیں گے۔۔۔ آرام سے! ناظم بخاری صاحب ان مضمون پر لکھتے ہیں ”پتلی جیسے منہ سے کیوکر پ کا شکر یہ ادا کروں۔“ ”جیراں کی پرندہ میدان ہے پرانند“ (جیراں اڑتے بلکہ ان کے مرید انھیں اڑاتے ہیں) لیکن یہاں تو گنگا الٹا بہہ پڑی۔ ”میر خوسرو یو کو جو پر غم خود پرینے کا بھی اہل نہیں، اس کا دل باریا ہے۔“ ”قلید کعبہ! آپ نے مجھے لکھنے کی تحریک دی ہے۔ اس کا جواب آپ کو دینا میرے لیے خاص شہر میں لیا ہوا کہ کبھی مجھے شاعر کہہ لیتا ہوں۔ افسوس چاہتے ہوئے بھی لکھ نہیں سکا۔ ہاں، آپ کے لیے ایک اچھی خبر ہے کہ اپنے ایک دوست محمد عمران کا تازہ بہ تازہ افسانہ اگلے شمارے کے لیے بھجواؤ گا۔ مجھے اچھا لگا ہے، ”میر خوسرو یو“ ہوں دل داران ”سب رنگ“ کے لیے افسانہ اور افسانہ گرد بذات خود بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوں گے۔“

فاروق احمدی کتبی، لاہور سے، ”محترم مدیر اعلیٰ، السلام علیکم۔ ایک ماہی غیر حاضری کا خاص شمارہ ملا۔ ”سب رنگ“ تو ہمیشہ ہمارے لیے خاص رہا ہے۔ محترم میرے ہر خط میں آپ کو تحقیر لگتی ہوئی لیکن اس کی وجہ آپ بھی جانتے ہوں گے۔ محترم، میں نے پچھلے شمارے میں کہانیوں پر دی کی تصاویر پر تنقید کی تھی۔ اس شمارے کا غنڈہ Low Quality کا ہے جس کی وجہ سے بھی تصاویر میں وہ چمک نہیں ہے جو ”سب رنگ“ کا خاصہ تھی۔ براہ مہربانی تاریخی کہانی کا انداز بدلیں، یوں لگتا ہے کہ ”سب رنگ“ کی تاریخی کہانی پڑھنے کے بعد بھی تصدیق باقی رہتی۔ جس کے لیے میں نے پچھلے شمارے میں اپنا شعر بجا تھا اور اس پر ناظم بخاری صاحب کا تبرہ اس شمارے میں ہے۔ محترم ناظم بخاری صاحب سے گزارش ہے کہ محترم میں کوئی شعر نہیں ہوں۔ میری مادری زبان سندھی ہے، اور اردو میں کچھ ضرور لکھتے ہیں، آپ کی تجویز پر ضرور عمل کروں گا لگتا ہے ”بازی گر“ بھی اختتام کی طرف بڑھ رہی ہے۔

ایس احتیاد احمدی خیر گری کی رہتی ہے۔ ”محترم مدیر صاحب، السلام علیکم۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ ماہ نومبر کا دل کش شمارہ ”سب رنگ“ میں ناٹل کا انتخاب لاجواب رہا۔ اسٹوریز کا جواب نہیں۔ میں بھی اکثر میگزینز میں لکھتا ہوں۔ آپ کے پرچے ”نئی آواز“ اور ”الشرق“ کے لیے کافی لکھا ہے۔ ”سب رنگ“ کے لیے شیطانی کھیل ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ پلیز قریبی اشاعت میں جلد دیں۔ آپ کو اور دیگر اسٹاف اور ”سب رنگ“ کے تمام قارئین کا دعا سلام۔“ امتیاز صاحب ”شیطان کی کھیل کے بارے میں پڑھنے کے بعد آپ کو مطلع کر دیا جائے گا۔

عمر علی راؤ کی ای سیل، ماڈل کالونی کراچی سے، ”میر خوسرو صاحب، السلام علیکم۔ امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ ”سب رنگ“ نے طویل انتظار کرایا۔ آخر کار آج یہ حاصل ہوا۔ اپنی ای سیل میں شامل دیکھ کر حیرت آمیز صرست ہوئی۔ آپ کا پیش کردہ خاص شمارہ بہت پسند آیا۔ تقریباً اب تک پڑھ چکا ہوں۔ میں نے چنگیزی ای سیل میں بھی لکھا تھا کہ ”بازی گر“ کا خاص فیصلہ تبدیل ہوئی ہے۔ ”سب رنگ“ میں روشن صحت کی اشاعت کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں۔ یعنی اولیائے کرام کے حالات و واقعات۔ ”عشق کا شین“ بھی اچھی کہانی ہے۔ آخر میں اللہ اولیاء سے دعا ہے کہ آپ کواد ”سب رنگ“ کو مزید ترقی عطا فرمائے، آمین۔“

سید محمد علی واسطی کا خط، شہزاد خان، اسلام آباد سے۔ ”محترم جناب ایڈیٹر صاحب، السلام علیکم۔ آپ نے جنوری کے شمارے میں ناچیز کا خط شائع کر کے بہت افزائی فرمائی، میں اس کے لیے بہت شکر گزار ہوں۔ جب وعدہ ”الشرق“ میں مل مارٹ جو آپ کے آئوٹر کے شمارے میں شائع ہوئی کا دوسرا حصہ ارسال کر رہا ہوں اور گوہر کی آپ کے معیار کے مطابق ہو اور فروری یا مارچ 2010ء کے شمارے کی زینت بن سکے۔ آپ کے اور ”سب رنگ“ کے لیے بہت سی دعائیں۔ فقط آپ مخلص۔“ واسطی صاحب آپ کی ارسال کی ہوئی کہانی لکھی۔ قابل اشاعت ہونے کی صورت میں قریبی شمارے میں شائع کر دی جائے گی۔ قلمی تعاون جاری رکھیے گا۔

احمد عظیم، ٹوبہ ٹیک سنگھ سے رقم طراز ہیں۔ ”مدیر محترم! خدا کا شکر ہے کہ سب رنگ کی اشاعت میں شمول آ گیا۔ عدم شمول نے ”بازی گر“ کا سارا مزہ کر کر کر

تھا۔ میانوالی سے سرفراز خان آفریدی نے بھی اس بات پر تنقید کی تھی۔ ساجد گیل کا خط بھی نومبر کے شمارے میں دل خوش کر گیا۔ موصوف نے ٹھیک یہ لکھا تھا کہ ”بازی گر“ پر یہ لکھنا بعد کر دیں کہ آخر کار انتظار کیا جاتا ہے۔ اب کہانی سچ ڈگر پر گامزن ہے۔ راتر کو ہدایت کریں کہ کسی ٹھیک پر قلم چلائیں۔ کورا کا انخواہ چھامڑ ثابت ہوا اور اب تک صرف مصل اور باہر زماں ہی میدان مارتے رہتے ہیں۔ ”عشق کا شین“ اچھی جا رہی ہے، جتنی صاحب نے پہلے بھی قارئین کو اچھی کہانیاں دی ہیں۔ ”رجینی ٹیل کا“ ”الوکا پنشا“ سٹارٹن تحقیق تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ اپنے اسٹائل میں خوب صورت تنقیدی کہانیاں کسی دوسرے ڈائجسٹ میں تحریر کر چکی ہیں۔

اردو ادب سے آپ کا انتخاب بلاشبہ معیاری ہے۔ شکایت کے موضوع پر بھی کبھی کہانی بونی چاہیے۔ ایک فراموش ٹوٹ کریں، ”امیر تیل“ کا بقیہ حصہ ”پرندہ میدان“ لوازہ میں... اور ہاں جناب، ”دیکر کا شمارہ کیوں لکھ گئے؟“، ”فیر میاں“ ہم نے ہمیشہ عوام کی رائے کو مشعل راہ جانا ہے۔ ”بازی گر“ میں کورا کا انخواہ کیا رنگ لائے گا، اس کا انتظار کریں۔ اپنے مشوروں سے آئندہ بھی نوازتے رہے گا۔

ارباب جاموٹ، رحیم یار خان سے مدد سراسر ہیں۔ ”راشد ملک صاحب! ”بازی گر“ میں ماحول بدل کر رائے بقول ابن عربی ”بازی گر“ کی اس کے بعد میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اب ”سب رنگ“ سے منہ موڑوں گا۔ ایک دوست کے اصرار پر جنوری کا شمارہ پڑھا۔ ”بازی گر“ میں ایسا ہی لگا جیسے مردے میں دوبارہ جان پڑ گئی۔ لکھنے والے کو زیادہ ذہین نہ دیں، کہیں دوبارہ کہانی کو کھمرا پھر کر ٹھیک ٹوٹے کیا تو سب بدول ہوں گے۔ جنوری کی قسط اچھی لگی۔ کورا کے خواہ کے بعد باہر زماں اور مصل کا احساس ہوگا کہ دوسرے بھی مرد ہوتے ہیں۔ اب دیکھئے کہ کہ لکھی قسط میں باہر زماں، مصل اور ان کے سماجی کیا تر چلاتے ہیں۔ ”عشق کا شین“ جتنی صاحب کی ”عشق کا شین“ ہے، پہلے اردو کی کہانیوں کی وجہ سے ”سب رنگ“ کیجیانا تھا جاتا تھا۔ انکا، اقبال اور امیر تیل وغیرہ انوار صدیقی کے نام سے رسالوں میں شہرہ آفاق ہیں۔ آپ نے ایک ایسا شمارے میں لکھا تھا کہ ”امیر تیل“ کی طرح ”بازی گر“ بھی ناٹل رہ گئی جس کا افسوس ہے۔ ”بازی گر“ تو دوبارہ شروع ہوئی، ”امیر تیل“ کا کیا رہا؟ کیا انوار صدیقی کو خواست... ہو گئے، ان کی کہانی تو ابھی حال کے شمارے میں چھپی تھی۔ ان سے نئی قسط ہی پرانے انداز میں شروع کریں۔“ ”بھی جاموٹ صاحب ذرا مصل سے کام لیں۔ انوار صدیقی صاحب ماشاء اللہ جو علم اور جواں حوصلہ ہیں اور ہمارے رابطے میں ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ آپ امیر تیل کا باقی حصہ بھی جلد پڑھ سکیں۔“

شہل غلامی کا اظہار خیال، سیالکوٹ سے۔ ”راشد ملک صاحب، ہم نے ایک خبر سے چل کر لیا تھا کہ ”بازی گر“ دوبارہ مضامین پر چائے اور میری کے کردار دنیا ماحول دیکھ کر ہلکا ہوا جائیں۔ دیکھا آپ نے چلے گا کیا اب رہا۔ ”بازی گر“ جنوری میں واپس راہ راست پر آگئی۔ کورا کے خواہ کے بعد کیا کرے گی، باہر زماں پر... وہ کیا ماحول کا اردو کی کرے اس کا انتظار ہے۔ گارنٹی ٹیل کا ”الوکا پنشا“ خوب صورت کہانی تھی، بہت پسند آئی۔ ”عشق کا شین“ جتنی صاحب کی مایہ ناز تحقیق ہے، اس کی جتنی مایہ ناز لکھی ہے، خدا ان کے قلم کو باندھ کر بندھے۔ میں نے چوچہ ”بازی گر“ کے سلسلے میں لکھا تھا اس پر جو رقم خرچ ہوئی تو کون دے گا؟ ”چنگیزی“ کی آپ نے خرچ چاہو تو اپنی ”بازی گر“ میں خرچ خرچ کر دیں۔ ویسے شکر ہے آپ کو ”بازی گر“ کی قسط پسند آئی۔ میں یقین ہے کہ آپ کو مزید چلنے کرانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

تلمن، لاہور سے لکھتے ہیں، ”محترمی دیکر، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وسلاطین۔ ”سب رنگ“ کے پرانے شمارے میں سے ہوں۔ بہت ہی پرانے پرانے شمارے اس وقت پڑھنے کو ملے جب سب رنگ کو شرم نامی میں چلا گیا تھا۔ پھر کبھی کسی اس کا کوئی تازہ شمارہ آ تو خوشی کا کوئی ٹکنا نہ ہوتا، پھر خبر ملی کہ اب یہ باقاعدگی سے کچھ کچھ خرچ میں اس کا تسلسل نوٹار باہر زماں اور دیگر شمارے کراچی سے ایک دوست کے ذریعے مل گئے، ایک ای سیل بھی کی جی کہ قارئین دستاویز سب رنگ کے خطوط بھی شائع کیے جائیں جو پوری ہو تو کوئی ای سیل کا جواب موصول نہیں ہوا۔ بہر حال، میں اپنی خوشی ان الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ پڑھنے، لکھنے اور پڑھانے کا مصل ہے۔

کمال کامیابو ”سب رنگ“ نے پھر ارکھنا ہوا ہے اس کا جواب نہیں نہیں۔ ”بازی گر“ کا تو واقعی جواب نہیں، اس کا آکھواں حصہ ”بازی گر“ ہے، ”عشق کا شین“ جتنی صاحب کا تو حلقہ نامہ یاد ہیں، اب ان کی طبیعت کیسی ہے؟ جنوری کے شمارے میں ”خواندہ رنگ“ کی تحریریں لاجواب تھیں خصوصاً ”ڈاکٹر، کاش اور حمرے“، ”بھی مصل والوں کے لیے بہت ہی گہری ہیں۔ اور ادراستی کا تو کیا کہنا، ہم تو ادراستی کے بہت بڑے فن ہیں۔“ ”خبر“ بھی ان کی سدا بہر تحریر ہے جیسے ان کی مشہور زمانہ نظم۔ ”آج آکھواں وارث شاہوں“ ”مصل تو صوفی نے ”اسمعیل امرتا“ کا صحیح خطاب دیا ہے۔ امیر تیموری زندگی کا ایک ”دوق“ ”وعدہ“ کی مصل میں پڑھنے کا بھی لطف آیا۔ موصوف

امارہ علی چاند ہیں۔ محترم انوار صدیقی صاحب کی واپسی کی بھی بے حد خوشی ہوئی ہے۔ ان کے لیے ذہیروں دعائیں، خطوط لکھنے والے دوستوں سے ابھی جان بچان نہیں ہے، اس لیے ان کی گزارشات اور تھروں پر کچھ نہیں کہوں گا۔ ہاں، ”سید محمد عظیم عارف صاحب کا تازہ ضرور کیوں گا کہ کوئی مالوالی اور ”سراسر کہانیاں آج بھی اسی دوق شوق سے پڑھی جاتی ہیں جس طرح آج سے 30 سال پہلے پڑھی جاتی تھیں۔ ذرا انوار صدیقی صاحب کی آج سے 30 سال پہلے لکھی گئی کتابوں کی 2010ء میں بھی مقبولیت کا اندازہ لگانے کے لیے کسی بک اسٹال پر چلے جائیں اور ”انکا“، ”اقبال“، ”غلام رؤف“ اور ”امیر تیل“ کی ڈیٹا مل کا پتا کریں۔ یہ سارے سلسلے ”سب رنگ“ میں ہی شائع ہوتے رہے ہیں اور ساتھ دیگر تحریریں بھی تو شامل ہیں۔ باقی پندرہ اپنی ہے۔ میں نے بذراہد ای سیل سے

محمد یحییٰ قلمی کہ پرانے شماروں کی تحریریں بھی دوبارہ سے شائع کریں تاکہ نئی نسل بھی ان سے لطف اندوز ہو سکے۔ ویسے مرضی تو سرکار کی ہوتی ہے، عوام کی نہیں۔ ”بھی معدودت“ میں خط لکھا تھا نہیں آتا، اوپر سے طبیعت بھی کچھ ناساز ہے اس لیے معاف فرمائیے گا۔ زندگی کی سائنس پر رقرار ہیں تو ”آئندہ ماہ ذرا تفصیلی جائزہ پیش کریں گے۔ سب دوست ذرا اپنی اپنی نائی کوٹ، آستینیں وغیرہ درست فرمائیں کیوں کہ تم قلم خود ”نقاد“ ہیں تو پھر او... سب رنگ اور اس کی پوری ٹیم کے لیے بہت ہی دعاؤں اور نیک تمنائوں کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں، اللہ حافظ۔ ٹوٹ۔ ”یہ ہمارا اصلی نام نہیں، مرحوم اشفاق احمد کے ایک کردار سے متاثر ہو کر رکھا ہے۔ اس لیے آئندہ ہمیں اسی نام سے لکھا اور پکارا جائے ورنہ قاتلوں کی چارہ جوئی کا حق محفوظ ہے۔“

زندگی کے بارے میں سوچا، بہت کچھ سوچا، بہت کچھ لکھا اور لکھنا چاہا۔ سوچیں تو زندگی ایک جام بھی ہے اور مشروب بھی۔ چہرے انسانوں کے شکلیں مختلف ہیں۔ وہ ہیں کسی کو چھوٹا جام ملا کسی کو بڑا۔ اور یہ مشروب بھی عجیب ہے۔ جس کے ہر گونے کا رنگ بھی مختلف اور آٹھ ہر خدا ایک گونے میں سو شہد کو شہید ہے تو دوسرے میں نہر کو تلخ اور پسند آئے نہ آئے ہر گونے پینا پڑتا ہے۔ اور مشروب ختم ہو جائے تو جام ڈوبنے کو بھی جارتے ہیں۔

یہ گونے گونے زندگی کو کھانڈو ہے جسے پڑھتے ہوئے کہیں آپ کے منہ میں خلا و خلو جائے اور کہیں خلو تک کٹاؤ نہ کہے لکیریں کھینچ جائیں۔ یہ کھانڈو کہیں آپ کو مسکراتے پر مجبور کرے گا اور کہیں آپ کو ادا سے کر دے گا۔ یہ عالمی آدمی کے بہتے قد اور ناولنگر مہینہ لٹریچر کو تکریر ہے۔ وہ میں لکھ جائے اور اسے ناول کا اسلوب آپ کو حیران کر دے گا کہ یہ آج بھی اشنا ہے تازہ، اشنا ہے منفرد اور اشنا ہے جدید ہے۔ یہ اس کھانڈو کو خوش قسمتی ہے کہ تیرے کے لیے اسے ایک بے حد معتبر کام کا میسر آ گیا ہے۔ اس کا ترجمہ آپ کو آجنیہ کا احساس نہیں ہوئے دے گا بلکہ آپ خود کو کھانڈو میں شامل محسوس کریں گے۔ آہ... ڈیخو فیر سے ساتھ رہو، مادہ پرست دنیا میں گم ہو کر نہ رہو۔ زندگی دو گونے خور لے کر دیکھ اور بتائے کہ کیسا لگا۔

زندگی گزارنے والوں کے لیے ایک زندہ انسان کی روداد

میں نے اسے دیکھا۔ وہ اس وقت قلبی اذیت سے دوچار تھا۔ ڈیپورا اس کی چھوٹی بہن تھی۔ والدین کی موت کے بعد اس نے اسے باپ بن کر پالا تھا۔ اور جب وہ معذور ہوا تو ڈیپورا نے اسے سہارا دیا۔ اب میں سمجھ سکتا تھا کہ میری ہر وضاحت قبول کرنے کے لیے وقتی طور پر تیار ہے۔ البتہ اس وقت میرا بچ اس کے لیے ضرر رساں ہوگا۔ چاہے بعد میں کبھی حقیقت اس پر ظہور جائے۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں یہ بچ نہیں۔“ اس نے یہ ضرور ہے کہ میکی فیلڈز ایک بد معاش ہے۔ ڈیپورا کو اس بات کا پتہ اس کی سیکرٹری بننے کے بعد چلا۔ مگر اس وقت تک وہ ہر چلنی تھی۔ تم تو جانتے ہو کہ پھر اس چکر سے نکلنا آسان نہیں ہوتا۔“ اس کی اذیت دور تو نہیں ہوئی البتہ کم ہو گئی۔ ”بے چاری ڈیپورا...!“ وہ بڑبڑایا۔ ”میری وجہ سے کتنی اذیتیں اٹھانی ہیں اس نے۔“ پھر اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ”تمہاری ڈیپورا سے ملاقات کیسے ہوئی؟“ ”میری اس لفظ سے لڑائی ہوئی تھی۔ میں زخمی ہو گیا تھا۔ ڈیپورا نے میری مدد کی اور مجھے بچا کر یہاں لے آئی۔“ میں نے کہا۔ وہ مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن پھر اسے جیسے

میں نے پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھا۔ دروازے کے قریب ہی لوہے کی ایک سلاخ بڑی تھی جس کی مدد سے میں گرم راتوں میں اوپر والی چھوٹی کھڑکی کھولا کرتا تھا۔ میں نے وہ اٹھانی اور دروازے کے پیچھے دبک گیا۔ دروازہ کھلا اور بین لڑکھڑاتا ہوا اندر آیا۔ کلکٹر اس کے پیچھے تھا۔ اس نے لات مار کر دروازہ بند کر دیا پھر وہ پلٹ کر دیکھ بغیر بین کے پیچھے چل دیا۔ میں آگے بڑھا اور سلاخ سے اس کے سر پر وار کیا۔ وہ آواز نکالے بغیر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اسے پتا بھی نہیں چلا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ ”میں سوچ رہا تھا کہ تم کہاں ہو آخر؟“ میں نے سرگوشی میں کہا۔ ”میں یہیں تھا۔ لیکن موقع کا انتظار کر رہا تھا۔“ اب میں اسے کیسے بتاتا کہ میں ان لفظوں کے سامنے نہیں آتا چاہتا تھا۔ اس نے اس پر غور بھی نہیں کیا۔ اسے تو اس وقت اپنی بہن کی فکر تھی۔ ”تم نے سنا یہ ڈیپورا کے بارے میں کیا کہہ رہا تھا؟“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”کیا یہ سچ ہے؟“

وقار

پیشانی

بیوہ



یقین آگیا۔ وہ سکون نظر آنے لگا۔ ”اور وہ جو دوسرے کمرے میں موجود ہے...؟“

”ہم اسے سنبھال لیں گے۔“ میں نے کلکٹر پر جھٹکتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کی جیکٹ کھولی اور کندھے کے ہولڈر سے اس کی گن نکال لی۔ لیکن میں بہت محتاط تھا۔ گن میرے لیے بالکل نئی چیز تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی حادثہ رونما ہو۔

بین گن کو کھور ہا تھا۔ ”اب میری سبھ میں آیا۔ اسی لیے تو ڈیپٹی جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ مجھے یہ سب معلوم ہو۔“

”ہاں بین یہی بات ہے۔“

باہر کی گاڑی کے ڈرنے کی آواز ہمارے کانوں میں آئی۔ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ میں نے بین کو بیڈ پر بیٹھنے کو کہا اور خود دروازے کے عقب میں کھڑا ہو گیا۔

مرکزی دروازہ کھلنے کی آواز سنا دی۔ پھر اسپت میں سکون لہجے میں کہا۔ ”ہائی بیب! جیسے ہی میکسی نے الماری سے تمہارے کپڑے غائب دیکھے، ہمیں یہاں بھیج دیا۔“

”بین! بین کہاں ہے؟“ ڈیپور اچلائی۔ ”تم نے کیا کیا ہے اس کے ساتھ؟“

”وہ خبریت سے ہے رونی۔ کلکٹر اسے پریشانی سے بچانے کے لیے عقبی کمرے میں لے گیا ہے۔“

میں نے آتے ہوئے قدموں کی چاپ سنی۔ پھر دروازہ کھلا اور ڈیپور کمرے میں داخل ہوئی۔ ”بین... بین! تم ٹھیک تو ہو؟“ اس کا لہجہ بدیانی تھا۔

بین مسکراتا ہوا اٹھا۔ اسی لمحے اسپت بھی کمرے میں آگیا۔ میں نے آگے بڑھ کر گن اس کی کمرے لگا دی۔ ”ہلنا مت اسپت۔ میں بہت نروس ہو رہا ہوں۔ گنوں کا مجھے بالکل تجربہ نہیں ہے۔“

اسپت نے سر گھمانے کی بھی جرات نہیں کی۔ ”ڈیپٹی... تم؟“ اور یہ سوال نہیں تھا۔

میں نے گن سے اسے ہٹو کا دیا۔ ”دیوار سے ٹک کر کھڑے ہو جاؤ۔ ایسے تمہاری ناک دیوار سے ٹکے گی ہو۔“

اس نے بڑے محتاط انداز میں بے ہوش کلکٹر کو پھانگ لیا۔ ”تم نہیں سُدھ رہے ڈیپٹی! پہلے تم نے میکسی کی دولت پر ہاتھ صاف کیا۔ پھر اس کی لوڈیا پر۔“

میں نے گن کا دستہ اس کے سر پر سید کر دیا۔ وہ لڑکھڑایا۔ میں نے اسے دھکا دیا اور وہ دیوار سے ٹکرایا۔ میں نے ریو اور

اس کی پشت سے لگاتے ہوئے اس کی جیب میں رکھی میان سے اس کا چاقو نکال لیا۔

”میکسی کو یہ بات اچھی نہیں لگے گی ڈیپٹی...“ اسپت نے مجھے دھمکی دی۔ ”ایک بار بچنے کا یہ مطلب نہیں کہ تم ہر بار بچ جاؤ گے۔“

میں نے قہقہہ لگایا۔ ”تم زندہ ہی نہ رہے تو تمہیں کیا پتا چلے گا۔“

ڈیپور بین کے سینے سے لگ کر رو رہی تھی۔ بین اسے تسلی دے رہا تھا۔ ”مت رو، میری بہن! تمہیں اب اس کے لیے کام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

ڈیپور کا رونا اچانک موقوف ہو گیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”کیا اسے پتا چل گیا ڈیپٹی؟ کیا ان لوگوں نے...“

”میں نے بین کو بتا دیا ہے کہ تم لاءمی میں کیسے خراب آدمی کی سیکرٹری بن گئی تھیں... میں نے جلدی سے کہا۔“

اسے یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس کے کاروبار کے متعلق جاننے والے بعد تمہارے لیے جان چھڑانا ممکن نہیں رہا تھا۔“

”میں سب کچھ جان گیا ہوں ڈیپٹی... بین نے کہا۔ ”تم نے پہلے ہی کیوں نہیں بتا دیا مجھے؟ ہمل کر کوئی راستہ نکال لیتے۔“

ڈیپور اب مجھے تفکر آمیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں مسکرایا۔ وہ اپنے بھائی کی طرف بڑھنے لگی۔ ”میں اس سے خوف زدہ تھی بین۔ مجھ میں اتنی جرات نہیں تھی۔“

”اب تم فکر نہ کرو۔ ہم ان بدعاشوں کو پولیس کے حوالے کر کے یہاں سے نکل چلیں گے۔“

وہ پھر خوف زدہ ہو گئی۔ ”ہم ایسا نہیں کر سکتے بین۔“

”ہاں۔ ورنہ پولیس والے تمہیں روک لیں گے۔ پھر تم سنے سرے سے زندگی شروع نہیں کر سکو گے...“ میں نے کہا۔

”تم اب یہاں سے چلے جاؤ۔ تمہارے جانے کے بعد میں انھیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔“

”تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں ہوگی؟“

”بالکل نہیں۔ بس تم لوگ جلدی سے نکل جاؤ یہاں سے۔“

دیوار کی طرف سے اسپت کی منمناتی ہوئی آواز ابھری۔ ”میں بہت تکلیف میں ہوں ڈیپٹی۔ مجھے پلٹنے کی اجازت دے دو۔“

میں نے حلیف پر پڑا تار اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”ابھی ایک منٹ میں تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا...“ پھر میں نے اس کے

دونوں ہاتھ اس کی پشت پر لاکھڑی سے باندھ دیے۔ پھر اسے پٹائیا۔ ”اب آرام سے بیڈ پر بیٹھ جاؤ۔“

وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ بین اپنا تمام سامان لے جا چکا تھا۔ بس ایک چھوٹا بیگ رہ گیا تھا۔ پھر بین آیا۔ اس بیگ کو اٹھاتے ہوئے اس نے ہچکچاہٹ سے مجھے دیکھا۔ ”تم سب سنبھال سکو گے ڈیپٹی؟“

”ہاں! تم اس کی فکر نہ کرو۔ تم بس نکل لو یہاں سے۔“

بین نے نرمی اور محبت سے میرے کندھے کو ہچکھا۔ ”خدا تمہیں خوش رکھے۔ تم نے ہم پر بہت مہربانیاں کی ہیں ڈیپٹی۔“

پھر وہ پلٹا اور دروازے کی طرف چل دیا۔ اسی لمحے ڈیپور کمرے میں داخل ہوئی اور میری طرف آئی۔ وہ عجیب سی نظروں سے بین کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ ”تم واقعی ہمارے ساتھ نہیں چلنا چاہتے؟“

میں زبردستی مسکرایا۔ ”اب تو یہ بات سن ہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”دیکھو نا یہ مصروفیت بھی تو ہے۔“

وہ کوشش کے باوجود مسکرائیں گی۔ ”وہ جانے کے لیے مڑی مگر پھر وہ اپنی پلٹ کر میری ہاتھوں میں آگئی۔ وہ رو رہی تھی۔

”جاؤ ڈیپٹی، چل جاؤ۔ تاکہ یہ سب پیچھے رہ جائے... تاکہ تم اپنی زندگی یاد دلانے کے لیے تمہارے پاس کچھ بھی نہ رہے۔“

وہ زبردستی ہوتی آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ پھر میرے رشتہ پر پیار کر کے وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

”ہائی ڈیپٹی اینڈ گڈ نائٹ!“

اور میرے جواب دینے سے پہلے ہی وہ جا چکی تھی۔

میں اسپت کی طرف مڑا۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ ”ہم نے تمہاری تلاش میں کوئی جگہ نہیں چھوڑی۔ بس یہیں کا خیال نہیں آیا۔ اب مجھے یاد آیا ہے کہ اس رات رونی بھی ایسٹ سائڈ میں موجود نہیں تھی۔ ہمیں یہ اندازہ لگا لینا چاہیے تھا۔“

مجھے وہ کچھ بدلا بدلا سا لگا۔ اس تبدیلی کو سمجھنے میں مجھے کچھ دیر لگی۔ اور وہ بڑی تبدیلی تھی۔ اب اس کے ساتھ رال اڑانے والا مسئلہ نہیں رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ میں بے تہدلی سمجھ گیا ہوں۔

اس کی آنکھیں چمکے لگیں۔ ”میں تمہارا شکر یہ ادا کرنا بھول گیا۔“

”تم نے مجھے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ اس رات تمہاری ٹوکرنے میرا ہونٹ پھاڑ ڈالا تھا۔ ڈاکٹر کو پلاسٹک سرجری کرنی پڑی۔ اس میں میرا وہ پرانا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔“

میں مسکرایا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ میری محنت تمہارے کسی کام

آئی۔ شکر یہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ اچھا! اب ذرا پیٹ کے بل لیٹ جاؤ۔“

اس نے ہچکچاتے ہوئے میرے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے تار سے اس کے دونوں ٹخنوں کو جوڑ کر باندھا۔ پھر اسی تار سے دونوں ہاتھوں کو کھینچ کر باندھا۔ اب وہ ایسی خمدہ حالت میں تھا کہ چند گھنٹے اس حال میں رہنے کے بعد کئی دن تک وہ سیدھا نہیں ہو سکتا تھا۔

پھر میں نے کلکٹر کے پوچوں کو چیک کر لیا۔ وہ بھی آسانی سے ہوش میں آنے والا نہیں تھا۔ میں نے اپنی گئی جتنی چیزیں اپنے چھوٹے بیگ میں ڈالیں۔ اسپت اس تکلیف دہ پوزیشن میں بیٹھا مجھے دیکھ رہا تھا۔ ”اس پارتمنٹ میں نہیں سکو گے ڈیپٹی! اس نے کہا۔

میں نے ریو اور نکالا اور اس کی طرف بڑھا۔ میرے تیور دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو گیا۔ ”یہ تمہیں کیسے پتا چلا؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے ریو اور کو دیکھتا رہا۔ میں نے مسکرا کر ریو اور کو جیب میں رکھ لیا تو اس کی جان میں جان آئی۔ میں نے اس کے چہرے پر زور دار پھر سید کیا۔

”اگر تم اتنے عقل مند ہو اسپت... جتنا کہ میں تمہیں سمجھتا ہوں تو آئندہ بھی میرے رستے میں نہیں آؤ گے۔ اب تم ہر بار تو خوش قسمت ثابت نہیں ہو سکتے۔ اور یاد رکھو ہونگوں کا سوراخ تو ڈاکٹر بھر دیتے ہیں لیکن دماغ کا سوراخ دنیا کا کوئی ڈاکٹر نہیں بھر سکتا۔“ یہ کہہ کر میں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میں باہر نکلا تو بارش شروع ہو گئی تھی۔ مجھے اچھا لگا۔ جو کچھ میں پیچھے چھوڑ کر آیا تھا، کاش بارش اسے دھو دے اور ممکن ہے کبھی میں یہاں واپس آؤں اور اس وقت حالات مختلف ہوں۔

میں عقبی سیٹ پر بیٹھ گیا اور اخبار کھول لیا۔ اس میں وقت جنوب کی طرف جانے والی بس میں تھا۔ بس نیو جرسی کے مضافات سے گزر رہی تھی کہ براڈوے سے متعلق کالم میں اس خبر پر میری نظر پڑی۔

مجھے اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے بار بار آنکھیں مل کر دیکھا مگر وہ حقیقت تھی۔ لکھا تھا:

تقریبی مقامات اور تفرق گاہوں کے سب سے بڑے ٹھیکے دار معروف ہیپت چیک کنگ اور سامی گورڈن کے نام سے لائٹ ہیوی ویٹ کے سابق چیمپین سام وانگن نے کل مریم (سیمی) فشر سے شادی کر لی۔ واضح رہے کہ

مریم فشر گلووز چیمپنزی ڈین فشر کی بہن ہے۔ برمودا میں ہنی مون منانے کے بعد ڈلھا ولسن سینٹرل پارک ساؤتھ کے علاقے میں اپنے نئے پینٹ ہاؤس میں زندگی کا آغاز کریں گے جسے سام وائلکن نے خاص طور پر اپنی ولسن کے لیے بڑی محبت سے آراستہ کر لیا ہے۔

غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ بس رکوانے والی گھنٹی کے بٹن کی طرف لپکا۔ ایک لمحے کو میری انگلی بٹن پر جھکی رہی... لیکن بغیر دباؤ ڈالے۔ پھر میں نے اپنے ہاتھ کو واپس کھینچ لیا۔ واپس جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

میں نے اس خبر کو دوبارہ پڑھا۔ تنہائی کے احساس نے مجھے نڈھال کر ڈالا۔ میمی اور مسٹر سام! یہ کیسے ہو گیا؟ وہ کیسے ملے؟ اور میمی جو اپنے دفتر میں کام کرنے والے اس لڑکے کے لیے پاگل ہو رہی تھی اس لڑکے کا کیا بنا؟

میں نے آنکھیں موند لیں۔ کیا فرق پڑتا تھا؟ اب کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ کم از کم مجھ پر نہیں۔ جہاں تک ان لوگوں کا تعلق تھا تو میں ان کی زندگی سے نکل چکا تھا۔ ان کے لیے میرا وجود اور عدم برابر تھا۔

بارش بس کی کھڑکی کے شیشے سے ٹکرا کر اسے میرے ذہن کی طرح ڈھنڈلاتی رہی۔ میں اونگھنے لگا۔ میمی اور مسٹر سام کی تصویریں میری آنکھوں میں چمکتی رہیں۔ لیکن وہ الگ الگ تصویریں تھیں ایک ساتھ نہیں۔ جب ایک پوری طرح فوکس میں آتی تو دوسری معدوم ہو جاتی۔

میں انھیں باہمی خوشیوں کی دعا بھی نہیں دے سکا!

”میری غیر موجودگی میں...“

وہ ڈیرنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اپنے آنسوؤں پر اس کا بس نہیں تھا۔ ہاتھ میں موجود رومال اس کے منہ پر رکھا تھا تاکہ سسکیوں کا گلا گھونٹ سکے۔

پاپائروس ہونے لگے۔ ”یہ آخر کس بات پر رو رہی ہے؟“ انھوں نے ماما سے کہا۔ ”آج اس کی شادی ہے۔ یہ کوئی روئے کا موقع ہے بھلا؟“

ماما نے سخت بد مزگی سے انھیں دیکھا اور ان کا ہاتھ تھام کر کمرے کے باہر چلی گئی۔ ”جاؤ تم مہمانوں کی فکر کرو...“ ان کے لہجے میں قطعیت تھی۔ ”یہاں کے معاملات تمہارے سمجھنے کے نہیں ہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا زارویر میں۔“

پاپا احتجاج کرتے رہے لیکن ماما نے دروازہ بند کر دیا۔ پھر

وہ اس کے پاس چلی آئیں۔ ان کے چہرے پر تعظیم تھی۔ وہ خاموشی سے طوفان کے گزرنے کا انتظار کرتی رہیں۔ اور انھیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ بالآخر میمی کے آنسو ٹپ گئے۔ اب وہ ہزوں انداز میں ہاتھ میں پکڑے ہوئے رومال کو مسل رہی تھی۔

”تم اس سے محبت نہیں کرتیں۔“ ماما نے سکون لہجے میں کہا۔ میمی نے جھپٹکے سے سر اٹھایا اور ان کی آنکھوں میں جھانکا۔ مگر اگلے ہی لمحے دوبارہ نظر جھکا لی۔ ”میں اس سے محبت کرتی ہوں۔“ اس نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

”اگر تم اس سے محبت نہیں کرتیں تو یہ شادی نہ کرو۔“ ماما نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

اس بار میمی نے پلکیں جھپکائے بغیر ان کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”اب میں ٹھیک ہوں ماما۔“ اس نے غیر جذباتی لہجے میں کہا۔ ”میں خواہ مخواہ چپنا کر رہی تھی۔“

ماما کے چہرے پر اب بھی سنگینی تھی۔ ”شاید تم سمجھ رہی ہو کہ شادی کر کے تم بڑی ہو جاؤ گی۔ مت بھولو کہ تمہارے شادی کے لائنس دست خط مجھے کرنے ہیں۔ اجازت دینے والی میں ہی ہوں۔“

میمی نے پلٹ کر آئینے میں خود کو دیکھا۔ پھر وہ اٹھی۔ کوئے میں لگے داش بنس کی طرف چل دی۔

ماما نے ہاتھ بڑھا کر اسے روکا۔ ”یہ پوری زندگی کا معاملہ ہے میمی۔“ انھوں نے کہا۔ ”تمہیں اس کے ساتھ عمر گزارینی ہے۔ اگر...“

”ماما ایسی باتیں نہ کریں۔“ میمی نے بذیانی لہجے میں کہا۔

”اب بہت دیر ہو چکی۔“

”ہرگز نہیں۔ ابھی وقت ہے۔ تم ارادہ بدل سکتی ہو۔“

میمی نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کے چہرے پر استقلال جھلکے لگا۔ ”نہیں ماما۔ بہت دیر ہو گئی۔ دیر تو ابی وقت ہو گئی تھی جب میں پہلی بار اس سے یہ پوچھنے لگی تھی کہ ڈینی کہاں گیا۔ اب میں کیا کر سکتی ہوں ماما؟ ڈینی کی تلاش میں جو کچھ اس نے خرچ کیا، وہ اسے لوٹا سکتی ہوں میں؟ اسٹور خریدنے اور جمانے کے لیے جو اس نے پاپا کو پانچ ہزار ڈالر قرض دیے وہ چکا سکتی ہوں میں؟ اس نے جو میرے لیے انگوٹھی خریدی، ملبوسات خریدے وہ لوٹا دوں اسے؟ اور اس سے کہوں کہ سوری میں خود کو سمجھ نہیں پاتی۔ یہ شادی مناسب نہیں ہے؟“

ماما کی آنکھوں کا ڈھکھڑاہٹا ہوا گہرا ہوا گیا۔ ”ہاں عمر بھر ناخوش رہنے سے یہ بہتر ہے۔ تم مجھے اور اپنے پاپا کو اپنے ساتھ وہ کچھ نہ کرنے دو جو ہم ڈینی کے ساتھ کر چکے ہیں۔“ دیکھتے ہی دیکھتے

ان کی آنکھیں بھرا آئیں۔

”آپ خود کو بلا وجہ الزام نہ دیں۔“ میمی نے چمک کر کہا۔ ”یہ سب پاپا کا کیا دھرا ہے۔“

”نہیں میمی! میں انھیں روک سکتی تھی۔ مجھے انھیں روکنا چاہیے تھا...“ ماما نے کہا۔ ”اسی لیے میں اس وقت تم سے بات کر رہی ہوں۔ میں غلطی ڈھرائتا نہیں چاہتی۔“

میمی کے چہرے پر استقلال تھا۔ ”نہیں ماما یہ الگ بات ہے۔ سام مجھ سے محبت کرتا ہے۔ بے شک میں اس سے اتنی محبت نہیں کرتی جتنی وہ مجھ سے کرتا ہے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ میں بھی اس سے اتنی ہی محبت کرنے لگوں گی۔ وہ بہت چھٹا کشادہ دل اور بڑا دلدار ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ماما۔“

ماما سواہ نظر لیں۔ اس کے چہرے پر سنگینی رہیں۔ ”میمی نے اچانک جھک کر ماما کی پیٹ پیٹ دی۔ ”آپ ایمان نہ ہوں ماما۔“ وہ بولی۔ ”میں جانتی ہوں کہ میں کیا کر رہی ہوں۔ اور یہی سبھی چاہتی ہوں۔“

وہ طوف زدہ سی پہلو بیٹھی تھی۔ آنے والے لمحوں کے تصور سے اس کے اعصاب بچ رہے تھے۔ ہاتھ روم کی طرف سے اٹھ کر فرش کرنے کی آواز آرہی تھی۔ پھر بہتے ہوئے

کی آواز آئی۔ گئی۔ لائن کے سوچ کی کلک سنائی دی تو وہ زبردست زور سے بلا جھ سے دبا۔ اس کے جسم کا تناؤ بڑھ گیا اسے سردی کا احساس ہونے لگا۔

ایک لمحہ خاموشی رہی۔ پھر سام نے نرمی سے اس کے سر کو ہاتھوں سے دانت پر دانت جھادے۔ اسے اس نے سام کی سرگوشی سنی۔ ”میں تم سے محبت کرتا ہوں بی بی!“

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ ”کیا بچ بچ سام؟ جو میں نے تمہارے ساتھ کیا اس کے بعد بھی؟“

”ہاں بی بی۔ اور تم نے کیا ہی کیا ہے۔“ وہ سرگوشی میں بولا۔ اس کے جسم کا تناؤ دُور ہو گیا۔ ”شکر یہ سام!“ اس نے کہا۔

لیکن قربت کے لمحوں میں اسے جارج کا خیال آتا رہا۔ وہ لڑتی رہی۔ اسے اپنی سوچوں سے دُور پھیلنے کی کوشش رہی۔ وہ خود کو یاد دلاتی رہی کہ یہ تو سام کے ساتھ زیادتی ہو چکا ہے۔ اس میں سام کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ سب

کچھ سام کی وجہ سے نہیں ہوا تھا۔ غلطی تو اس کی اپنی تھی۔ اس نے خود بھی چاہا تھا۔ جب وہ پہلی بار نیلی کے ساتھ سام کے پاس گئی تھی، بھیجی سے اس نے یہی چاہا تھا۔

طوفان گزر گیا!

اس کے پہلو میں لینے ہوئے سام نے نرمی سے اس کے رخسار کو ہاتھوں سے مس کیا۔ ”تم ٹھیک تو ہونا؟“

میمی نے اس کے سینے میں چہرہ چھپا لیا۔ ”ہاں ٹھیک بھی اور خوش بھی!“ اس نے کہا۔ لیکن اپنے دل میں وہ جانتی تھی کہ یہ جھوٹ ہے۔ اور اب وہ ساری زندگی اس سے یہ جھوٹ بولتی رہے گی۔ وہ ہمیشہ خوف زدہ رہے گی۔ قربت کے نازک لمحوں میں اس کی نگاہوں میں سام کا نہیں جارج کا چہرہ تھا۔

”اے خدا!“ اس نے خاموشی سے دل میں دعا کی۔ ”کیا ساری عمر میرے ساتھ یہی ہوتا رہے گا؟ کیا میں ہمیشہ یونہی خوف زدہ رہوں گی؟“

جوابی آواز اس کے ذہن میں ابھری۔... بھاری مردانہ آواز! ”میرے ساتھ دہراؤ میری بیٹی۔ میں مریم! اپنے وجود کی سچائی کے ساتھ...“ سیوسیل کو اپنے شوہر کی حیثیت میں قبول کرتی ہوں۔ میں عہد کرتی ہوں کہ غربت میں پریشانی میں بیماری میں ہر طرح اس کی شریک رہوں گی۔ میری محبت، میری آبرو اس کی امانت ہے۔ میں مرتے دم تک یہ ساتھ بھاؤں گی۔“

سام سوچکا تھا۔ میمی نے تاریکی میں اس کے چہرے کو دیکھا۔ وہاں خوشی تھی۔ اس نے سوچا۔ یہ بھی غیبت ہے۔ پھر دیکھے پسر رکھ کر لیت گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ چپکے چپکے رو رہی تھی۔

وہ... وہ تو مجھے ڈھونڈنے لگی تھی۔ اور اب وہ پوری زندگی... ہر دن اور ہر رات اس کے ساتھ گزارے گی۔ لیکن وہ بھی نہیں جان سکے گا کہ میمی اس کے پاس ہے اس کی دست رس میں ہے۔ لیکن اس کی نہیں ہے۔

دن زندگی کے

بارش یوں برس رہی تھی جیسے کبھی نہیں رُکے گی۔ خیمے کی بھیگی ہوئی کیڑوں کی دیواریں تیز ہوا سے اندر کی طرف چپک رہی تھیں۔ میں نے سگریٹ کو ایک طرف پھینک دیا۔

ہوئے سوچا کہ بھیگی ہوئی سگریٹ کو دیکھنا بھی کتنی کوفت کا باعث ہوتا ہے۔

مجھے یہاں رہتے ہوئے دو سال ہو گئے تھے۔ یہاں موسم بہت سخت تھے اور کیڑوں کے خیمے ان کی سختی کو آدرا بڑھا دیتے

پڑے۔ میں تنہائی سے عاجز آچکا ہوں۔

تھے گرمی ہوتی تو خیمے کے اندر یہ احساس ہوتا کہ یہ جہنم کا کوئی خاص الخاص گوشہ ہے جہاں تیش نہ جینیے دیتی ہے اور نہ مرنے دیتی ہے۔ سرد راتوں میں صاف محسوس ہوتا ہے کہ بڈیوں کے اندر موجود گودا جما جا رہا ہے۔

گھر سے دُور گھر سے بے خبری کے وہ دو سال! میں نہیں جانتا تھا کہ نیلا کیا حال ہے، اماور پاپا کیسے ہیں... اور بیسی اور سام۔ یہ نام ہمیشہ اذیت جگاتے تھے۔ تنہائی کا احساس ستانے لگتا تھا۔

خیمے کے ساتھ سفر کرتے کرتے اب میں تقریباً گھر پہنچ چکا تھا۔ ہاں گھر نہیں، تقریباً گھر۔ میں فلاڈلفیا میں تھا... گھر سے ستر منٹ کی مسافت پر۔ سوچتا تو بہت آسان لگتا۔

لیکن سوچنے اور عمل کرنے میں بہت فرق ہے۔ سوچنا آسان ہوتا ہے اور عمل کرنا مشکل۔ جو کچھ پیچھے ہو چکا تھا وہ سب یاد آتا تھا۔ اور میں پھر مشتعل ہو جاتا تھا۔ اپنی جلاوطنی پر مجھے غصہ آتا تھا۔ اور میں ڈرتا بھی تھا کہ واپس جاؤں گا تو نہ جانے کیا کہہ ہوگا۔

اس کے باوجود میں گھر واپس جانا چاہتا تھا... آج سے نہیں ہمیشہ سے... میں کچھ رشتوں کی دُور سے بندھ تھا چاہے وہ مجھے قبول نہ کریں۔ وہ رشتے جنہیں میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔ بس میرے جذبات ان کی تفریح کر سکتے تھے۔ آج میں ان سے ستر منٹ کے فاصلے پر تھا۔ لیکن کل جب یہ خیمے جنوب کی طرف سفر شروع کریں گے تو پرسوں میں گھر سے مجھے دُور ہوں گا۔ اور ایک ہفتے بعد وہ مسافت چوبیس گھنٹے کی ہوئی اور ایک ماہ بعد وہ ایک دن پر محیط سفر ہوگا جو میں کبھی نہ کر سکوں گا۔

میں نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ بارش چہرے کو چھنار رہی تھی۔ یہ بارش نہیں تھمے گی۔ دوسری سگریٹ بھی بجیک کر کرور ہو گئی تھی۔ میں نے اسے بیروں کے پاس پانی کے چھوٹے سے تال میں پھینک دیا۔ پانی سے اپنی آگ کو بچانے کی کوشش میں وہ غصے سے پھنکاری۔ شاید میں بھی اس سگریٹ جیسا ہی ہوں... اپنی زندگی کے لیے لڑتا ہوں۔

میرے اندر ایک پکاری آہ بھری۔ ایک مسلسل پکار... مجھے گھر جانا ہے... ہر حال میں ہر صورت میں چاہے کچھ بھی ہو... مجھے گھر جانا ہے۔ مجھے نیلی سے ملنا ہے۔ اماور بیسی سے بھی... اور پاپا سے بھی چاہے وہ نہ مانا چاہیں، مجھ سے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ مجھے قبول نہیں کیا جائے گا... میں وہاں نہیں رہ سکوں گا... چاہے مجھے واپس نہیں آنا پڑے۔ چاہے مجھے کل ہی واپس آنا

میرے سامنے سے گزری۔ مگر وہ ان میں نہیں تھی۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ کچھ اور لڑکیاں باہر آ رہی تھیں۔ لیکن وہ ان میں بھی نہیں تھی۔ میں نے اپنی رست واپس میں وقت دیکھا... فوج کرپاچ منٹ۔ اب وہ آئی ہی ہوگی۔

میں نے اپنے چہرے کو رومال سے پونچھا۔ ہوا میں خشکی تھی۔ اس کے باوجود مجھے پینا آ رہا تھا۔ رومال جیب میں ٹھوس کر میں پھر دروازے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لڑکیاں اب بھی باہر آ رہی تھیں۔ میری نگاہیں ایک ایک کوشٹول رہی تھیں۔ ہر ناکامی پر امید کے جام میں سے ایک قطرہ ٹپک جاتا تھا، اب باہر آنے والی لڑکیاں بھی کم ہی تھیں... گاؤں کا دُکا۔ وہ باہر آئیں، سر اٹھا کر آسمان کو دیکھیں اور پھر پوچھنا۔

میں نے پھر کھڑی ہو کر وقت دیکھا۔ اب نوٹیس ہو چکے تھے۔ مایوسی میرے وجود میں سرایت کر رہی تھی۔ میں واپس جانے کے لیے پلٹا۔ میں پاگل تھا کہ سوچا، دو سال سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ لیکن میرے قدم رکتے گئے۔ میں نے آنے کے بعد اس طرح لوٹ جانا مجھے پاگل پن ہے۔ اب تک اسٹور خالی نہیں ہو جاتا۔ بند نہیں ہو جاتا، مجھے اس کا

اس خیال نے کچھ اور سوچوں کے درمیانے کھول دیے۔ اب بھی بدل گئی ہوگی میری طرح؟ یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ مجھے قبول ہو۔ ممکن ہے کسی اور سے اس کی دوستی ہو گئی ہو۔ لیکن مجھ سے کی دوستی تو نہیں تھی۔ مجھ سے وہ محبت کرتی تھی۔ کون جانے ایک نوجوان لڑکی کی زندگی میں دو سال کا عرصہ بہت بڑا ہوتا ہے اسٹور کے دروازے پر میں رکا اور اندر جھانکنے کی وجہ سے مجھ میں وہ چوٹ پار کرنے کا حوصلہ پیدا ہو گیا۔ کیا پتا وہ سے ملنا ہی نہ چاہے۔ میں ایک لمحہ وہاں کھڑا بیٹھا تا رہا۔

کارن کی طرف چلا گیا۔ میں نے پٹ کر اسے دیکھا... اور دیکھتا رہا۔ اس نے جس کی کوشش بیکر کیا تھا وہ مخالف سمت میں جاری تھی۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ وہ بائیں ٹھیک بدلی تھی۔ وہی ہونٹ وہی رخسار وہی

میں نے لائٹ کے نیچے جہاں کھڑے ہو کر میں ہمیشہ اس کا انتظار کیا تھا۔ میں نے لیمپ پوسٹ سے ٹیک لگائی اور سگریٹ کے لیتا رہا۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے اچانک فائو اینڈ ٹین کی ونڈو کی روشنی نگاہیں گھٹی ہوئی اور سنہل کر کھڑا ہو گیا۔ سگریٹ کو میں نے نیچے پانی میں ڈال دیا۔ اب بس چند منٹ کی بات ہے... بس چند منٹ۔ کچھ میں کوئی سن پھر سنے گی۔ حلق خشک ہونے لگا۔ کام کرنے والی لڑکیوں کی ایک ٹولی اسٹور سے

میں اب اپنے لیے چھتری کھول رہی تھی۔ چھتری کو اپنے کی طرف لے جاتے ہوئے اس کی نگاہ اوپر اٹھی... اور مجھ پر ڈالی۔ وہ ساکت ہوئی۔ اس کے چہرے پر بے یقینی تھی۔ وہ اندر میری طرف بڑھی پھر رکت گئی۔ ”ڈینی...؟“ اس کے

مسجد بیت المکرم

قومی سطر پر اگر جائزہ لیا جائے تو پاکستان میں ماڈرن مسجد کی تعمیر کا نقطہ آغاز ڈھاکہ میں تعمیر ہونے والی مسجد بیت المکرم کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کی تعمیر کا آغاز 1959ء میں ہوا اور یہ مسجد 1963ء میں باپہ تکمیل کو پہنچی۔ ڈھاکہ کا اُس وقت پاکستان کا حصہ تھا۔ بیت المکرم مسجد کی تعمیر کے پیچھے اصل دل چھپی معروف صنعت کار عبداللطیف بھادوی کی تھی جب کہ ماہر فن تعمیرات عبدالحمید تھریانی جس نے ہندوستان سے فن تعمیر میں تعلیم حاصل کی تھی، پہلی مرتبہ خانہ کعبہ کی مکعب شکل کو بنیاد بناتے ہوئے مسجد بیت المکرم کا ڈیزائن تیار کیا جو شہادت میں ہو یہ ہو خانہ کعبہ جیسا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ بیت المکرم مسجد کی بیرونی دیواروں کو سیاہ رنگ کی بجائے سفید رنگ کیا گیا، اور صرف چاشی ہی کو سیاہ رکھا گیا۔ دیکھتے میں یوں تو یہ بالکل خانہ کعبہ جیسی عمارت ہی کی تعمیر تھی، اور اسی وجہ سے اس مسجد میں بیٹناری تعمیر نہ کیا گیا، تاہم گرد و نواح کے اعتبار سے کئی مختلف چیزیں نظر آتی ہیں۔ اس کی تعمیر کو ممکن بنانے میں اُس وقت کے چیف مارشل لائیڈ سنٹرل میجر جنرل امر اوخان کا ہاتھ تھا جب کہ تعمیراتی اخراجات مقامی صاحب ثروت لوگوں نے اپنے ذرائع سے پورے کیے۔

ترجمہ: ڈاکٹر مبارک علی، تعاون: احمد بن محمد

مجھے میں بھی بے یقینی تھی۔

میں اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ میرے ہونٹ بے آواز بل رہے ہیں۔ سگریٹ میرے ہونٹوں سے گرمی۔ اس کی چنگاریاں میرے پکڑوں کو چھوٹی ہوئی جل نکھیں۔

”ڈینی... ڈینی...!“ اس بار وہ چلائی اور میری طرف پلک۔ چھتری نیچے گر گئی۔ لیکن اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ اگلے ہی لمحہ وہ میری ہانہوں میں تھی اور بے تابانہ میرے چہرے کو چوم رہی تھی۔ اس کے آنسو میرے رخسار بھجورہے تھے۔ اس کا جسم سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

میری آنکھوں میں دھند سی چھانے لگی... اور وہ بارش کی

کچھ کیا۔ تمہارے پایا کو کاروبار میں مدد دی۔“

میں نے ایک گہری سانس لی۔ مجھے سب سے زیادہ اسی بات کی فکر تھی۔ پچھلے چند برسوں میں مجھے یقین ہو گیا تھا کہ پایا کسی سہارے کے بغیر کھڑے ہونے... چلنے والے نہیں ہیں۔ اچھا ہے انھیں سام کا سہارا مل گیا۔ اب یہ پتا نہیں کہ سام میرے بارے میں کس انداز میں سوچتا تھا۔ کیا وہ مجھ سے خفا ہوگا؟ یقیناً ہوگا... اور اس میں اس کا کوئی تصور بھی نہیں تھا۔ وہ حق بہ جانب تھا۔

”تم ان سے ملنے جاؤ گے؟“ نیلی نے مجھے چونکا دیا۔

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”لیکن ڈینی یہ ضروری ہے۔ وہ تمہاری فیملی ہے۔“

”پاپا کے نزدیک میں گندہ انداز ہوں...“ میں نے بے رحمی سے کہا۔ ”اور تمہیں وہ کیا سمجھتے ہیں یہ بھی مجھے معلوم ہے۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے...“ وہ بولی۔ ”میں جانتی ہوں کہ وہ لوگ مجھے پسند نہیں کرتے لیکن پھر بھی تمہیں جانا چاہیے۔“

”میں نہیں جاؤں گا...!“ میں نے نیلی سے کہا۔ ”میں تمہارے لیے آیا ہوں ان کے لیے نہیں۔“

ہم اس ڈور وے میں ایک دوسرے سے لپٹ کھڑے تھے... دو برس پہلے کی طرح۔ اچانک وہ رونے لگی۔ میں نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھر کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”کیا بات ہے نیلی؟“

”میں بہت خوف زدہ ہوں ڈینی۔ میں نہیں چاہتی کہ اب تم مجھے چھوڑ کر جاؤ۔ اس بار گئے تو تم بھی واپس نہیں آؤ گے۔“

”میں جاؤں گا ہی نہیں۔ میں تمہیں کد باٹ کبیرا ہوں گد بانی نہیں۔“

”نہیں ڈینی، نہیں۔ میں نے تمہیں جانے دیا تو تم کبھی نہیں آؤ گے۔“ وہ بچوں کی طرح بلکتے لگی۔

”مت رو نہی... پلزز!“

اس کے لہجے کا خوف اور بڑھ گیا۔ ”تم مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ ڈینی۔ ورنہ میں مرنے جاؤں گی۔“

”میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گا نیلی۔“ میں اسے تھپکتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کی سسکیاں ختم نہ گئیں۔

وہ میرے سینے میں منہ چھپائے کچھ بول رہی تھی۔ آواز اتنی دھیمی تھی کہ سننے کے لیے مجھے کان لگانے پڑے۔ ”کاش کوئی ایسی جگہ ہوتی جہاں ہم جا سکتے... جہاں ہم ساتھ رہ

سکتے۔ وہاں میں بیٹھ کر تمہیں دیکھتی رہتی اور کہتی... میرا ڈینی واپس آ گیا ہے۔“ اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ ”میں آج رات گھر نہیں جانا چاہتی۔ میں نہیں چاہتی کہ اپنی بہن کے ساتھ سوؤں اور منہ اٹھ کر سوچوں کہ تمہارا آنا محض ایک خواب تھا۔ میں چاہتی ہوں کہ تمہارے ساتھ رہوں تمہارا ہاتھ تھام کر بیٹھی رہوں اور جب صبح ہو تو کہوں کہ یہ خواب نہیں۔ میرا ڈینی اب بھی میرے ساتھ ہے۔“

”میں صبح تمہارے پاس آ جاؤں گا۔“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔

”نہیں... تم نہیں آؤ گے...“ اس کا لہجہ یاس آمیز تھا۔ ”اگر میں نے اس بات کو تصدیق کر لیا تو تم واپس نہیں آؤ گے۔ کچھ ایسا ہو جائے گا کہ تم واپس نہیں آ سکو گے۔“ اس کی آنکھیں پھر بھر آئیں۔ ”آخری بار بھی تم نے یہی کہا تھا ڈینی... یاد ہے نا تمہیں؟ تم نے کہا تھا حالات کچھ بدل گئے ہوں... میں یہ نہ بھولوں کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ یہی کہنا مانا؟ پھر تم واپس نہیں آئے۔ لیکن مجھے تمہاری بات یاد رہی۔ میں نے یاد رکھا۔“ اب آنسو اس کے رخساروں پر پھسل رہے تھے۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی۔

میں نے مسکرائے کی... بات کو شرافت بیانی سے ہلکا کرنے کی کوشش کی۔ ”لیکن نیلی، ہم اس ڈور وے میں پوری رات تو نہیں گزار سکتے۔“

”کوئی ایسی جگہ تلاش کر دو جہاں ہم رات گزار سکیں...“ اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ”جہاں میں بیٹھ کر تم سے بات کر سکوں تمہارا ہاتھ تھام کر بیٹھی رہوں یہاں تک کہ آج گزر جائے اور کل آجائے۔ اور مجھے یقین آجائے کہ یہ خواب نہیں ہے۔“

کھڑکی سے در آنے والی دھوپ میری آنکھوں میں چھٹی تو آنکھیں کھل گئیں۔ وہ پہلو کے بل لیٹی مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کا سر اپنے ہاتھ پر ٹکا تھا اور نظریں میرے چہرے پر جمی تھیں۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی۔

میں ایک لمحے بے یقینی سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں بھی مسکرا دیا۔ مجھے رات کی یاد آئی۔ میرے جسم میں توانائی سے دوڑ گئی۔ ”دیکھا تم نے...“ میں نے کہا۔ ”رات گزر گئی۔ صبح آ گئی۔ میں تمہارے سامنے موجود ہوں۔ یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔“

اس نے سر کو تھپی جُنپش دی۔ پھر کھڑکی کی طرف اور پھر

میرے چہرے کو دیکھا۔ ”ہاں... صبح ہوگئی۔“

”اور اس وقت تم اور زیادہ خوب صورت لگ رہی ہو۔“
اس کا چہرہ ہنستا اٹھا۔ ”اور تم سو تے میں بہت خوب صورت لگ رہے تھے...“ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”میں رات بھر بیٹھی تھیں دیکھتی رہی۔ سو تے میں تم چھوٹے سے لڑکے لگ رہے تھے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ جاگنے کے بعد میں بڑا لگ رہا ہوں؟“
میں نے مصنوعی غصے سے کہا۔
وہ ہنسنے لگی۔

”اور سنو... تم سوئی نہیں؟ رات بھر جاگتی رہیں؟“
”ہاں۔ سونا ہوتا تو کھر نہ چلی جاتی...“ اس نے کہا۔ پھر بولی۔ ”تمہاری تو پسلیاں نظر آنے لگی ہیں۔ بہت ڈبلے ہو گئے ہو تم؟ تمہیں بہت کھانا پڑے گا۔“

”تو ابھی سے شروع کر دو۔ بہت ہلک لگ رہی ہے مجھے۔“
وہ میرے چہرے کو اگلی سے سہلانے لگی۔ ”ڈینی تم مجھ سے محبت کرتے ہونا؟“

”نہ کرتا ہوتا تو اس وقت یہاں نہ ہوتا۔“
”سچ کہہ رہے ہونا؟“
”اس میں جھوٹ ہونے کی گنجائش ہی کہاں ہے؟“
اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ”بار بار کہتے ہو کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ اچھا لگتا ہے۔“

میں... آئی ٹو ٹی... آئی ٹو ٹی... کی گردن کرتا رہا۔
چرچ کے کھلے ہوئے دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ رُک گئی اور سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ ”ڈینی میرے ساتھ اندر چلو گے؟“

میں نے چرچ کو اور پھر والیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں التماس تھی۔ میں نے خاموشی سے سر ہلادیا۔
اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ہم چرچ میں داخل ہو گئے۔ اندر نیم تاریکی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور لرزتی آواز میں بولی۔ ”ڈینی تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو؟“

”یہ کیسے ممکن ہے؟“ میں نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔
اس کے ہونٹوں پر تشکر آمیز مسکراہٹ چھلنے لگی۔ ”اگر میں پہلے یہاں نہ آتی تو وہ سب کچھ بعد میں مجھے درست نہ لگتا۔“
وہ آگے بڑھی اور قرآن گاہ کے سامنے جھک گئی۔ چند لمحوں کے بعد وہاں آنکھیں بند کیے سر جھکائے کھڑی رہی۔ پھر وہ سیدھی ہوئی اور پلٹ کر میرے پاس چلی آئی۔ اس کے لبوں پر

مسکراہٹ تھی اور چہرہ دمک رہا تھا۔

میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور چرچ سے نکل آئے۔ ہم باہر آئے اور آگے بڑھنے لگے۔ چند لمحوں خاموشی رہی۔ پھر اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ ”اب میں بہتر محسوس کر رہی ہوں۔“ اس نے شرمیلے لہجے میں کہا۔ ”مجھے خوشی ہے۔“

”مجھے اندر جانا ہی تھا ڈینی۔ ورنہ یہ سب کچھ مجھے جاء نہ لگتا۔“

”اچھا ہوا...“ میں نے کہا۔ ”ایسی دلچسپ مجھے اچھی نہیں لگتی جسے سب کچھ غلط لگ رہا ہو۔“ پھر میں نے سینی بچا کی کیب کو روکا۔ میں نے دروازہ کھولا اور سہارا دے کر اسے کیب میں بٹھایا۔

ڈرائیور نے والیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”سٹی ہا پلیر۔“ میں نے اس سے کہا۔

چند منٹ... صرف چند منٹ بعد ہم ٹاؤن ہال کے نکلے۔ ٹاؤن ہال کی بیڑھیوں پر کھڑے ہو کر ہم نے ایک دور دورے دیکھا۔ ہم صرف چند منٹ کے لیے ٹاؤن ہال میں گئے تھے باہر آ گئے تھے۔ لیکن ان چند منٹوں میں سب کچھ بدل چکا تھا۔ اب ہم شادی شدہ تھے!

نیلی نے میری ہاتھ تھام لیا۔ ”ہم لوگ سب سے پہلے میرے گھر والوں کو یہ خبر دے دیں گے۔“ اس نے کہا۔ ”اوکے۔“
”پھر ہم تمہارے گھر والوں سے ملیں گے اور انہیں بتائیں گے۔“

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”کیوں؟ ان کا اس کی واسطہ؟ اور انھیں اس کی پروا بھی نہیں ہے۔“
اس کی آنکھوں میں ایک ضد سی چلی۔ ”ایک استقلال!۔“
”لیکن میرے لیے اس بات کی بہت اہمیت ہے۔ میں اسے ضرور بتاؤں گی۔“

”تم مجھے نہیں۔ انھیں ہماری کوئی پروا نہیں بلکہ وہ ہمیں سمجھتے ہیں۔ اور تمہیں تو... نہیں نیلی! انھیں بتانے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے احتجاج کیا۔

وہ میرا بازو دھکی سے دباتے ہوئے مسکرائی۔ ”ڈینی فخر چاہتے ہو کہ ہماری ازدواجی زندگی کا آغاز جھگڑے سے ہو لڑکر اس نئی زندگی کا افتتاح کریں؟ اگر ایسا ہے تو میں اس

لیے تیار ہوں... یہیں... اسی وقت۔“

میں نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ فرط محبت سے ہنستا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی۔ ”نن... نہیں۔ میں یہ نہیں چاہتا۔“ میں نے گڑبڑا کر کہا۔ ”بس تو پھر انھیں بتائیں گے۔“

”ٹھیک ہے نیلی۔ ہم انھیں بتائیں گے۔“ میں نے کہا اور اس کا ہاتھ تھام کر ٹاؤن ہال کی بیڑھیوں سے اترنے لگا۔ ”بلکہ تم حکم کرو تو میں ریڈیو اینکشن جا کر اعلان کرنے کو بھی تیار ہوں۔ تاکہ پوری دنیا کو اس کا علم ہو جائے۔“

وہ خوش ہو کر ہنسی اور میری طرف دیکھا۔ ”واقعی... یہ ایڈیڈیا بھی بہت اچھا۔“

درہان نے ہمیں روکنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس کی لگاؤں میں انتظار تھا۔

”مسٹر وانگن کا اپارٹمنٹ پلیر۔“ میں نے کہا۔
اس نے سر کو اٹھائی جنبش دیتے ہوئے مؤذبانہ لہجے میں کہا۔ ”مسٹر گورڈن کے اپارٹمنٹ کا نمبر C21 ہے... انہیں ویس ملے۔“

نیلی کی طرف بڑھے۔ دروازہ ہمارے عقب میں بند ہو گیا۔

لٹھ میں نیلی نے سرگوشی میں نیلی سے پوچھا۔ ”یہ مسٹر گورڈن کا کیا مطلب ہے؟“ لٹھ آپریٹر دروازے کی طرف رخ کیے کھڑا تھا۔

”گزشتہ سال اس نے قانونی طور پر اپنا نام تبدیل کر لیا تھا۔“ نیلی نے بھی سرگوشی میں کہا۔
میں نے سر کو تھوپی جنبش دی۔ وانگن نام بروک لین کی حد تک تو مناسب تھا۔ لیکن سینٹرل پارک ساؤتھ کے اس علاقے میں ان پوش اپارٹمنٹس میں گورڈن ہی زیادہ مناسب لگتا تھا۔ یہ تو اس کا اپنا نام تھا اوقات بدل جائے تو لوگ پاپ تک کا نام بدل دیتے ہیں۔

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ نو بج چکے تھے۔ نیلی کے گھر سے نکلنے کے بعد ہم نے ڈنر کیا تھا۔ پھر ہم پاپا اور ماما کی طرف گئے تھے۔ وہ اب واشنگٹن ہائٹس میں رہتے تھے۔ بہت اچھی حالت تھی... لیکن اس جیسی نہیں۔ وہاں درہان نے ہمیں بتایا تھا کہ مرنے کی رات وہ دونوں اپنی بیٹی کے گھر پر ڈنر کرتے ہیں۔
پہاں چہ ہم سام کے اپارٹمنٹ چلے آئے تھے۔

اب میں سوچ رہا تھا کہ وہ لوگ کیسے ہوں گے... کیا رد عمل ہوگا ان کا؟ میرے اندر ایک اضطراب سا اُٹنے لگا۔ نیلی کے گھر والوں کا رویہ تو برا نہیں تھا۔

جب ہم گئے تو دروازہ نیلی کے ڈیڈی نے کھولا تھا۔ وہ بہت غصے سے ہمیں دیکھتے رہے۔ جانے کیا سوچ رہے ہوں گے یہ میں نہیں سمجھ پایا۔ مگر پھر وہ ایک طرف ہٹے اور انھوں نے ہمیں اندر جانے کے لیے راستہ دیا۔ اور ہم اپارٹمنٹ میں داخل ہو گئے۔ پھر اچانک نیلی کی ماں چٹختی ہوئی ہماری طرف لپکی۔ انھوں نے نیلی کو اپنی بانہوں میں لیا اور رونے لگیں۔ میں دروازے پر کھڑا رہا۔ مجھے اجنبیت کا احساس ہو رہا تھا جیسے میں جن بلا یا مہمان تھا۔ میں انھیں دیکھتا رہا۔ اب نیلی بھی رو رہی تھی۔ اور میں اور اس کے ڈیڈی ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ ہم دونوں کی سمجھ میں اپنی پوزیشن نہیں آ رہی تھی۔

پھر اچانک دوسرے کمرے سے ایک مسرت بھری چیخ سنائی دی۔ ”ڈینی!“ اور زپ پیل میری طرف لپکا۔ اس کی ہاتھیں کھلی ہوئی تھیں اور ہاتھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے مجھے پٹنایا۔ پھر نیلی کی چھوٹی بہن کمرے میں آئی۔ اور وہ بھی رونے لگی۔
ڈراسی دیر میں ماحول بدل گیا۔ نیلی کے ڈیڈی ہچکچاتے ہوئے اندر گئے اور وانگن کی ایک بوتل نکال لائے۔ سب نے مل کر ہمارے لیے جام صحت تجویز کیا۔

بوتل ختم ہوتے ہوئے بے تکلفی کی فضا بن گئی۔ جو کچھ ہم نے کیا تھا اس پر وہ لوگ بہت خوش تو نہیں تھے۔ لیکن انھوں نے عالی ظرفی اور خوش دلی سے اسے قبول کر لیا تھا۔ ماما بیٹی نیلی کے مختصر سے سامان کی پیکنگ میں اس کا ہاتھ بنا رہی تھیں۔ انھوں نے ہمیں کھانے پر روکنے کی کوشش کی۔ لیکن ہم نے نرمی اور سلیقے سے ٹال دیا۔ یہ کہہ کر کہ ابھی ہمیں میرے گھر والوں سے بھی ملنا ہے۔

لٹھ رُکے اس کے دروازے کھلے۔ لٹھ آپریٹر نے سر باہر نکال کر ہمیں بتایا۔ ”ہال کے اس طرف چو تھا دروازہ مسٹر گورڈن کا ہے۔“

ہم اس طرف چلے گئے۔ دروازے پر سام گورڈن کی نیم پلیٹ موجود تھی۔ میں نے بزرگ بن دیا اور اندر کہیں حل رنگ بچے لگے۔ ”زبردست!“ میں نے نیلی کی طرف دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا۔

ہال دے کی مدد ہم روشنی میں اس کے چہرے کی رنگت زرد لگ رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے سر کو اٹھائی جنبش دی۔ ہم

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بڑھتی سے محفوظ رکھیں۔

دو دنوں کی طرف سے کوئی جذبہ اس طرح کو پاٹ نہیں سکتا تھا۔ اور وہ ایک دفعہ کی طرح میرے سینے میں بھی تھی جسے کوئی جذبہ منہل نہیں کر سکتا تھا۔ میرے اندر ایک عجیب سی آوازیں بھر گئی۔ ایک بہت بڑی چیز سے ہم محروم ہو گئے تھے... اپنائیت... ہوا بھری ہمارے درمیان نہیں پنپ سکے گی۔

میں نے جھک کر ماما کے سر پر بوسہ دیا۔ ”آئی ایم سوری ماما“ میں نے کہا۔ کوئی نہیں سمجھ سکا کہ ہوا کا میں کس بات پر مدد کر رہا ہوں۔ ماما نے اس طرف دیکھا جو دور چلے گئے تھے اور دیوار سے ٹک کر جھٹکے رہے تھے۔ ان کی لگاؤں میں ایک ایکلاں اور عجیب سا ایک خوف تھا۔ میں نے ماما سے ماما سے ہاتھ پھڑپھڑایا اور ان کی طرف بڑھ گیا۔ کمرے میں میرے قدموں کی چاپ اور ماما کی سسکیوں کے ہوا کوئی آواز نہیں تھی۔

”ہیلو ماما!“ ان کی آواز میں ایک لمحے کو ادھر ادھر بھٹکیں۔ پھر انھوں نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”ہیلو ڈینی!“ ان کی آواز میں لرزش تھی۔ ”آپ کیسے ہیں پاپا؟“ ”میں ٹھیک ہوں ڈینی۔“

یہاں پر ہم دونوں کا ذخیرہ الفاظ جواب دے گیا۔ کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ کمرے کی فضا میں آہستہ آہستہ کشیدگی اور سکنتی سرائت کرنے لگی۔ میں نے سام کو سر کے اشارے سے سلام کیا۔ اس نے جواب میں سر ہلایا۔ لیکن بولا کچھ نہیں۔ سب لوگ خاموشی سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

میرے وجود میں دھیرے دھیرے مایوسی پھیلنے لگی۔ مالاں کہ مجھے پہلے سے تو بخشنے کی یہی کچھ ہوگا۔ میں واپس آؤں یا نہ آؤں یہاں کسی کو اس سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ پھر میں بولا تو کوشش کے باوجود میرے لہجے میں تپ تھی۔ ”دو سال ہو گئے...“ میں نے ایک ایک چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ میں سے کوئی مجھ سے نہیں پوچھتا کہ ان دو سالوں میں میں نے کیا کیا کیا؟ مجھ پر کیا گزری؟ کیا محسوس

عجیب بات تھی۔ مجھے کبھی احساس نہیں ہوا تھا کہ میں اس کی کمی محسوس کرتا ہوں... کتنا سس کرتا ہوں اسے۔ ہم کمرے میں ساتھ تھے تو ہمیشہ لڑتے رہتے تھے۔ اندر کتنی محبت ہے اس کی یہ کبھی پتائی نہیں چلا تھا۔

اس نے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے دوسرے کمرے کی طرف کھینچنے لگی۔ ”آجاؤ... ماما اور پاپا بھی یہیں موجود ہیں۔“ میں نے کندھوں کے پیچھے سے نیلی پر نظر ڈالی۔ وہ مسکراتے ہوئے سر ہلارہی تھی۔ چہرہ وہی ہمارے پیچھے آنے لگی۔ یہی مجھے دوسرے کمرے میں لے گئی۔

ماما اور پاپا وہاں ایک کاؤچ پر بیٹھے تھے۔ دروازے کی طرف ان کی پیٹھی تھی۔ لیکن وہ پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ماما کا ایک ہاتھ ان کے سینے پر تھا اور انھیں تقریباً بند ہو رہی تھیں۔ پاپا کے چہرے پر پہلی ہی حیرت تھی۔ ان کے ہونٹوں میں سگارد ہاتھ۔ سام ان کے سامنے کھڑا تھا... ہاتھ میں ایک بڑا جام لیے۔ اس کی آنکھوں میں تجسس کی چمک تھی۔ یہی نے مجھے ماما کے سامنے لے جا کر کھڑا کیا۔ جب میں میرا ہاتھ چھوڑا۔ ماما پلٹیں جھک کر بغیر میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھیں جیسے یہ پڑھنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ جدائی کے اس عرصے میں مجھ پر کیا گزری۔

”ہیلو ماما!“ میں نے دھیرے دھیرے کہا۔ انھوں نے ہاتھ بڑھا کر میرے کوٹ کو چھوا پھر ان کا ہاتھ آستین کی طرف آیا یہاں تک کہ انھیں میرا ہاتھ مل گیا۔ پھر ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں اور انھوں نے مجھے اپنی طرف ہنج لیا۔ ان کے ہونٹ میرے ہاتھ پر پڑے۔ ”میرا بلونڈی!“ انھوں نے سرگوشی میں کہا۔ ”میرا بچہ!“ ان کے لہجے میں دل شکستگی واضح تھی۔

میں کھڑا ان کے جھکے سر کو دیکھتا رہا۔ ان کے سارے بال سفید ہو چکے تھے۔ یہی تو وہ لمحہ تھا جس سے میں خوف زدہ ہو رہا تھا۔ مجھے یہ خوف نہیں تھا کہ وہ مجھ سے کیسے ملیں گے۔ مجھے یہ خوف تھا کہ میں انھیں دیکھ کر کیا محسوس کروں گا۔ اور اب مجھے حیرت ہو رہی تھی اپنے سکون اور اپنی بے تعلقی پر۔ جیسے میں دنیا کی کسی سیٹ پر بیٹھا پردے پر وہ سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ جیسے میں اس منظر کا حصہ ہوں۔ جیسے وہ ڈینی فکرونی اور تھا جو دو سال پہلے ان سے دور چلا گیا تھا اور وہی واپس نہیں آیا تھا۔

تو یہ ہوا تھا اس جدائی میں! ان برسوں نے اور تنہائی نے ہمارے درمیان ایک وسیع خلیج حائل کر دی تھی... ایسی خلیج کہ

دروازہ کھلنے کا انتظار کرتے رہے۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی ہتھیلیاں نم ہو رہی تھیں۔ بالآخر دروازہ کھلا۔ وہ ایک سیاہ فام عورت تھی... خادمہ کی وردی میں۔

”ہمیں مشرواٹ... میرا مطلب ہے، مسز گورڈن سے ملنا ہے۔“ میں نے کہا۔ اس نے بے تاثر نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”آپ کا نام پلیر؟“ اس نے دھیمی خوش گوار آواز میں پوچھا۔

”میں ان کا بھائی ہوں۔“ خادمہ کی آنکھیں کچھ پھیل سی گئیں۔ وہ احترام سے ایک طرف ہٹی۔ ”آپ یہاں چند لمحے انتظار کریں گے پلیر!“

ہم بحرانی دروازے والے برآمدے میں کھڑے ہو گئے اور نشست گاہ کا جائزہ لینے لگے۔ خادمہ اندر چلی گئی۔ وہ ڈیوڈی نیلی کے پورے اپارٹمنٹ سے بھی بڑی تھی۔ اندر کسی کمرے سے لوگوں کی دھیمی آوازیں۔ جھنجھٹا ہٹ کی طرح سنائی دے رہی تھیں۔ پھر اچانک خاموشی چھا گئی اور خادمہ کی آواز سنائی دی۔

”باہر ایک جینٹلمن ہیں اور ایک لیڈی موجود ہیں...“ خادمہ نے کہا۔ ”وہ کہتے ہیں کہ انھیں مسز گورڈن سے ملنا ہے۔“ پھر میں نے نیلی کی آواز سنی۔ ”تم نے پوچھا بھی کہ وہ کون ہیں؟“ اس کے لہجے میں الجھن تھی۔

”جی مام“ میں نے پوچھا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ آپ کے بھائی ہیں۔ اور...“ وہ اپنا جملہ پورا نہیں کر سکی۔ یہی نے بیانی آواز میں کہا۔

”یہ ڈینی ہے... یہ ڈینی ہے۔“ اور اگلے ہی لمحے وہ ہمارے سامنے کھڑی تھی۔ ہم چند لمحے ساکت کھڑے رہے۔ پہلی نظر میں تو مجھے لگا کہ وہ بالکل نہیں بدلی ہے۔ لیکن غور سے دیکھنے پر تبدیلیاں نظر آئیں۔ اس کی آنکھوں کی رنگت گہری ہو گئی تھی اور ان کے نیچے ہلکے نیل گوں حلقے تھے جیسے وہ اچھی نیند سے محروم ہو۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ دوبارہ ماں بننے والی تھی۔ لیکن اس کے دہانے کے قریب بھی مجھے چند لکیریں نظر آئیں جو پہلے نہیں تھیں۔

پھر وہ مجھ سے لپٹ گئی اور بے تابانہ میرے چہرے کو چومنے لگی۔ ”ڈینی...“ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”کیسی خوش ہو رہی ہے تمھیں دوبارہ پا کر۔“ اور یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

مجھے بھی اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔ میں مسکرایا۔

”میں نے کہا۔ ”ہاں میں نے کوشش کی تھی واپس آنے کی۔“
 ”لیکن ڈینی۔“ میمی میرے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگی۔
 میں اس کے احساسات سمجھ رہا تھا جانتا تھا کہ وہ کیوں رورہی ہے۔ لیکن کچھ فائدہ نہیں تھا۔ جھوٹا ہونا اب ملنے والا نہیں تھا۔
 میں نے اس کے لرزے ہوئے کندھے کو جھٹک دیا۔ ”روؤ“
 مرت میم اس طرح سے کوئی بہتری نہیں ہوگی۔ ”... یہ کہہ کر میں نیلی کی طرف چلا گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور پلٹ کر ان سبھوں کو دیکھا۔ ”آج میں یہاں آیا تو صرف اپنی بیوی کی خاطر...“ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”اس کا کہنا تھا کہ ہمیں آپ لوگوں کو لازمی طور پر بتانا چاہیے۔ یہ کہ آج صبح ہم نے شادی کر لی ہے۔“

میں نے ان کے چہروں کے تاثرات دیکھے۔ ماں کا دکھ باپ کی ملامت اور حقارت۔... اور میں اپنے اندر یوں سم گیا جیسے کسی نے مجھے کوڑا مارا ہو۔
 ”ایک بیوی تو تھی جو چاہتی تھی... دل سے چاہتی تھی کہ میں واپس آ جاؤں۔“ میں نے کہا۔

میں چند لمحے انتظار کرتا رہا کہ شاید کوئی کچھ بولے۔ لیکن وہ سب چپ تھے۔ نیلی کے گھر والوں کو بھی ہمارا شادی کرنا پسند نہیں آیا تھا۔ لیکن کم از کم انھوں نے انسان ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ انھوں نے یہ تو ثابت کیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی سے بہ ہر حال محبت کرتے ہیں۔ میرے گھر والوں کے پاس تو کہنے کے لیے ایک لفظ بھی نہیں تھا۔ مستقبل کی خوشیوں کے لیے ایک دعا بھی نہیں... کچھ بھی نہیں!

میرے اندر کی اذیت ایک دم تحلیل ہو گئی اور اپنے پیچھے ایک خلا چھوڑ گئی۔ سینے کا ایک حصہ جیسے ستر ہو گیا۔ میں نے ماما کے رخسار پر بوسہ دیا۔ وہ رورہی تھیں۔ پھر میں نے میمی کا رخسار چوما اور اپنے پاپا کے سامنے سے گزرا۔ ان کے چہرے پر بچی کی ایک نقاب سی تھی۔ میں بغیر کچھ کہے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے بستر پر بے چینی سے کروٹ بدلی۔ مجھے احساس تھا کہ میں سوئے میں روتا رہا ہوں۔ لیکن اب میں جاگ گیا تھا اور میری آنکھیں خشک تھیں۔ میں نے پڑ سکون ہو کر لیٹنے کی کوشش کی تاکہ نیلی ڈسٹرب نہ ہو۔

ہم بھول کے چھوٹے سے کمرے میں تھے۔ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں نے جی سے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”تم تو بہت اچھی طرح جانتی تھیں کہ میں ان لوگوں سے نہیں ملنا چاہتا۔ جانتی تھیں نا؟“

اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔
 ”اور پھر بھی تم نے مجھے جانے پر مجبور کیا؟“ میرے لہجے میں ترقی تھی۔

اس نے میرے کندھے کو تھپتھپایا اور میری آنکھوں میں دیکھا۔ ”تمہارا جانا ضروری تھا ڈینی...!“ اس نے غلوں سے کہا۔ ”نہیں تو ہماری ازدواجی زندگی میں ایک خلا رہ جاتا جو کبھی نہ بھرتا۔ تم خوش گمانی میں مبتلا رہتے، حقیقت بھی نہ جان پاتے۔“

میں نے منہ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک کہتی ہو۔ اب میں نے حقیقت جان لی۔“

”اب جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔“
 ”بھول جاؤں...؟“ میں نے کہا اور ہنسنے لگا۔ کچھ باتیں ایسی تھیں جو وہ بھی نہیں جانتی تھی۔ ”کوئی کیسے بھول سکتا ہے؟ وہ سب کچھ جو ساتھ مل کر کیا ہو... مشترکہ افعال... مشترکہ خوف... بھلا برا۔ یہ تم آسانی سے کہہ سکتی ہو۔ لیکن میں نے بھول سکتا ہوں۔ کیا میں اپنے جسم کا سارا اہو گٹر میں بہا دوں؟ اچھا ہو یا برا خوش ہو یا غم میں بھول کیسے سکتا ہوں؟ کیا تم اپنے والدین کو بھول سکتی ہو؟ کیا اچھا اور برا رشتوں سے زیادہ اہم ہو سکتا ہے؟“

”نہیں ڈینی تم سمجھ نہیں...“ اس کے لہجے میں التجا تھی۔ ”یہ سب بھولنے کی باتیں نہیں یہ تو یاد رکھنے کی باتیں ہیں۔ جو دکھ پہنچا اسے بھول جاؤ۔ یہ وہ دکھ ہے جو مجھے کو برا بنا دیتا ہے۔ دکھ جو آدمی کو تنہا، سخت اور غمور بنا دیتا ہے جیسے تم اس وقت ہو رہے ہو۔ میں اس دکھ کو بھلانے کی بات کر رہی ہوں۔“

میں اس کی بات سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ”یہ بھی کیسے بھول سکتا ہوں میں؟“ میں نے بے بسی سے کہا۔ ”یہ اس تعلق ہی کا تو حصہ ہے۔“

”نہیں ڈینی ایسا نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے...“ وہ مجھ سے لپٹ گئی اور مجھے چومنے لگی۔ ”میں تمہارا یہ دکھ بھلا دوں گی...“
 ”میں تمہیں ایسا کر دوں گی کہ تمہیں صرف اچھی باتیں یاد رہیں گی۔“

”ایسا کوئی کیسے کر سکتا ہے؟“ میں نے حیرت سے کہا۔
 ”میں کر سکتی ہوں اور کر دوں گی...“ اس نے سرگوشی میں کہا۔

”میرے پاس تمہارے لیے اتنی محبت ہے... اتنی کہ تمہیں کسی اور کی محبت کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

جب میں سمجھ گیا۔ میں نے فکڑ سے اس کا ہاتھ تھام کر اسے لہاں سے لگالیا۔ اس نے عہد کیا تھا مجھ سے اور میں جانتا تھا کہ وہ جی ہے۔ میں نے جان لیا کہ آنے والے وقت میں وہ اچھا ہو یا برا مجھے ہر آسائش ہر طاقت اور مضبوطی اس کے وجود سے ملے گی۔ چاہے کچھ بھی ہو اب میں کبھی تنہا نہیں ہوں گا۔

تہہ دلی لانے والا دن
 15 ستمبر 1936ء

”ام زینہ پڑھو...“ چوٹی سڑھیاں ہمارے بوجھ تلے پڑ چکی تھیں۔ ہمارے لیے وہ دو منہ آواز تھی جیسے وہ پرانی بڑھیاں ایک نو بیا ہوتا بچے کو خوش آواز دے رہی ہوں۔ مجھے وہ آواز اچھی لگی۔

میں جو سوٹ کیس اٹھائے ہوئے تھا وہ زیادہ بھاری نہیں تھا۔ ہمارے پاس زیادہ کپڑے تھے ہی نہیں۔ سوچا تھا بعد میں کمائوں گا تو اپنے اور اس کے لیے کچھ ڈھنگ کے کپڑے خریدوں گا۔ ابھی تو جو تھوڑی بہت رقم تھی وہ گھر کے سامان خریدنے میں صرف ہو گئی تھی بلکہ اس کے لیے کسی کو کافی ثابت ہوئی تھی۔

چوٹی منظر پر وہ دروازے کے سامنے رکی اور پلٹ کر مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا۔ چابی اس کے ہاتھ میں تھی۔

میں ہوا مسکرایا۔ ”دروازہ کھولو جان یہ ہمارا گھر ہے۔“

اس نے چابی نقل میں ڈالی اور اسے تھمایا۔ دروازہ آہستہ سے کھلا۔ میں نے سوٹ کیس ایک طرف رکھے جھک کر اسے گدیں اٹھا دی اور چوٹ پارکر کے اپارٹمنٹ میں داخل ہو گیا۔

وہ اہل ہول تھی گی۔ میں نے اسے اتار دیا۔
 ”خدا امان ہے کہ کوڑھیوں سے بھردے ڈینی فشر۔“ وہ بولی۔
 وہ گدانا اپارٹمنٹ تھا۔ پچیس ڈالر ماہانہ کرائے میں یہی پارکر ملتا تھا۔ لیکن کمرے اور ایک ہاتھ۔ پورے گھر میں صرف ایک کمرہ تھا۔ لیکن بہ ہر حال وہ صاف ستھرا تھا۔ گرم پانی کی سہولت بھی تھی۔

اس کمرے کے لیے میں نے نو سو ڈالر کا فرنیچر خریدا تھا۔ پارلر کے لیے ایک ڈائجٹ اور کرسیاں ایک بڑا ڈبل بیڈ ایک ڈریسنگ جس میں ایک لگا تھا۔ چن سیٹ دنگچیاں برتن اور دوسری ضروری چیزیں۔ ہاتھ تو خالی ہو گیا لیکن گھر بھرنا بہت ضروری

تھا۔ اور بہ ہر حال، بہ مقروض بھی نہیں تھے۔
 ”جاؤ... سامان بیڈروم میں لے آؤ۔“ نیلی نے مجھ سے کہا۔ ”جی بہتر نام۔“ میں نے خوش دلی سے کہا اور دروازے پر جا کر سوٹ کیس اٹھا لایا۔ انھیں میں نے بیڈ پر پٹخ دیا۔
 ”ڈینی یہ گندے سوٹ کیس بیڈ پر سے ہٹاؤ...“ اس نے تیز لہجے میں کہا۔ ”یہ بھول نہیں ہمارا گھر ہے۔“

میں نے ہنستے ہوئے اسے دیکھا۔ عورت کو جیسے ہی گھر مل جائے وہ مالکن بن جاتی ہے۔ میں نے جلدی سے سوٹ کیس پیچھے رکھ دیے۔ پھر میں بیڈ کے نرم گدے پر قلابازیاں لگانے لگا۔ ”ذرا یہاں تو آؤ۔“ میں نے اس سے کہا۔

”کیوں؟“ وہ شک آمیز نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔
 ”تمہیں کچھ دکھانا ہے۔“

وہ ایک قدم میری طرف بڑھی پھر رک گئی۔ میرے لیے اتنا تنہا کافی تھا۔ میں نے اسے اپنے اوپر پٹخ لیا۔

”یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے ڈینی...“ وہ میری گدگدی سے بے حال ہونے لگی۔ پھر ہنستے ہوئے اس نے میری جسارتوں پر احتجاج کیا۔ ”پاگل ہو گئے ہو؟“

”ہو نہیں گیا“ تم نے پاگل کر دیا ہے مجھے۔...“ میں نے کہا۔
 ”آئی کو یو بے بی۔“

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ ”ڈینی تمہیں کبھی کوئی پچھتاوا نہیں ہونے دوں گی میں۔“

”کیسا پچھتاوا؟“
 ”اس پر کہ تم نے مجھ سے شادی کی۔ میں بہترین بیوی ثابت ہوں گی۔“

میں نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیا لے میں بھر لیا۔ ”اس کا تو مجھے یقین ہے۔ کاش میں تمہیں کبھی مایوس نہ کروں۔“

میری انگلیاں بھیگیں تو مجھے اس کے آنسوؤں کا احساس ہوا۔ ڈینی... یاد رکھنا میں نے کبھی تم سے مایوس ہوں گی اور نہ میں کبھی پچھتاؤں گی۔“

ہم پردے لٹکا کر نئے ہی تھے کہ اطلاع گھنٹی بجی۔ ”میں دیکھتا ہوں۔“ میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ پھر میں نے دروازہ کھول دیا۔

نیلی کی ماما ایک پادری کے ساتھ کھڑی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹا شاپنگ بیگ تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر

مسکرائیں۔ ”ہیلو ڈینی؟“

”ہیلو ماما بیٹو۔“ میں نے کہا۔ ”آئیے۔ تشریف لائیے۔“ وہ ایک لمحے کو شرمندگی سے ہچکچائیں۔ ”میں فادر بریٹن کو ساتھ لاتی ہوں۔“

میں پادری کی طرف بڑھا اور اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ”پلیز فادر ہم ان۔“

میری ساس کے چہرے پر سکون نظر آیا۔ شاید انھیں مجھ سے یہ امید نہیں تھی۔ فادر نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ”ہیلو ڈینی۔ تم سے مل کر خوشی ہوئی۔“

بچن کی طرف سے نیلی نے پکارا۔ ”کون آیا ہے ڈینی؟“ ”تمھاری ماما اور فادر بریٹن۔“ میں نے جواب میں پکارا۔ وہ بھاگی بھاگی باہر آئی۔ اس کا چہرہ تمنا رہا تھا۔ اس نے ماں کے رخسار کو چوم اور فادر سے ہاتھ ملایا۔ ”مجھے آپ کی آمد سے بہت خوشی ہوئی ہے فادر۔“

”میں تمھارا بوڑھا دوست ہوں میری بچی۔ مجھ سے رسی باتیں مت کرو۔“ مسز بیٹو نے مختاط نظروں سے میری طرف دیکھا اور شاپنگ بیگ زمین پر رکھ دیا۔ ”میں گھر کے لیے کچھ چیزیں لائی ہوں۔“ وہ بولیں۔

نیلی نے شاپنگ بیگ کھول کر اس میں جھانکا۔ پھر وہ اطالوی زبان میں جلدی جلدی کچھ بولنے لگی۔ اس کا لہجہ بچپانی تھا۔ اس کی ماما نے بھی اطالوی میں ہی جواب دیا۔ پھر نیلی میری طرف مڑی۔ ”ماما کچھ کھانے کی چیزیں لائی ہیں ہمارے سنے گھر کے لیے تاکہ اس گھر میں بھی بھوک نہ آئے۔“ اس نے وضاحت کی۔

میں مسز بیٹو کی طرف مڑا۔ لوگ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں لیکن ان کے بنیادی تفکرات مشترک ہی ہوتے ہیں۔ مجھے یاد ہے جب ہم بروک لین والے گھر میں منتقل ہوئے تھے تو میری ماما بھی وہاں سب سے پہلے بریڈ اور نمک لے کر گئی تھیں۔ ”شکر یہ ماما۔“ میں نے بے حد خلوص سے کہا۔ انھوں نے میرا رخسار تھپتھپایا۔ ”اس کی ضرورت نہیں۔ اب تو تم میرے بیٹے ہو! کاش میں وہ سب کچھ تمھیں دے پانی جو پینے کو دل چاہتا ہے۔“

”کافی کے بارے میں کیا خیال ہے...؟“ نیلی نے کہا۔ ”ڈینی تم جا کر کیک لے آؤ نا۔“

ماما بیٹو نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں، مجھے گھر پہنچ کر کھانا پکانا

ہے اور فادر بریٹن نیلی کو دعا دینے کے لیے آئے ہیں۔“ نیلی پادری کی طرف مڑی۔ ”شکر یہ فادر مجھے سچ بہت خوشی ہوئی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ڈر تھا کہ...“ پادری نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”ارے نہیں نیلی، ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے بے شک اس پر یامی ہوئی کہ تمھاری شادی میرے ہاتھوں نہیں ہوئی۔ لیکن اس کے باوجود میری خوشی تو اپنی جگہ ہے۔“

نیلی کے چہرے پر سایہ سا رہ گیا۔ ”لیکن میں تو سمجھی تھی کہ ہماری شادی چرچ میں ہو ہی نہیں سکتی۔“ پادری ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”اگر سچ معنوں میں چرچ میں تمھاری شادی ہو تو تمھیں اعتراض تو نہیں ہوگا بیٹی؟“

لیکن میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی نیلی بول پڑی۔ ”یہ اچھا سوال نہیں ہے فادر! ہمارے درمیان اس پر بھی بات نہیں ہونی۔“ پادری نے اسے دیکھا۔ اس کی مسکراہٹ ہوا ہو گئی تھی۔ ”تم جانتی ہو میری بچی کہ چرچ تمھاری شادی کو قبول کرنا ممکن اسے مستند تسلیم نہیں کرتا۔“

نیلی کے چہرے پر زردی کھنکھن گئی۔ ”میں جانتی ہوں فادر۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”اور تم نے بچوں کے بارے میں سوچا...؟“ فادر نے مزید کہا۔ ”وہ کئی برکتوں سے کٹ کر انعامات سے محروم ہوں گے۔“ اس بار جواب میں نے دہرائی۔ ”میں نہیں سمجھتا کہ والدین کے عقیدے کی وجہ سے چرچ بچوں کو کتنی زخمی دے رہا ہے۔“ ”یعنی تم اس بات کے خواہش مند ہو کہ تمھارے بچے چرچ کے سامنے ہیں پروان چڑھیں؟“ فادر نے کہا۔

”میں یہ کہہ رہا ہوں فادر کہ بچے اپنے لیے عقیدہ منتخب کرنے میں آزاد ہوں گے۔ اور جب تک وہ اس فیصلے کی عمر کو پہنچیں گے مجھے ان کی اپنی ماں کے چرچ سے وابستگی پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

نیلی میرے قریب آئی اور اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”میرا خیال ہے ابھی یہ باتیں بہت قبل از وقت ہیں۔ ابھی تو شادی ہوئی ہے ہماری۔“

پادری نے باری باری ہم دونوں کو دیکھا۔ ”نیلی، ایک کیسٹولک ہونے کی حیثیت سے تم اپنی ذمہ داریوں سے واقف ہو۔ بعد میں ناخوش ہونے سے بچنے کے لیے آدمی کو پہلے ہی ضروری فیصلے کر لینے چاہئیں۔“

”آپ کے تعلق خاطر کا شکر فادر...!“ نیلی نے مضبوطی سے ہر ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یقین رکھیں کہ ہمیں وہ فیصلے کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی جس میں ہم دونوں کی خوشی اور بہتری ہو۔ اور ہاں اس طرف جب بھی آپ کا آنا ہو ہمارے گھر ضرور آئیے گا۔“

پادری کا چہرہ بے تاثر تھا۔ ”ایک پادری کی زندگی میں تو مشکل مقام آتے ہی رہتے ہیں۔ اور وہ بھی انسان ہی ہوتا ہے۔ یہ الگ بات کہ لوگ رہنمائی اور دعا کے لیے اسی کی طرف رجحان رکھیں۔ مجھے امید ہے... اور میں تمھاری خوشیوں کے لیے راضی کروں گا۔“

”ام آپ کے فادر ہیں گے فادر۔“ میری بیوی نے کہا۔ وہ اب بھی میرا ہاتھ تھامتے ہوئے تھی۔ ”میں فادر بریٹن کو رخصت کرنے دروازے تک گیا۔ وہاں انھوں نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ ”تم سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔“ انھوں نے کہا۔ لیکن اس بار ان کے لہجے میں نرمی تھی اور ان کے ہاتھ کی گرفت میں۔

دروازے بند ہوا تو نیلی اپنی ماں سے اطالوی میں شروع کر دی۔ ”اس کا لہجہ تھا اور ماما کا انداز مدافعت۔ بلکہ ان کی آواز اس آواز سے تھیں جس سے بس کھڑا دیکھتا اور سنا۔“ میں نے اس کا لہجہ یاد کیا تھا۔ پھر وہ مکالمہ ختم ہوا۔ ماما نے نیلی کو ہمت سے لپٹا کر لپیٹا دیا۔

نیلی میری طرف مڑی۔ ”ماما شرمندہ ہیں کہ فادر کو یہاں نہیں لایا۔ ان کا مقصد یہ نہیں تھا۔ یہ کبھی ہیں کہ اگر تمھیں توہین کا سامنا ہوا ہے تو یہ شرمندہ ہیں۔“

میں ایک لمحہ انھیں دیکھتا رہا۔ پھر مسکرا دیا۔ ”آپ کو شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ماما بیٹو۔ میں جانتا ہوں کہ آپ صرف ارے بھلی فکر کرتی ہیں۔“

اب کے انھوں نے مجھے لپٹا لیا اور میرا رخسار چوم لیا۔ ”تم اتنی اچھے ہو ڈینی...!“ انھوں نے لرزیدہ آواز میں کہا۔ ”بس تم کی نیلی کا خیال رکھنا۔ میں اور کچھ نہیں چاہتی۔“

”آپ اس کی فکر نہ کریں ماما...“ میں نے نیلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان سے وعدہ کیا۔ ”یقین رکھیں یہ کام میں زندگی آخری سانس تک کروں گا۔“

ماما کے جانے کے بعد ہم نے پارٹنٹ سیٹ کیا۔ اس میں ہر گھنٹہ میں پارلر میں جا بیٹھا اور ریڈیو پر موسیقی سننے لگا۔

نیلی آئی اور میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ”یہ بتاؤ ڈنر میں کیا پسند کرو گے؟“ اس کے لہجے میں تنجید تھی۔ ”تمھارا مطلب ہے کہ تمھیں کھانا پکانا آتا ہے؟“

”بے وقوفی کی باتیں مت کرو...“ اس نے غصے سے کہا۔ ”میری بات کا جواب دو۔“

”پکانا چھوڑو۔ آج کھانا باہر کھائیں گے... لیے بریٹ کریں گے۔“

”ہرگز نہیں۔ یہ بہت مٹی کا پڑے گا۔ جب تک تمھیں حجاب نہیں ملتی، ہمیں اپنی بچی بچی رقم میں ہی گزارہ کرنا ہوگا۔ بعد میں جوجی چاہے کر لیتا۔“

میں نے پہلی بار اسے احترام کی نظر سے دیکھا۔ ہر روز مجھے احساس ہوتا تھا کہ وہ کچھ اور بڑی ہو گئی ہے۔ میں اٹھا اور میں نے ریڈیو بند کر دیا۔ ”جوجی چاہے پکالو۔ میں جانتا ہوں کہ تم یہاں بھی مجھے حیران ہی کرو گی...“ میں نے کہا۔ ”میں ذرا کام کی تلاش میں نکلتا ہوں۔“

باہر نکلا تو دھوپ میں میری آنکھیں چمک رہی تھیں۔ میں چند لمحے کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ پھر سب وے انٹیشن کی طرف چل دیا۔ میرے سامنے ایک سائے سا آگیا۔ بغیر دیکھے میں اس سے کترا کر گزر رہا تھا کہ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر وہ جانی بچانی آواز میری سماعت میں پہنچی۔ ”اب جب کہ تم یہاں آ چکی ہو اور سٹبل بھی ہو گئے ہو ڈینی تو باس محسوس کرتا ہے کہ وہ تمھارے ایک وزٹ کا مستحق ہے۔“

مجھے سر اٹھا کر دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ کون ہے بلکہ میں تو کب سے اس تصادم کی توقع کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس طرح کے لوگ کبھی کچھ بھولتے نہیں۔

اسپٹ میرے سامنے تن کر کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس کا حلیہ بدل گیا تھا۔ وہ ایک بیش قیمت سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اسے دیکھ کر ایک لمحے کو مجھے ایسا لگا کہ میری آنکھیں دھوکا کھا رہی ہیں۔ ”میں ذرا جلدی میں ہوں۔“ میں نے کہا اور آگے بڑھنے کی کوشش کی۔

اس نے میرا بازو مضبوطی سے تھام لیا اور اس کا دوسرا ہاتھ چیکٹ کی جیب کی طرف گیا۔ مجھے اس کی گن کی ایک جھلک نظر آ گئی۔ ”میرا خیال ہے اب تمھیں اتنی جلدی نہیں رہی ہوگی ڈینی؟“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اب ایسی جلدی بھی نہیں ہے مجھے۔“

اس نے سائیڈ کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک کار کھڑی

تھی۔ اس کا انجن جاگ رہا تھا۔ ”بس تو بیٹھ جاؤ۔“

میں نے دروازہ کھولا اور عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔ وہاں کلکٹر پہلے سے موجود تھا۔ ”ہیلو ڈینی!“ اس نے آہستہ سے کہا اور پوری قوت سے میرے پیٹ میں گھونسا مارا۔ میں تکلیف کی شدت سے دہرا ہوا کرکار کے فرش پر بیٹھ گیا۔ کار حرکت میں آگئی تھی۔

”یہ سب کچھ نہ کرو۔“ اسپٹ نے کہا۔ ”باس کو برا لگے گا۔“
”یہ حرام زادہ میرا بہت مقروض ہے۔ کچھ حساب تو چکا لوں۔“
اسپٹ نے کار سے قہام کر مجھے اٹھایا اور سیٹ پر بٹھادیا۔

اب میں ان دونوں کے درمیان تھا۔ ”اس پرانے حساب کے بارے میں باس سے کچھ نہ کہنا۔ ورنہ لگلی بار اس سے زیادہ سختی میں پڑوگے۔“ اس نے مجھے دھکی دی۔

میں نے سر کو کھینچ کر جیش دی۔ اس وقت تو میں کچھ سمجھنے کے قابل نہیں تھا۔ چند منٹ بعد میری سمجھ میں اس کی بات آئی۔۔۔ اگلی بار! اس کا مطلب صاف تھا۔ وجہ چاہے کچھ بھی ہو۔ لیکن اس بار میری بخشش ہوگئی تھی۔ کیوں... کیسے؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کیوں کہ میکسی فیلڈز جیسے کینہ پرور اور منقسم مزاج لوگ کسی کو اتنی آسانی سے معاف نہیں کرتے۔

کار فیلڈز کے اسٹور کے سامنے رکی۔ ہم اترے۔ اسپٹ میرے آگے تھا اور کلکٹر میرے پیچھے۔ ہم اسٹور سے گزرے اور سیڑھیاں چڑھ کر فیلڈز کے پارٹمنٹ تک پہنچے۔ اسپٹ نے دروازے پر دستک دی۔

”کون ہے؟“ اندر سے فیلڈز دہاڑا۔

”میں ہوں باس۔ ڈینی فشر کو ساتھ لایا ہوں۔“ اسپٹ نے جواب دیا۔

”اندراؤ! اسے“ فیلڈز نے چیخ کر کہا۔

اسپٹ نے دروازہ کھول کر مجھے اندر دھکیلا۔ میرا پیٹ اب تک دکھ رہا تھا۔ لیکن پہلے جیسی بات نہیں تھی۔ اب کم از کم میں سیدھا کھڑا ہو سکتا تھا۔

میکسی فیلڈز اپنی ڈیسک کے عقب میں بھاری ستون کی طرح کھڑا تھا۔ اس کی دھکی ہوئی نظریں مجھ پر جمی تھیں۔ ”تو تم یہاں سے دور نہیں رہ سکتے تھے؟ تمہیں واپس بھی آنا تھا۔“ یہ کہہ کر وہ گھوم کر میری طرف آیا۔

میں نے جواب نہیں دیا۔ بس اسے دیکھتا رہا۔ اب میں خوف زدہ نہیں تھا۔ اسپٹ نے اُن جانے میں مجھے بہت کام کی بات بتادی تھی۔ پھر میں نے فیلڈز کے ہاتھ کو کسی شکل میں گھوم کر اپنے چہرے کی طرف آتے دیکھا تو جلی طور پر میں پھرنی

سے جھک گیا۔

کمر پر گھٹنے والی تیز ضرب نے مجھے سیدھا ہونے پر مجبور کر دیا۔ وہ میرے پیچھے کھڑا ہوا اسپٹ تھا جس نے اپنے چاٹو کے دستے سے وہ ضرب لگائی تھی۔ اس کے نیچے میں فیلڈز کا دوسرا تھپڑ میرے رخسار پر پڑا۔ میں لڑکھڑا کر رہ گیا۔ لیکن بولا کچھ نہیں۔ بولنا بات بڑھانے کے مترادف تھا۔ اور بات بڑھانا میرے مفاد میں نہیں تھا۔ فیلڈز جیسے انا پرست لوگوں کا فیصلہ بدلتے ہوئے دینا مشکل تھی۔

فیلڈز کے دانت نکل پڑے۔ وہ بڑی بے رحمی سے مسکرایا۔ ”واپس آنے والے تم اکلیں نہیں ہو۔“ اس نے کہا۔ پھر دوسرے کمرے کی طرف رخ کر کے چلایا۔ ”رونی“ میرے لیے ڈرنک لے کر آؤ۔ دیکھو تو، تمہارا ایک پرا دوست مجھ سے ملنے آیا ہے۔“

میں نے اس دروازے کی طرف دیکھا۔ شاید میرے کار باج رہے تھے۔ پھر وہاں مجھے ڈیپورا نظر آئی۔ ڈرنک کے ہاتھ میں تھا اور اس کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر اس کی نظر پھری گئی۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے فیلڈز کی طرف بڑھنے لگا۔

ڈرنک اسے تھمادیا۔

فیلڈز شیفت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ”ہیلو نہیں کہو؟“ اپنے یار کو؟

وہ میری طرف مڑا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سا خالی پن تھا۔ ”ہیلو ڈینی!“

”ہیلو ڈیورا!“

فیلڈز نے میری طرف دیکھا۔ ”وہ کیا انداز؟ ہے؟ کچھ بھی تو نہیں بدلا۔“

میں ڈیورا کے بے تاثر چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ ”ہاں“ کچھ؟ نہیں بدلا۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”فیلڈز کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں بدلتا۔ رونی بھلا مجھ۔ دُور رہ سکتی تھی! خود ہی چلی آئی میرے پاس...“ اس نے کہ ”کیوں رونی“ تھیک کہہ رہا ہوں نا؟“

ایک لمحہ کو ڈیورا کی آنکھوں میں شعلہ سا بھڑکا، مگر فوراً جل بجھا۔ ”ہاں میکسی“ اس نے آہستہ سے کہا۔

فیلڈز نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ ”رونی اپنے میکسی کے رہ ہی نہیں سکتی۔ ہے نا رونی؟“

ڈیورا کے ہونٹ تھر تھرائے۔ ”ہاں میکسی۔“

میکسی نے غصے سے اسے دُور دھکیل دیا۔ ”اب تم دوسرے کمرے میں جاؤ۔“ وہ دہاڑا۔

ڈیورا میری طرف دیکھے بغیر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

ایک لمحہ کو دروازے پر اس کے قدم ٹھٹھکے تھے جیسے وہ پلٹ کر نہ جانا چاہتی ہو۔

فیلڈز میری طرف مڑا۔ ”میکسی فیلڈز کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا... کوئی بھی نہیں۔“

میں اسے دیکھتا رہا۔ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ تو اس نے ثابت کر دکھایا تھا۔ میں سوچ رہا تھا... ڈیورا کیوں واپس آگئی؟ اور بین کا کیا بنا؟

فیلڈز اپنی ڈیسک کے پیچھے جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب وہ مجھے غور رہا تھا۔ ”یاد رکھنا ڈینی، میکسی فیلڈز سے کوئی نہیں بچ سکتا۔“

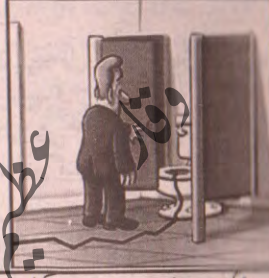
”میں یاد رکھوں گا۔“

اس نے اپنا جام خالی کیا اور مجھے غور تے ہوئے بولا۔ ”اوکے... اب تم جاسکتے ہو۔“

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں ہل بھی نہیں سکتا۔ اتنی آسانی سے...!

”تم نے سنا نہیں۔“ وہ دہاڑا۔ ”دفع ہو جاؤ اور مجھ سے دُور رہو۔ اگلی بار خوش قسمتی تمہارا ساتھ نہیں دیگی۔ اگلی بار تمہارا انا اچھا نہیں ہوگا۔ اسی وقت میز پر رکھے فون کی

گھنٹی بجے گی۔“



کھینچی گئی۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور ماؤتھ پیس میں دھاڑا۔ ”ہیلو...“ مگر دوسری طرف کی آواز سنتے ہی اس کا لہجہ اس کے چہرے کا تاثر اور اس کی آواز بھی کچھ بدل گیا۔ ”ہیلو سام!“ اس نے بڑی تہذیب سے کہا۔ پھر وہ دوسری طرف کی بات سنتا رہا۔ اچانک اسے میرا خیال آیا تو اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”اسپٹ“ اگر یہ خود سے نہیں جاتا تو اسے اٹھا کر باہر پھینک دو۔“

مجھے اب کسی دُعا تو نامے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں تیزی سے وہاں سے نکل گیا۔ باہر سڑک پر آکر مجھے احساس ہوا کہ میں آزاد ہوں۔ یہ میں اب بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ فیلڈز نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ ایک ہی بات سمجھ میں آئی تھی کہ ڈیورا نے اس کے لیے فیلڈز سے ڈیل کی ہوگی۔ شاید اسی لیے وہ مجھ سے نظر نہیں مل رہی تھی۔ ہاں... یہی بات ہے۔ اور کچھ تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ڈھائی بجے تھے۔ گھر جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سوچا، ایجنسیوں کے چکر لگالوں۔ نیلی کو میں اس واقعے کے بارے میں بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں جارایجنسیوں میں گیا۔ مگر بات نہیں بنی۔ انھوں نے مجھ سے اگلے روز صبح کے وقت آنے کو کہا۔ چار بجے کے قریب میں گھر کی طرف چل دیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگلے روز سویرے

ہی نکلنا ہوگا۔ ملازمت ملنا اتنا آسان نہیں ہے۔ کیوں کہ بے روزگاری بڑھ گئی ہے۔

دن زندگی کے

وہ کامیٹکس کے کاؤنٹر کے سامنے سے گزر کر آئی اور اسٹول پر بیٹھ گئی۔ ”جی مس... کیا حکم ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”شارٹ کوک ودھ لائم ڈینی۔“ وہ مسکرائی۔ اس کی پلکیں بھاری ہو رہی تھیں۔

”ابھی لیں۔“ میں نے عقبی شیلٹ سے گلاس اٹھایا اور مشروب تیار کر کے اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس کی مسکراہٹ اور گہری، اور کشادہ ہو گئی۔ اس نے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبائی۔ میں نے فوراً ہی لائٹر پیش کر دیا۔ ”شکریہ ڈینی!“

”اس کی کیا ضرورت ہے؟“ میں نے اس کی طرف اسٹرا بڑھائی۔

اس نے سب کھینچے ہوئے کہا۔ ”سب وہ پر بھی لوک ملنی چاہیے۔“

”میں تو یہ نہیں چاہوں گا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”وہاں لوک اور لائم ملے تو تم یہاں آنا چھوڑ دو گی۔“

اس نے سناٹاں مسکراہٹ سے مجھے نوازا۔ میں دوسرے کاؤنٹر پر موجود جیک کی طرف بڑھ گیا۔ یہ وہاں کھیل تھا۔

کاروبار کا حصہ تھا۔ بیس بیٹ کا مشروب اور ساتھ میں بے ضرر ساروماس فری!

”ایک بج چکا ہے جیک۔ اب صفائی ہو جائے؟“ میں نے کہا۔

جیک نے رجسٹر سے سر اٹھا کر کلاک کو دیکھا۔ پھر اس نے لڑکی پر نگاہ دوڑائی۔ ”ہاں ڈینی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہ تمہارے بلونڈ بالوں اور نیلی آنکھوں کی برکت ہے نا؟“

”ان کے لیے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بس کسی کا ہونا ہی کافی ہے۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”دس آنکھیں جو مجھے نظر انداز کر کے گزرتی ہیں، ان میں سے کم از کم آٹھ تمہیں دعوت ضرور دیتی ہیں۔“

”تو جلتے کیوں ہو۔ وہ آنکھیں میرے کسی کام کی نہیں۔ اور ان کا مال تو تم سینٹے ہو۔“

”جیتا تو ڈینی، تم ان سے استفادہ نہیں کرتے؟“

”تم مجھے جانتے ہو جیک۔ شادی شدہ ہوں اور ایک بچی کا باپ بھی۔ میرے پاس ان حقائق کے لیے وقت کہاں۔“

اور پھر غریب آدمی ہوں۔“ میں نے آئینے میں لڑکی کو دیکھا۔ وہ مسکرائی۔ میں بھی مسکرایا۔ ”اور یہ بھی سن لو۔“ میں نے جیک سے کہا۔ ”ان پر ہاتھ بھی رکھو گے تو جیج چلا کر

ساری دنیا کو جمع کر لیں گی۔“

وہ مسکرایا۔ ”مذاق کر رہے ہو۔ مگر خیر... ہاں، اب صفائی کر لی جائے۔“

میں نے لڑکی سے پیسے وصول کیے، خوش اخلاقی سے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کی دی ہوئی ٹپ جیب میں ڈال لی۔

اس وقت سوا بج تھا۔ میں تھکن سے بڑھتا تھا۔ شام چھ بجے سے اب تک سوا سات گھنٹے ہو چکے تھے، اور مجھے آرام کا ایک لمحہ بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ لیکن یہ بھی میری خوش قسمتی تھی۔

ورنہ جاب ملنا کوئی مذاق تھا۔ میں خود کتنا عرصہ خواہ رہا تھا۔

تین سال! ہاں، کبھی جاب بھی مل جاتی تھی۔ لیکن زیادہ تر

رہتی نہیں تھی۔ کچھ بھی یہاں نہ ہو جاتا، اور میں پھر سڑک پر ہوتا۔

جب تک نیلی کام کرتی رہی، صورت حال بہت خراب نہیں ہوئی۔ گزرا ہوا بی جاتا تھا۔ مگر وہی پیدا ہوئی تو سب کچھ بدل گیا۔ علم معاشیات ہمیں درس دینے لگا۔

مجھے وہ دن یاد تھا جب نیلی کا ہم سے گھر واپس آئی اور اس نے مجھے بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ میرے چہرے پر اس نے نہ جانے کیا دیکھا ہوگا کہ ہاتھ بڑھا کر میرا بازو تھام لیا۔

”ڈینی... تمہیں خوش نہیں ہوئی؟“ اس کے لہجے میں بھی دکھ تھا اور آنکھوں میں بھی۔

”ایسی بات نہیں۔ میں خوش ہوں۔“ میں نے کہا۔

وہ میرے نزدیک ہو گئی۔ ”تو پھر بات کیا ہے؟“

”میں پیسوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔“

”تمہیں جاب مل جائے گی۔ وقت ہمیشہ ایک سا کب رہتا ہے۔“

میں نے مڑ پھیرا اور سگریٹ جلائی۔ ”بہی تو میں خود کو یاد دلاتا رہتا ہوں۔“

اس کا دکھ اور گہرا ہو گیا۔ ”تمہیں خوشی نہیں ہوئی کہ ہمارے ہاں اولاد ہونے والی ہے۔“ اس نے الزام دینے والے انداز میں کہا۔

”میں خوش کیوں نہیں ہوں گا۔“ میں نے منتھوں سے

دھواں نکالتے ہوئے کہا۔ ”میں سڑکوں پر مارا مارا پھر رہا ہوں۔ اور ہر وقت اُترتا ہوں کہ یہی حالات رہے تو ہمارا سڑکوں پر ہی رہنا ہوگا۔“

”ایہی!“

میں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

میں نے سگریٹ کا طول کش لیا۔

”تم نہیں چاہتے کہ ہمارے ہاں بچے ہو؟“

اس کے لہجے کی اذیت میرے وجود میں دوڑ گئی۔ میرا دل

لگتا تھا کہ میں نے نفی سے اسے کھینچا اور اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ ”سوری نیلی، اولاد تو ہر شخص کا خواب ہوتی ہے۔ بس میں

یہاں ہوں۔ خدا تو بچے مفت دیتا ہے لیکن انسانوں کو پھر بھی

ایک سڑک پر پاتا ہے۔ جب کہ میں قفلز ہوں۔“

اس کے ہونٹ کھڑکھڑانے لگے۔ وہ مسکرائی۔ ”بچے کچھ نہیں

مالتے۔ ڈینی... محبت کے سوا۔“

لیکن یہ کہنا آسان تھا۔ پیسے کی اہمیت اپنی جگہ مسلم تھی۔

مجھے یاد تھا، جب ہمارا آخری ڈالر بھی خرچ ہو گیا تو ہم ریلیف

اس کے اور وہاں ہم نے امداد کے لیے درخواست دی۔ کلرک

نے جس طرح ہمیں دیکھا... مجھے اور پھر نیلی کے پھولے

کے ہونٹ... تو بلیز لفظوں کے اپنے تاثر سے اس نے کہہ دیا

کہ ”بچے نہیں نکھال سکتے تو بچے پیدا کرنے کا شوق کیوں

مالتے ہو۔“ ایک سوال نامہ بھرنا پڑا۔ تقیث کار ہمارے

گھر آ کر کھنٹوں پوچھ پچھ کرتے رہے۔ ایسی پوچھ پچھ ہوئی کہ

مجھے رہنمائی کا احساس ستانے لگا۔ ہماری نئی زندگی کا کوئی گوشہ

وہ وی کی پیدا ہونے سے پہلے کی بات تھی۔ پھر نیلی ہاسٹل

میں جب نرس نے پہلی بار مجھے میری بچی کا چہرہ دکھایا... گلابی

رنگت اور بلونڈ بال... تو میری ہر شرمندگی مٹ گئی۔ میں نے

سوچا۔ اس خوشی، اس دولت کے لیے تو ہر توہین، ہر اذیت

برداشت کی جاسکتی ہے۔ صرف اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے!

پھر میں نیلی سے ملا۔ وہ جس وارڈ میں تھی، وہاں سات

عورتیں اور تھیں۔ وہ مجھے آتے ہوئے دیکھتی رہی۔ میں نے

کچھ نہیں کہا۔ میں کچھ کہنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے جھک کر

اُس کا رخسار چوما اور اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ہمیں نیلی ملی ہے۔“ اس کے لہجے میں تھکن تھی۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”مگر اس کے بال تمہارے جیسے ہیں۔“ اس نے جلدی سے کہا۔

”اور چہرے کے نقش اور آنکھیں تمہارے جیسی۔“

وہ مسکرائی۔ ”تو تم مایوس نہیں ہوئے؟“ اس کے لہجے میں

بچوں کی سی مصحوبیت اور انتہائی۔

میں نے بہت شدت سے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں یہی تو چاہتا

تھا۔“ میں نے کہا۔ ”ایک اور تم... ایک اور نیلی۔“

نرس ہماری طرف چلی آئی۔ ”اب آپ کو جانا چاہیے

مرشد فر۔“

میں نیلی کو پیار کر کے وارڈ سے نکل آیا۔ میں گھر گیا اور وہاں

تہا ایک بے آرام رات گزاری۔ صبح سویرے ہی میں کام کی

تلاش میں نکل گیا۔

ہمیشہ کی طرح اس روز بھی ناکامی ہی ہوئی۔ میں نے

پریشان ہو کر سوچا۔ کیا میں اپنی بچی کے لیے کچھ بھی نہیں

کر سکتا ہوں۔ سام سے ملوں۔ شاید وہ کچھ مدد

کرے۔ اس کا آفس اسپانر اسٹیٹ بلڈنگ میں تھا۔ مجھے یاد

ہے، میں ایک گھنٹا اس عمارت کے سامنے کھڑا اپنا حوصلہ جمع

کرنے کی کوشش کرتا رہا، بالآخر میں اندر گیا اور لفٹ میں بیٹھ کر

اُس کے آفس کی طرف گیا۔

استقبالیہ کلرک نے مجھے اس کے آفس میں نہیں گھنے دیا۔

اس کا کہنا تھا کہ وہ مجھ سے نہیں ملنا چاہتا۔ میں نے نیچے جا کر

پبلک فون سے اس کا نمبر ملایا۔ اس کی آواز بہت کھردری تھی۔

اس کے ابتدائی الفاظ نے ہی میرے جسم کو سرد کر دیا اور میں نے

ریسیور ہنگ پر لٹکا دیا۔ اس کے الفاظ میرے کانوں میں گونج

رہے تھے، اور میرے پیٹ میں اٹھن ہو رہی تھی... ”کیا بات

...

ہے کد؟ کوئی اور چوٹ دینا چاہتے ہو؟

مجھے احساس ہوا کہ میرے لیے تمام دروازے بند ہو چکے ہیں۔ دنیا میں کوئی ایسا نہیں جس سے میں مدد مانگ سکوں۔

نیلی بچی کے ساتھ گھر آگئی تھی۔ پورا موسم گرما بے روزگاری میں گزر گیا۔ چند ہفتے ایک جلیب کی۔ رات کا کام تھا، اور خواہ گزاریے لائق بھی نہیں تھی۔ لیکن میں نے یہ سوچ کر قبول کر لی کہ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے، بہتر ہے... سوڈا فائنڈین میں کلرک، تنخواہ چھ ڈالر فی ہفتہ اور ٹیس مقدور کے مطابق۔ اگر میں اس ملازمت کو ریلیف والوں سے چھاپوں تو یہ معمولی سی آمدنی اضافی بن کر خاصا کام آسکتی ہے۔ ریلیف والوں کے ماہانہ 72 ڈالر میں پورا مہینا نہیں چل پاتا تھا۔

میں نے صفائی مکمل کی اور کلاک پر نظر ڈالی۔ ڈھائی بج رہے تھے۔ تین بجے گھر پہنچوں تو ریلیف والی کے آنے تک چند گھنٹے کی نیند تو لے سکتا ہوں۔ آج اسے چیک لانا تھا۔ اور عام طور پر صبح سات بجے آ جاتی تھی۔

میں بیٹھا مسز اسٹائیڈر کی خنچی 'روں روں' کرتی آواز سننے لگا۔ میرے لیے آنکھیں کھولنا دشوار ہو رہا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی، جو ہر چیز میں ماہر ہوتے ہیں، یا یوں کہہ لیں کہ خود کو سمجھتے ہیں۔ اس وقت وہ نیلی کو گوشت کی ایک ڈش تیار کرنے کی ترکیب کے بارے میں بتا رہی تھی۔

”زبردست... ہے نا ڈینی؟“ نیلی نے اسے داد دیتے ہوئے مجھے بلایا۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں اور گڑ بڑا کر کہا۔ ”کیا...؟“

”آپ میری بات نہیں سن رہے تھے مسز فشر۔“ مسز اسٹائیڈر نے سرد لہجے میں مجھے تنبیہ کی۔

”میں سن رہا تھا مسز اسٹائیڈر۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”ایک ایک لفظ سنائیں نے آپ کا۔“ اس نے مجھے چشمے کے پیچھے سے بہ غور دیکھا۔ ”تم بہت جلدی سے لگ رہے ہو مسز فشر۔“ اس نے شک آمیز لہجے میں کہا۔ ”کیا کرتے رہے رات بھر؟“

اب تو میں پوری طرح بیدار ہو گیا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں مسز اسٹائیڈر۔ میں سوئے کے لیے جلدی لیٹ گیا تھا۔ مگر رات عجیب سی بے چینی رہی۔ اچھی نیند نہیں آئی۔“ وہ نیلی کی طرف مڑی۔ میں اسے متاثر نہیں کر پایا تھا۔ ”اور

بچی کا کیا حال ہے مسز فشر؟“

”آپ اسے دیکھیں گی؟“ نیلی نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں مسکرایا۔ نیلی مسز اسٹائیڈر کو پینڈل کرنا جانتی تھی۔ مسز اسٹائیڈر اولاد سے محروم تھی اور بچوں سے بہت پیار کرتی تھی۔ اب چاہے میں خیرا لے لیتا رہوں، مسز اسٹائیڈر کو بچا پتا نہیں چلے گا۔ وہ ویسی گم ہو جائے گی۔

مسز اسٹائیڈر کے رخصت ہوتے ہی میں سو گیا۔ میری آنکھ کھلی تو مجھے لگا کہ میں گھر میں اکیلا ہوں۔ میں نے سر گھما کر وقت دیکھا۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ بیڈ سائیڈ کلاک کے پاس نیلی کا رُقعہ رکھا تھا:

چیک کیش کرانے جارہی ہوں۔ پھر بل ادا کرنے ہیں۔ کچھ شاپنگ بھی کرنی ہے۔ وہی کو ساتھ لے جا رہی ہوں تاکہ تم سکون سے سو سکو۔ کافی اسٹوپر موجود ہے۔ میں تین بجے تک واپس آ جاؤں گی۔

میں نے نوٹ کو وہیں رکھا اور اٹھ کر انڈرائی لی۔ اٹھ روم میں جا کر میں نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ میں کھانا کھا کر ابھی عصر سے بڑا لگ رہا تھا۔ جلد خشک ہو رہی تھی۔ آنکھوں کے گوشوں پر لکیریں سی نمودار ہو گئی تھیں۔

میں نے گہری سانس لی اور شیو کی تیاری کرنے لگا۔ قفل میں چابی گھومنے کی آواز سنائی دی تو میں شیو سے فارغ ہو چکا تھا۔ میں باہر نکلا تو دروازے میں نیلی کھڑی نظر آئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں وہی تھی اور دوسرے ہاتھ میں شاپنگ بیگ۔ میں نے بڑھ کر اس کی گود میں لے لیا۔ نیلی سامان لے کر کچن میں چلی گئی۔

”میں نے گروسری والے کو اور قصائی کو مارا کر دی ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اور فلیٹ کا کرایہ ادا کرنے کے بعد میرے پاس 6 ڈالر بچے ہیں۔“

”گڈ۔“ میں نے کہا۔ اسی وقت مجھے احساس ہوا کہ وہی بہت چپ چاپ ہے۔ ورنہ عام طور پر میرے پاس آ کر وہ خوب ہاتھ پاؤں چلائی، خوب کھلتی تھی۔ ”یہ وہی کو کیا ہوا؟“ میں نے نیلی سے پوچھا۔

”پتا نہیں۔“ نیلی نے فکر مندی سے کہا۔ ”صبح سے یہی کیفیت ہے اس کی۔ اسٹور میں تو رونے لگی تھی۔ اسی لیے تو میں جلدی گھر آگئی۔“

میں نے وہی کو ہاتھ پھیلا کر اپنے سامنے کیا اور اس کا جائزہ لیا۔ ”کیا ہوا میری بھئی گویا کو؟“ میں نے انگلی سے اسے

کہا۔ ”میں معمول کے مطابق اس کی ہلکھلاہٹ کا منتظر تھا۔ لیکن وہ تو رونے لگی۔ اس کے رونے کی آواز سے کمر ابھر گیا۔ میں ہلکھلا کر نیلی کی طرف مڑا۔ بچی روتی تھی تو مجھے کچھ کہا۔ میں دیکھا بلکہ میری انگلیاں سن ہو جاتی تھیں۔“

”لاؤ اسے بیڈ پر لٹا دوں۔“ نیلی نے کہا اور بچی کو مجھ سے لے لیا۔ ”سوئے کی تو شاید بہتر ہو جائے گی۔“

میں بیڈ پر کرائی پینے لگا اور نیلی بچی کو تھکنے لگی۔ میں نے ہمارا جائزہ لیا۔ ریلیف بیڈ کے بارے میں ایک آرٹیکل چھپا تھا کہ وہ کچھ ایسے لوگوں کے بارے میں تفتیش کر رہے ہیں جو ہر شے ہونے کے باوجود ان سے ناجائز طور پر امداد حاصل کر رہے ہیں۔

نیلی واپس آئی تو میں نے وہ نیلی سے دیکھا۔ ”تمہارے خیال میں مسز اسٹائیڈر کو تم پر شک ہے؟“ اس نے

میں نے کندھے سے ہلکے سے ہاتھ مار کر کہا۔ ”بھئی، تو شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ وہ جب بھی آتی ہے، میں گھر پر ہی ہوتا ہوں۔“

”کیا پڑوسی نے تمہارا بے وقت آنا نوٹ کیا ہو؟“ میں نے کہا۔ ”ہر شخص اپنی پریشانیوں میں گم ہے۔“

”اس آج صبح اس کا طرز عمل عجیب سا تھا۔ جیسے وہ کچھ پتا ہو۔“

”ہول جاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”وہ کچھ بھی نہیں جانتی۔“ وہی پھر رونے لگی۔ اس بار بونے کے دوران وہ کھانسی بھی کی۔ وہ گہری اور بھاری کھانسی تھی۔ ایک لمحے کو ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھا، پھر نیلی پٹی اور بیڈ روم کی طرف

میں اس کے پیچھے تھا۔ ”میرے ہاتھ تک نیلی نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا تھا، اس کی کھانسی رک گئی تھی۔ وہ اسے تھک رہی تھی۔ نیلی نے زور سے دیکھا۔ ”اس کا جسم گرم ہو رہا ہے۔“ میں نے نیلی سے وہی کی پیشانی کو چھوا۔ ”گلتا ہے،“

”رات کو بھی کھانسی ہو رہی تھی اسے۔ میرا خیال ہے، خنڈ

کھانسی تھی۔“ ہمیں ڈاکٹر کو بلانا چاہیے۔“

بچی پھر رونے لگی۔ ہم دونوں بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ نیلی نے بچی کو اور پھر مجھے دیکھا۔ ”میرا خیال ہے، ڈاکٹر کو بلانا ہی پڑے گا۔“ اس نے کہا۔ ”میڈیکل کارڈ بچن کے فیلڈ پر رکھا ہے۔ نیچے ہال میں فون موجود ہے۔ جلدی کرو۔“



ڈاکٹر نے بچی کا معائنہ کیا پھر نیلی کو اشارے سے بلایا۔ ”آپ کے شوہر بچی کو پچھوڑے میں لٹا دیں تو میں آپ کا معائنہ کروں۔“

”بچی ٹھیک تو ہے۔“ نیلی نے ہچکاتے ہوئے پوچھا۔ میں وہی کو پچھوڑے کی طرف لے جا رہا تھا۔ میں نے کن آنکھیں سے اسے دیکھا۔

”اسے ٹھنڈ لگی ہے جس نے اس کے گلے کو جکڑ لیا ہے۔“

میں اسے دوا دے دوں گا۔ آپ ڈرائیو کھولیں اپنا... آ... آ... نیلی نے منہ کھولا۔ ڈاکٹر اس کے حلق کا جائزہ لینے لگا۔ پھر اس نے نیلی کو کھانسنے کو کہا۔ مگر نیلی پر جھج کھانسی کا دورہ سا پڑ گیا۔ ڈاکٹر نے اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے تھرمامیٹر نکال لیا۔

”کوئی مسئلہ ہے؟“ نیلی نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے اسے دیکھا اور مسکرایا۔ ”آپ پریشان نہ ہوں مسز فشر۔“ اس نے کہا۔ ”مجھے چیک کرنا ہے کہ آپ کو بخار تو نہیں ہے۔“ اس نے نیلی کے منہ میں تھرمامیٹر لگایا اور پیڈ نکال کر اس پر کچھ لکھنے لگا۔

میں اتنی دیر میں وہی کو لانا کہ اسے ڈھانپ چکا تھا۔ ڈاکٹر نے مجھ سے کہا۔ ”آپ کے پاس اسائن میٹ نمبر ہے؟“

”جہاں میں ہے۔ میں ابھی لایا۔“

میں واپس آیا تو ڈاکٹر تھرمامیٹر دیکھ رہا تھا۔ ”بخار تو آپ کو بھی ہے مسز فشر۔“ اس نے کہا۔ ”آپ کو اس کا پتا تھا؟“

نیلی نے نفی میں سر ہلایا۔

”آپ کے لیے چند روز تک بیڈریٹ ضروری ہے۔“

”لیکن ڈاکٹر، آپ نے مجھے وہی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“ نیلی نے احتجاج کیا۔

ڈاکٹر نے بد مزگی سے اسے دیکھا۔ ”دونوں کا ایک ہی مسئلہ ہے۔ گلے آئے ہوئے ہیں۔ نزلہ ہے اور بخار ہے۔ میں نسخہ لکھ رہا ہوں۔ حسب ہدایت استعمال کرنی رہیں۔ جلد ہی دونوں

ٹھیک ہو جائیں گی۔“

”آپ کا خیال ہے، بچی کی بیماری کا سبب میں ہوں۔“
نیلی نے پوچھا۔

ڈاکٹر پھر لکھنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ ”اے آپ سے لگی یا آپ کو اس سے، یہ تو میں نہیں بتا سکتا۔ آپ یہ فارم بھردیجیے، دوا لینی اور دیتی رہیے اور سردی سے بچتی رہیے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہاں، ممبرلا آپ کو؟“ وہ میری طرف مڑا۔

میں نے خاموشی سے کارڈ اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ کارڈ ہمیں ریلیف بیورو والوں نے دیا تھا۔ ڈاکٹر اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھنے لگا۔ پھر اس نے ریلیف کارڈ کے ساتھ ایک کاغذ میری طرف بڑھایا۔ ”یہ اپنے ریلیف انویسٹی گٹر کو دے دینا۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا بیگ اٹھالیا۔ ”میں کل پھر چکر لگاؤں گا۔“
”لیس ڈاکٹر۔“

دروازے پر پہنچ کر وہ پلٹا اور تنہی لہجے میں بولا۔ ”میری ہدایات پر عمل کرنا۔ مکمل پیڈریسٹ اور حسب ہدایت وقت پر دوا لینا بہت ضروری ہے۔“

اس کے جانے کے بعد نیلی نے مجھے دیکھا۔ غصہ میرے اندر اندر ہاتھا۔ میں نے ڈاکٹر کے دیے ہوئے کاغذ کو گولا بنا کر ایک طرف اچھال دیا۔ ”انھیں صرف اپنی دو ڈالر فیس کی پروا ہے۔“ میں نے غصے سے کہا۔ ”سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتے بد بخت، صرف اس لیے کہ ہم خیراتی مریض ہیں۔ عام مریضوں سے اس طرح بات نہیں کرتا ہوگا۔“

نیلی کھانسنے لگی۔ ”لیکن ہم لوگ کبھی کیا سکتے ہیں۔“ اس نے اکھڑتی سانسوں کے درمیان کہا۔ ”کم از کم وہ آیا تو۔ ورنہ کچھ تو ایسے ہیں کہ آنے کی زحمت بھی نہیں کرتے۔“

”اس کا انداز ایسا تھا جیسے ہم انسان نہیں، کچرے کا ڈھیر ہوں۔“ میرا غصہ کم نہیں ہو رہا تھا۔

نیلی بیڈ کی طرف لگی اور اس پر ڈھیر ہو گئی۔ ”اب تم نے دیکھ لیا نا ڈینی کہ لوگ کیسے کیسے ہوتے ہیں۔“

اس کا کل دیکھ کر مجھے اپنے اشتعال پر شرمندگی ہونے لگی۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اگر میں نے دنیا کو... اور لوگوں کو اب بھی نہیں سمجھا تو شاید کبھی نہیں سمجھ سکوں گا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما۔ ”لاؤ، نسخہ مجھے دو۔ میں ڈرگ اسٹور جا کر دوا بنوالاؤں۔ میرا خیال ہے، آج مجھے چھٹی کرنی ہوگی۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں ڈینی، تم بس دوا لا دو۔ کام پر جانا ضروری ہے۔ ہمیں پیسوں کی ضرورت ہے۔“

”لیکن ڈاکٹر نے تمہارے لیے پیڈریسٹ تجویز کیا ہے۔ وہ مسکرائی۔ ”ڈاکٹر تو یہی کہتے ہیں۔ اب کوئی شخص ٹھنڈا وجہ سے بستر تو نہیں چلا سکتا تم کام پر جاؤ تمہارے واپس آ۔ تک ہم دونوں ٹھیک ہو چکے ہوں گے۔“



میں دوڑتے ہوئے سیڑھیاں چڑھا اور اپنے دروازے کے سامنے زکا۔ میں نے فٹل میں چابی لگائی۔ اندر سے نیلی کھانسنے کی آواز آرہی تھی۔ میں نے چابی گھمائی۔ دروازہ کھلا دروازہ بند کر کے میں بیڈ روم کی طرف لپکا۔ ”نیلی... تم جا رہی ہو؟“ میں نے اسے پکارا۔

میں دروازے پر ٹھک گیا۔ نیلی پنگھوڑے پر جھکی ہوئی تھی اور اب سیدھی ہو رہی تھی۔ ”ڈینی، اس کے منہ سے وحش بھری آواز نکلی۔“

میں لپک کر اس کے پاس پہنچا۔ ”کیا بات ہے؟“ اس نے میری جینٹ تھام کر مجھے پنگھوڑے پر کھینچ کر لپکا کرنا ہوگا ڈینی۔ ”وہ بری طرح کھاس رہی تھی۔“ اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ ”وکی تو بخار میں بھٹن رہی ہے۔“ میں نے ہاتھ بڑھا کر پنگھوڑے میں لپٹی ہوئی اپنی بچی پیشانی کو چھوا۔ وہ واقعی انکارہ ہو رہی تھی۔

”ایک سو تین بخار ہے۔“ نیلی کی آواز لرز رہی تھی۔ میں نیلی کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس کی اپنی کیفیت اچھی نہیں تھی۔ میں نے اپنی آواز کو پندرہ سکون رکھنے کی کوشش کی۔ ”تم پریشان نہ ہو۔ بچوں کو بخار بھی ہو جاتا ہے۔ مجھے ہے، تمہارا بخار بھی بڑھ گیا ہے۔“

”میری فکر مت کرو۔“ اس کا لہجہ مضطرب تھا۔ ”ہمیں کے لیے کچھ کرنا ہے۔“

میں نے اس کے کندھے تھام کر کہا۔ ”پندرہ سکون ہو جاؤ۔ نیچے جا کر ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔“

وہ رو رہی تھی۔ ”آسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے۔“ ”جاؤ ڈینی، جلدی کرو۔ میری بچی دک رہی ہے۔ جاؤ ڈینی۔“ میں نے نیچے جا کر فون کیا۔ کئی گھنٹیاں بچیں، تب فون ریسیو کیا گیا۔ کسی نے نیند بھری آواز میں کہا۔ ”لیس؟“

”ڈاکٹر اڑیہ مر؟“

”بات کر رہا ہوں۔“

”ڈاکٹر، میں ڈینی فشر بات کر رہا ہوں۔“ میں نے جلدی کہا۔ ”آج آپ میری بچی کو دیکھنے آئے تھے نا۔“

”ہاں ہاں، مجھے یاد ہے۔“ ڈاکٹر نے چڑچڑے پن کہا۔ ”آپ فوراً آجائیں ڈاکٹر۔ بچی کو اب 103 بخار ہے۔“ وہ سو رہی ہے؟“

”ہاں ہاں۔ لیکن اس کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے اور وہ پسینے میں لہا رہی ہے۔ اس کی حالت اچھی نہیں ہے ڈاکٹر۔ اور میری بیوی کا بخار بھی بڑھ گیا ہے۔“

”میری تجویز یہ ہوئی دو آئیں دی تھیں؟“ ”ہاں ہاں ڈاکٹر۔“

”اس تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں مسٹر فشر۔ شدید بخار میں بخار دوا کے وقت بڑھ جاتا ہے۔ دونوں کو کوئی گرم دوا اور ڈھانپنے کا رطوبت تک دونوں بچے ہو جائیں گی۔ پھر اس آجائیں گا۔“

”لیکن ڈاکٹر... میں نے احتجاج کرنا کی کوشش کی۔“ ”میری ہدایت پر عمل کرو مسٹر فشر۔“ ڈاکٹر کے لہجے میں سختی تھی۔ پھر رابطہ منقطع ہو گیا۔

میں ہند لہجے ڈیڈ ریسیور کو گھورتا رہا۔ پھر میں نے اسے بگ میں داخل ہوا تو نیلی نے مجھ سے پوچھا۔ ”وہ آ رہا ہے؟“ ”نہیں۔“ میں نے سرسری لہجہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔ ”پہلے ہی پریشان تھی۔ میں اس کی پریشانی بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔“ اس نے کہا، پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ بخار تو رات کو زیادہ ہوا ہوتا ہے۔ ”میں نے ڈاکٹر کی ہدایات دہرا دیں۔“

”ڈینی، تمہارے خیال میں کوئی خطرہ تو نہیں؟“ اس کے لیے کچھ کرنا ہے۔“

میں نے مسکرا کر اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔ حالاں کہ اس کے منہ سے یہ محروم تھا۔ ”سب ٹھیک ہے جان۔ دیکھو نا، وہ اکر ہے۔ ہم سے زیادہ جانتا اور سمجھتا ہے۔ اس نے کہا ہے تو ٹھیک ہی کہا ہوگا۔“ میں اسے سہارا دے کر بیڈ کی طرف لے گیا۔ ”تم لیٹ جاؤ۔ میں تمہارے لیے چائے بناتا ہوں۔“

”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”پہلے وہ کوئی فیڈر میں چائے“

”اس بلی اس اب تم کل اوٹھ کر لیٹ جاؤ۔“

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے کنارے پر تک

گیا۔ ”اشو اور چائے کی بو۔ طبیعت بہتر ہو جائے گی۔“ وہ پیالی کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر منہ تک لے گئی۔ لپک گھونٹ لینے کے بعد اس نے کہا۔ ”اچھی ہے... بہت اچھی۔“ میں مسکرایا۔ ”اچھی کیوں نہ ہو۔ ڈینی فشر نے جو بنائی ہے۔“

اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ”اب ذرا اوکھ لو۔ کیسی ہے وہ؟“

میں پنگھوڑے کی طرف گیا اور جھک کر اپنی بچی کو دیکھا۔ وہ سو رہی تھی۔ ”سکون سے سو رہی ہے۔“ میں نے اعلان کیا۔ نیلی نے چائے کی پیالی خالی کر کے مجھے دی اور پھر نیچے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ ”ارے... میں تو بھول ہی گیا تھا کہ تم کتنی خوب صورت ہو۔“ میں نے کہا۔

وہ مسکرائی۔ لیکن اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ بہت تھکی ہوئی تھی۔ ”راتوں کو کام کرنے سے تمہاری نظر کمزور ہو گئی ہے ڈینی۔“ اس نے مذاق کہا۔

میں نے لائٹ آف کر دی۔ ”اب تم سو جاؤ بے بی۔“ میں نے اس کی پیشانی چوم کر کہا۔

بچن میں جا کر میں نے پیالیاں دھو کر رکھیں۔ پھر کرسی پر بیٹھ کر پاؤں پھیلالے۔ تھکن سے میرا برا حال تھا۔ اچانک میرے کانوں میں بچی کے رونے کی آواز آئی۔ میں نے سرکریٹ بٹھایا اور لپک کر بیڈ روم میں گیا۔ وہ کھانسنے لگی تھی... وہ گہری کھانسی تھی، پسینے کو ہلا ڈالنے والی۔ میں نے کمرے میں لپٹی ہوئی اپنی بچی کو اٹھا کر سینے سے لگایا اور اسے تھکنے لگا۔ یہاں تک کہ کھانسی ختم ہو گئی۔

نیلی بے سندھ سو رہی تھی۔ مجھے خوشی ہوئی کہ وہ کی کھانسی سے اس کی نیند خراب نہیں ہوئی۔ میں نے بچی کے چہرے کو چھو کر دیکھا۔ وہ اب بھی تپ رہا تھا۔ اس کا منہ سا ہاتھ میرے کندھے پر تھا۔ مگر اب وہ سو رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے اسے پنگھوڑے میں لٹا دیا۔

میں پھر بچن میں گیا۔ وہاں کی لائٹ آف کر کے میں بیڈ روم میں واپس آیا اور پنگھوڑے کے پاس کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ ہاتھ بڑھا کر میں نے اس کے ہاتھ کو چھوا۔ جبلی طور پر اس کی نصی منی انگلیاں میری درمیانی انگلی سے لپٹ گئیں۔ میں اسی حالت میں بیٹھا رہا تا کہ اس کی نیند خراب نہ ہو۔

کھڑکی سے چاندنی نظر آرہی تھی، جیسے وہ کوئی نئی نو بجی رات ہو، جیسے وہ کوئی اور ہی دنیا ہو... کھڑکی سے باہر! پھر وہ

نے حرکت کی۔ میں نے پنگھوڑے میں دیکھا۔ اب وہ کروٹ سے لپٹی ہوئی تھی۔ میری بیٹی! میں نے فخر سے سوچا۔ اس کی بیماری نے مجھے ڈرا دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں پہلی بار میں نے جانا تھا کہ وہ میرے لیے کتنی قیمتی ہے۔ ”میں تمہارے اس عرصے کی تلافی کروں گا“ میں بڑبڑایا۔ اپنی آواز نے مجھے خود بھی ڈرا دیا۔

میں نے گھبرا کر نیلی کی طرف دیکھا۔ مگر وہ بے خبر سو رہی تھی۔ میں نے پھر پنگھوڑے میں جھانکا۔ مگر اس بار وہ بڑی محتاط سرگرم تھی۔ ”وکی بے بی، جلدی سے اچھی ہو جاؤ، اپنے ڈیڈی کی خاطر۔ باہر بہت بڑی دنیا تمہاری منتظر ہے، جو تمہارا ڈیڈی تمہارے ساتھ شہر کرنا چاہتا ہے۔“

اس نے پھر حرکت کی، اور میں نے پھر پنگھوڑے میں جھانکا۔ میں نے سوچا۔ میں کتنا بے خبر، کتنا نادان ہوں۔ سمجھ ہی نہیں سکا کہ میری بیٹی نے مجھے کتنا دولت مند بنادیا ہے۔ میں نے نہت کی طرف مٹہ اٹھا کر دعا کی۔ ”پلیز گاڈ... پلیز گاڈ... اسے صحت عطا کر دو۔“

نیلی سوتے میں کھانسنے لگی۔ پھر اس نے کروٹ بدلی۔ میں اپنی کرسی سے اٹھا اور جا کر اسے دیکھا۔ مکمل اس کے جسم سے ہٹ گیا تھا۔ میں نے دوبارہ اسے مکمل اڑھایا اور اپنی کرسی پر آ بیٹھا۔

وہ رات شاید بہت طویل تھی اور ساکت بھی۔ مجھے اونگھ آنے لگی۔ کئی بار میں نے سر جھکا کر آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ لیکن ہر کوشش ناکام رہی۔ پریشانی نے تمکھن کو اور بڑھا دیا تھا۔

میرے کانوں میں دُور سے... بہت دُور سے کسی کے کھانسنے کی آواز آئی۔ میری پلکیں خرمخراں تھیں تو مجھے آجائے کا احساس ہوا۔ میں نے ایک دم سے آنکھیں کھولیں اور پنگھوڑے میں دیکھا۔ وکی بری طرح کھانسی رہی تھی... جھٹکے لے رہی تھی۔ میں نے اسے گود میں اٹھایا اور تھپتھپانے لگا۔ لیکن اس بار اس کی کھانسی رُک نہیں۔ اس کی آنکھیں بھی ہوئی تھیں اور پیشانی پر پینا چمک رہا تھا۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے میرے ہاتھوں میں اس کے جسم میں کھنچاؤ سا آیا... اکڑن سی پیدا ہوئی، اور اس کے چہرے کی رنگت نیلی ہو گئی۔

میں نے گھبرا کر اس کے مُنہ سے اپنا مٹہ ملا لیا اور اسے سانس دینے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے دوؤں ننھے منے پہلوؤں

پر پھیلیوں سے ہلکا سا دباؤ ڈالا اور دوبارہ اسے سانس دی۔ میں جانتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس دکھ کی شدت سے مجھے اپنا دل بند ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

میں اس کے پیچھے دوں کو اپنی سانس، اس کے جسم کو اپنی زندگی دینے کی تیجیم کوشش کرتا رہا، اس کے باوجود کہ میں جانتا تھا، سب کچھ بے سود ہے۔ اب میں یا کوئی اور... کوئی بھی اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا... کبھی نہیں!

میں اسے گود میں لیے ساکت کھڑا تھا۔ صبح کی خضدنی ہوا اس کے ننھے سے وجود کو شہر آ رہی تھی۔ یہ... یہ میری بیٹی تھی۔ میں سوچ رہا تھا۔ آنکھوں سے بہنے والے آنسو میرے مُنہ میں اُتر رہے تھے۔ زبان پر نمک کا ذائقہ تھا۔

”ڈیڈی!“ نیلی نے خوف زدہ لہجے میں مجھے پکارا۔ آہستہ سے میں اس کی طرف پلٹا۔ دیر تک میں اسے دیکھتا رہا۔ ان لمحوں میں بغیر کچھ کے میں نے ہزاروں باتیں اسے کہہ دیں، اور اس نے سماعت کے بغیر وہ سب کچھ سن لیا۔ وہ جان گئی۔ بلکہ وہ پہلے سے جانتی تھی... نہ جانے کیسے... وہ خوف زدہ تھی۔ اس نے وکی کی طرف ہاتھیں پھیلا دیں۔ دھیرے دھیرے چلتا میں اس کی طرف گیا اور بیٹی اسے گود میں سوپ دیا۔ وہ ہماری بیٹی تھی!

ہم چڑھ رہے تھے اور جونی سیز حیاں ہمارے بوجھ تھیں۔ کب کب وہ ہمارے لیے جانی پہچانی آوازیں بھی۔ لیکن آج اس میں ہمارے لیے کوئی خوشی نہیں تھی۔ وہ خوش ہو کر تقریباً ساڑھے تین سال پہلے یہی سیز حیاں چڑھتے ہوئے ہم نے محسوس کی تھی۔

تب ہم خوش تھے، جوان تھے اور زندگی ایک روشن دن کی طرح تھی۔ امکا نات سے روشن دن کی طرح! ہم ہنس رہے تھے۔ ہماری رگوں میں خون کی جگہ ہیمان دوڑتا تھا۔

میرے ذہن کے کسی تہہ خانے میں ایک بات تھی کہ کیسے میں نے اسے گود میں اٹھا کر چوکت پار کرانی تھی۔ لیکن وہ، ہر پرائی، دھندلائی ہوئی بات تھی۔ جلدیوں پرانی یاد!

وہ مجھ سے ایک قدم آگے تھی۔ میں اس کی پیٹھ دیکھ رہا تھا۔ سیدی اور سخت کمزور۔ وہ مضبوط تھی... ہمیشہ مضبوط رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، نہ ہونگوں پر سسکیاں، نہ اپنے دکھ کوئی گلہ۔ بس اس کی سیاہ آنکھوں میں اس کا دل نظر آ رہا تھا۔

یہ وہ دن تھا جسے بھلانے کی کوشش کی جاتی ہے، جسے اس کی آنکھیں بھڑوم کے دروازے کی طرف اٹھیں۔ پھر اس کی آنکھیں اس کی نگاہوں میں تنہا تھی۔ ”ڈیڈی، میں بیڈ

اس کی کہیں لہاں خانے میں دفن کر دیا جاتا ہے، تاکہ آپ کو اپنا انسان کی یاد آئے۔ آپ کے کانوں میں تدفین کے موقع پر گئی جانے والی دعا میں نہ ٹھیک۔ تاکہ آپ قربان گاہ پر روشن آنکھوں کو بھول جائیں۔ آپ کو تابوت کا رنگ یاد نہ رہے۔ زمین میں قبر بنانے والے کدال اور پتیلے کی دھاتی آوازیں آپ کو نہ سنائیں۔ اور تابوت پر گر گئی ہوئی مٹی کی آواز دل پر ہر دلوں کی طرح نہ گرے۔

بھول جاؤ! بھول جاؤ! بھول جاؤ! لیکن کوئی کیسے بھول سکتا ہے؟ اپنے پڑوسیوں کی غم گساری، ان کی ہم دردی اور مہربانی؟ آپ ان کے دروازے پر دستک دیتے ہیں۔ آپ کے اپنے بچے کی تدفین کے لیے کچھ بھی نہیں۔ وہ مدد نہ کریں۔ آپ اپنے بچے کو خود ہی گڑھا کھود کر دفن کرنے والے دفن نے برجمبور ہو جائیں۔ کوئی پتھر مار دے، کسی کے پاس صرف دو ڈالر ہوں، کوئی دس دے اور کسی چھ۔ یوں 70 دس، اور اس نے سماعت کے بغیر وہ سب کچھ سن لیا۔ وہ جان گئی۔ بلکہ وہ پہلے سے جانتی تھی... نہ جانے کیسے... وہ خوف زدہ تھی۔ اس نے وکی کی طرف ہاتھیں پھیلا دیں۔ دھیرے دھیرے چلتا میں اس کی طرف گیا اور بیٹی اسے گود میں سوپ دیا۔ وہ ہماری بیٹی تھی!

ہم چڑھ رہے تھے اور جونی سیز حیاں ہمارے بوجھ تھیں۔ کب کب وہ ہمارے لیے جانی پہچانی آوازیں بھی۔ لیکن آج اس میں ہمارے لیے کوئی خوشی نہیں تھی۔ وہ خوش ہو کر تقریباً ساڑھے تین سال پہلے یہی سیز حیاں چڑھتے ہوئے ہم نے محسوس کی تھی۔

تب ہم خوش تھے، جوان تھے اور زندگی ایک روشن دن کی طرح تھی۔ امکا نات سے روشن دن کی طرح! ہم ہنس رہے تھے۔ ہماری رگوں میں خون کی جگہ ہیمان دوڑتا تھا۔

میرے ذہن کے کسی تہہ خانے میں ایک بات تھی کہ کیسے میں نے اسے گود میں اٹھا کر چوکت پار کرانی تھی۔ لیکن وہ، ہر پرائی، دھندلائی ہوئی بات تھی۔ جلدیوں پرانی یاد!

وہ مجھ سے ایک قدم آگے تھی۔ میں اس کی پیٹھ دیکھ رہا تھا۔ سیدی اور سخت کمزور۔ وہ مضبوط تھی... ہمیشہ مضبوط رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، نہ ہونگوں پر سسکیاں، نہ اپنے دکھ کوئی گلہ۔ بس اس کی سیاہ آنکھوں میں اس کا دل نظر آ رہا تھا۔

یہ وہ دن تھا جسے بھلانے کی کوشش کی جاتی ہے، جسے اس کی آنکھیں بھڑوم کے دروازے کی طرف اٹھیں۔ پھر اس کی آنکھیں اس کی نگاہوں میں تنہا تھی۔ ”ڈیڈی، میں بیڈ

روم میں نہیں جاسکتی۔ وہاں اس کا پنگھوڑا ہے، اس کے کھلونے ہیں... اس کی آواز ڈوب گئی۔ اس کے محسوسات مجھ پر روشن تھے۔ میں اسے سمجھ رہا تھا۔ ”جو ہوتا تھا، ہو گیا ہے۔ اب ہمیں آگے بڑھنا ہے، زندہ رہنا ہے۔ زندگی تسلسل کا نام ہے۔ میں اس توقف تو ممکن ہی نہیں۔“ میں نے اسے سمجھایا۔

اس نے میرے ہاتھ تختی سے تھام لیے۔ اس کی آنکھوں میں وحشت اُٹھ رہی تھی۔ ”ایسا کیوں ڈینی... کیوں؟“ مجھے جواب نہیں معلوم تھا لیکن جواب دینا ضروری تھا۔ ”کیوں کہ انسان مجبور محض ہے۔ کیوں کہ ہمارے جینے میں ہی ہماری بچی کی خوشی ہے۔“

”وہ میری بیٹی تھی... میری ننھی سی بچی...“ وہ پہلی بار رو دی۔ ”وہ میری ننھی بچی کی کیا چاہتی تھی... بس جینا۔ لیکن میں ناکام رہی۔“

میں نے اسے اپنا لیا۔ بچے سے محروم ہونے والی ماں کو تسلی دینا ناممکن ہوتا ہے۔ لیکن مجھے کوشش کرنی تھی۔ ”اس میں تمہارا کیا قصور نیلی؟ کسی کا بھی قصور نہیں۔ یہ سب تو خدا کے اختیار میں ہے۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں ڈینی۔ میرا قصور تھا۔ شروع ہی سے میرا قصور تھا۔ میں نے ایک گناہ کیا اور اس میں اسے حصے دار بنالیا۔ اور اس کی سزا مجھے نہیں، اسے ملی۔ میں نے یہ سمجھنے کی غلطی کی کہ میں خدا سے زیادہ، خدا سے بہتر جانتی ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں ایسی دھتکی ہوئی دیوانگی تھی جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

”میں نے گناہ کیا اور میں حالت گناہ میں رہتی رہی۔“ اس نے شہر لہجے میں کہا۔ ”میں نے اپنی شادی، اپنی ازدواجی زندگی کے لیے کبھی خدا سے تائید نہیں چاہی۔ میرے لیے انسانی تائید کافی تھی۔ تو پھر میں اپنی بچی کے لیے خدا سے رحمت کی توقع کیسے رکھ سکتی ہوں۔ فادر برین نے شروع ہی میں بتا دیا تھا مجھے۔“

”فادر برین نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔“ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”آج چرچ میں بھی انھوں نے یہی کہا کہ خدا ہماری بچی کو خوش آمدید کہے گا۔“ میں نے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ”ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے، اب بھی کرتے ہیں۔ بس خدا کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ وہ اور کچھ نہیں کہتا ہم سے۔“



جعفر از بنگال

انگریز مؤرخوں کا یہ دعویٰ کہ کلانیو نے تین ہزار فوج کی مدد سے نواب سراج الدولہ کی لاتعداد فوج پر فتح پائی، قرین عقل نہیں ہو سکتا، کیوں کہ 50 ہزار میں سے ہر ایک کے ہتھے میں تین ہزار کی بونی تک نہیں آ سکتی۔ دراصل خود نواب کی فوج کا بیش تر حصہ اپنے گھر کو آگ لگا رہا تھا۔ یہ میر جعفر جیسے شخص کی غدار ی تھی جس کے باعث بنگال میں اسلامی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس پر بھی اگر نواب سراج الدولہ کا سپہ سالار نہ مرنے کا نتیجہ کچھ اور ہوتا۔ سپہ سالار کو جو میر جعفر کے ساتھ شریک تھا، میر جعفر ہی کے آدمیوں نے قتل کر ڈالا۔ کلانیو کے صرف 20 آدمیوں کا مارا جانا اور 50 کا زخمی ہونا تعجب خیز نہیں تھا، کیوں کہ توپ خانہ پہلے ہی خرید لیا گیا تھا اور توپوں میں پانی ڈلوادیا گیا تھا۔

لڑائی کے بعد کلانیو مرشد آباد پہنچا۔ وہ کٹھ پتلی شاہ دہلی سے پہلے ہی میر جعفر کی تقرری کا فرمان حاصل کر چکا تھا، چنانچہ 29 جون 1757ء کو کرنل کلانیو نے میر جعفر کو گولی پر بٹھادیا۔ میر جعفر کو انگریزوں کی مفروضہ امداد کے سلسلے میں تمام خزانہ اور ذاتی زرد جوہر کلانیو کی نذر کرنے پڑے جن میں سے ہر انگریز افسر کو معقول حصہ دیا گیا۔ صرف کلانیو کا حصہ 35 لاکھ 10 ہزار روپے تھا۔ اس کے علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک کروڑ روپے کلکتہ کے نقصان کے عوض دیے گئے، اس کے علاوہ بنگال میں 24 پرگنوں کا زرخیز علاقہ بھی کمپنی کی نذر ہوا۔ 1759ء میں شاہ عالم نے اس تمام علاقے کا حاصل جو چار لاکھ 50 ہزار روپے ہوتا تھا، کلانیو کو بخش دیا اور اس طرح تقریباً سارا بنگال انگریزوں کے زیر تسلط آ گیا۔

لاہور سے آیا زخمی کا مطالعہ



کہا۔ ”میں تو صرف حقیقت جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ ”تو سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ ماہنامہ 72 ڈالر میں تین افراد کا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے نتیجے میں کبھی کبھی وہ تین سے دو ہو جاتے ہیں۔ 72 ڈالر میں آدمی کو بڑے والے آلو کھانے پڑتے ہیں۔ بھوکا مرنے سے بچنے کے لیے آدمی ہاتھ پاؤں بھی نہ مارے۔“

170 ابر

اس نے یہ اضافہ بھی پنسل کی مدد سے نوٹ بک کے سپرد کر دیا۔ ”آپ کے پاس یہ رقم کہاں سے آئی، مسٹر فشر؟“ ”اس کام سے کیا سود کار؟“

اس کے لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ مچلی۔ ”ہم سے زیادہ اور کے ق کے پوچھ کچھ کا۔ دیکھیں مسٹر فشر، آپ ریلیف پر ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ تلاش ہیں۔ یعنی آپ کے پاس کچھ بھی نہیں ہے، اسی لیے تو ہم آپ کی مدد کر رہے ہیں۔ اب ایسے میں آپ 70 ڈالر کی فضول خرچی کریں گے تو پوچھ کچھ تو ہوگی۔ آپ کو نہیں بتانا ہوگا کہ یہ رقم آپ کے پاس کہاں سے آئی۔“

میری نگاہیں مسکرائیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انہیں آپ کو فزیت حاصل ہے آپ کو جواب دلانے سے نہیں تو آپ کی امداد تم مجھے بتانا چاہیے تھا۔ لیکن میری عزت نفس، میری غیرت نے مجھے روک دیا۔ میں اسے کیسے ہی سکتا تھا۔ یہ بات تو وہی اور اس کے والدین کے درمیان تھی۔ کوئی کسی سے پوچھنے کہ ہمارے پاس اپنی بیٹی کی تدفین کے لیے رقم کہاں سے آئی تو تو ظلم ہے۔ اس نے یہ نہیں پوچھا کہ اس رقم کے ہوتے ہوئے اسے کسی ایسے ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھایا! انھاری بیٹی رات میں اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔

”ممکن ہے ہم سے چھپ کر تو ان کو نوکری کرتے رہے ہوں۔“ اس نے قحانہ لہجے میں کہا۔ ”تم ہمیں دھوکا دیتے رہے۔“ ”مسٹر فشر۔“

میں نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اسے یہ کیسے معلوم ہوا؟ ”اس معاملے سے اس کا کیا تعلق؟“ میں نے کہا۔

وہ اب بڑے فخر سے مسکرا رہا تھا۔ ”ہمارے اپنے ذرائع ہیں معلومات کے۔“ اس نے لہجے میں پراسراریت سموتے ہوئے کہا۔ ”تحصیل شاید پتا نہیں۔ ہمیں بے وقوف بنانا پڑا۔ ہم کا پڑتا ہے۔ یہ نیویارک شہر کے ساتھ فراڈ ہے۔ تم جیل بھی جا سکتے ہو۔“

اب مجھے غصہ آ رہا تھا اور میری برداشت جواب دے رہی تھی۔ اس دن کی اب تک کی اذیتیں اتنی تھیں کہ پتھر بھی پھینک دیتا۔ اس پر مستزاد یہ سفاک آدمی۔ ”کوئی کام کرنا چاہے تو اسے جیل جانا پڑتا ہے۔ یہ تم مجھے کیا پڑھانے کی کوشش کر رہے ہو؟“

”کچھ نہیں مسٹر فشر، کچھ بھی تو نہیں۔“ اس نے بے حد رसान

اٹھا۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا اور حیران ہوا کہ انہی صرف تین بجے ہیں۔ مجھے تو ایسا لگ رہا تھا کہ صبح کے بعد سے اب تک ایک سال گزر چکا ہے۔

میں نے دروازہ کھولا۔ باہر ایک اجنبی کھڑا تھا۔ ”کیا بات ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے اپنا والٹ نکال کر مجھے اپنا بیج دکھایا۔ ”میں ویلفیئر انوسٹی کیگز ہوں، مسٹر فشر۔“

”میرا نام جان مورگن ہے۔“ اس نے کہا۔ ”آپ مجھے چند منٹ دے سکیں گے؟ مجھے آپ سے کچھ سوال کرنے ہیں۔“ میں اسے گھورنے لگا۔ وہ کسی بھی طرح کی جواب دہی کے لیے مناسب وقت نہیں تھا۔ ”آپ پھر کی وقت آجائے گا مسٹر مورگن۔“

اس نے ٹی ٹی سر ہلایا۔ ”نہیں، بات اسی وقت ہوگی۔ اس کا لہجہ کچھ ناخوش گوار ہو گیا۔ ”مسز اسٹانٹن پر خدشہ آپ کے کیس کے بارے میں کچھ ایسی معلومات حاصل ہیں جن کی فوری تصدیق ضروری ہے۔ اس میں آپ ہی کا بھلا ہے۔“

مجھے اس کا لہجہ، اس کا انداز بہت برا لگا۔ ویلفیئر ڈیپارٹمنٹ کا بیج آدمی کو خدا تو نہیں بنادیتا۔ میں دروازے پر پھیل کر کھڑا ہو گیا۔ ”ٹھیک ہے۔“ میں نے سر دھجے میں کہا۔ ”میں آپ کے ہر سوال کا جواب دوں گا۔“

اس نے بے چینی سے پہلو ہلایا۔ لیکن اسے اندازہ ہو گیا کہ میں اسے گھر میں بٹھانے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ اس۔ جب سے چھوٹی سی ایک نوٹ بک نکالی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ ”آج آپ اپنی بیٹی کی تدفین کی ہے۔“

میں نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ سر دھجے میں، بے حد غیر جذباتی انداز میں شروع ہو گیا اس نے نوٹ بک میں کچھ لکھا۔ میں جانتا تھا، تمام انوسٹی گم ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ان سے ان کی نوٹ بک چھین لو تو بولنے کے قابل ہی نہیں رہیں گے۔

”سروں اور تابوت پر 40 ڈالر خرچ ہوئے۔ قبرستان فیس 20 ڈالر تھی۔ کیا یہ درست ہے؟“

”نہیں۔ تم کچھ بھول گئے ہو۔“ میں نے سر دھجے میں کہا۔ ”کیا؟“ اس نے تیز نظروں سے مجھے گھورا۔

”ہم نے چرچ میں ڈس ڈالر کا عطیہ بھی دیا تھا۔ یہ کل ما

اس نے اداس نظروں سے مجھ کو دیکھا اور زنی سے میرے چہرے کو چھوا۔ ”میرا بیٹی بے چارہ... کچھ بھی تو نہیں سمجھتا۔“ میں نے جواباً اسے دیکھا۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ میرے نزدیک تو وہ افراد کے درمیان محبت ہی سب سے بڑی حقیقت تھی۔ اگر وہ محبت کچھ تھی تو یہ خدا کا کرم تھا، نعمت تھی۔ ”آئی لو یو!“

وہ آنسوؤں کے درمیان مسکرائی۔ پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے ترم آئین نظروں سے مجھ کو دیکھا۔ ”تم سمجھتے ہو کہ تمھاری محبت ہی سب کچھ ہے۔ اس کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ تم نہیں سمجھتے کہ خدا کے نزدیک یہ نا کافی ہے۔“

میں نے اس کے ہاتھ کو بوسا دیا۔ ”ہمارے لیے ہمیشہ ہماری محبت ہی کافی رہتی ہے۔“

اس کی نگاہیں بہت دُور گئیں دیکھ رہی تھیں۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میری غلطی تو کرتے رہے ہیں ہم۔ لیکن اب میں نے جان لیا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ ہمیں صرف اپنے ساتھ، اپنے لیے نہیں جینا ہوتا۔ ہمیں خدا کے ساتھ، خدا کے لیے بھی جینا ہوتا ہے۔“

پھر وہ بیڈروم میں چلی گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ بستر کی چرچاہٹ سے اندازہ ہوا کہ وہ لیٹ گئی ہے۔ پھر اندر خاموشی چھا گئی۔ میں نے ایک اور سرکریٹ سلگائی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

باہر بارش ہو رہی تھی۔ یہ وہ دن تھا جسے بھول جانے کو جی چاہتا تھا۔ لیکن کوئی کیسے بھول سکتا ہے۔ خاموشی میری ہڈیوں تک میں اُتری جا رہی تھی!



مجھے اپنا جسم سن ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ عجیب سی کیفیت تھی۔ نیم خوابی اور نیم بیداری۔ شاید ایسا تھا کہ میرا جسم سو رہا تھا اور میرا دماغ جاگ رہا تھا۔ میرے پاس سوچوں اور خیالات کے سوا کچھ نہیں تھا۔ خیالات بھی نامکمل اور پھٹے پھڑے۔ اور لنگڑی لولی، نامکمل یادیں جو دماغ میں چکر ا رہی تھیں، اذیت دے رہی تھیں، لیکن جسم اس اذیت سے بے خبر تھا۔

شاید اسی لیے پہلی بار میں بزرگی آواز نہیں سن سکا۔ نہیں، یہ غلط ہے۔ آواز میں نے سن لیکن اسے پہچان نہیں سکا۔ مگر دوسری بار بزرگی آواز میں ایک پیہم اصرار تھا۔ تب مجھے خیال آیا کہ کوئی میرے گھر کے دروازے پر کھڑا ہے۔ تیسری گھنٹی نے مجھے غصہ جوڑ ڈالا۔ میں اچھل کر کرسی سے

”تو تم اعتراف کر رہے ہو کہ تم ہم پر خود کو بے روزگار ظاہر کرتے رہے، جب کہ اسی دوران تم راتوں کو چھپ کر ملازمت کرتے رہے؟“

”میں نے ایسا کوئی اعتراف نہیں کیا۔“

”تو پھر پچی کی تدفین کے لیے 70 ڈالر کہاں سے آئے تمہارے پاس؟“

میرے حلق میں کچھ پھٹنے لگا۔ ”ہاں، میری بیٹی مر گئی۔ میں نے اس کی تدفین کی۔ اور کیا کر سکتا تھا۔ اگر میرے پاس پیسے ہوتے تو اس کا علاج نہ کرتا۔ رات بھر تمہارے محسوس امدادی ڈاکٹر کی آمد کا انتظار نہ کرتا۔ میرے پاس پیسے ہوتے تو اپنی بیٹی کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتا، اور اس وقت وہ زندہ ہوتی۔“

وہ مجھے سرد نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی اسے دیکھ کر کہ کوئی انسان اتنا غیر حساس بھی ہو سکتا ہے۔

”تو تم راتوں کو کام کرتے رہے ہو؟“ اس نے دہرایا۔

اچانک تمام تلخیاں، تمام آذیتیں اور دلی تکلیفیں میرے وجود میں یک جا ہو گئیں۔ میں نے اسے ناٹی سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور اس کی تھوچی اپنے چہرے کے قریب لے آیا۔

”ہاں... میں راتوں کو جاگتا اور محنت کرتا تھا۔“ میں نے اسے جھکا دیتے ہوئے کہا۔

اس کا چہرہ سپید پڑ گیا۔ وہ میری گرفت میں پھڑپھڑانے لگا۔ ”مجھے چھوڑو مسٹر فشر!“ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

”یہ سب کچھ کرتا تمہارے لیے اور نقصان دہ ہو گا۔ تم پہلے ہی بڑی مشکل میں پھنسنے ہوئے ہو۔“

وہ نہیں جانتا تھا اور میں جانتا تھا کہ اس نے کتنی سچی بات کہی ہے۔ جہاں سنیاناس وہاں سواستیاناس۔ نقصان تو اب ہونا ہی تھا، تو کیوں نہ دل خوش کر لیا جائے۔ میں نے اس کے منہ پر اُلٹے ہاتھ کا تھپو رسید کیا۔ وہ دیوار سے ٹکرایا۔ اس کی ناک پر خون کا دھبہ نمودار ہو گیا تھا۔

اب اس کی نگاہوں میں خوف تھا۔ وہ ہال وے کی دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ پھر وہ دیوار سے چپکے چپکے زینے کی طرف پھٹکنے لگا۔ زینے پر پہنچ کر اُس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ پھر وہ ہسپریائی انداز میں چلا یا۔ ”تم اس کا نتیجہ بھٹکو گے۔ تمہاری امداد بند ہو جائے گی۔ میں تمہیں اس حال کو پہنچا دوں گا کہ تم بھوکوں مرو گے۔“

میں نے جارحانہ انداز میں اس کی طرف قدم بڑھایا تو وہ سیڑھیاں اترنے لگا۔ میں نے ریلنگ سے نیچے دیکھتے ہوئے

اسے لٹکارا۔ ”تم واپس آئے یہاں تو میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔ مجھ سے دور رہنے میں ہی تمہاری بھلائی ہے۔“

وہ اگلی لینڈنگ پر پہنچ گیا تھا۔ میں اپنے پارٹمنٹ میں واپس چلا آیا۔ مگر میری طبیعت بگڑ رہی تھی۔ اب میں اپنے آپ سے شرم سار ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے عمل سے اس دن کے دامن کو داغ دار کر دیا تھا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا... کم از کم آج کے دن نہیں۔

نیلی بیڈروم کے دروازے پر کھڑی تھی۔ ”کون تھا ڈینی؟“

”ویلفیئر ڈیپارٹمنٹ کا ایک بندر۔“ میں نے اپنے لہجے کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”عقل مند بن رہا تھا۔ میں نے بھگا دیا اسے۔“

”کس لیے آیا تھا؟“

اس روز اس وقت تک جو کچھ ہو چکا تھا، وہی اس کے لیے کم نہیں تھا۔ اس میں اضافہ کرنا زیادتی ہوتی۔ ”کچھ نہیں۔ بس کچھ پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا۔ تم جاؤ میری جان۔“

”نہیں تمہاری نائٹ جاب کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے نا؟“ اس کے لہجے میں یاس تھی۔

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ شاید اس نے سب سن لیا تھا۔

”تم کچھ دیر سوچو تا کہ کوشش تو کرو۔“ میں نے موضوع بدلا۔

وہ غٹکی باندھے مجھے دیکھتی رہی۔ ”جھوٹ بولو ڈینی! یہی بات ہے نا؟“

”اگر ایسا ہے تو مجھی کیا؟ میں نے ظاہری بے پروائی سے کہا۔ ”اس کی اہمیت ہی کیا ہے۔ میری جان پر گزرا ہ ہو سکتا ہے۔“

”باس نے وعدہ کیا ہے کہ جلد ہی میری نوکری بڑھادے گا۔“ وہ کھڑی مجھے دیکھتی رہی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ میں اس کی طرف بڑھا اور میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”ہمارے لیے کچھ بھی اچھا نہیں ہو گا ڈینی۔“

اس نے بے چارگی سے کہا۔ ”ہم ہمیشہ پریشانیوں میں گھرے رہیں گے۔ اب آج کے دن کو ہی دیکھو۔ جو کچھ ہو چکا تھا، وہ کم تو نہیں تھا۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ ابھی اور بہت کچھ ہونا ہے۔“

”ایسا نہیں ہے بی بی۔“ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ ”اب حالات بہتر ہوتے جائیں گے۔ دیکھ لینا۔“

”نہیں ڈینی، کچھ نہیں بدلے گا۔ یہی نہیں بدلے گا۔ میں اپنے ساتھ تمہارے لیے صرف بد قسمتی لائی ہوں۔“

”یہ بات اپنے دل سے نکال دو۔ آدمی کو ہمیشہ بہتری کی

امید رکھنی چاہیے۔“

”امید! کیسی امید؟ تمہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ تمہاری ماں بے یارہ بھی چھن گئی۔ چار دن سے چھٹی کر رہے ہو تم اور تم نے ہاں فون بھی نہیں کیا۔“

”میں اس طرف سے فکر مند نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔

لیکن یہ سچ نہیں تھا۔ مجھے پریشانیوں میں بے خیال ہی نہیں آیا کہ ایک کوفون کر کے بتا دوں۔ ”جب جیک کو صورت حال کا علم ہو گا تو وہ سمجھ جائے گا۔“

لیکن نیلی کی نگاہوں میں بے یقینی تھی۔ اور وہ بے یقینی مجھے اپنے اندر اتنی محسوس ہو رہی تھی۔

میں اسٹور میں داخل ہوا تو جیک نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں کوئی خیر مقدمی تاثر نہیں تھا۔ میں نے کاؤنٹر کی طرف دیکھا۔ وہاں میری جگہ ایک اور شخص کام کر رہا تھا۔

”ہیلو جیک۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”ہیلو ڈینی۔“ اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

میں منتظر تھا کہ وہ مجھ سے کچھ پوچھے گا۔ مگر وہ خاموش تھا۔

”اگر وہ ہو گیا کہ وہ غصے میں ہے اور مجھے ہی پہل کرنی پڑے گی۔“ میں نے اپنی بات ہو گئی تھی جیک کہ میرا آنا ممکن ہی نہیں تھا۔

”میں نے کہا۔“ اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

”اور پانچ منٹوں میں تمہارے لیے ایک فون کرنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔“ اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اس پر شک ہے جیک۔“ میں نے معذرت طلب لہجے میں کہا۔

”میں جانتا ہوں کہ مجھے فون کرنا چاہیے تھا۔ لیکن میری ذہنی حالت اس کی تھی کہ مجھے اس کا خیال ہی نہیں آیا۔ میں تو سب کچھ کر رہا تھا۔“

”دو راتوں تک میں یہاں اپنی کمر توڑتا رہا۔ تمہارا لٹکارنا رہا۔ امید تھی کہ تم آؤ گے۔ لیکن تم نے تو فون تک نہیں کیا۔“

”میں مجبور تھا جیک۔ مجھے کچھ ہوش ہی نہیں تھا۔“

”پانچ دن میں ایک فون کرنا بھی ممکن نہیں رہا۔“ اس نے کہا۔ ”یہ تو مجھ میں آنے والی بات نہیں۔“

میں اسے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے رانی سے کہا۔ ”میری

ایک ہی خاموشی رہی پھر وہ بولا۔ ”ملاقات تو نہیں کر رہے

ہو ڈینی؟“

”یہ تو مذاق میں سوچنا بھی ممکن نہیں تھا میرے لیے۔“

اس کی نظریں جھک گئیں۔ ”آئی ایم سوری ڈینی، رینلی سوری۔“

میں نے کاؤنٹر کی طرف دیکھا۔ میرا متبادل کن آنکھیوں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ انداز ایسا تھا جیسے اسے ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو میں دل چسپی ہی نہ ہو۔ لیکن درحقیقت وہ اپنی نوکری کے لیے فکر مند تھا۔

”تو تم نے دوسرا آدمی رکھ لیا؟“ میں نے جیک سے کہا۔

اس نے سر کو اٹھائی جنبش دی۔ کہا کچھ نہیں۔

”میرے لیے کوئی جگہ نہیں تمہارے پاس؟“ میں نے کہا۔

بھوک کا عفریت میرے سامنے منہ کھولے کھڑا تھا۔

اس نے لمحاتی توقف کے بعد جواب دیا۔ ”فی الحال تو نہیں ہے۔ آئی ایم سوری ڈینی!“

اس کے لہجے میں جو ہم دردی تھی، میں اس کے لیے شکر گزاری محسوس کر رہا تھا۔

”جیسے ہی کوئی امکان نکلا، میں تمہیں فون کر دوں گا ڈینی۔“

اس نے کہا۔ ”اگر تم مجھے فون کر دیتے تو...“

”اگر کے ساتھ تو بہت سے جملے بولے جاسکتے ہیں۔ جیک۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں تمہیں فون نہیں کر سکا۔ کچھ یاد کرنے کی فرصت ملتی تو میں تمہیں فون کرنا بھول ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ ہر حال، تمہارا شکر یہ۔“

باہر نکل کر میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ابھی ساڑھے چھ نہیں بجے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نیلی کو کیا بتاؤں گا... اور کیسے بتاؤں گا۔ جب کہ اس نے تو پہلے ہی یہ خدشہ ظاہر کیا تھا۔

میں نے پیدل چلنے کا فیصلہ کیا۔ فاصلہ کم نہیں تھا لیکن جو صورت حال تھی اس میں ایک نکل کی بھی اہمیت ہوتی ہے۔

مجھے تین گھنٹے پیدل چلنا پڑا۔ لیکن مجھے برا نہیں لگا۔ اتنی دیر میں نیلی کا سامنا کرنے سے بچا جو رہا۔

ساڑھے نو بجے میں گھر پہنچا۔ رات خنک ہو گئی تھی۔ لیکن میں پسینے میں بیٹھا ہوا تھا۔ میڑھیاں چڑھنے کے بعد میں ہال وے میں کھڑا رہا۔ دروازہ کھولنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔

نیلی کو کیا بتاؤں گا میں؟

بالآخر میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ بارڈر میں روشنی ہو رہی تھی۔ لیکن پارٹمنٹ میں خاموشی تھی۔ ”نیلی...“ میں نے

اسے پکارا اور اپنی جیکٹ اتار کر الماری میں لٹکانے لگا۔
قدموں کی چاپ ابھری اور ایک مردانہ آواز نے کہا۔ ”یہی ہے وہ۔“

میں نے گھوم کر دیکھا۔ پارلر کے دروازے پر نیلی دھڑوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ زرد اور سٹہا ہوا تھا۔ میں جلدی سے اس کی طرف بڑھا۔ اسی لمحے میں نے دونوں مردوں میں سے ایک کو پہچان لیا۔ وہ ویلفیئر ڈیپارٹمنٹ کا وہ اونیسیٹی کیٹر تھا جسے دو پہر کو میں نے مار بھگا تھا۔

اس کی ناک پر ایک بیڑی تاج چلی ہوئی تھی، ایک آنکھ سوجی ہوئی تھی، اور اس کے پیچھے نیل تھا۔
دوسرا آدمی میری طرف بڑھا۔ اس نے مجھے پولیس کا بیج دکھایا۔ ”تم ڈیٹی فسر ہو؟“ اس نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔
”مسٹر مورگن نے تم پر مار پیٹ اور تشدد کا الزام عائد کیا ہے۔ مجھے تمہیں حراست میں لینا ہے۔“

میرا جسم تن گیا۔ واقعی... اس دن میں نہ جانے اور کیا کچھ ہونا تھا۔ وہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ پھر میں نے نیلی کو دیکھا اور میرے جسم کا سارا تناؤ ایک لمبے ڈور ہو گیا۔ ”میں اپنی بیوی سے چند منٹ بات کر سکتا ہوں؟“

اس نے ایک پل سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا اور پھر سر ہلا دیا۔ ”ضرور۔“ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ”ہم باہر تمہارا انتظار کریں گے۔“ یہ کہہ کر اس نے مورگن کا ہاتھ تھاما اور اسے دھکیلتا ہوا اپارٹمنٹ سے باہر لے گیا۔ دروازہ بند کرنے سے پہلے اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ ”زیادہ دیر نہ لگانا۔ بیٹے۔“

میں نے تشکر آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔
نیلی خاموش کھڑی اپنی نظروں سے میرے چہرے کو ٹھول رہی تھی۔ پھر وہ میری ہانگوں میں ساگی اور میرے کندھے پر سر دکا کر سسکتی لگی۔ ”ڈینی... میرے ڈینی، اب کیا ہوگا؟ اب ہم کیا کریں گے؟“

میں نے نرمی سے اس کے بالوں کو تھپتھپایا۔ ”کیا کہوں، یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ کیا ہوگا، اور ہم کیا کریں گے۔ مجھے تو لگ رہا تھا کہ چاروں دیواریں ہمیں گھیرے میں لیے آگے بڑھی آ رہی ہیں۔ ذرا دیر میں ہم ان کے درمیان گھٹ جائیں گے۔“

”یہ لوگ تمہارے ساتھ کیا کریں گے؟“ نیلی نے پُر تشویش لہجے میں پوچھا۔

میں نے کندھے جھجک دیے۔ ”مجھے نہیں معلوم۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے کوئی پروا بھی نہیں تھی۔ ایک عجیب سی بے حس میرے وجود میں پھیل گئی تھی۔“ شاید مجھ پر کیس بنے گا اور پہلی سماعت تک کے لیے مجھے باکر دیا جائے گا۔“

”لیکن اگر انھوں نے تمہیں حوالات میں بند کر دیا تو؟“ میں نے مسکراتے کی کوشش کی۔ ”ایسا نہیں ہوگا۔“ میں شاید صرف اسے نہیں، خود کو بھی بھلائے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”اسے اتنی اہمیت نہ دو۔ میں بس چند گھنٹوں میں واپس آ جاؤں گا۔“

”لیکن مسٹر مورگن بہت برے آدمی ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ تمہیں جیل میں سزا دیں گے۔“
”وہ ذلیل آدمی، وہ کچھ بھی نہیں جانتا۔ جب میں حقیقت بتاؤں گا تو وہ مجھے چھوڑ دیں گے۔ تم فکر نہ کرو۔“

”میں تمہارے لیے مخصوص ثابت ہو رہی ہوں ڈینی۔ کاش تم واپس ہی نہ آؤ ہوئے۔“
”اگر میں واپس نہ آتا تو اس وقت دنیا کی سب سے بڑی نعمت سے محروم ہوتا۔“ میں نے کہا۔ ”جو کچھ ہو رہا ہے اس میں نہ تمہارا کوئی قصور ہے نہ میرا۔ یہ تو قسمت کی بات ہے، جو اب الجال ہمارا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔“

دروازے پر دستک ہوئی۔
”میں ابھی ایک منٹ میں آیا۔“ میں نے پکارا اور پھر نیلی کی طرف دیکھا۔ ”تمہارے جاؤ اور آرام کرو۔ میں چند گھنٹوں میں واپس آ جاؤں گا۔“

اس نے شک بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”جج آ رہے ہو؟“
”ہاں، تمہیں میری غیر موجودگی کا احساس تک نہیں پائے گا اور میں واپس آ چکا ہوں گا۔“ میں نے الماری میں۔

جیکٹ نکالتے ہوئے کہا۔
میں ان دونوں کے ساتھ باہر سڑک پر آیا تو مورگن فاتحانہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا نا۔“

زہریلے لہجے میں بولا۔
میں خاموش رہا۔
پولیس والا ہمارے درمیان تھا۔ اُس نے اسے جھڑک دیا۔

”سٹاپ مورگن، یہ لڑکا پہلے ہی بہت پریشان ہے۔ تم اسے سناؤ نہیں۔“
میں نے کن آنکھوں سے پولیس والے کو دیکھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ مورگن کو پسند نہیں کرتا ہے۔ آنکھوں سے وہ

”اگر آدمی لگتا تھا۔“
”اس نے دو بلاک کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ میں نے پولیس والے سے پوچھا۔“ عام طور پر اس طرح کے معاملات میں کیا ادا ہے؟“

اس نے میری طرف دیکھا۔ ”ہم پر چا کا ٹیس گئے، اور پھر سماعت ہوئی۔“
”تو سماعت تک تو میں آ زار ہوں گا؟“
”بشرطے کہ تمہارے پاس ضمانت ہو۔“ پولیس والے کے لہجے میں ہم دردی تھی۔

”ضمانت!“ میں اپنی حیرت چھپا نہ سکا۔ ”کتنے کی ضمانت؟“

”500 ڈالر۔“
”اور کیسے پاس اتنی رقم نہ ہو تو؟“
”تم تو سماعت تک جیل میں سڑتے رہ گے۔“ مورگن نے بہت تیزی سے جواب دیا۔

میں چلتے چلتے رُکا اور میں نے پولیس والے کی طرف دیکھا۔ ”لیکن میری بیوی بیمار ہے، اور آج وہ بے چاری کتنے صدموں سے گزری ہے۔ آج ہی تو ہم نے اپنی بیٹی کو دفنایا۔“

اس نے ہم دردی سے مجھے دیکھا۔ ”مجھے افسوس ہے بیٹے۔“ اس نے ہم لہجے میں کہا۔ ”لیکن میں کچھ کر نہیں سکتا۔ ہمارا کام تو تمہیں پولیس اسٹیشن پہنچانا ہے۔“
”لیکن نیلی... میری بیوی... وہ اب کیسی کیسے رہے گی۔ وہ بچی کو یاد کرے گی... اور وہ بیمار بھی ہے۔“

”کیا کر سکتے ہیں۔ تم بس چلتے رہو۔“
میں اس کے ساتھ چلتا رہا۔ میرے ہاتھ پر اس کی گرفت مل رہی تھی۔ میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ کبھی تو پہلی سماعت میں بھی کئی ہفتے لگ جاتے ہیں۔ میں نے مورگن کی طرف دیکھا۔ وہ پولیس والے کے اُس طرف تھا۔ اس کے ہمارے پر لمبائیت اور مسرت تھی۔ مجھے اس پر غصہ آنے لگا۔

میرے حالات بدتر تو تھے ہی، لیکن اس نے انہیں بدترین کے درجے پہنچا دیا تھا۔
میں نے سوچا۔ ”مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ پہلی سماعت تک تو اسے کوئی حوالہ دینا ہے۔“ میں اتنے دن نیلی کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ کچھ نہیں معلوم کہ وہ اس دوران کیا کر بیٹھے، لیکن

”والہ تھا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔“
میں نے سوچا۔ ”مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ پہلی سماعت تک تو اسے کوئی حوالہ دینا ہے۔“ میں اتنے دن نیلی کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ کچھ نہیں معلوم کہ وہ اس دوران کیا کر بیٹھے، لیکن

سکھنے کی روشنی تبدیل ہوئی۔ ہمارے سامنے سے گاڑیاں گزرنے لگیں۔ اسی لمحے دانستہ یا نادانستہ، پولیس والے نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ جبلی طور پر میں نے آگے کی طرف چھلانگ لگادی۔ ایک گاڑی کے بریک چلائے۔ کوئی مجھے گالیاں دے رہا تھا۔ مگر میں تیری طرح سڑک پار کر گیا۔ حیرت ہے کہ میں کسی گاڑی کی لمبیت میں نہیں آیا۔ ”پکڑو... پکڑو... رک جاؤ۔“ مورگن چلا رہا تھا۔ پھر پولیس والے کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ مگر اس وقت تک میں اگلے کار پر پہنچ چکا تھا۔

وہاں پہنچ کر میں رُکا اور میں نے پلٹ کر دیکھا۔ مورگن فٹ پاتھ پر گر رہا ہوا تھا اور پولیس والا تن کر کھڑا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے ہاتھ ہلایا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چمکتی ہوئی دھانی چیز تھی۔ وہ چیخ کر مجھے رُکنے کو کہہ رہا تھا لیکن ہاتھ سے مجھے بھاگ جانے کا اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے جان لیا کہ روئے ارض پر انسانیت کبھی ختم نہیں ہو سکتی!

میں لمبا چکر کاٹ کر اپنے گھر گیا۔ اس سے ملنا، اسے سمجھانا بہت ضروری تھا۔ اس سے کہنا تھا کہ وہ پریشان نہ ہو۔ مگر جب میں وہاں پہنچا تو پولیس کی کشتی گاڑی بلندنگ کے سامنے کھڑی تھی۔

میں نے سڑک پار کی اور مخالف سمت میں چلنے لگا۔ میرے پیٹ میں اچھٹن ہو رہی تھی۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ سوا دس بجے رہے تھے۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ میں نے بھاگ کر حماقت کی۔ اب خود کو پولیس کے حوالے کرنے کے سوا میرے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ یونی بھاگتا رہا تو زندگی اسی طرح بھاگتے ہوئے تمام ہو جائے گی۔ واپس آنا ممکن ہی نہیں رہے گا۔

یہ سوچ کر میں گھر کی طرف پلٹا مگر مجھے یاد آیا کہ میں یہ معلوم کرنے کے بعد بھاگتا تھا کہ ضمانت مجھے حوالات سے بھاگ سکتی ہے۔ میں رک گیا اور سوچنے لگا۔ کہیں نہ کہیں سے مجھے رقم کا بندوبست کرنا ہوگا۔ نیلی کے گھر والے اگر چاہتے ہیں تو میری مدد نہیں کر سکتے تھے۔ اتنی بڑی رقم کا تو ان کے پاس تصور بھی نہیں تھا۔ میرے جاننے والوں میں ایک ہی ایسا شخص تھا، جو یہ رقم دینے کی اہلیت رکھتا تھا۔ اور وہ تقاسام۔

مجھے وہ فننگو یاد آیا جو آخری بار ہمارے درمیان ہوئی تھی۔ میں نے سوچا، بعض اتفاقات ایسے ہوتے ہیں جیسے کسی نے

”کیا کوئی اور بھی ہے مسٹر گورڈن کے ساتھ؟“ میں نے دربان سے پوچھا۔

”تم نے اچھی ترکیب نکالی۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کام شروع کرنے سے پہلے انھیں سکون فراہم کر دیا جائے۔ اس طرح کارکردگی بہتر ہوتی ہے۔“

ان میں بات کرنا ضروری تھا۔ ”اگر میں بھاری جگہ
اسام کو اتنی اطمینانہ بات بھی نہ کرتا۔“ میں نے اس کے
دلوں پر غور رکھتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ ”تم جسمانی
اساتذہ بہت ڈور ہو چکے ہو۔“

میں جانتا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ 23 سال کی عمر اور

چھ سال سے رنگ سے دور... میرے لیے کوئی چانس نہیں تھا۔ ”تو کیا ہو؟ یہ اتنا بڑا آفس ہے تمہارا۔ مجھے یہاں کوئی جاب دے دو۔“

”نہیں، ہرگز نہیں۔“ اس نے صاف انکار کر دیا۔

”میں وعدہ کرتا ہوں کہ آج رات یہاں جو نظارہ دیکھا ہے، اس کے بارے میں ممی کو بھی بتاؤں گا۔“

اس کے چہرے سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ ناک آؤٹ فچ تھا۔ یہی ایک زبان تھی جو دیکھ سکتا تھا۔ میں نے شرافت سے بات کی۔ التجا کی۔ بھیک مانگنے والا انداز اختیار کیا۔ مجھ سے پیش آیا مگر اس دنیا میں آگے بڑھنے کا اپنے لیے راست بنانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ یہ کہ جو چاہیے، ہاتھ بڑھا کر لے لو، نہ ملے تو چھین لو۔ سام کا پناہی بھی طریقہ تھا۔ اور اگر یہ اس کے لیے جائز تھا تو میرے لیے ناجائز کیوں ہوتا۔

”تم اب بھی ویسے ہی ہو ڈینی۔“ اس نے کہا۔ ”جیسے دینا پر لازم ہے کہ تمہاری ہر ضرورت پوری کرے؟“

”نہیں، اب میں وہ نہیں ہوں سام۔“ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ ”جو اس وقت تمہارے سامنے کھڑا ہے یہ ایک نیا ڈینی فشر ہے۔ مجھ پر جو کچھ گزر رہی ہے، اس کے بعد میں بدلے بغیر ہی نہیں سکتا۔ ڈیڑھ سال میں ریلیف پر رہا ہوں۔ صرف اپنا اور متعلقہ لوگوں کا پیٹ بھرنے کے لیے میں تحفہ کیڑوں کی طرح رینگ رینگ کر گیا ہوں۔ آج میں نے ایک ریلیف انوسٹی گیشن پر صرف اس لیے ہاتھ اٹھایا کہ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ اپنی بیٹی کی تدفین کے لیے میرے پاس رقم کہاں سے آئی، اور میں اسے بتانا نہیں چاہتا تھا کہ میرے غریب پڑوسیوں نے میری مدد کی تھی۔ اب وہ انوسٹی گیشن پولیس لے کر گیا۔ میں ان سے جان چھڑا کر بھاگا ہوں۔ بیوی میری بیمار ہے اور اب میرے لیے فکر مند بھی ہوگی۔ اب بتاؤ، اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی آدمی بھلا پہلے جیسا رہ سکتا ہے؟ نہیں سام، اب میں بھی پہلے جیسا۔“

اس نے شاید کچھ میں میری بات کاٹ دی۔ ”اتنا کچھ ڈینی... اتنا کچھ!“

”تم نے سن تو لیا سب۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا اور سرد نظروں سے اسے گھورا۔ ”اب میں کبھی پہلے جیسا نہیں ہوں گا... ہونا چاہوں گا بھی نہیں۔ اب تم بتاؤ، میری مدد کرو گے یا میں تمہاری عظیم الشان سرگرمیوں کے بارے میں ممی کو مطلع کروں۔“

اس کی نظریں جھک گئیں۔ چند لمحے وہ میز کو ٹکٹا رہا۔ اس نے نظریں جھکائے جھکائے کہا۔ ”او کے کڈر نے مجھے کر لیا۔“ اس کے لہجے میں عجیب سی نرمی تھی۔

”میں تمہارا احسان مند ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”زندگی پر موز پر زندگی گزارنے کے، اس دنیا میں جینے کے نئے طریقے مجھے سیکھائے ہیں۔“



میں جیسے ہی اندر داخل ہوا، استقبالی کلرک نے مسکرا ہوئے کہا۔ ”صبح یہ خیر ڈینی۔“ وہ چیوم چار ہی تھی۔ ”با تمہیں یاد کر رہا ہے۔“ میں بھی مسکرایا۔

میں بڑے آفس ہال میں داخل ہوا۔ وہاں سب کاموں میں مصروف تھے۔ میں کارز میں کھڑکی کے ساتھ اپنی ڈیسک کی طرف بڑھا۔ کرسی پر بیٹھ کر میں نے ان کمنڈر باسکٹ میں سلیپے سے رکھے کاغذات کو دیکھا۔ مجھے وہاں بیٹھے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ میں جھٹکا سا نظر آیا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔

”ڈینی... کیٹ نے بات شروع کی۔“ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ ”میں جانتا ہوں بی۔ باس مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔“

اس نے اثبات میں ہلایا۔ ”اور میں یہاں دوڑ رہی۔“

”تو انتظار کر بات کا؟“ وہ زہلے لہجے میں بولا۔ ”نقشیں حروف میں جیسے دعوت نامے کا... کہہ کر وہ چلی اپنی ڈیسک کی طرف چلی گئی۔“

کیٹ کو میں چیخڑنا اور ستا تھا۔ اس کے باوجود وہ اچھی لڑکی تھی۔ نہ تو وہ دنیا کی پہلی سیکریٹری تھی اور نہ آخری اپنے باس کی سواری تھی۔ لیکن ہماری پہلی ملاقات صورت حال میں ہوئی تھی، اس کے تحت میرے لیے اس ناپسندیدگی فطری تھی۔

میں اس رات کو یاد کر کے مسکرایا۔ اس رات کو ساڑھے سال ہو چکے تھے۔ اس کے بعد سے اب تک بہت کچھ ہوا تھا۔ جب عظیم شروع ہو چکی تھی۔ بہت لوگ جنگ برپا تھے۔ میں ایک ایسے جسمانی عیب کی وجہ سے مسترد کر دیا جس سے میں خود بھی بے خبر تھا اور جو پیدائشی تھا۔ میں نے ضروری کاغذات سینئر افسر اٹھ کر اٹھائے۔ اسی

دن کی گھنٹی بجی اور میں نے ریسپور اٹھالیا۔ وہ ٹیلی فون اور لانگ آئی فیلڈ کے وار پلانٹ سے فون کر رہی تھی جہاں وہ کام کرتی تھی۔ ”میں تمہیں لائن ڈری کے بارے میں بتانا بھول گئی تھی ڈیئر۔“ اس نے کہا۔ ”مگر مجھے یاد ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اور سناؤ، تمہاری طرف کیا حال ہے؟“

”بہت گرمی ہے ڈیئر۔ پلانٹ میں ٹمبر پچر 90 درجہ ہے۔“ ”تو چھوڑ دو نا جاب۔ اب اس کی ضرورت بھی نہیں۔ میں ایک شاہک مار رہا ہوں۔“

”اس پر کچھ گفتگو ہوتی رہی ہے۔ اور میرے پاس کرنے کو ہے۔“ پورے دن گھر پر اس کی رہوں تو پاگل ہو جاؤ گی۔ میرے لیے مصروفی ضروری ہے۔“ میں جانتا تھا کہ بحث کا کچھ حاصل نہیں۔ وہ کی موت کے بعد وہ بدل گئی تھی۔ وہ خاموش رہنے کی سبکی آکھوں میں ہمارے کی جگہ گاہٹ بھی کسی قدر ماند پڑ گئی تھی۔ ”رات کا کھانا کھا لیں گے یا باہر؟“ میں نے پوچھا۔

”باہر کھا نہیں گے۔“

”اب کد میں گھر سے تمہیں پک کر لوں گا... چھ بجے۔“ میں نے سام کے دفتر کا دروازہ کھولا تو کیٹ نے میرا منہ پکڑا اور اپنے ناپ پر رائٹر پر جھک گئی۔ میں مسکراتے ہوئے اندرونی دفتر کے دروازے کی طرف بڑھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیٹ کیٹ مجھے پسند کرتی ہے۔

سام نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ ”تو بالآخر تم مجھ تک پہنچنے والے ہو۔“ وہ غریبا۔

مجھے اس کی کچھ ایسی پروا نہیں تھی۔ یہاں کے چند برسوں میں میں نے بہت کچھ کیا تھا۔ اب میری بات کا کچھ وزن کوئی آسان کاروبار نہیں تھا۔ لیکن میرے لیے بہت آسان تھا۔ یہ کچھ سوچوں، کچھ آئیڈیوں پر مشتمل تھا جسے چند آدمی ایسے سمجھ سکتے تھے۔ وہی ان سوچوں اور آئیڈیوں سے کام لے کر کھڑے کر سکتے تھے۔ مجھ جیسے اور سام جیسے لوگ۔ اور یہ سام بھی جانتا تھا۔

”اگر کڈر کالاج نہ ہوتا تو میں آتا ہی نہیں۔“ میں نے اس کے سامنے ٹیبل کر بیٹھے ہوئے کہا۔ ”تم نہیں جانتے کہ تم کتنی مست ہو۔“

اس کا چہرہ دھک اٹھا۔ ایسے میں وہ بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کا دل بہت بڑھ گیا تھا۔ بخوڑی ایک کی جگہ دو نظر

آنے لگی تھیں۔ اب وہ سینٹرل پارک ساؤتھ کے علاقے میں رہنے والا، تین بیٹوں کا باپ تھا۔ تیسرے کا گاڈ فادر تھا۔ ”اور ہاں، ممی نے کہا ہے کہ میں آج رات تمہیں اور ٹیلی کو ڈر پر مدعو کر لوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اب یہ بتاؤ کہ ایسی کیا آفت آگئی؟“

”میں چاہتا ہوں کہ تم سلاٹ مشین کے کچرے کو بھول جاؤ۔“ میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”کیوں بھی؟ میرا تو خیال تھا کہ تم اس پر بری طرح فدا ہو۔“

”میں نے ارادہ بدل دیا۔“ وہ بولا۔ ”ان پراخراجات بہت ہوں گے۔ اور جب وہ خراب ہوں گی تو سب ختم۔ جنگ کی وجہ سے نہ تو ان کے پاس دست یاب ہوں گے، نہ ہی متبادل مشینیں مل سکیں گی۔“

”بس یہی وجہ ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔ ”یا یہ اس لیے ہے کہ میکسی فیلڈز بھی ان میں دل چسپی لے رہا ہے۔“ اس کا چہرہ پھر تھمیا۔ مجھے تو لگا کہ وہ ہائی بلڈ پریشر کا مریض بن گیا ہے۔ وہ عمر کے خطرناک حصے میں تھا۔ ”مجھے میکسی فیلڈز سے کیا۔“ اس نے کہا۔ ”بس مجھے یہ کام اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ کسی ہول کا، نائنٹ کلب کا ٹھیکا میرے لیے زیادہ موزوں ہے۔ مجھے لوگوں میں دل چسپی ہے۔ میں انھیں سمجھتا ہوں، ان کو خوشی فراہم کرنے کے ذرائع تخلیق کر سکتا ہوں۔ لیکن مشینیں میری سمجھ میں نہیں آتیں، نہ ہی مجھ سے دل چسپی ہے۔“

”لیکن میں نے اس سیٹ اپ کے لیے ایک ہفتہ مغز ماری کی ہے۔ اور صرف پندرہ ہزار ڈالر میں یہ نہایت منفعت بخش سرمایہ کاری ہے۔“

”تو یہ میکسی فیلڈز کو مبارک ہو۔ مجھے اس میں کوئی دل چسپی نہیں۔ میں ان جانی فیلڈز میں نہیں گھسنا چاہتا۔ پندرہ ہزار ڈالر کوئی معمولی رقم نہیں۔“

میں آگے کی طرف جھکا۔ میری دانست میں وہ ایک بڑا موقع گنوارا رہا تھا۔ اور یہ پہلا موقع تھا کہ میں اس سے اختلاف کر رہا تھا۔ ”تم بہت اچھا موقع گنوارا ہے ہو سام۔ میں اس پورے سیٹ اپ کا جائزہ لے چکا ہوں سام۔ یہ مشینیں بہت آگے جانے والی چیز ہیں۔ جنگ ختم ہونے کے بعد دیکھنا، گرم کافی سے لے کر آئس کریم تک ہر چیز ان مشینوں سے ہی ملا کرے گی۔“

”ہوتا رہے۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔ یہ طے تھا کہ وہ

فروری 2010ء

سروپ رسونتی سے عمر میں خاصی بڑی تھی۔ اُس کا بیاہ ہو گیا

”ہٹو جی! سب مُنہ دیکھے کی باتیں ہیں۔“ سروپ دا

جب اویناش نہادھوکر کر خوب چٹار ہوکر

ابن حسن عثمان آبادی کے قلم سے

اویناش جب وکالت کی تعلیم پوری کر کے دہلی سے گھر لوٹا

تھا تو قصبے کی پکھری میں اُسے سرکاری وکیل کی نوکری مل گئی تھی۔
تبھی سے اُس کی ماں رجنی کو اُس کے بیاہ کی چتا لگ گئی تھی اور
اس سلسلے میں انھوں نے قصبے کے ایک کھاتے پیتے اور پڑھے
لکھے گھرانے کی لڑکی پاروتی کا انتخاب کر لیا تھا۔

بھرے بھرے گداز جسم کی، گدرائے ہوئے امرود کی سی
سانولی سلونی بھولی بھالی پاروتی اویناش کو بھی بے حد بھائی تھی۔
پاروتی کا اکلوتا بڑا بھائی آکاش میڈیکل کے فائنل ایئر کا
طالب علم تھا۔ سنجیدہ، باوقار اور کم گو سا۔ آکاش، رجنی کو رسونتی
کے لیے بہت اچھا لگا تھا۔ آخر برس دو برس میں رسونتی بھی بیاہ
کے لائق ہونے والی تھی، اور رجنی، سروپ اور اویناش کی طرح
رسونتی کا بیاہ بھی، اپنے سامنے اپنے ہاتھوں سے کر دینے کی
خواہش مند تھی، مگر اُس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

پاروتی کے بہو بن کر گھر آنے کے تین مہینے کے اندر
اندرا نے پتی وشواس تھا کر کے بعد وہ بھی پرلوک ساہارا گئی۔
اُس نے اپنی زندگی میں ہی پاروتی کے لیے رسونتی کے
لیے آکاش کا رشتہ مانگا تھا۔

پاروتی اور اُس کی ماں کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہ تھا
مگر خود آکاش نے بڑے سلیقے سے منع کر دیا تھا۔ وہ اپنی
کلاس فیلو شانی اور برائے کو پسند کرتا تھا۔ وہ پچھلے پانچ سال
سے ایک ساتھ پڑھ رہے تھے، ایک دوسرے سے ملتے ہی
اُن کے من میں برائی جو لونچل پھوٹی تھی، اب وہ ایک چھتتا
رورخت بن چکی تھی۔

رجنی مرتے سے رسونتی کا ہاتھ پاروتی کے ہاتھ میں دے
گئی تھی۔ سروپ تو سپہ سالار پور میں بیٹا تھا۔ یہاں رسونتی کے سر
پر تو صرف پاروتی ہی تھی۔

پاروتی اچھے دل کی نیک عورت تھی۔ اسے رسونتی سے بہنوں
جیسا پیار تھا۔ اپنی سُرگ باسی ساس کی خواہش کے پیش نظر، اُس
کے دل میں بھی رسونتی کو اپنے لاکھوں میں ایک بھائی کی دوشن
بنانے کی آرزو تھی۔ وہ اسی کوشش میں لگی تھی کہ کسی طرح اپنے بھائی
آکاش کو اس رشتے پر راضی کر لے، مگر آکاش تو صرف اور صرف
شانی اور برائے کو اپنا بیٹا سمجھتا تھا۔

سے کا پچھی مخصوص رفتار سے اپنی اڑان بھرتا رہا۔ دیکھتے
ہی دیکھتے چار برس بیت گئے۔

ان چار برس میں خاصا کچھ بدل گیا تھا۔ کام والی بوڑھی
گنگا بائی کے انتقال کے بعد رسونتی نے رسونتی سنبھال لی تھی۔
پاروتی ایک کے بعد ایک چار بیٹوں کی ماں بن گئی تھی۔ ہر رات

پتی کا بستر گرم کرتے اور سال کے سال بچے جتنے، دیکھتے
دیکھتے اُس کا جو بن ڈھل گیا تھا۔ تباہ و بدن ڈھیلا پڑ گیا تھا
نازک کمر پھیل کر کمر ہو گئی تھی۔ کو لھے بھاری اور پیٹ نکل
تھا۔ چہرے اور گردن پر بھی خوب گوشت چڑھ آیا تھا، اب
رُس سے بھری، نو عمر چھوڑی کی بجائے ایک پنی عمر کی تھکی
عورت لگنے لگی تھی۔

اب رات کو اُن کے کمرے میں چار پانی کی گرم
چرچاہٹ، تیز سانوں اور وہی سرگوشیوں کے بجائے سنا
اور خراٹوں کی صدائیں گونجتیں، یا پھر بیٹیوں میں سے ک
رونے اور ٹھکنے کی آواز سنانی دیتی۔

”اویناش!“ اویناش کی بے زار تنبیہ اب بھرتی اور پار
تھکن سے بھرپور ڈوبی تھی۔ کو سنانے میں جُت جاتی...
اب بھی اویناش صبح سویرے نہاد ہو کر خوب تیار
پکھری کے لیے نکلتا تو وہ رسونتی کے کھڑکی سے اُسے
جاتی۔ اُس میں ذرہ بھر فرق نہ آیا تھا۔ وہ آج بھی پہلے کی
سندر اور چھبلا لگتا۔ وہ اُس کے لیے اور کلائیوں کے سیاہ
بالوں کو دھبتی تو جانے کیوں اُس کے دل میں میٹھی
کسمساہٹ جاگتی۔ اب وہ چودہ پندرہ برس کی دہلی
چھوڑ کر نہیں رہی تھی، بل کہ اٹھارہ اٹیس برس کی بھرپور
کمر میں ڈوبی نوخیز اور دل آویز حسینہ بن چکی تھی۔

اویناش اب بھی اپنی سابقہ روش پر برقرار تھا۔ وہ اس
کبھی اُس کی طرف نظر بھر کر نہ دیکھتا تھا۔ وہ گھر میں
سارا وقت پٹنگ کی طرح اُس کے آس پاس منڈلاتی رہتی
اُسے، اس کی موجودی کی خبر تک نہ ہوتی۔

”آئے ہائے، پارو! یہ تو نے اپنی کیا حالت بنا رکھی،
برسوں بعد پاروتی کی موسیٰ اجیر سے آئی تو اُس سے
کے گھر بھی آئی اور پاروتی کی حالت دیکھ کر حیرت زدہ رہا،
”بس کیا تاؤں موسیٰ، اوپر تلے کی چار بیٹیاں پیدا
پالنا کوئی آسان ہے؟“ پاروتی نے الٹا سوال کیا۔

”تو یہ رسونتی کس مرض کی دوا ہے۔ اپنی کچھ فٹے
تو اُس کے سر لگا۔“ موسیٰ نے پھولوں سے بھری شاخ کی
لچکتی رسونتی کی طرف ناپسندیدگی سے دیکھا۔

”ہائے نہیں موسیٰ! گھر کا سارا کام تو وہی سنبھالتی
اب میں بچیوں کا بوجھ بھی اس پر ڈال دوں!“ پاروتی

پیار سے دیکھ کر ممتا بھرے لہجے میں بولی۔
”اس چھوڑی کے چھن کچھ ٹھیک نہیں لگتے۔“

اُسے شک بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پاروتی کے کان میں سرگوشی کی۔

”اے نوج موی!“ پاروتی نے بُرا مانتے ہوئے کہا، ”رسوتی تو بچپن سے ہی اس گھر میں پلی بڑھی ہے۔“

”مگر پارو!“ موی نے رسوتی کی آنکھوں سے جھانکتی بھانوائوں کو بھانپ لیا تھا ”ایسی چھوری کہ جس کی جوانی منہ سے بولتی ہو... جوان بچی کے ہوتے گھر میں رہے تو...“

”ارے موی! اویناش تو اُسے سرپ دیدی سان چھوٹی بہن مانتے ہیں“ پاروتی نے بھرپور اعتبار سے کہا۔

”ماننے سے کیا ہوتا ہے...“ موی ہتھیار ڈالنے کو تیار تھی ”رشتہ تو نہیں ہے نا؟“

”رشتہ ہی تو بنانے کے جتن لگی ہیں۔“ پاروتی دھیمی آواز میں مکر کر بولی۔ ”ہماری ساسو ماں کی اچھا سگی کہ رسوتی کا بیہ آکاش بھیتا سے ہو جائے۔ ماں کو بھی رسوتی پسند ہے، مگر آکاش بھیتا ذرا آنا کافی کر رہے ہیں۔“

”اچھا!“ موی کو اب قدرے اطمینان ہوا۔ ”ایسا ہے تو برا نہیں۔ دیکھنے میں بھی اچھی ہے اور کام کاج میں بھی خوب بھرتی ہے۔“

”اور دل کی بھی بہت اچھی ہے۔“ پاروتی نے زور رسوتی کے دروازے سے ٹیک لگائے کھڑی رسوتی کی طرف متا بھری نظروں سے دیکھا۔ ”تجی آکاش بھیتا کے ساتھ تو اُس کی چاند سورج کی جوڑی لگے گی۔“

”سو تو ہے۔“ موی نے تصور میں مسکرا دی۔

ساتھ ساتھ رکھ کر سوچا اور خود بھی مسکرا دی۔

”اب کے راگھی باندھنے میکے جاؤں گی، تو بھیتا سے دو ٹوک بات کروں گی۔“ پاروتی نے نہ عزم لےجے میں کہا اور چھٹکی کو گود میں بھر کر دوڑھ پلانے لگی۔

وہ بھتی کا دن تھا۔ اویناش اپنے بستر پر نیم دراز، وکالت کی ایک موٹی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اُس کی سہری کے قریب ہی زمین پر بیٹھی چھٹکی ریں ریں کیے جا رہی تھی۔

”پاروتی! اے! دیکھو بھی...“ اُس نے عاجز آ کر پتی کو آواز دی۔ ”یہ کیا مانگ رہی ہے؟“

”پانی مانگ رہی ہے۔“ پاروتی گود والی کی کلوت بدل رہی تھی۔ اُس نے رسوتی سے کہا، ”ہے رسوتی، ذرا چھٹکی کو پانی پلاوے بہنا۔“

اُس نے رسوتی سے بیتی بھرے لہجے میں کہا، اور رسوتی جھٹ بانی کا کٹورہ بھر چھٹکی کے پاس جا پہنچی۔

چھٹکی ماں کے بجائے اُسے سامنے پا کر چڑ گئی اور پانی سے بھر اکٹور اُسی پر لٹو دیا۔

”تو گھر گھرے کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی گلے سے لے کر پیسا۔“

”ہائے رام!“ رسوتی نے گھبرائے ہوئے انداز میں پٹری کھینچ کر الگ کی، اُس کی وائل کی باریک قیص سینے سے پیٹ تک چپک کر رہ گئی تھی۔ اُس کی ”ہائے رام“ پر اچانک ہی اویناش نے اُس کی جانب دیکھا تھا۔

پھر تو جیسے وہ نظریں پھٹا ہی بھول گیا تھا۔ رسوتی کو اپنے روم میں مچھتی اُس کی نظریں بڑی بھلی لگ رہی تھیں۔ برسوں بعد آج تو یہ شہ گھڑی آئی تھی کہ اُس نے اپنی ذات کے حصار سے نکل کر اُس کی طرف نظر بھر کر دیکھا تھا۔

بچا کچھا پانی نکل جائے، وہاں پانی ہوتا تو کھتا، مٹا تو لے بیجان جاگا، ایسی پھل اٹھی کہ اویناش کی آنکھوں میں اترنے لگا۔ اُس نے شک ہوتے ہوئے پریزبان بھیری اور بڑی مشکل سے نظریں دوبارہ کتاب پر مرکوز لیں۔

”بڑی ضدن ہو گئی ہے یہ بھی۔“ پاروتی نے قریب آ کر چھٹکی کے گال پر پٹاخ چھٹکایا تھا۔

”ہائے کیا کر رہی ہو دیدی!“ رسوتی نے لہجے میں گھول کر کہا، اور جلدی سے چھٹکی کو گود میں بھر لیا اور مٹتی ہوئی با کو چل دی۔ وہ جانتی تھی کہ اویناش اُسے کتاب کی اوٹ جاتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔

چنگاری سلگ اٹھی تھی، وہ بڑی ہوش باری سے چنگار کو پودا دیے جاتی۔ اویناش کے سامنے وہ بھی آچل ڈھلکا کر کبھی کمر سے دامن کھسکا کر کمر کھانے لگتی۔ اُس کے بدن قیامت خیز گداز اور کمر کا نازک سحر انگیز خم اویناش کو دبا بنا دیتا۔ اُس کا خود پر قابو رکھنا مشکل ہو جاتا۔

لاوا پک چکا تھا۔ کسی بھی لمحے جولا بھی پھٹنے کے لیے کل تھا۔ اویناش راغب تھا تو رسوتی من سے ملتقت تھی ملن کی وہ گھڑی جانے رفتی مجبوریوں کی اوٹ میں چھپی تھی آہی نہ چھٹی تھی۔

پاروتی کے گھر میں موجود ہوتے ملن کی فکر ممکن تھا؟ پاروتی تو جیسے گھر سے نکلتا ہی نہیں جاتی تھی۔

اُس کے شروع کے دنوں میں وہ اکثر میکے جایا کرتی تھی۔ اُس کی اہلیاں پھری جاتے ہوئے اُس کی ماں کے کونڈوں پر ہاتھ لگاتیں۔ پاروتی کا بھائی آکاش کاج سے لوٹنے کے لیے اپنے ساتھ لیے جاتا۔ لیکن اب چار چھوٹی چھوٹی بہنیں دروازہ دیکے جان ممکن نہ تھا۔ ساس کے مرنے کے بعد اُس کی ذمہ داری بھی اُسی پر پڑی تھی، اُس لیے بہنوں بیت جاتے اور وہ میکے جانے کا نام تک نہ لیتی۔

رکھنا بندھن کے تھوہار پر پاروتی، بھائی کو اٹھایا باندھنے کے لیے والی تھی۔ پہلے تو پاروتی نے رسوتی کو اپنے ساتھ ہی لانے کی ٹھانی تھی، پھر اُسے خیال آیا تھا کہ آج وہ اویناش کے ساتھ، رسوتی کے بیہ کی بات کرنے والی ہے، اُس لیے ساتھ لے جانا مناسب نہیں۔ چنانچہ اُس نے اکیلے ہی کھانا کھاتے ہوئے سامان دھو کر اٹھاتے دوپہر آگئی تھی، تب کہیں جا کر وہ کام والے چھوٹے رامو کے آگے پہنچے۔ اُس کے جاتے ہی اویناش نے سارے جہاں کی پیاس اُس میں سیٹ کر رسوتی کی طرف دیکھا۔

”ہائے رام، بڑی گرمی ہے۔“ رسوتی نے چڑیا کھینچ ہاتھ لگائی طرح جھلتا شروع کیا۔ اُس کے نوخیز گداز کی پھل اویناش کو پودا نہ کر گئی۔ اُس نے آن کی آن میں گداز کر کے اُس کی آنکھوں میں پانی ڈال دیا۔

”ہاہا کر درو بجا کھلا ہے۔“ رسوتی نے کسمسا کر خڑے سے اُسے دھکیل دیا۔ وہ بستر پر جا نکلا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر اُس کی نازک کلائی تھامی۔ اُس کی نبض تیز چل رہی تھی۔

”بلکلے سے جھٹکے سے اُسے اپنے قریب، بستر پر گر لیا۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اویناش کی آنکھیں ابھری تھیں۔ نشہ سارا اُٹا آیا تھا۔

اُس کی سندھ پینے کی طرح اُس کی پلکوں میں سامتا جا رہا تھا۔ اُس کی مٹھی سکندھ کی طرح اُس کی سانوں میں بستا جا رہا تھا۔ اُس کی مٹھی میں شامل ہو کر تن من میں اترتا جا رہا تھا۔ اُس کے اپنے من میں پھل چاتے ہزاروں آن جانے، اُس کے جواب مل رہے تھے۔

دو دنوں دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے میں ڈوبے تھے۔ ڈوب کر ابھر رہے تھے، ابھر کر ڈوب رہے تھے۔

اُس کی دوسری دروازہ کھول کر پاروتی کا بھائی، ڈاکٹر

آکاش کمرے میں داخل ہوا۔ گھٹنے بھر پہلے جب وہ اسپتال سے نکلنے لگا تھا تو اُس نے اپنے گھر فون کر کے پاروتی کا پوچھا تھا۔ تب اُس کی ماں نے بتایا تھا کہ پاروتی اب تک میکے نہیں گئی۔ تو اُس نے سوچا کہ پاروتی کو کساتھ لیتا ہوا کھر چلا جائے گا۔ سو وہ پاروتی کو لینے یہاں چلا آیا تھا۔

باہر کا دروازہ بند تھا، مگر کنڈی نہیں لگی تھی۔ ہاتھ لگاتے ہی کواڑ کھلتے چلے گئے تھے اور وہ سیدھا اندر چلا آیا۔ سامنے کے کمرے کے بھڑے ہوئے کواڑ کھول کر جوں ہی وہ اندر داخل ہوا تو سامنے ہی اویناش اور رسوتی ایک دوسرے میں ڈوبے ہوئے نظر آ گئے۔

لحمہ بھر بھر کر اٹھ گئی، لمحے وہ واپسی کے لیے پلٹ گیا۔ اویناش رسوتی کو دھکیلا اٹھ کھڑا ہوا۔

جذبات کا طوفان اتر چکا تھا، مگر اویناش آنے والے طوفان کے خوف سے لرزہ بر اندام تھا۔ شام کو اُسے پاروتی کو لینے جانا تھا۔ سے بیٹنے کے ساتھ ہی وہاں سے بلاوے پر بلاوا آرہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا، کس منہ سے جائے؟ آکاش سے سامنا کرنے کی اُس میں ہمت نہ تھی، مگر جانا تو تھا۔ حالات کا سامنا کرنا تو تھا۔

نہا دھو کر بٹیرا ہو کر وہ سسرال کے لیے روانہ ہوا، اور ڈرتے ڈرتے قدموں سے گھر میں داخل ہوا۔

تب ہی پاروتی، خوشی سے تہمتائے چہرے کے ساتھ اُس کی جانب لپکی تھی۔

”بڈھائی ہوئی! آکاش بھیتا نے رسوتی کے ساتھ بیہا کے لیے ہال کر دی۔“ پاروتی نے مسرت سے لبریز لہجے میں بتاتے ہوئے اُس کے حیرت سے کھلمنہ میں لڈ ڈھوندا۔

اویناش نے بے یقین نظروں سے آکاش کی طرف دیکھا۔ مگر آکاش اُس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اُس کی محبت لٹائی نگاہیں اپنی جیتی بہن کے خوشی سے دھکتے چہرے پر ٹپکی ہوئی تھیں اور ایک ہاتھ سے وہ، دوسرے ہاتھ پر بندھی راگھی کو سہلا رہا تھا، جو کچھ دیکر پہلے اُس کی لاڈلی بہن پاروتی نے باندھی تھی۔

بہن کی خوشیوں کی رکھشا کے اُس بندھن میں بندھنا، وہ پاروتی کی سندھ سے بھری مانگ، بندی سے سامتا تھا اور کالج کی چوڑیوں سے بھری سہاگن کلائیوں کو پورے یقین سے دیکھ رہا تھا۔

شاہ نظر

یکاور

مغلیہ سلطان تھوڑے آخر عرصہ قریب مایوس کروا، بہادر شاہ ظفر کو ”نظر“ کا ماحول
اولاد ہونے اور اولاد کو مدد دینے کا احساس اس کا اندازہ کچھ اُسے پہنچتا تھا

بہر حال دنیا شطرنج کی ایک بساط کے مانند ہے جس پر وقت اپنی
شاہانہ چال چلتا رہتا ہے۔ کبھی دنیا کو ہٹا نا اور کبھی ہٹتے کو زلا
دینا۔ کسی کو موت کے منہ سے نکال کر زندگی کی طرف لے جانا تو
کبھی زندگی سے بھرپور ہستی کو موت کی گہری نیند سلا دینا۔ وقت
کا یہ کھیل ازل سے جاری ہے اور اب تک جاری رہے گا۔

وقت کبھی نہیں ٹھکتا، کبھی نہیں رکتا۔ نہ ہی وقت کو
مضیوں میں جکڑا جاسکتا ہے۔ وقت کی چال میں کبھی
یکسانیت نہیں ہوتی۔ کبھی اس کے مزاج میں طوفان کی سی
تیزی آجاتی ہے اور کبھی وہ دبے پاؤں اس طرح گزر جاتا
ہے کہ کسی کو پتا ہی نہیں چلتا۔ وقت ہمیشہ جاگتا رہتا ہے
وقت کو نیند کبھی نہیں آتی۔

وقت کو اپنے تیور بدلنے ذرا دیر بھی نہیں لگتی، اس کی محض
ایک جنبش، چشم زدن میں دنیا بھر میں ان گنت اچھے برے
واقعات اور خوف ناک حادثات کو جنم دیتی ہے۔ وقت کی
کرٹیں کبھی تھک کر دم لینا نہیں جانتیں۔ اس کی ہر کرٹ سے
جنم لینے والے واقعات اور حادثات تاریخ کے صفحات پر درج
ہو جاتے ہیں۔ وقت کی طرح تاریخ بھی کبھی نہیں ٹھکتی۔ اس
کے صفحات بھی وقت کے پیدا کردہ اچھے برے واقعات کو
اپنے اندر سمیٹتے ہی رہتے ہیں۔

وقت اور تاریخ کی یہ کارستانیاں اس وقت تک جاری رہیں گی
جب تک یہ دنیا قائم و دائم ہے۔ وقت نے تاریخ کے صفحات پر بے
شمار داستانیں رقم کر رکھی ہیں۔ ان داستانوں کو نکلینے بنانے کے
لیے کہیں ان پر خون کے چھینٹے ڈالے گئے تو کبھی محبت کے رنگ
بکھیرے گئے۔ وقت کی یہ ادا بھی بڑی عجیب ہے۔

اب سے تقریباً پونے دو صدی قبل دہلی کی سرزمین پر شاہی
مخلات کی اونچی اونچی دیواروں کے درمیان میں جب دہلی دہلی
آوازوں میں ایک کینز کا ذکر ہونا شروع ہوا تھا تو اس وقت بھی
وقت کی چال یہی تھی۔

ایسے ہی کوئی پونے دو سو سال قبل 1857ء سے بھی ہیں

برس پہلے وقت نے ایک ایسی کرٹ بدلی کہ زمانہ رنگ رہ گیا۔
دہلی کی ایک چھوٹی سی سرائے کے دروازے پر لٹکا ہوا شاہ
کا بوسیدہ سا پردہ ہٹا کر وقت اچانک ہی اندر داخل ہوا تھا۔ شاہ
کسی کی بھرپور جوانی کو دیکھنے کے اشتیاق میں... کسی کی خوب صورت
آنکھوں کے اشاروں کا مفہوم سمجھنے!

سرائے کے ایک نیم تاریک چھوٹے سے کمرے میں
عقل و دانش کا ایک مجسمہ گم نامی کی حالت میں بڑا تھا لیکن اب
دنوں سے اس کے چہرے کی بازگشت شاہی محل کی دیواروں میں
شانی دینے لگی تھی۔ شاید یہ بات درست ہے کہ جہاں آنکھوں
اشارے وقت کی چال میں بھی غیر آہستہ پیدا کر دیتے ہیں۔
دہلی کے ایک پس ماندہ علاقے کی اس معمولی سی سرائے
کے سامنے جب شاہی پاکلی آکر رُک کر تو یوں لگتا تھا کہ یہ
زمانہ ہی اس سرائے کے دروازے پر آکر ٹھہر گیا ہو اور وقت
کرٹیں جیسے سانس لینے کے لیے سستانے لگی ہوں۔

وہ شاہی پاکلی خالی تھی۔ اس میں کوئی شاہی سوا
نہیں تھی۔ لیکن اس کے ہاتھ شاہی محافظ اور چوب
موجود تھے۔ خالی پاکلی کو چوب سرائے کے دروازے
سامنے رکھ دیا گیا تو محافظوں نے اس کا حکم کے لیے چو
داری طرف دیکھا۔

اس سرائے کے ایک کمرے میں کبھی اوجیز عمر عورت ٹھہ
ہوئی تھی... ایک عام سی معمولی عورت جس کے ساتھ ایک
اور بے حد حسین لڑکی بھی تھی۔ حسن کا یہ مرقع اس کی بیٹی
آسان پر چمکتے ہوئے ستاروں کی شرم اس نوجوان دو شہ
آنکھوں میں کھر کرنے کے لیے تڑپ رہی تھی اور سورج کی
پھیلنے سے پہلے چلتے ہوئے پھولوں کی تازگی اس کے جسم کی
جلد کے پاس آتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔

سرائے کے باہر کھڑے ہوئے لوگ حیرت بھری نظر
سے شاہی پاکلی اور شاہی محافظوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان
سے کسی کی بھی ہمت نہیں تھی کہ وہ شاہی محافظوں سے

پوچھے۔ شاہی چوب دار نے لوگوں کی بڑھتی ہوئی بھیڑ پر ایک نظر ڈالی اور پھر ہاتھ کے اشارے سے انھیں دُور ہٹ جانے کا اشارہ کرتا ہوا اپنی دھبی اور بارعب چال سے سرائے کے دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔ اندر داخل ہونے کے بعد وہ اس چھوٹے سے کمرے کے باہر ٹک گیا جس پر ٹاٹ کا ایک میلا کچلا پردہ لٹک رہا تھا۔ آہٹ پا کر کمرے میں مقیم ادیب و عمر عورت نے اپنا سر باہر نکالا تو چوب دار نے کہا۔

”خاتون... بادشاہ سلامت کے وزیر محبوب علی خاں نے آپ کے لیے پاکی بھیجی ہے۔ انھوں نے آپ کو اپنی بیٹی کے ہم راہ یا دفر مایا ہے۔“

ادیب و عمر عورت کا نام نو بہار بیگم تھا۔ جس قبیلے کی عورتیں مردوں کو پچھاننے اور انھیں بے وقوف بنانے میں ماہر ہوتی ہیں، نو بہار بیگم کا تعلق بھی عورتوں کے اسی قبیلے سے تھا۔ وہ لاہور کی ایک مشہور طوائف رقصہ اور مغنیہ تھی۔ نو بہار بیگم کی جوانی اور اس کی سُریلی آواز کا جادو پورے لاہور اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں ایک عرصے تک سرچڑھ کر بولتا رہا تھا۔ لیکن وقت کی رفتار بھی ایک جیسی نہیں ہوتی۔ وقت کروٹیں بدلتا رہا یہاں تک کہ نو بہار بیگم کے خُسن اور آواز کا سورج دھیرے دھیرے ڈھلنے لگا۔ تعریفی جملے اور واہ واہ کے ڈونگے دھیرے دھیرے خالی ہوتے گئے۔ وقت نے خُسن اور آواز کے سارے طلسم کو توڑ ڈالے اور نو بہار بیگم کے عروج کو زوال آگیا۔

جہاں دیدہ اور وقت شناس نو بہار بیگم بہت پہلے سے یہ بات جانتی تھی کہ ہر عروج کو زوال ہے۔ گھر کو روٹی دینے والا چراغ اسی وقت تک جل سکتا ہے جس وقت تک اس میں تیل باقی رہے۔ اور اسی حقیقت کے پُوش نظر اپنے کو ٹھے کی روٹی اور روٹی برقرار رکھنے کے لیے اس نے ایک نئے چراغ کا انتظام پہلے سے کر رکھا تھا۔ اُس کے اس نئے چراغ کا نام تھا۔ ماہ نور!

نو بہار بیگم نے اپنی بیٹی کی پرورش پر بھرپور توجہ دی تھی۔ اس نے ماہ نور کو اپنے فن کے دُمرے میں آنے والے تمام تر ہنر سکھا کر گویا کِل کانٹے سے پوری طرح لیس کر دیا تھا۔ نو بہار بیگم نے ماہ نور کی تعلیم و تربیت کے علاوہ اس کی جوانی کو سجانے سُوَرنے کے لیے بھی اپنی تمام تر صلاحیتوں سے کام لیا تھا۔ اپنے لہجے کی مٹھاس اور اپنی آواز کے جادو کو اس نے ماہ نور کو منتقل کرنے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔ اپنے پیروں میں

بندھے ہوئے گھنگھروں کی جھکارد وہ اسے پہلے ہی سوئپ چکی تھی۔ یہی نہیں اس نے ماہ نور کو تعلیم کے زور سے بھی آراستہ کر دیا تھا۔ چنانچہ اب وہ رقص و موسیقی کے فن میں طاق ہونے کے ساتھ ساتھ عربی فارسی اور دینی تعلیم سے بھی آراستہ تھی۔ ایک مولوی صاحب پورے سات برس تک ماہ نور کو مذہبی تعلیم دینے کے لیے آتے رہے تھے۔

اپنی بیٹی کی قابلیت جہاں دیدہ نو بہار بیگم اس کے بچپن میں ہی بھانپ گئی تھی۔ اسی لیے ضروری تعلیم دلوانے کے ساتھ ساتھ اس نے ماہ نور کو اپنے پیشے کے اسرار و رموز سے بھی خوب اچھی طرح رُو شناس کر دیا تھا۔ سارے ناز و نغمے ساری ادائیں اور چتر اس نے گویا گھول کر ماہ نور کو پیلا دیے تھے۔ اسے سماج میں ہر کر زندگی گزارنے کے طور طریقے بھی سکھائے تھے اور مذہب کی گہرائی اور اس کی حدود سے بھی خوب اچھی طرح واقف کر رکھا تھا۔

... اور وہی ماہ نور...! اس کی اکلوتی وارث اس وقت اس کے ساتھ دہلی کے اس چھوٹی سی سرائے میں مقیم تھی جس کے دروازے پر اُن ماں بیٹی کو لے جانے کے لیے شاہی پاکی موجود تھی۔

شاہی محل کے اندر جس وقت ماہ نور کے خُسن و جوانی کے چرچے دہلی دینی آوازوں میں ہو رہے تھے تو اس وقت ہندوستان کے تخت پر مغلیہ سلطنت کا آخری تاج دار بہادر شاہ ظفر براجمان تھا۔ شاہی محل کی دیواروں میں ہونے والی ماہ نور کی قابلیت اور حاضر جوانی نے تہذیبوں کی بازگشت اس نے بھی سنی تھی۔ اسی وجہ سے ایک دن بہادر شاہ ظفر نے اپنے وزیر محبوب علی خاں کو حکم دیا کہ ان ماں بیٹی کو ملے کے رُوبہ زور پیش کیا جائے۔ بادشاہ سلامت کے اس حکم کے بعد بیٹی دہلی کے اکر معمولی سرائے کے دروازے پر شاہی پاکی پہنچی۔

نو بہار بیگم کو بھی اپنے پیشے کی تربیت و رشتے میں ملی تھی۔ اپنے حلقے کی بہت اونچی طوائف تھی۔

اُس نے پاکی لانے والے چوب دار کی بات سنی اور بل بل میں ہی اس کا جواب سوچ لیا۔ اس نے چوب دار سے کہا۔ ہماری طرف سے وزیر محبوب علی خاں کی خدمت میں سلام پیش کیجیے گا اور ان کی خدمت میں یہ عرض کیجیے گا کہ نو بہار بیگم آج ہی لاہور جانے کی تیاری کر رہی ہے۔ جب وہ واپس آئے گی تو فوراً ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائے گی۔“

دراصل نو بہار بیگم اصل معاملہ بھانپ گئی تھی۔ وہ وزیر محبوب

اس کے پاس جانا نہیں چاہتی تھی۔ اور اسی وجہ سے اس نے کہا تھا۔

چوب دار نو بہار بیگم کا جواب سُن کر تھوڑی دیر تک تو روٹا رہا۔ پھر روٹ گیا۔ نو بہار بیگم دروازے پر کڑی نگاہ ڈالی۔ وہ دیکھتی رہی پھر پلٹ کر اپنے کمرے میں گئی۔ ”بیٹی! میں نے انھیں لے لیے لی لاہور جانے کا بہانہ کیا تھا۔ لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ اب ہمارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ ہمیں جلد سے جلد اس سے ہٹا جانا چاہیے۔“

”کیوں ماں...؟“ ماہ نور نے حیرت سے پوچھا۔ ”ہمیں اس سے کیوں اور جلد ہی ضرورت کیا ہے؟“

”ضرورت ہے بیٹی۔“ نو بہار بیگم نے کہا۔ ”اس سے تمام بادشاہ اور وزیروں کے چنگل میں پھنس جائیں گے۔ اہل جانا ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہو سکا تو کمرے کی اور تمھاری دکان پر ہاد ہو جائے گی اور ہمیں یہاں دکان اور غلام بن کر رہنا ہوگا۔“

”لیکن ہمارا قصور کیا ہے ماں...؟“ ماہ نور نے کہا۔ ”کیوں اُمی اور غلام بن کر رہنا ہوگا۔ آخر بادشاہ سلامت کے لیے یہاں سلوک کیوں کریں گے؟“

”جواب مت کرو۔ تم نہیں جانتیں کہ آزادی کی بات ہے۔“ نو بہار نے ماہ نور کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”اے بیٹی! ہم اگر یہاں غلام بن کر رہ گئے تو پھر ہمیں آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع نہیں ملے گا۔“

”اُمی! اور واپس جانا ہوگا۔ وہاں اور کچھ نہیں تو کم سے کم اسے تو رہے کیوں گے۔“

”ماہ نور! لاہور واپس جانے کی بات ذرا بھی پسند نہیں کرتی۔ وہاں میں ہی رہنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی بات کو دہرایا۔ ”ماں! لاہور میں ہم بہت سال رہ چکے ہیں۔“

”اس کا شہر ہے۔ مجھے تو یہاں رہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“

”بیٹی! تم ابھی بچی ہو...“ نو بہار بیگم نے کہا۔ ”ان وزیروں کی باتوں کی ہنس میں خوب پہچانتی ہوں۔“

لیکن جب سارا سامان باندھ لیا گیا اور ایک گاڑی والے سے لاہور جانے کے لیے بات بھی طے ہو گئی تو اس کے تھوڑی ہی دیر بعد وہی شاہی چوب دار اپنے ساتھ پانچ سپاہیوں کو لے کر پہنچ گیا اور نو بہار بیگم سے بولا۔ ”فنی الحال آپ لاہور نہیں جاسکتیں آپ کو ہمیں رہنا ہوگا۔ وزیر محبوب علی خاں کا یہی حکم ہے۔“

”لیکن ہمارا تو سارا سامان بھی بندھ گیا ہے...“ نو بہار بیگم نے چوب دار سے کہا۔ ”اور میں نے سرائے کے مالک سے بھی کہہ دیا ہے۔“

”اس کی آپ کو فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے...“ شاہی چوب دار نے کہا۔ ”وزیر صاحب نے بادشاہ سلامت کو یہ بتا دیا ہے کہ آپ کی بیٹی علم کی دولت سے مالا ہے۔ بادشاہ سلامت اس کی قابلیت کا سُن کر بہت متاثر ہوئے ہیں اور خود اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے مجھے دوسری بار آپ لوگوں کو لینے کے لیے آنا پڑا ہے۔“

”لیکن ہم تو...“ نو بہار بیگم نے پس پیش کرنے کے لیے مٹھ کھولا ہی تھا کہ شاہی چوب دار درمیان میں ہی بول پڑا۔ ”وزیر محبوب علی خاں کی معرفت یہ بادشاہ سلامت کا حکم ہے اور بادشاہ سلامت کے حکم کی نافرمانی جرم ہے۔ آپ کو میرے ساتھ چلنا ہی پڑے گا۔“

بادشاہ سلامت کی حکم عدولی نو بہار بیگم کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ حکم سنتے ہی اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ لیکن ماہ نور اپنی تعریف سن کر دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی اور اسے اپنے آپ پر فخر محسوس ہونے لگا تھا۔ اس کی خوشی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسے شاہی محل اور شاہی دربار کو دیکھنے کی بڑی تمنا تھی۔ آج تک وہ بھی شہر کی گلی کے اندر نہیں گئی تھی۔ آج تک نہ تو اس نے کسی وزیر کو دیکھا تھا اور نہ ہی بادشاہ سلامت کو۔ البتہ اس نے بادشاہوں کے جاہ و جلال اور شان و شوکت کے قصے بہت سنے تھے اور ان کے بارے میں کتابوں میں پڑھا بھی تھا۔

نو بہار بیگم نے چوب دار اور سپاہیوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن چوب دار نے اس کی ایک نہ سنی۔ اتنے میں شاہی پاکی بھی وہاں آ گئی۔ نو بہار بیگم کے پاس اب کوئی چارہ نہیں تھا! اس لیے مجبوراً اسے اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر شاہی پاکی میں سوار ہونا پڑا۔

پاکی میں بیٹھے بیٹھے ماہ نور دہلی شہر کی گلیاں اور راستوں کو دیکھتی رہی۔ طرح طرح کے چھوٹے بڑے مکانات اسے

نظر آتے رہے۔ کہیں کہیں تو ٹوٹے پھوٹے، چھوٹے چھوٹے مکانات تھے اور کہیں کہیں بڑی بڑی شان دار جویلوں کو وہ گھور گھور دیکھتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد وزیر محبوب علی خاں کی شان دار حویلی بھی آ پہنچی۔ پاکی کو کندھوں پر اٹھائے چاروں کبار ڈیوڑھی سے گزرتے ہوئے پاکی کو اندر تک لے آئے۔

دونوں ماں بیٹی پاکی سے باہر نکلیں تو انھیں بڑے عزت و احترام سے حویلی کے اندر لے جایا گیا۔ دیوان خانے کی سخاوت اور چمک دمک دیکھ کر ماہ نور کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ سوچنے لگی کہ جب ایک وزیر کی حویلی اور اس کا دیوان خانہ اس قدر شان دار ہے تو بادشاہ سلامت کے محل اور شاہی دربار کی شان و شوکت کیسی ہوگی؟ لیکن اس کی سوچ کا سلسلہ جلد ہی ٹوٹ گیا کیوں کہ ایک دروازے سے وزیر محبوب علی خاں دیوان خانے کے اندر داخل ہو رہا تھا۔ ماہ نور نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور اپنے گلابی ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ سجا کر محبوب علی خاں کو جھک کر آداب کیا۔

محبوب علی خاں نے بھرپور نظروں سے ماہ نور کو دیکھا اور سلام کے جواب میں دھیرے سے اپنی گردن ہلا دی۔ لیکن اس کی آنکھیں کو ماہ نور کے چہرے پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ وزیر اربعہ محبوب علی خاں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے فارسی کے مشہور شاعر حافظ کے ایک شعر کا مصرعہ پڑھا۔ اس مصرعے میں حسن کی تفسیر بیان کی گئی تھی۔ ماہ نور کے حسن کی تعریف کے لیے شاید محبوب علی خاں کو کوئی الفاظ نہیں ملے تھے اور اسی لیے اس کے منہ سے بے اختیار حافظ کا یہ مصرعہ نکل گیا تھا جسے سن کر ماہ نور کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ محبوب علی خاں کا اشارہ اسی کی طرف ہے۔

ماہ نور حافظ کا وہ مصرعہ سن کر مسکراتی رہی۔ پھر اچانک شرم سے اس کی پلٹیں جھک گئیں۔ حافظ کی جس غزل کا وہ مصرعہ تھا وہ پوری غزل ماہ نور کو زبانی یاد تھی۔ آخر وہ دوبارہ بیگم جیسے حجبے کا بار اور جہاں دیدہ طوائف کے سامنے میں اور اس کی خاص نگرانی میں جوان ہوئی تھی۔ جس نے ایسی عورت کی ناہموں میں سانس لی ہو وہ گئی گزری لڑکی تو ہو ہی نہیں سکتی۔ اس نے بڑی خود اعتمادی اور جرأت کے ساتھ اس ادھورے شعر کا دوسرا مصرعہ سنا کر شعر مکمل کر دیا۔ اس کے بعد اُس نے اسی غزل کا دوسرا شعر پڑھا جو محبوب علی خاں کے اس مصرعے کا جواب تھا۔ شعر کا ایک ایک لفظ ماہ نور

کی زبان سے اس طرح ادا ہو رہا تھا جیسے پھول کی نازک نازک پتھریوں پر سے شبنم کی ننھی ننھی بوندیں پگھلتی ہیں۔

محبوب علی خاں کی آنکھوں میں ایک چمک کی لہرائی اور اس کے چہرے پر لبو کی سرخی دوڑ گئی۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس نے منہ سے ماشاء اللہ بھان اللہ اور واہ وا کے الفاظ نکل پڑے۔

پھر اچانک ہی اس نے خدمت گاروں کو حکم دیا کہ سازندوں کے پاس میں لگتی آسانی سے آکر بیٹھ گئی تھی۔ ماہ نور نے دھیرے دھیرے چپک چپک اپنے منہ سے یہ حکم دینے کے بعد اس نے ماہ نور کی جانہ سے ہاتھ بڑھا کر اس مالا کو اٹھا کر چوم لیا۔ محبوب علی خاں دیکھ کر کہا۔ ”ماہ نور تم نے ایک شعر سنا میری پیاس بہت دیر اور تک تو اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”بہت خوب ماہ نور! مجھے دی ہے۔ کلام کی ادا نیکی کا ہنر بھی تمھیں خوب آتا ہے۔“

”اب اللہ ہو گیا ہے کہ بادشاہ سلامت کے سامنے ہم دونوں ہی لیے تم سازندوں کی سنگت میں مجھے یہ غزل سناؤ۔“ یوں سمجھ کر وہ منہ سے بولے۔

”انشاء اللہ آپ کے وعدے کی آبرورہی ہے۔“ ماہ نور نے دھیرے دھیرے جواب دیا اور پھر سازندوں کے درمیان بیٹھ کر اس کی موسیقی کے دلکش سُر میں اپنی سحر انگیز آواز شامل کر دی۔

”ساز اور آواز کے سنگم میں ماحول پر ایک عجیب سی نشاۃ الثانیہ طاری کر دی۔ محبوب علی خاں کو زندگی میں کی بار ساز اور آواز کے جادو کا تجربہ ہو رہا تھا۔ ماہ نور کے ہونٹوں سے ادا ہونے والا فارسی کلام جیسے محبوب علی خاں کے دل کی ترازو ہوا جا رہا تھا اور وہ یہ سوچنے لگا تھا۔

”ماہ نور کو قیامت تک محفوظ کر لینے کی کوئی ترکیب ڈھونڈ چاہیے۔ کیوں کہ اگر یہ آواز بھی موت کی ابدی نیند سو گئی تو اس کے ساتھ ساتھ زندگی کی مٹھاس کی بھی موت ہو جائے۔“

کچھ دیر باری اور خدمت گار جو اس وقت آس پاس کھڑے تھے وہ سب یہ منظر دیکھ کر حیران رہ گئے کیوں کہ اس مالا کی طرف دیکھا۔ محبوب علی خاں ان آنکھوں کا اشارہ سمجھ گیا۔ تاریخی حقیقت وابت بھی اور یہ سب لوگ اس حقیقت سے اتارا اور ماہ نور کے آگے رکھ دیا۔

”ماہ نور جہاں پناہ کے علم میں یہ بات آئی ہے کہ عربی اور فارسی زبانوں پر تمھیں عبور حاصل ہے تمھیں شعر و شاعری اور ادب سے بھی کافی لگاؤ ہے اور دنیا کے دیگر تمام موضوعات پر بھی تمھارا مطالعہ بہت گہرا ہے۔ ادب اور شاعری پر جہاں پناہ کا مطالعہ بھی بے حد وسیع ہے کیوں کہ جہاں پناہ خود بھی شاعر ہیں۔“

”جی ہاں میں جانتی ہوں۔“ محبوب علی خاں ذرا رکا تو ماہ نور نے دھیمے لہجے میں ادب سے کہا۔ ”اس ناچیز کو معلوم ہے کہ جہاں پناہ بہت عظیم شاعر ہیں۔ اس ناچیز اور کم عقل ماہ نور کو جہاں پناہ کی غزلیں اور شاعریاں یاد ہیں۔“

”بہت خوب۔۔۔“ محبوب علی خاں نے کہا۔ ”تب تو تمھیں یہ بات بھی معلوم ہوگی کہ مذہبی علما بڑے بڑے پندتوں۔۔۔ ادیبوں شاعروں اور دانشوروں کو دربار میں بحث و مباحثہ کے لیے بلاتا جہاں پناہ کا شوق ہے اور وہ دل سے ایسی تمام عظیم شخصیات کی قدر کرتے ہیں؟“

”جی ہاں مجھے یہ بات بھی معلوم ہے۔“ ماہ نور نے گردن جھکا کر جواب دیا۔ ”اور میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھ رہی ہوں کہ میں ایک بادشاہ کے روپ میں ایک عظیم شاعر اور بے حد ادب نواز شخص کے سامنے کھڑی ہوں۔ اور یہ جہاں پناہ کی ذرہ نوازی ہے ورنہ میں اس قابل نہیں ہوتی۔“

”جہاں پناہ کے علم میں یہ بات بھی آئی ہے کہ تمھیں مذہبی معاملات میں بھی بڑی سوجھ بوجھ ہے۔ کیا یہ بات غلط ہے؟“ محبوب علی خاں نے پوچھا تو ماہ نور ایک ہل کے لیے سچا گئی لیکن دوسرے ہی ہل اس نے اپنا سر جھکا دیا اور دھیمی سی آواز میں بولی۔ ”ناچیز میں اتنی بڑی بڑی خوبیاں نہیں ہیں۔ لیکن جو تھوڑی بہت سمجھ بوجھ ہے وہ ساری قدرت کی دین ہے۔ اور بادشاہ سلامت کی نوازش ہے جو مجھے کی قابل سمجھتے ہیں ورنہ میں تو ایک بہت ہی معمولی لڑکی ہوں۔“

ماہ نور کی خوبیوں خامیوں اور اس کی صلاحیتوں کو پرکھنے کے لیے بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے بھرے دربار میں ایک ایسی بات کہہ دی جس کی سچائی کو تسلیم کرنے کے لیے ماہ نور تیار نہیں تھی۔ اس پر دونوں جانب سے بحث کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بادشاہ سلامت نے اپنی بات کے حق میں دلائل دیے اور ماہ نور نے اس کے خلاف اپنی دلیلیں پیش کیں۔ دربار میں موجود تمام علمائے دین و ذرا اور دیگر معزز حضرات ماہ نور کے منہ سے نکلنے والے ایک ایک لفظ کو اپنے علم کے ترازو میں تول رہے تھے۔ انھیں حیرت ہو رہی تھی کہ ایک کم عمر لڑکی میں قدرت نے یہ کیسی

کچھ بوجھ کوٹ کوٹ کر بھری ہے؟ انھوں نے ذرا دیر میں ہی سمجھ لیا کہ ماہ نور کے دلائل میں کافی وزن ہے۔ خود بادشاہ بہادر شاہ ظفر بھی ماہ نور کی بے خوبی نہمت اور خود اعتمادی پر دل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا۔ لیکن اپنی شکست کے باوجود بادشاہ سلامت کو اس بات کی خوشی ہو رہی تھی کہ اسے ایک مدت کے بعد ایک ایسا گویہر نایاب ہاتھ لگا ہے جس پر جتنا بھی فخر کیا جائے وہ کم ہے۔ آخر میں بادشاہ سلامت کا اشارہ پا کر وزیر محبوب علی خاں نے اٹھ کر کہا۔ ”ماہ نور تم نے حاضرین دربار کے دل جیت لیے ہیں۔ جہاں پناہ بھی تمھاری سوچ ہو پناہ ڈور اندیش اور تمھاری قابلیت پر خوش ہیں اور تمھاری صلاحیتوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ ان کی یہ خواہش ہے کہ تم جیسے گویہر نایاب کو شاہی ملکیت میں شامل ہونا چاہیے اور شاہی محل کا فخر ہونا چاہیے۔“

”تاج دار ہندوستان ہم ناچیز تو آپ کی رعایا ہیں...“ ماہ نور نے اپنی رعایا کیلئے اٹھ کر ایک نظر بادشاہ سلامت کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا کر آگے بولی۔ ”رعایا ہونے کے ناتے میں اور میری ماں دونوں ہی آپ کی ملکیت ہیں۔ ہم تو شاہی محل کی کینڑوں اور باندیوں کی طرح ہیں جن سے اپنی خواہش کا اظہار نہیں کیا جاتا، بلکہ انھیں حکم دیا جاتا ہے عالم پناہ!“

”لیکن ہم تمھیں شاہی محل کی ایک ادنیٰ کینڑ بنا کر تمھاری حق تلفی اور تمھارے رتبے کی توہین کرنا نہیں چاہتے...“ بہادر شاہ ظفر نے کہا۔ ”بلکہ ہم تمھیں اپنا دوست اپنا ہمدر اور اپنا صلاح کار بنا کر محل میں رکھنا چاہتے ہیں... تاکہ امور سلطنت چلانے میں تم ہمیں مفید مشورے دیتی رہو ہمیں ٹیک و بد سے آگاہ کرتی رہو۔“

”جہاں پناہ! یہ ناچیز اپنے آپ کو اس عظیم منصب کے قابل تو نہیں سمجھتی لیکن میری یہ کوشش ہوئی کہ آپ کے معیار اور نگاہ انتخاب پر پورا اتر سکوں۔“

نوبہار بیگم نے نہیں چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی اور وہ شاہی محل کی چار دیواری کے اندر اپنی زندگی کے دن گزاریں۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی بیٹی بھی اس کی طرح آزاد اور اعلیٰ فضاؤں میں سانس لے۔ وہ ماہ نور کا جواب سن کر خوش نہیں ہوئی اسی لیے اپنی جگہ سے ایک قدم آگے بڑھ کر موڈ باند لہجے میں بولی۔ ”جہاں پناہ“

”آپ ہمارے اُن داتا ہیں ہمارے مالک ہیں اور یہ درست بھی ہے کہ ہم آپ کی رعایا ہیں۔ لیکن میں ایک ماں ہوں اور ماہ نور میری اکلوتی بیٹی ہے۔ میں نے مصیبتوں کے بڑے بڑے

بوجھ اپنے سر پر رکھ کر اس کی پرورش کی ہے پال پوس کر کر قابل بنانے کی پوری کوشش کی ہے کہ سماج میں اسے ایک عزت دار اور اعلیٰ مقام ملے۔ اسی لیے میں نے اسے اچھی سے اچھی تعلیم دلائی۔ میں ماں ہوں جہاں پناہ... میرے دل میں بہت ارمان ہیں اور اب تو میں اپنی بیٹی کا گھر آ پاد کھینچا جاتی ہوں بس یہی میری آخری خواہش ہے۔“

بہار بیگم کی بات سن کر وزیر محبوب علی خاں نے بادشاہ سلامت کی طرف دیکھا اور پھر نوبہار بیگم سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”خاتون اس میں آپ کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں پناہ آپ کی بیٹی کی شادی آپ کی پسند اور آپ کی اجازت سے خود کرائیں گے اور جہاں پناہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ آپ اور آپ کی بیٹی محل میں ہی رہیں تاکہ ماہ نور جہاں پناہ کے علی وادائی ذوق میں معاون و مددگار ثابت ہو سکے۔“

محبوب علی خاں کی یہ بات سن کر نوبہار بیگم زیادہ صبر نہ کر سکی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ یہ سمجھتی تھی کہ ماہ نور بھی محل میں ہی رہنا چاہتی ہے اور یہی سوچ کہ وہ یہ سمجھتی تھی۔

اس کے بعد نوبہار بیگم کو دس ہزار روپے کی ایک رقم ملی اور ہر ماہ دوسروں کے وظیفہ بھی مقرر کر دیا گیا۔ لالہ ظفر اندر ہی ان کے رہنے کا انتظام کر دیا گیا۔ نوبہار بیگم کو اب وہ شکایت نہیں تھی اور ماہ نور بھی بہت خوش تھی۔ اسے ہر روز بادشاہ سلامت کے سامنے سلامی کے لیے حاضر ہونا پڑتا تھا۔ کبھی کبھی جب بادشاہ سلامت کو ماہ نور کے ساتھ موضوع پر بات کرنے کا موقع مل جاتا تو بحث سلسلہ دریں چلتا رہتا۔ کبھی نوبہار شاہ ظفر اسے اپنی کو تازہ غزل اور اشعار وغیرہ بھی سن کر اس کے بوجھ لیتا اور کبھی بھی تو فرمائش کر کے ترنم سے ماہ نور کی حرا آئیز آواز میں اپنی غزل بھی سناتا تھا۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے بہادر شاہ ظفر کو نہ جانے کیا سوچی اس نے ماہ نور سے کہہ دیا۔ ”اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے نور کہ تم بے شک نور کا ایک جسم ہو لیکن ہمیں تمھارا یہ نام پسند نہیں ہے۔“

”یہ بھی آپ کی ذرہ نوازی ہے جہاں پناہ!“ ماہ نور مسکرا کر کہا۔

”ہم کوئی الگ تھلگ نام چاہتے ہیں تمھارا...“ بہادر شاہ ظفر نے کہا۔ ”اس لیے تم ہی بتاؤ تمھارا کیا نام رکھا جائے؟“

”یہ تو جہاں پناہ کی نظر کرم پر منحصر ہے...“ ماہ نور نے ادھر

نوبہار بیگم نے جب اس نوجوان کو دیکھا اور اس سے باتیں کر کے اس کی شخصیت اور اس کی شرافت سے بہت متاثر ہوئے تو ان پر روزگار تھا۔ نوجوان اور خوب صورت تھا اور اس کی رائی ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ نوبہار بیگم نے علی خاں کی پسند اور اس کی کوششوں کی تعریف کی اور

اہل مرد کے موڑے استعمال کرنے کا طریقہ

ابوسعید سجادہ کا کہنا ہے کہ اہل مرد میں سے کچھ لوگ موڑے پہننے کے موسم میں چھ ماہ موڑے پہننے میں اور کسی وقت بھی موڑے نہیں اتارتے۔ وہ تین ماہ تک بوجھوں کے بل چلتے ہیں اور باقی تین ماہ اپنی ایزوں کے بل چلتے ہیں۔ چھ ماہ پہننے کے باوجود ان کے موڑے ایسے لگتے ہیں کہ گویا انھوں نے صرف تین ماہ پہنے ہیں۔ بچوں اور ایزوں کے بل چلتے ہیں وہ یہ ہے کہ انھیں ڈر ہوتا ہے کہ کہیں موڑوں کے تلے گھس نہ جائیں۔ ظاہر بات ہے کہ پورا قدم لگانے کی صورت میں موڑے گھس جائیں گے۔ اس طرح وہ اپنے جسم کو اذیت دے کر موڑوں کی عمر بڑھاتے ہیں۔

کتاب: ”بخیلوں کے نوکے واقعات“ از: ابوحنان مردین

بحر الجاحظ ترجمہ: عبدالرزاق نقادون مصطفیٰ ارباب

نن کر زندگی کی سب سے بڑی اور سچی خوشی پائی۔

ماہ نور کی شادی کے کچھ عرصے بعد ہی نوبہار بیگم بیمار بیماریا رہنے لگی تھی۔ اُس کے سر سے بیٹی کی شادی کا بھاری بوجھ اتر گیا تھا جس کے لیے اس نے خدا کی شکر گزار تھی اور بہادر شاہ ظفر کے احسانوں کے بدلے اسے دعائیں بھی دیتی رہتی۔ لیکن وہ زیادہ دنوں تک اپنی بیٹی کی خوشیاں نہ دیکھ سکی اور ہمیشہ کے لیے دنیا سے رخصت ہو گئی۔

گرچہ ماہ نور عرف شاہ ظفر شاہی دربار کے ایک اعلیٰ عہدے دار کی بیگم بن چکی تھی لیکن اس کے باوجود وہ خود کو بادشاہ سلامت کی کینڑی ہی سمجھتی تھی۔ بہادر شاہ ظفر اب بھی اس کی پہلے کی طرح عزت کرتا تھا۔ ایک دن بہادر شاہ ظفر نے مذاق کے ترنگ میں آ کر شاہ ظفر کو پچھڑنے کے لیے یوں ہی کہہ دیا۔ ”شاہ ظفر ہمارا خیال ہے کہ ایک بڑے عہدے دار کی بیگم بننے کے بعد تم کچھ مغرور ہو گئی ہو لیکن تمھیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تم اب بھی ہماری کینڑ ہو۔“

یہ بات سن کر شاہ ظفر فوراً ہی اس بات کی تہہ تک پہنچ گئی اور اسے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ بادشاہ سلامت آج اس سے آقا اور غلام کے موضوع پر بحث کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے بڑے ادب و احترام سے کہا۔ ”آپ نے باطل درست فرمایا

ہے جہاں پناہ! لیکن اگر گستاخی معاف ہو تو میں کچھ عرض کرنا چاہوں گی۔

”کچھ کہنے کے لیے تمہیں ہم سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے... بہادر شاہ ظفر نے کہا۔“ تمہیں جو کہنا ہے کہہ سکتی ہو۔ ہمیں یقین ہے تمہاری طرف سے کوئی گستاخی ہو ہی نہیں سکتی۔“

”جہاں پناہ! آپ تو مذہب اور مذہب کے تمام قاعدے قوانین سے واقف ہیں... شاہ ظفر نے کہا۔“ آج جس طرح کی کنینیں دایاں اور غلام عام گھرانوں میں موجود ہوتے ہیں اسے اگر مذہب اور مذہبی قانون کی نظر سے دیکھا جائے تو انھیں کنیز غلام یا داسی نہیں کہا جاسکتا۔ وہ ملازم کہلاتے ہیں۔ کیوں کہ یہ لوگ جنگ میں پکڑے ہوئے جنگی قیدی نہیں ہوتے۔ جب جنگ چھڑ جائے اور اس جنگ کے نتیجے میں شکست خوردہ مردوں اور عورتوں کو گرفتار کر کے انھیں جنگی قیدیوں کی حیثیت دے دی جاتی ہے تو یہی مرد اور عورتیں دایاں اور غلام بن سکتے ہیں۔ اس لیے آپ کی یہ ادنیٰ کنیز حقیقت میں آپ کی کنیز اور داسی نہیں بلکہ آپ کی ملازمہ ہے۔ اور ایک ملازمہ کی حیثیت سے ہی میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں کیوں کہ اپنے مالک کا حکم ماننا اور خدمت کرنا ایک ملازمہ کا فرض ہے۔ مجھے آپ نے کسی جنگ میں پکڑ کر قیدی نہیں بنایا ہے اور نہ ہی میں آپ کی زرخیز غلام یا داسی ہوں۔“ یہ سخت بات بہت ہی میٹھے اور دھیمے لہجے میں کہہ کر شاہ ظفر نے اپنا سر جھکا لیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر چپ چاپ اسی جگہ کھڑی رہی۔ بادشاہ بہادر شاہ ظفر کافی دیر تک غلطی باندھ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ مگر شاہ ظفر نے اپنی گردن نہیں اٹھائی۔ اس کے دونوں ہاتھ ابھی تک معافی کے انداز میں اس کے سینے پر جڑے ہوئے تھے۔

اس کی طرف دیکھتے دیکھتے اچانک ہی بہادر شاہ ظفر کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھرائی۔ اس کی نگاہیں اب بھی شاہ ظفر کے جھکے ہوئے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اصل میں وہ چاہتا تھا کہ شاہ ظفر اپنی جگہ ہوئی گردن اٹھا کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے دیکھے۔ لیکن شاہ ظفر تو سر جھکائے ہی کھڑی رہی۔ اس نے تو اپنی پلکیں بھی نہیں اٹھائی تھیں مگر تھوڑی دیر بعد اس کے بند ہونٹوں میں لڑش ہوئی اور پھر اس کی کپکپاتی ہوئی مدھر آواز بہادر شاہ ظفر کی سماعت سے ٹکرائی۔ ”جہاں پناہ! آپ کے رو بہ رو میں نے جس

طرح کے گستاخانہ الفاظ کہے ہیں ان کی وجہ سے مجھ میں اتنی ہمت اور طاقت نہیں رہی کہ میں اپنا سر بھی خود سے سکوں۔ آپ کے پاکیزہ اور شفقت بھرے ہاتھ میرا اٹھائیں گے بھی میری جگہ ہوئی نظر اوپر اٹھے گی۔“

بہادر شاہ ظفر کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔ ذرا بعد وہ اپنے تخت پر سے اٹھا اور اپنے ہاتھ میں رومال تھا۔ دھیرے دھیرے شاہ ظفر کی جانب بڑھنے لگا۔ قریب قریب اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے شاہ ظفر کی ٹھٹھائی جھکی ہوئی گردن ذرا اوپر تو اٹھائی مگر شاہ ظفر کی پلکیں بند نہ ہوئیں۔ اس کی آنکھیں بند تھیں مگر آنکھوں کے کناروں پر آنسوؤں کے دھوئی ٹھیرے ہوئے تھے۔ بہادر شاہ ظفر نے اپنی انگلی سے ٹھیرے پر آنسوؤں کے قطرے کو گرنے سے پہلے ہی تھام لیا اور اپنے رومال میں جذب کر لیا۔

ہمدردی قدردانی، محبت، غلوس اور پدرانہ شفقت کے انداز نے شاہ ظفر کو اس قدر حیران کر دیا کہ اس کے منہ سے لفظ بھی نہیں نکلا۔ وہ تشکر کے اظہار میں بے اختیار اپنی سلامت کے قدموں میں جھکتی چلی گئی۔ بہادر شاہ ظفر کی شفقت بھر ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔

دن اپنی رفتار سے گزرتے رہے۔ اندھیرا اور اجالا دوسرے کے پیچھے بھاگتے رہے۔ وقت اپنے حساب کروٹیں بدل رہا تھا۔ اور ہر ایک ایسی کروٹ اس نے بندر دہلی شہر میں یہ افواہیں گردش کرنے لگیں کہ پورے شہر میں پھوٹ پڑا ہے۔ انگریزی حکومت کے مخالف ہندو سپاہیوں اور ہندوستانی عوام کا بول۔ حالات روز بروز خراب خراب تر ہوتے جا رہے تھے۔ انگریزوں کے لیے پورے ہندوستان میں نفرت پیدا ہو گئی تھی۔

اسی خطرناک ماحول میں شاہ ظفر نے ایک نئی کونجمن دلی صحت مند اور بالکل ٹھیک تھا کہ تھی لیکن شاہ ظفر کی طبیعت تھی۔ حکیم اور ویداس کا علاج کر رہے تھے مگر وہ روز بروز زور ہوئی جا رہی تھی۔ کوئی دوا اور کوئی دوا کام نہیں آ رہی دوسری طرف ہر جانب افراتفری مچی ہوئی تھی۔ قتل عام ہو گیا تھا۔ بہادر شاہ ظفر کی بادشاہت کو بھی خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ حالات روز بروز گھبرہ ہوتے جا رہے تھے۔

لال قلعے کے ایک کمرے میں شاہ ظفر اپنے بستر پر

اس کی ہاری میں کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔

دہلی کے حالات خراب رہے۔ پھر اس کے لیے مدد مانگنی۔ انگریز فوجیوں کے آجانے سے اس کا ہوا تھا اس لیے ان کے قتل عام کا سلسلہ کم ہوا۔ پھر چالاک انگریزوں نے دھیرے دھیرے اپنی اس اضافہ کرنا شروع کر دیا اور ایک دن انھوں نے شاہی محل کے چند پر قبضہ بھی کر لیا۔

اس کے بعد حالت یہ ہو گئی کہ ہندوستان کے آخری تاج اور شاہ ظفر کو بھی اپنی جان بچانے کے لیے دہلی سے فرار شاہی بیگمات اور شہزادوں کے ساتھ بہادر شاہ ظفر کو لال قلعے میں جاکر چھپنا پڑا۔ ایک مردہ بادشاہ کی پتی کی قبر کی گہرائی میں لیٹا تھا وہ لوگوں کو پناہ دینے کے لیے کمر بستہ تھا!

اس کے مقبرے میں آکر چھپنے سے پہلے بہادر شاہ ظفر وفادار ساتھیوں نے اسے لکھنؤ لے جانے کی کوشش کی۔ لیکن اس وقت انگریز اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے تھے۔ لیکن ساتھیوں نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ ان غداروں نے وہ انگریزوں سے ملے ہوئے تھے یہ کہہ کر بادشاہ کو روک لیا کہ آپ اگر لکھنؤ چلے گئے تو اس کے تخت پر انگریز قابض ہو جائیں گے اور ہندوستان ایک بار پھر غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دی جائے گی۔

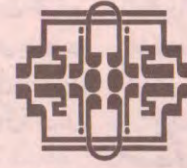
بہادر شاہ ظفر اپنے وفادار ساتھیوں کی بات مان لیتا اس کی زندگی کا انجام کچھ مختلف ہوتا۔ اس کے مقبرے میں بہادر شاہ ظفر اور اس کے خاندان کی اطلاع بھی انہی غداروں نے انگریزوں کو دی تھی۔ اسے لکھنؤ جانے نہیں دیا تھا۔ انگریز چاہتے تھے کہ بہادر شاہ ظفر کو جلد سے جلد گرفتار کر لیا جائے تاکہ وفاداروں کے جو سسلے پست ہو جائیں اور جنگ آزادی ہو جائے۔ اور ہوا بھی یہی۔ ہمایوں کے مقبرے میں انہی کی اطلاع ملنے ہی انگریزوں نے رات کی گہرائیوں کے مقبرے کو گھیرے میں لیا اور بہادر شاہ ظفر اور شہزادوں سمیت گرفتار کر لیا گیا۔ اپنا قیدی لال قلعے میں بھی گھس آیا تھا۔ جب وہ لیبرے شاہ ظفر کے کمرے میں داخل ہوئے تو شاہ ظفر کے خاندان نے انھیں روکنے کی کوشش کی لیکن وہ کئی لوگ تھے جنھوں نے فوراً ہی ایک اکیلے آدمی کو دبوچ لیا اور اس سے روپے پیسے سونا چاندی اور

یاد و مددگاری کے عالم میں مجبوری، مفلسی اور بے بسی کی زندگی گزارتی تھی۔ بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی زندگی کے آخری ایام اس جیسے نیک دل، شریف انفس، خداترس اور پرہیزگار بادشاہ کے شایان شان ہرگز نہیں تھے۔ اس کی بے بسی کا اس سے بڑا حوالہ اور کیا ہوگا کہ اس کی موت کے بعد انگریزوں نے آخری تاج دار ہند کو ہند کی مٹی میں دفن کرنے کی بھی اجازت نہیں دی۔

ادھر لال قلعے کے ایک کمرے میں شاہ ظفر اپنے بہ دستور پیار پڑی تھی۔ اس کی حالت ایسی تھی کہ اس سے اٹھنا بھی نہیں جاتا تھا۔ اسی بیماری کی حالت میں اسے بہادر شاہ ظفر کے بارے میں کچھ اڑتی اڑتی خبریں مل جاتی تھیں۔ جان بچانے کے لیے بہادر شاہ کا محل سے فرار ہمایوں کے مقبرے میں روپوشی پھر وہیں سے اس کی گرفتاری اس کے بعد مقدمات اور پھر جلاوطنی... یہ ساری خبریں اس نے بستر پر لیٹے لیٹے ہی سنی تھیں اور ظاہر ہے ان تکلیف دہ خبروں نے اس کی بیماری پر کوئی اچھا اثر نہیں ڈالا تھا۔ یہ سارے صد مات برداشت کرنا اس کے لیے آسان نہیں تھا۔

وقت نے ایسی کروٹ لی تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے سرسبز دھرتی ریگستان میں تبدیل ہو گئی۔ کوئی کسی کو پوچھنے والا بھی نہ رہا۔ شاہ ظفر کا خاندان ہی تن تنہا دن رات اس کی تیمارداری کرتا۔ اپنی بیوی اور اپنی بچی کی دیکھ بھال کے لیے وہ اکیلا ہی بچا تھا۔ مجبوری یہ تھی کہ اس افراتفری میں اپنی جان کے خوف سے محل کے نوکر چاکر دایاں اور کنینیں سب کے سب بھاگ چکے تھے۔ لال قلعے میں شاہ ظفر اس کے خاندان اور ان کی بچی کی برائی اور کوئی چوتھا شخص نہیں تھا۔ شاہ ظفر اور اس کے خاندان نے اپنے آپ کو اللہ کے اور قسمت کے بھروسے پر چھوڑ رکھا تھا۔ اور اس انتظار میں تھے کہ دیکھیں مصائب کی اس تاریکی میں اُمید کی کوئی کرن کب نمودار ہوتی ہے!

یہ بلوا یہ لڑائی یہ خون ریزی اور یہ جنگ سب سیاسی جالیں ہی تھیں۔ لیکن لوٹ مار کرنے والوں اور پیشور چور ڈاکوؤں کو تو ایسے موقعوں کا انتظار ہی رہتا ہے۔ اس بار بھی لیبروں نے موقع کا فائدہ اٹھایا اور انھوں نے شہر بھر میں خوب لوٹ مار کی۔ لیبروں کا ایک گروہ مال و دولت کی لالچ میں خالی پڑے ہوئے لال قلعے میں بھی گھس آیا تھا۔ جب وہ لیبرے شاہ ظفر کے کمرے میں داخل ہوئے تو شاہ ظفر کے خاندان نے انھیں روکنے کی کوشش کی لیکن وہ کئی لوگ تھے جنھوں نے فوراً ہی ایک اکیلے آدمی کو دبوچ لیا اور اس سے روپے پیسے سونا چاندی اور



سنچ رنگہ کا سچ سے مقبول سلسلہ
بابر زمانہ، ایک سنی گویہ، سزور خوجا دے کا فسانہ زندگ
وہ تحریر یہ جو جب کا انتظار کیا جاتا ہے

شہر گیا کے ہونہار کے بابر زماں خاں نے بدمت کے سالانہ میلے میں ایک بوڑھے شخص کے ساتھ حُسن و جمال میں ایک تاویگاندہ و لڑکی دیکھی تھی۔ اُس پری پیکری صورت بابر کی آنکھوں میں نقش ہو گئی۔ تعاقب کرتے کرتے وہ اُن کی کنیا تک پہنچ گیا۔ لڑکی کا نام کورا بوڑھے بھٹو کا اُنھیں۔ رفتہ رفتہ کورا اور بابر ایسے گھل مل گئے جیسے اُن میں کبھی کوئی دُوری ہی نہ تھی۔ اُنھیں بھی بابر سے خاصا مانوس ہو گیا کورا کا آں جہانی باپ بخت کے جاگ قیلے کا سردار تھا۔ باپ کی موت کے بعد بچپانے سرداری غصب کر لی۔ وہ کورا کو راستے سے ہٹا جاتا تھا کہ کورا کا اتالیق جہاں دیدہ عالم اُنھیں خود کو داو پر لگا کر اُسے قتل سے نکال لایا۔ قیلے کے کچھ خفیہ نقشے اور مہترک دستاویزیں بھی ساتھ لے آیا تھا۔ چچا کے آدمی ہر طرف کورا کو تلاش کر رہے تھے۔ کورا سے زیادہ اُنھیں مہترک دستاویزوں کی جستجو بھی موقع ملتا بدھ گیا کا رُخ کرتا۔ ایک روز وہ باصرار اُنھیں اور کورا کو اپنے گھر لے آیا۔ بابر کے والد صفر زماں خاں کا شہر کے شرعاً میں ہوتا تھا۔ ایک پُر اکھر تھا۔ اماں باپ، بابر کے علاوہ دو چھوٹے بھائی، اکبر، جہاں کیر، چار چھوٹی بہنیں، ہمیدہ، فرخ، فریال اور فارہ بہ۔ بھی تھے ان دو بہنوں پندیرائی کی۔ اُنھیں نے اُنھیں قیمتی تحائف پیش کیے۔ اس واقعے کے چند روز بعد ایک رات کورا اچانک بابر کے گھر پہنچ گئی، بکھرے ہوئے شادی لباس۔ اُس نے بتایا کہ جاگ قیلے کے سرکش کھوجوں نے آخر اُنھیں تلاش کر لیا۔ بوڑھا اُنھیں مزاحمت کرتے ہوئے مارا گیا۔ کورا بچائی یہاں تک پہنچ گئی۔ وہ نوادری کوٹلی اور مہترک کا فذا بھی بچا کے لائی تھی۔ بابر کے والد پولیس کو مطلع کرنا چاہتے تھے لیکن بابر کو یہ کو ہوا۔ وہ کورا کو ساتھ لے کر چپکے سے گھر سے نکل گیا۔ دونوں چھپے چھپاتے کلکتے جانے والی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ ایک مہربان شخص مولوی شفیق سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اُنھیں اپنے حجرے میں لے گئے۔ بابر نے اُنھیں کچھ اور ہی کہانی سنائی تھی۔ اُن خوف تھا کہ بچ کب تک چھپ رہے۔ چنانچہ ایک روز وہ وہاں سے بھی فرار ہو گئے۔ ہوٹل میں بھیرے بابر نے ملازمت ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ وہ کمرے کچھ رقم اور لے کر آیا تھا۔ صرف چاقو باقی رہ گیا۔ وہ بدردشور کریں کھانے کے بعد اُنھیں دوبارہ مولوی صاحب کے حجرے ہی میں ملائے۔ بابر نے اس بار کچھ بھٹوت، کچھ پھر مشعل ایک دوسری داستان اُنھیں سنائی۔ مولوی صاحب کا ارادہ تھا کہ اپنے کاموں سے نفٹ کے چند دن بعد وہ اُنھیں آباں شہر لے جائیں گے۔ ایک شام وہ ان دونوں کی دل بستگی کے لیے اُنھیں دریائے سیر کرانے لے گئے تھے کہ چند سگ آدمیوں نے حملہ کر بدلا ہوں کو کورا مطلوب تھی۔ حملہ آوروں سے بابر کے گھٹم گھٹا ہو جانے کی وجہ سے مولوی صاحب کورا کو ڈور رکھے اور بھاگ جانے میں کام رہے۔ بابر کو سات سال کی سزا ہو گئی۔ مولوی صاحب نے پھر اُس سے کوئی رابطہ کیا نہ اُس نے مناسب سمجھا۔ جیل میں کلکتے کا نامی گرامی بھٹل، بابر کی سرکش معصومیت اور چہرے سے اُٹھتے ہوئے جھونپے سے ایسا خُرقہ ہوا کہ ایک طرح سے وہ بابر کا مربی اور نگراں بن گیا۔ جیل اُستاد بھٹل اور اس کے شاگردوں کی آمدورفت ایک معمول تھی۔ بھٹل نہ ہوتا تو جیل میں اُس کے اڈے کے کارندے بابر کا بہت خیال رکھ اُنھوں نے چاقو زنی کے کرتب، بلم، لاشی کے گراو جسمی داوچ اُسے سکھائے۔ بھٹل کی تحریک پر بابر نے تعلیمی سلسلہ جاری رکھا اور اتر نمبروں سے ایم اے کر لیا۔ بابر نے سات سال کے پہون شب گن گن کے کاٹے تھے۔ رہا ہو کر اُسے اپنے مشفق و محسن بھٹل کے اڈے پر چاہیے تھا، لیکن وہ کورا کی تلاش میں نکل گیا۔ کلکتے کے مدرے میں مولوی شفیق سات سال سے نہیں ملتے تھے۔ مولوی صاحب کے آباں شہر بھی کسی کو اُن کا کوئی علم نہیں تھا۔ ہر طرف سے مایوس ہو کے بابر نے اپنے شہر گیا کا رُخ کیا۔ وہاں اُسے بتایا گیا کہ اُس کی ماں، بیٹے کے گھل گھل کر مر گئی۔ عرصہ ہوا، باپ، جامداتین وغیرہ بچ کے اور بچوں کو ساتھ لے کے شہر سے چلے گئے ہیں۔ کبھی کو اُن کی کوئی خبر نہیں تھی کلکتہ ہی بابر کی منزل ہو سکتی تھی جہاں بھٹل اُس کے لیے بہت پریشان تھا۔ بابر کی آمد سے اڈے پر بہار آ گئی۔ بھٹل نے زبیں کو بھی بابر



دولت صاحب کی حیدر آباد میں موجودگی کا اقرار کرتے ہوئے بتایا کہ مولوی صاحب شہر سے دور اُس کی زمینوں والے مکان میں ٹھہرے ہیں۔ رات ہو چکی تھی۔ نواب نے دوسرے دن صبح دوپہانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ دوسرے دن صبح مقررہ وقت پر وہ نواب کے ہاں پہنچ گئے۔ جمرو اور گدھائی کی گلی کا وہ نواب کو قتب کا احساس دلانے بغیر موٹر میں پیچھے پیچھے چلے رہے۔ آدھی رات کو سب آدھیوں نے یلغار کی اور اُن کو گھر لیا۔ نواب ثروت یا کو معلوم نہیں کہ ٹھنڈ اور بار کے دست و پا زور میں کیسا زور ہے۔ وہ حملہ آوروں پر غالب آگئے اور نواب اپنے گھر آئے۔ حملہ آوروں کی زبردستی کے برقی طرح زخمی ہو گیا۔ ٹھنڈ اور بار سے شہر واپس لے آئے اور شکستہ حالت میں اُس کے خاندانی ڈاکٹر کے گھر اپنے ہوٹل لوٹ آئے۔ تیسرے دن نواب اپنے آپ سے بارگیا۔ دم و جانیں اُسے کچھ دیر کے لیے ہوش آجاتھا کہ اُس نے ڈاکٹر کے علاج کی کیا کہ اُسے اپنی بد طبیعت کی سزا ملی ہے۔ اُسے یقین دلایا گیا تھا کہ باہر زماں کی موت ہی کو را کے دل سے اُس کا نقش مٹا سکتی ہے، سو یہ بہانہ طوراً اختیار کرنے کی ٹھانی۔ وہ کو را کو یہ برہمیت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ تیسرے دن رات کو ٹھنڈ اور بار نواب کی خیر خیریت لینے لگے۔ ڈاکٹر کے گھر پہنچے تو وہاں سنا پٹھا پایا ہوا تھا۔ نواب کی لاش اُس کے گھر لے جانی جا چکی تھی۔ ٹھنڈ کی ہدایت پر زور اور نواب ثروت کے گھر کے اُس کے ڈرائیور کو پکڑ لیا۔ اُس سے معلوم ہوا کہ وہ از خود مولوی صاحب کے گھر گیا تھا۔ مولوی صاحب نے کیرید کرید کے سارا واقعہ ہمارا بارہم کرنے کی ہمت کے ساتھ جانے والے دو آدمیوں کا ذکر بھی اُن سے کیا تھا۔ اُسے توقع تھی مولوی صاحب اپنے حریف نواب کی بددستی کے لیے دیر سے ڈر رہے تھے۔ وہ نہیں آئے۔ وہ آئے بھی کیسے۔ انھوں نے تو نواب کے ساتھ بارہم ٹھنڈ کی موجودگی کے سبب ہی اسباب بانہ لیا ہوگا۔ ٹھنڈ اور بار کی سیادت آگئے اور ایک اوسط درجے کی حویلی کے دروازے پر دستک دی۔ حویلی کے مالک نے دو نوک لفظوں میں مولوی صاحب کے بارے میں کچھ بتانے سے انکار کر دیا، مگر ٹھنڈ اور بار کی وحشت، اُن کا عزم دیکھ کے اُس کا راز با کھولی پڑی۔ بارہم ٹھنڈ اُس کے ہاں سے چل پڑے۔ لیکن ابھی اور حادثے اُن کے منتظر تھے اور وہ پولیس کو مطالبہ ہو گئے۔ پولیس نے کوئی ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے گواہیں آزاد رکھا تھا۔ لیکن اُن آباد سے باہر جانے پر پابندی کا اندر کڑی تھی۔ میں بائیس روز بعد یہی سبب سن کر ہوتی، پھر حویلی کے مکینوں کو اُداس چھوڑ کے مولوی شفیق اور کو را کی تلاش میں وہ سفر پر روانہ ہو گئے۔ گاڑی ابھی چالیس میل دور کی اور ایک پور بختشن رکنے والی تھی کہ انجی کی خرابی سے جھکے لینے لگی۔ بہت سے مسافر فری ہو گئے۔ خوابیدہ ٹھنڈ کا سر بھی جھکیوں سے اٹھ کر اٹھ گیا تھا۔ اُس کی حالت یہ تدریج خراب ہوتی گئی اور غرملتی کر کے انھیں پٹنا شہر زکنا پڑا۔ پہلے ایک ہوٹل میں انھوں نے رات بسر کی۔ اگلے دن صبح انھیں ہسپتال میں بٹھلایا گیا۔ ہسپتال میں ٹھنڈ کی حالت اور خراب ہو گئی۔ زس نے بتایا کہ ٹھنڈ کے سر کی جلد ہر طرح متاثر ہوئی ہے، وہیں سے ابورسروں کے لیے ضرورت نہیں۔ دودن بعد آخر ڈاکٹر نے ٹھنڈ کو گھر جانے کی نوید سنائی۔ پولیس کی نگرانی میں انھیں اسٹیشن لایا گیا۔ گاڑی میں چل نہ پڑی، پولیس اُن کے آس پاس منڈلائی رہی۔ عیادت کے لیے صبح دشام ہسپتال آتے آتے میدا کے چاکا غائب ہونے کا اندر ٹھنڈ نے یہ کہہ تسلیم کر لیا تھا اور چپ رہا تھا، لیکن اب رواں کی وقت بھی میدا کی غیر حاضری، دودن سے اڈے جانے کے ہسپتال میں قیام، آئی جی کی طرف سے گل دستہ، مزکوں کا ستانا، جگہ جگہ پولیس کا گشت، یہ سارے مظاہر ٹھنڈ کے لیے تشویش کا باعث بن چکے تھے۔ زوراء، جامو اور بابر اوس کا احساس تھا، مگر گاڑی کے حرکت میں آ جانے کے بعد ہی انھوں نے زبان کھولی اور ٹھنڈ کی بیماری پر غری کے دوران پیش آنے والے سانحوں سے آگاہ کیا تو ٹھنڈ بہت حیران ہوا، پشیمان اور آزرده بھی۔ اُس نے بابر کو بانہوں میں سمیٹنے کے اڈے کا قیام نہایت مختصر تھا، دورا تیں، ایک دن۔ زوراء اور جامو کلکتے چھوڑ کے بارہم ٹھنڈ مشرق اور مغرب کی رنگال مختلف بستیوں کا گھر چھانٹتے ہوئے دھکا کے پہنچ گئے، اور کسی جگہ شہر کے اڈے کے ایک آدمی سے اُن کا آمتنا سنا ہو گیا۔ وہ شاہ ہے تھا، ٹھنڈ کا شاہ ہے شہر کے انھیں اڈے پر لے آیا۔ یہاں مہارانی نامی ایک شخص عرصے سے چوکی پر بیٹھا ہوا تھا۔ بنیادی طور پر ساڑھ ہنگ سے اُس کا تھا۔ ٹھنڈ نے ایک پتھکار کے مشورے سے شاہے کو چوکی پر بٹھایا اور مہارانی کی ساز و آہنگ کی دنیا میں واپسی کا اعلان کر دیا۔ بالا خانے کے دربار میں ہوا چنچا چل گئیں۔ اُن کا اصرار تھا کہ مہارانی ہمیں بھی اپنے ساتھ لے جائے۔ مہارانی نے دو کی بیکانی پر اعتراض کیا۔ لیکن اُن کے اُسے آپس کے ایثار کا یقین دلایا۔ ٹھنڈ کی ایماء پر چند اور چپا کو بھی مہارانی کے ہمراہ کر دیا گیا۔ ہم وہاں سے کلکتے پہنچ گئے۔ اُن کے اُن کے اطلاع ملنے ہی اڈے پر کمرہ چل گیا۔ حاضری کے لیے ہجوم اُٹھ پڑا۔ میں نے نصیب میاں سے اُن کے خاص بانوں کا تذکرہ تو دیکھ لے کے سونا کا گچھی پہنچ گئے، جمرو اور زوراء بھی ہمراہ تھے۔ وہاں ہمارا سامنا ایک خود عبارت دیوانے سے ہوا۔ اُس کے بارے میں تو دیکھ کر میری مراد برآئے کا شردہ سنا۔ راہ چلتے ہم گلاب بانو کے بالا خانے پر چڑھ گئے۔ بالا خانہ اُس رات کلکتے میں تھا کہ اُس کا دل دیکھ کے میری مراد برآئے کا شردہ سنا۔ راہ چلتے ہم گلاب بانو کے بالا خانے پر چڑھ گئے۔ بالا خانہ اُس رات کلکتے میں

تو اور دوسرا ہو کاروں کے لیے وقف تھا۔ زور گلاب بانو سے اڑ گیا۔ وہ مجبوراً ہمیں اندر لے گئی۔ ہمیں دیکھ کر ایک نو جوان سا ہو کار بچہ اٹھا اٹھا۔
 نے تھوڑا نکال لیا۔ میں نے بمشکل بات سننے والی اور ان تینوں سمیت اڑے پرواہیں آگیا۔ سا ہو کاروں کو ہمارے متعلق علم ہوا تو وہ گھبرا گئے اور دھڑلے
 کے دیرینہ واقف کار سابق پولیس افسر کے ہمراہ اڑے پر معافی کے اختصار ہوئے۔ بمشکل تمام معاملے سے بچے خیر تھا۔ گلاب بانو بھی سچیں
 گئی۔ بمشکل وہ معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹا دیا۔ چند روز کلکتہ میں قیام کے بعد بمشکل ہمیں لے کر نکل کھڑا ہوا۔ زور اور مجبور بے اصرار ہمارا
 ساتھ ہو گئے۔ ہم لکھنؤ، گورکھ پور، فرخ آباد، رومی کے شہروں میں گھومتے رہے۔ مختلف شہروں اور رستوں کی خاک چھانٹتے بچپن کے روزوں میں
 آنچنے دلی کے اطراف میں گنگان آباد شہروں اور قصبوں کو گھنگلتے ہوئے ہم جودھ پور اور ہاڑیہ کے علاقے میر پور خاص آ گئے۔ وہاں سے
 حیدر آباد، قصبہ اور رحال ہوتے ہوئے کراچی پہنچے۔ کراچی سے ہم بمبئی کے لیے بحری جہاز پر سوار ہو گئے۔ جہاز انگلستان سے آ رہا تھا۔ جہاز میں
 ہماری ملاقات انگریز تحقیق دان پروفیسر تھا۔ محسن سے ہوئی۔ وہ ہندوستان میں انگریزوں کی کمزور پوزیٹ گرفت کے اسباب جاننے نکلے تھے۔
 ہمیں انگریزوں کے لیے مخصوص رستوران میں لے گئے، وہاں ہماری ملاقات حسین ڈیل مایہ سے ہوئی۔ مایا کی ماں ہندوستانی تھی اور باپ
 انگریز تھا۔ وہ اپنے شوہر ہجیر برنارڈ کے ساتھ بمبئی جا رہی تھی۔ پروفیسر تھا۔ محسن باہر سے گفتگو کر کے مرعوب ہو گیا تھا۔ مایا بھی باہر سے بے حد متاثر
 ہوئی وہ رستوران میں کھانا کھا رہے تھے کہ چاک مایا کا شوہر ہجیر برنارڈ وہاں آ موجود ہوا۔ وہ رستوران میں ہندوستانی لوگوں کو دیکھ کر بخون
 مشتعل ہو گیا اور پروفیسر تھا۔ محسن سے ہندوستانیوں کو نفور باہر نکلے کا کہا۔ مایا اور پروفیسر تھا۔ محسن نے اسے سمجھانا چاہا، لیکن باہر
 جھگڑے کو طول دینا مناسب نہ سمجھا اور از خود وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔ زور اور مجبور پیش میں آ گئے تھے۔ باہر پیش میں مجبوراً عرضے پر پہنچے
 وہاں بمشکل طمانیت اور خوش اطواری سے بیٹھا تھا۔ باہر نے اندازہ لگایا کہ اسے بمبئی والے گھر پہنچنے کے خیال سے شاد تھا۔ باہر نے ہجیر برنارڈ
 سے اچھے کا خیال ترک کر دیا۔ رات کے خاموشی پہر میں مایا باہر سے محذرت کرنے چلی آئی۔ وہ فرط جذبات سے باہر سے لپکتی اس دوراں
 مایا کا شوہر ہجیر برنارڈ اپنے دوست کے ہمراہ وہاں آن پہنچا۔ برنارڈ نے منچے کی زد پر باہر کو جہاز سے کودنے پر مجبور کر دیا۔ بمشکل باہر کو
 سے بے خبر نہیں تھا۔ اس گفتگو کے دوران وہ زور دیکھ ہی تھا۔ بمشکل نے ہجیر برنارڈ پر حملہ کر کے اسے بے دست و پا کر دیا۔ لیکن ان کے سامنے
 حال انتہائی خفّہ ہو گئی تھی۔ انھیں جلد بایر گرفتار ہی ہوا تھا۔ اسی اثنا میں کاٹھیاواڑ کے نام ورڈا کو کرنی کار بارودیہ کے سینکڑوں مسلح افراد جہاز
 پر چڑھ آئے اور انھوں نے جہاز پر قبضہ کر لیا۔ بارودیہ کے آدمیوں نے کمال انتظام سے جہاز کے سر کردہ انگریزوں کو باندھ کر کشتیوں میں ڈال
 لیا۔ جہاز پر موجود ایک تجربے غلطی سے باہر کو انگریزوں کا گمشدہ بتا دیا جس پر بارودیہ نے باہر کو بھی جہاز سے اتارنے کا حکم دے دیا۔ بمشکل
 مدخلت پر بارودیہ نے اسے بھی زور اور مجور سمیت جہاز سے اتار کے کشتیوں میں ڈال دیا۔ گھنٹا بھر بمبئی کے بعد کشتیاں ساحل سے جاںکشی
 وہاں باہر بمشکل زور، جبر و سمیت سو کے لگ بھگ انگریز مغویوں کی منتکشی کس کے انھیں یورپ میں منتکشی ہو گیا۔ ان یورپیوں سے لدا چالیم
 کے لگ بھگ جھگڑوں پر بمشکل قافلہ معلوم حاصل سے نامعلوم منزل کی طرف چل پڑا۔ باہر یورپی میں منتکشی گئے تھے وہاں سے باہر کے منافع
 دیکھ رہا تھا۔ جھگڑے سے جنگل سے نکل کر ایک قصبے کی پیرونی سرک سے گزرے۔ وہاں مسافر لاری پر سوار ہو رہے تھے۔ باہر نے اسے
 زندگی کا حاصل منظر دیکھا۔ مولوی شفیق، کورا کے ہمراہ لاری میں سوار ہو رہے تھے۔ باہر کے ساتھ لدی ہوئی یورپی میں واسرائلے بند کا معتد خام
 یونارڈ جھگڑا پڑا تھا۔ باہر نے اس کی مدد سے رسیاں کاٹنے کی جدوجہد شروع کر دی، جو بالآخر خرابی صبر آزمائی کش کے بعد کامیاب ہوئی، تاہم
 باہر کے کلوے پر گہرا ڈم آ گیا۔ باہر یونارڈ کے ہمراہ جھگڑے سے گھٹے جنگل میں کود گیا، لیکن ڈم سے مسلسل پینے خون کی وجہ سے وہ بے ہوش
 ہو گیا۔ یونارڈ نے وفاداری کا تقاضا ہو خونی بھیاں۔ باہر کو جب ہوش آیا تو وہ درخت کے تنے سے لگا بیٹھا تھا اور یونارڈ جنگلی چیلوں کا رس اس کے
 منہ میں پکڑا رہا تھا۔ رات کے اندھیرے میں ایک شیر بہر نے یونارڈ پر حملہ کر دیا۔ باہر کا چاقو آنکھ کو تاجیو تاثیر کے دماغ تک جا گھسا، جس سے
 موڑی مار گیا۔ کئی روز تک چلتے گھٹتے ایک ہی منی پیچھے گئے جہاں چھلیا نامی ایک بد معاش نے باہر کو گھیر لیا۔ وہ بارودیہ کا خیر خواہ تھا، اور پورے
 کاٹھیاواڑ کا نامی گرامی ناقابل شکست چاقو باز۔ باہر نے چھلیا کو معمولی مقابلے کے بعد دست و پا کر دیا۔ جس پر چھلیا اس کا بے دام غلام
 ہو گیا۔ چھلیا نے باہر کو بتایا کہ باہر کی موت کی اطلاع پر اس کا ساتھی بمشکل مشتعل ہو گیا۔ بمشکل بارودیہ کو ہلاک کر کے جنگل میں روپوش ہو گیا۔
 اس کے ساتھ ایک انگریز خاتون مایا اور اس کا ایک ساتھی ہے جب کہ جبر و ہلاک ہو چکا ہے۔ تمام انگریز مغوی ہلاک کر دیے گئے ہیں۔ چھلیا
 بمشکل کی کونج میں نکل پڑا۔ باہر لنگو اور دھیار کے ہمراہ ہستی کا جائزہ لینے لگا۔ بھو امہا جن نامی ایک سا ہو کار نے اسے اپنی دکان میں بصد
 بلایا۔ اس کی دکان ہمہ قسم کے ساز و سامان سے بھری ہوئی تھی۔ وہاں باہر کو کھشے کے ایک نمائشی صندوق میں ایک نادر و نایاب موتی نظر آیا۔
 موتی ہو بہو کورا کی دی ہوئی مالا میں پروئے موتیوں جیسا تھا۔ باہر موتی دیکھ کر بے چین ہو گیا۔ اس نے بھو سے موتی کی بابت دریافت

تو اور دوسرا ہو کاروں کے لیے وقف تھا۔ زور گلاب بانو سے اڑ گیا۔ وہ مجبوراً ہمیں اندر لے گئی۔ ہمیں دیکھ کر ایک نو جوان سا ہو کار بچہ اٹھا اٹھا۔
 نے تھوڑا نکال لیا۔ میں نے بمشکل بات سننے والی اور ان تینوں سمیت اڑے پرواہیں آگیا۔ سا ہو کاروں کو ہمارے متعلق علم ہوا تو وہ گھبرا گئے اور دھڑلے
 کے دیرینہ واقف کار سابق پولیس افسر کے ہمراہ اڑے پر معافی کے اختصار ہوئے۔ بمشکل تمام معاملے سے بچے خیر تھا۔ گلاب بانو بھی سچیں
 گئی۔ بمشکل وہ معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹا دیا۔ چند روز کلکتہ میں قیام کے بعد بمشکل ہمیں لے کر نکل کھڑا ہوا۔ زور اور مجبور بے اصرار ہمارا
 ساتھ ہو گئے۔ ہم لکھنؤ، گورکھ پور، فرخ آباد، رومی کے شہروں میں گھومتے رہے۔ مختلف شہروں اور رستوں کی خاک چھانٹتے بچپن کے روزوں میں
 آنچنے دلی کے اطراف میں گنگان آباد شہروں اور قصبوں کو گھنگلتے ہوئے ہم جودھ پور اور ہاڑیہ کے علاقے میر پور خاص آ گئے۔ وہاں سے
 حیدر آباد، قصبہ اور رحال ہوتے ہوئے کراچی پہنچے۔ کراچی سے ہم بمبئی کے لیے بحری جہاز پر سوار ہو گئے۔ جہاز انگلستان سے آ رہا تھا۔ جہاز میں
 ہماری ملاقات انگریز تحقیق دان پروفیسر تھا۔ محسن سے ہوئی۔ وہ ہندوستان میں انگریزوں کی کمزور پوزیٹ گرفت کے اسباب جاننے نکلے تھے۔
 ہمیں انگریزوں کے لیے مخصوص رستوران میں لے گئے، وہاں ہماری ملاقات حسین ڈیل مایہ سے ہوئی۔ مایا کی ماں ہندوستانی تھی اور باپ
 انگریز تھا۔ وہ اپنے شوہر ہجیر برنارڈ کے ساتھ بمبئی جا رہی تھی۔ پروفیسر تھا۔ محسن باہر سے گفتگو کر کے مرعوب ہو گیا تھا۔ مایا بھی باہر سے بے حد متاثر
 ہوئی وہ رستوران میں کھانا کھا رہے تھے کہ چاک مایا کا شوہر ہجیر برنارڈ وہاں آ موجود ہوا۔ وہ رستوران میں ہندوستانی لوگوں کو دیکھ کر بخون
 مشتعل ہو گیا اور پروفیسر تھا۔ محسن سے ہندوستانیوں کو نفور باہر نکلے کا کہا۔ مایا اور پروفیسر تھا۔ محسن نے اسے سمجھانا چاہا، لیکن باہر
 جھگڑے کو طول دینا مناسب نہ سمجھا اور از خود وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔ زور اور مجبور پیش میں آ گئے تھے۔ باہر پیش میں مجبوراً عرضے پر پہنچے
 وہاں بمشکل طمانیت اور خوش اطواری سے بیٹھا تھا۔ باہر نے اندازہ لگایا کہ اسے بمبئی والے گھر پہنچنے کے خیال سے شاد تھا۔ باہر نے ہجیر برنارڈ
 سے اچھے کا خیال ترک کر دیا۔ رات کے خاموشی پہر میں مایا باہر سے محذرت کرنے چلی آئی۔ وہ فرط جذبات سے باہر سے لپکتی اس دوراں
 مایا کا شوہر ہجیر برنارڈ اپنے دوست کے ہمراہ وہاں آن پہنچا۔ برنارڈ نے منچے کی زد پر باہر کو جہاز سے کودنے پر مجبور کر دیا۔ بمشکل باہر کو
 سے بے خبر نہیں تھا۔ اس گفتگو کے دوران وہ زور دیکھ ہی تھا۔ بمشکل نے ہجیر برنارڈ پر حملہ کر کے اسے بے دست و پا کر دیا۔ لیکن ان کے سامنے
 حال انتہائی خفّہ ہو گئی تھی۔ انھیں جلد بایر گرفتار ہی ہوا تھا۔ اسی اثنا میں کاٹھیاواڑ کے نام ورڈا کو کرنی کار بارودیہ کے سینکڑوں مسلح افراد جہاز
 پر چڑھ آئے اور انھوں نے جہاز پر قبضہ کر لیا۔ بارودیہ کے آدمیوں نے کمال انتظام سے جہاز کے سر کردہ انگریزوں کو باندھ کر کشتیوں میں ڈال
 لیا۔ جہاز پر موجود ایک تجربے غلطی سے باہر کو انگریزوں کا گمشدہ بتا دیا جس پر بارودیہ نے باہر کو بھی جہاز سے اتارنے کا حکم دے دیا۔ بمشکل
 مدخلت پر بارودیہ نے اسے بھی زور اور مجور سمیت جہاز سے اتار کے کشتیوں میں ڈال دیا۔ گھنٹا بھر بمبئی کے بعد کشتیاں ساحل سے جاںکشی
 وہاں باہر بمشکل زور، جبر و سمیت سو کے لگ بھگ انگریز مغویوں کی منتکشی کس کے انھیں یورپ میں منتکشی ہو گیا۔ ان یورپیوں سے لدا چالیم
 کے لگ بھگ جھگڑوں پر بمشکل قافلہ معلوم حاصل سے نامعلوم منزل کی طرف چل پڑا۔ باہر یورپی میں منتکشی گئے تھے وہاں سے باہر کے منافع
 دیکھ رہا تھا۔ جھگڑے سے جنگل سے نکل کر ایک قصبے کی پیرونی سرک سے گزرے۔ وہاں مسافر لاری پر سوار ہو رہے تھے۔ باہر نے اسے
 زندگی کا حاصل منظر دیکھا۔ مولوی شفیق، کورا کے ہمراہ لاری میں سوار ہو رہے تھے۔ باہر کے ساتھ لدی ہوئی یورپی میں واسرائلے بند کا معتد خام
 یونارڈ جھگڑا پڑا تھا۔ باہر نے اس کی مدد سے رسیاں کاٹنے کی جدوجہد شروع کر دی، جو بالآخر خرابی صبر آزمائی کش کے بعد کامیاب ہوئی، تاہم
 باہر کے کلوے پر گہرا ڈم آ گیا۔ باہر یونارڈ کے ہمراہ جھگڑے سے گھٹے جنگل میں کود گیا، لیکن ڈم سے مسلسل پینے خون کی وجہ سے وہ بے ہوش
 ہو گیا۔ یونارڈ نے وفاداری کا تقاضا ہو خونی بھیاں۔ باہر کو جب ہوش آیا تو وہ درخت کے تنے سے لگا بیٹھا تھا اور یونارڈ جنگلی چیلوں کا رس اس کے
 منہ میں پکڑا رہا تھا۔ رات کے اندھیرے میں ایک شیر بہر نے یونارڈ پر حملہ کر دیا۔ باہر کا چاقو آنکھ کو تاجیو تاثیر کے دماغ تک جا گھسا، جس سے
 موڑی مار گیا۔ کئی روز تک چلتے گھٹتے ایک ہی منی پیچھے گئے جہاں چھلیا نامی ایک بد معاش نے باہر کو گھیر لیا۔ وہ بارودیہ کا خیر خواہ تھا، اور پورے
 کاٹھیاواڑ کا نامی گرامی ناقابل شکست چاقو باز۔ باہر نے چھلیا کو معمولی مقابلے کے بعد دست و پا کر دیا۔ جس پر چھلیا اس کا بے دام غلام
 ہو گیا۔ چھلیا نے باہر کو بتایا کہ باہر کی موت کی اطلاع پر اس کا ساتھی بمشکل مشتعل ہو گیا۔ بمشکل بارودیہ کو ہلاک کر کے جنگل میں روپوش ہو گیا۔
 اس کے ساتھ ایک انگریز خاتون مایا اور اس کا ایک ساتھی ہے جب کہ جبر و ہلاک ہو چکا ہے۔ تمام انگریز مغوی ہلاک کر دیے گئے ہیں۔ چھلیا
 بمشکل کی کونج میں نکل پڑا۔ باہر لنگو اور دھیار کے ہمراہ ہستی کا جائزہ لینے لگا۔ بھو امہا جن نامی ایک سا ہو کار نے اسے اپنی دکان میں بصد
 بلایا۔ اس کی دکان ہمہ قسم کے ساز و سامان سے بھری ہوئی تھی۔ وہاں باہر کو کھشے کے ایک نمائشی صندوق میں ایک نادر و نایاب موتی نظر آیا۔
 موتی ہو بہو کورا کی دی ہوئی مالا میں پروئے موتیوں جیسا تھا۔ باہر موتی دیکھ کر بے چین ہو گیا۔ اس نے بھو سے موتی کی بابت دریافت



رگھو جان بوجھ کے اس کے چاقو کا نشانہ بننا چاہتا ہے۔ باہر نے رگھو کو گلے سے لگالیا۔ بھٹل اب تک اس تمام معاملے سے لاعلم تھا۔ وہ رگھو کی فروشی سے متاثر ہوا اور لکشمی کا رشتہ مانگنے سیٹھ راج پٹیل کے گھر پہنچ گیا۔ خاصی ہفتہ اور جرح کے بعد سیٹھ راج پٹیل لکشمی کا رشتہ رگھو کو پرآبادہ ہو گیا۔ اس خوش خبری کے ساتھ ہی لوگ اڈے پر واپس پہنچے تو شان دار جشن منایا گیا۔ مٹھائی سیم کی گئی۔ باہر رگھو کے ساتھ اس کے گھر میں موجود صاحب بی بی اطلاع ملی کہ لکشمی اپنی بیوی کے ہمراہ گھر سے بھاگ کے اڈے پر آ گئی ہے۔ باہر باہر آیا تو لکشمی کھڑی بلک رہی تھی۔ لا پر سراسیمگی طاری تھی۔ بھٹل نے اسے تسلی دی۔ استفسار پر اس نے بتایا کہ اس کے بھائیوں نے رشتہ ماننے سے انکار کر دیا تھا اور رگھو سے منسلک لیے کسی اجرتی قاتل سے مدد لینے کی کوشش کی تھی۔ بھٹل نے اسے سمجھانا چاہا کہ وہ باپ اور بھائیوں کی بات مان لے مگر وہ دوبارہ گھر نہ جانا کا تہیہ کر کے آئی تھی۔ وہ دیکھ اس کے لیے رات گھر میں سمان تھا اور وہ اسی کی وجہ سے گھر چھوڑ آئی تھی۔ بھٹل نے لکشمی کے چہرے سے آخری بات کا فیصلہ کیا اور چھپایا سے موثر لائے کو کہا۔ سب سیٹھ راج پٹیل کی کوئی پہنچ تو پہرے داروں اور کتوں نے ان کا استقبال کیا۔ ایک پہرے دار لکشمی کو چھوڑ کر، باقی لوگوں کو واپس جانے کو کہا مگر بھٹل کی درستی نے اسے خاموش کر دیا۔ گفتگو شروع ہوئی تو سیٹھ نے بیٹوں کے آگے اپنی بی بی کا رونا روایا۔ بھٹل نے سیٹھ کو علیحدہ لے جا کر حقیقت بتائی۔ وہ واپس آئے تو بھٹل کے چہرے پر اطمینان تھا جبکہ سیٹھ کا چہرہ دھواں ہو رہا آتے ہی بھٹل نے تیزی سے مختلف احکامات جاری کرنا شروع کر دیے۔ مجھے شری رام کے ساتھ جانا تھا۔ شری رام مجھے لے کر اجیت کے قریب پہنچے۔ وہاں سے اجیت ہمیں لے کر اپنی ماں کے گھر گیا۔ اس دوران میں میری حرارت، تھیر بخار میں بدل چکی تھی۔ میں سوئے جانے کے عالم میں لکشمی کی شادی کے معاملات طے ہوتے اور آگے بڑھتے دیکھتا سنتا رہا۔ بالآخر اپنی سندھ بدھ کھو بیٹھا۔ آنکھ کھلی تو معلوم ہوا، دوسرا چہرہ چکا ہے۔ دھیار امیر سدھار بارہا تھا۔ مجھے بے ہوش بے ہوش دیکھ کر سب کے چہروں پر رونق آ گئی۔ معلوم ہوا کہ سب کچھ خوش السطوی سے نرسا ہے اور اب بھٹل آبادہ روانہ ہو گیا تھا۔ سب نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ نہ رکا۔ میرا سفر کورا کے تصور میں کٹا کر کشاں کشاں میں گھر پہنچا تو وہ موجود ملے۔ حویلی پہنچے تو اندازہ ہوا کہ اباجان نے خاصے شانہ نشاٹ باٹ اپنا لیے تھے۔ سب روایتی محبت اور اپنائیت سے ملے۔ گلاب کھانے کے بعد اباجان مجھے باہر لے آئے جہاں بکرا منڈی کا سامنا تھا۔ وہ بکرے صدقے کے لیے لائے گئے تھے۔ ایک مولوی صاحب موجود تھے۔ اباجان نے ان سے میرا تعارف کرایا اور ہمیں چھوڑ کر اندر چلے گئے۔ مولوی صاحب نے اباجان کو یہ یاد کرایا تھا کہ مجھ پر چارہ کا سایہ ہے۔ مولوی صاحب نے سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔ میں طرح دیتا رہا۔ لیکن جب اس نے کورا کی شان میں گستاخی کی تو میں خود پر رگھو کا اور اپنے اندر چھلنے والی اس خواہش پر کچل کر گراں اس پر دے ماروں، عمل کر بیٹھا!

میں نے ہاتھ بکا رکھنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن مولوی صاحب کے لیے وہ بھی بہت کافی ثابت ہوا۔ انھیں اسپتال میں داخل کرنا میں اپنے بستر پر سوچوں میں غلطیاں بڑھا تھا۔ اباجان نے اسپتال سے واپسی پر مجھے بھی عیادت کے لیے اسپتال جانے کی تاکید کی۔ یہ کوئی اندازہ تھا کہ مولوی نے اباجان کو اپنے چنگل میں لیا ہوا ہے۔ میں انھیں اس کے چنگل سے نکالنے کے طریقوں پر غور کر رہا تھا دوران میں دوسرے بلاوا آچکا تھا کہ اندر سب لوگ مجھے یاد کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں جگنو کیلا واپس آ گیا۔ بھٹل اندر اور جھرو کے باہر میں استفسار پر اس نے بتایا کہ بھٹل کو پولیس گرفتار کر کے لے گئی ہے۔ میں جگنو کو لے کر فوری طور پر گھر سے نکلا۔ راستے میں ایس پی کے گھر گیا۔ وہ میرے گھر سے ہو کر آیا رہا تھا۔ اس نے مجھے فوراً گھر لوٹنے کو کہا اور وعدہ کیا کہ بھٹل کو رہا کرنا اس کی ذمہ داری ہے۔ بھٹل کی خاطر اس نے مجھے فوری طور پر فیض آباد جانے کا مشورہ دیا۔ بعد میں بھٹل کو بھی وہیں پہنچنا تھا۔ میں ذرا اور جھرو کی مغیبت میں آباد روانہ ہوا۔ تمام راستے آنکھوں میں کورا چھٹی رہی۔ فیض آباد میں سب ہی چشم بردار تھے۔ ایس پی شکانے مجھے تاکید کی تھی کہ فیض آباد کر ڈی ایس پی سریندر پور سے ضرور ملوں۔ وہ بہت کام کا آدمی ہے۔ میں اس سے ملا۔ وہ واقعی بہت ہی نڈر اور بے باک آدمی لگا۔ اس نے مجھے اپنے نمبر لکھوا کر تاکید کی کہ کوئی بھی کام ہو، بلا بھیجا ہٹ اس سے رابطہ کروں۔ بھٹل فیض آباد پہنچا تو اس کے ساتھ ایس پی شکانہ خاص آدمی بڑی بھی تھا۔ اس دبلے پتلے آدمی کے بارے میں شکانہ جی نے زمین و آسمان کے قلابے ملائے تھے۔ اگلے روز شکانہ جی کے بتے بتایا کہ بل پر میں کورا اور مولوی صاحب کو دیکھا گیا تھا۔ بھٹل نے مجھ سے کہا کہ کوئی تو بھی نکل پڑیں۔ لیکن میں بھیڑ بھاڑ چاہتا تھا۔ اس لیے رات کی تاریکی میں، کسی کو کچھ بتائے بغیر تہا ہی نکل پڑا۔ بل پر میں بلوری سے ملاقات ہوئی جس نے رقم کے عوض شکانہ جی کے ٹھکانے کی نشاندہی کر دی۔ میں وہاں پہنچا تو مولوی ایک لاش کی صورت ملا۔ جاگت قبیلہ کا کوئی فرد کوڑا کو لے کر جاچکا تھا۔ شکانہ آدمیوں کے روکنے کے باوجود میں نے وہاں سے نکلنا چاہا۔ اسی وقت مجھے اپنے بازو میں سوئی کی جھپن محسوس ہوئی۔ میں نے سوئی نا پھینک دی۔ سنبھلنے کی کوشش کے باوجود میں زمین پر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

’وہی جو میری جان کے دشمن ہیں۔ اس کی مترنم آواز حلق میں گھٹنے لگی۔‘ تم اور تمھارے جاں نثار ساتھیوں کے سبب، ابھی تک وہ دُور دُور رہ کر میرا تعاقب کرتے رہے۔ لیکن ... آج ان کا داؤ چل گیا۔‘

کورا کی پکلوں پر تھمے تھمے آنسوؤں کے قطروں نے مجھے دیوانہ کر دیا۔ کس کی موت آئی ہے، کون ہے وہ بد بخت جس کی زندگی کے دن پورے ہونے والے ہیں؟ میرے لہجے میں وحشت اور جنون چھلنے لگے۔

’اپنی کورا کا کہاں جاؤ باہر۔ اس کے لیوں پر اتھا ترپ اٹھی۔‘ وہ کوئی غیر نہیں، اپنے ہی ہیں۔ اپنے نہ ہوتے تو دشمن کیوں کرتے؟‘

میرے اندر کا وحشی ایک لخت جاگ اٹھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ کورا نے جو کہا وہ غلط بھی نہیں۔ جاگت قبیلہ کا ایک شخص کورا پر پوری طرح نظریں جمائے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ خاصا فوجی انداز نظر آتا تھا۔ کورا بھی مصمم لڑیا، اس سے خوف زدہ ہوئے بغیر وہ ہی نہیں سکتی تھی۔ مجھے اس بات پر حیرت ہوئی کہ وہ مجھے کیوں نظر انداز کر رہا تھا؟ ممکن ہے کہ حد سے زیادہ اعتماد اور احساس برتری کے سبب اس نے مجھے خاطر میں لانے کی ضرورت ہی نہ محسوس کی ہو۔ میرا جنوں اور فزوں ہو گیا۔ میں نے اس کا گریبان تھام کر اسے اس بات کا احساس دلانا ضروری سمجھا کہ باہر زماں کون ہے؟ کورا کی خاطر میں پہلے بھی تین تین کر چکا تھا۔ اس جرم کی پاداش میں طویل سزا بھی کاٹ چکا تھا۔ اور اب بھی کسی بھی حد تک جانے سے دریغ کرنے والا نہیں تھا۔

’تم جسے بے یار و مددگار سمجھ رہے ہو اس کا ایک حمایتی ابھی زندہ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس لڑکی کے تعاقب سے باز آ جاؤ ورنہ میں تمھیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔‘

”مسٹر باہر۔ پولیس مسٹر باہر! بہت سے کوئی آواز آتی محسوس ہوئی۔“ آپ کو میری آواز آ رہی ہے مسٹر باہر؟“ کسی نے شفیق لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ ”میں اکثر احسان ہوں۔“

ایک ایک میں شعور کی سطح پر آ گیا اور میں نے ہز بڑا کر آنکھیں

سے واقف تھے، اس کے بعد فیروز چینیوں کے ذریعے ...
 ”ٹھل کے ساتھ جبر و زور اور جھگڑ بھی ہوں گے؟“ میں نے سیورین کی طرف دیکھا، ڈاکٹر مڈھنا کر رہ گیا۔

”اور بھی بہت سارے لوگ اسپتال کے لان پر موجود ہیں۔“
 ”لیکن فی الحال میں آپ کو کسی سے ملاقات کی اجازت نہیں دے سکتا۔“ ڈاکٹر کی زبان پھر بے قابو ہو گئی۔ ”آپ کو ابھی کچھ دنوں صرف آرام و مکمل سکون کی ضرورت ہے۔“
 اس نے اپنا جملہ مکمل کر کے قریب کھڑی نرس کو اشارہ کیا، وہ انجکشن لیے پہلے ہی سے منتظر تھی۔

”ڈاکٹر...“ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ ”کیا مجھے صرف ٹھل سے بات کرنے کی اجازت مل سکتی ہے؟“
 ”اس وقت ٹھل صاحب کو نیند سے بیدار کرنا مناسب نہیں ہوگا۔“

”ڈاکٹر، آپ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں؟“ میری آواز جھنجھکی۔

”ایسا نہیں ہے...“ سیورین نے میرا ہاتھ تھپ تھپ کر تسلی دی۔ اس کی نظریں گواہی دے رہی تھیں کہ ٹھل ٹھیک تھا۔

”تمہارے اوپر جو گزر گئی، ہم سب کو اس کا احساس ہے۔“ ابا جان مدھم لہجے میں گویا ہوئے۔ ”قسمت میں شاید یہی لکھا تھا۔“

میں نے جواب دینے کے بجائے آنکھیں موہ لیں، سیورین نے میری آستین اوپر کی، ڈاکٹر نے مجھے انجکشن لگا دیا۔ وہ شاید سکون بہم پہنچانے کی خاطر نیند کا کوئی انجکشن تھا جس کے محلول نے جسم میں داخل ہوتے ہی دماغ کو دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا!

میری آنکھ بارہ گھنٹے بعد کھلی۔ سیورین میرے قریب ہی کھڑی تھی۔ اس کی گلابی آنکھوں سے نیند کا شمار جھانک رہا تھا۔ ڈیوٹی پر موجود نرس آرام کرسی پر سر ڈالے لہجہ خواب تھی۔ سیورین کو جگنا دیکھ کر میرے ہونٹ کپکپانے لگے، رات کے دو گھنٹے تھا۔

”نرس کو میں نے ہی کچھ دیر آرام کرنے کو کہا تھا۔“ وہ میرے چہرے کے تاثرات بھانپ گئی۔ ”آپ کی بیمار داری تو میرے لیے بڑے نصیب کی بات ہے۔“
 ”اب نرس کو چگا کر تم...“

”مجھ سے میرا حق نہ چھینیں، پلیز!“ اس کی آواز زندہ اس کے لہجے میں اپنائیت تھی، خلوص تھا۔
 ”ٹھل اب کیسا ہے...؟“ میں نے خلوص کا جامہ خلوص سے دیا۔

”خون دینے کی وجہ سے کم زوری لاحق ہے۔ ایک دن میں جاتی رہے گی۔“ اس نے بڑی خوب صورتی موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ ”آپ کی بیماری کی خبر نرسوں سے اور بھی کچھ لوگ آگئے ہیں۔ سب کو آپ کی فکر لاحق ہے۔“

سیورین کا جواب سن کر میں نے کسی تاثر کا اظہار نہیں کیا۔ سب تو اوزن کا مسئلہ ہے۔ ساری اندیشیاں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ وقت کی ڈگڈگی، اوقات انسان کو بھی بندروں کی طرح تپتا پڑتا ہے۔

میں نے آدی کیا ہے کیا ہو جاتا ہے، بڑے بچے بچہ بن جاتا ہے۔ سب تو اوزن کا مسئلہ ہے۔ ساری اندیشیاں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ وقت کی ڈگڈگی، اوقات انسان کو بھی بندروں کی طرح تپتا پڑتا ہے۔

میں بھی اسی ہست و بود کا شکار تھا۔ درمیان میں محض دیوار حال تھی، ٹھل دوسرے کمرے میں پڑا زندگی کی تو نظر تھا۔ ہم دونوں زندہ تھے، مگر بے بس۔ نہ ٹھل میرے آنے کی طاقت رکھتا تھا، نہ مجھے بستر سے نیچے اجات کی طاقت تھی۔ ڈاکٹر جھوٹ بولتے ہیں، دروغ گوئی میں نئے انداز اختیار کر کے مریض کو پانی ملنے کی خوشی میں سے دوچار رکھتے ہیں، ٹھل یا میری بیماری سے دنیا میں سے ذرا ادھر ادھر نہیں ہوئی۔ نظام چلتا رہا، بس سے

کام جو آج پورے نہیں ہوئے، کل ہو جانے کی آدی نو اپنے آپ کو فریب میں مبتلا رکھتا ہے۔ زندگی کے معاملات تن درستی سے مشروط ہیں۔ زندگی کا سبب اناب لگانے والے بھی ہمیشہ ڈنڈی مارتے ہیں، نیند کو دور اپنے کو بھی زندگی میں شکار کر لیتے ہیں۔ کیوں کرتے ہیں؟

میں نے آدی کیا ہے کیا ہو جاتا ہے، بڑے بچے بچہ بن جاتا ہے۔ سب تو اوزن کا مسئلہ ہے۔ ساری اندیشیاں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ وقت کی ڈگڈگی، اوقات انسان کو بھی بندروں کی طرح تپتا پڑتا ہے۔

میں نے آدی کیا ہے کیا ہو جاتا ہے، بڑے بچے بچہ بن جاتا ہے۔ سب تو اوزن کا مسئلہ ہے۔ ساری اندیشیاں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ وقت کی ڈگڈگی، اوقات انسان کو بھی بندروں کی طرح تپتا پڑتا ہے۔

میں نے آدی کیا ہے کیا ہو جاتا ہے، بڑے بچے بچہ بن جاتا ہے۔ سب تو اوزن کا مسئلہ ہے۔ ساری اندیشیاں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ وقت کی ڈگڈگی، اوقات انسان کو بھی بندروں کی طرح تپتا پڑتا ہے۔

بڑی توقعات باندھ رکھی تھیں۔

ٹھل سے خیال میں ملاقات نے میری زندگی کے بہت سارے رُخ بدل دیے تھے۔ اس کے ساتھیوں نے مجھے چاقو زنی کے کرتب، بلم لالچی کے گُر اور جسمانی داؤ بیچ سکھائے۔ ہر فن میں طاق کر دیا، ٹھل کی تحریک پر میں نے خیال ہی سے امتحان دے کر ایم اے بھی کر لیا۔ ابا جان میری تعلیمی قابلیت سے بھی مالی استفادہ حاصل کرنے کے بارے میں غور و فکر کرنے لگے۔ انھوں نے کہا تھا کہ اگر میں آمادہ ہوں تو وہ کئی مہینے لگوا دیں، میں سچ کمرے میں بیٹھا اپنے کارندوں پر حکم چلاتا رہوں، کمپنیوں کے کھاتے دار دو اور دو چار کرتے رہیں، دولت میں اضافہ ہوتا رہے، مختلف بینکوں میں ٹیکس چوری کرنے کی غرض سے مختلف ناموں سے علیحدہ علیحدہ اکاؤنٹ کھولے جائیں، دس بارہ کوشیاں، حویلیاں مختلف شہروں میں خرید کر، کرائے پر چڑھا دی جائیں تاکہ آمدنی کا گراف تیزی سے بڑھنے لگے۔

ارادہ آدمی کی متاع ہے۔ اس کے بغیر کچھ بھی نہیں، میرا قصور میرا اپنا وجود ہے۔ میں نہ ہوتا تو ابا جان اپنی توقع کا اظہار کس سے کرتے؟ زندگی کے ہنگاموں میں لوگ ایک دوسرے سے بچھڑ بھی جاتے ہیں، مگر کوئی رگ جاں بھی ہوتا ہے، متاع جاں... جس کے بغیر آدمی خود کو ادھورا محسوس کرتا ہے۔ جسے زندگی کا مرکز و محور مان لیا جائے، اس کے بغیر زندگی بے معنی ہو جاتی ہے۔ میں کورا کو فراموش کر دوں؟ نہیں، ایسی زندگی پر تو میرے جیسا سودا ہی ہزاروں زندگیاں قربان کر سکتا تھا۔ ایک دوسرے کی ضرورت، اس کی طلب اور بے چینی کا دوسرے کے اندازہ بھی نہیں لگا سکتے، وہ اپنی زبان بولتے ہیں، دوسرے کے دل میں ایک نظر جھانکنے کا وقت کا زیاں تصور کرتے ہیں، خود غرضی اور کہہ سکتے ہیں؟

عزت، شہرت، دولت اور اقتدار کی ہوس میں دوڑتے دوڑتے آدمی کی صلاحیتیں کم زور ہوتی چلی جاتی ہیں، اسے احساس نہیں ہوتا کہ کیا کھویا کیا پایا؟ ابا جان نے بھی کورا کے خزانے، زرو جواہرات سے بھرے ہوئے صندوق کے حصول کی خاطر زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔ بچوں کو در بدر سے دوچار کر دیا تھا۔ جہاں گیر خانم کے ہاتھوں نہ لگا ہوتا تو تربیت کا تصور بھی نہ کر پاتا۔ کوئی ٹھل اسے مل جاتا تو وہ کسی اڈے پاڈے کا دادا کہلاتا... فہمیدہ، میری فی، بیرون میں گھنگھر و باندھ کر کوٹھے تک پہنچتی، نیلم جان بن گئی۔ اسی فیض آباد میں جہاں

میں زندگی اور موت کے دورا ہے پر کھڑا ہوں۔ نیلم جان نامی مغنیہ کی بھی بڑی دھوم تھی، ڈنکے بجتے تھے، میں خود تماشا بین بن کر اس کے کونٹے ٹھیکہ پہنچ گیا۔ وہ بد نصیب کیل کانٹے سے لیس ہو کر تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ لہرائی بل لہائی، چودھویں کے چاند کے مانند طلوع ہوئی تھی، محفل میں رنگ جمائے کی خاطر اس نے بھی نہ جانے کیا کیا توقعات باندھ رکھی ہوں گی، مجھ پر نظر پڑی تو... اس کی ساری شوخیاں، تمام رنگ یک لخت پھیکے پڑ گئے۔ توقعات کو ایسا دھچکا لگے گا، اس نے خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا۔ مجھ بے غیرت پر نگاہ ڈالتے ہی اس کی غیرت جاگ اٹھی، بس ایک نظر اس نے مجھے ہی بھر کر دیکھا پھر غیرت اڑے آگئی۔ اس نے بالا خانے کی کھڑکی سے آن کی آن میں نیچے سڑک پر چھلانگ لگا دی۔ اس کا وجود تماشا بینوں کے دیکھتے ہی دیکھتے ہی پتھر مارا کر رہ گیا۔ ابا جان کی خزانے پالنے کی لگن پوری ہو گئی۔ اور اس وقت... سیوریہ مجھے توقعات پر زندہ رہنے کی آس دلا رہی تھی! میں نے جواب میں خامشی اختیار کی تو اس کے لبوں میں دوبارہ ارتعاش ہوا۔

”میں آپ کو دلا سائیں دے رہی۔“ اپنے ہاتھوں کے درمیان میرا ہاتھ بڑی اپنائیت سے دبا کر گویا ہوئی۔ ”ابھی ایک امید باقی ہے...“

”وہ امید تمھاری جاگیر ہوگی۔“ میں بلبلاتا تھا۔ ”روایتی نرسوں والا سلوک کر کے میرے زخموں پر نمک پاشی نہ کرو۔“ میں نے اپنا ہاتھ ہٹ لیا۔ ”مریضوں کو زندگی کی امید دلانا کبھی تمھارے پیشے کا اہم تقاضا تھا لیکن اس وقت...“

”اس وقت بھی میں نے نھل صاحب اور آپ کے ساتھ اپنے فرائض ادا کرنے میں کسی کوتاہی کا شجوت نہیں دیا تھا، اس وقت تو صرف اور صرف آپ لوگوں کے رحم و کرم پر زندہ ہوں۔“ سیوریہ بھی کسی پتھر کا بے جان بت نہیں، گوشت پوست کا ایک جیتا جاگتا وجود تھی۔ اس کے سینے میں دل بھی تھا جو میرے ہونٹ لچکے کی کاری ضرب نہ جھیل سکا اور پھڑ پھڑا اٹھا۔

”میری اپنی کوئی جاگیر نہیں ہے۔ جو کچھ اثاثہ ہے وہ آپ اور صرف آپ کے بزرگوں کی مہربانیاں، کرم نوازیایں ہیں۔ کل آپ کا کوئی خادم میرا ہاتھ تھام کر حویلی سے باہر کر دے تو میں پھر اپنی اوقات پر...“

”چپ ہو جاؤ سیوریہ، ہنر کرو اپنی زبان...“ میں نے چل کر کہا۔ ”میں اس وقت اپنے ہوش میں نہیں ہوں، میری کوئی بات بری لگی ہو تو...“

”آگے کچھ نہ کہیے گا... ورنہ میرا مان ٹوٹ جائے گا۔“ سسک اٹھی۔ اس کی آنکھوں کی طفانی ذرا کم ہوئی تو میں نے مدھم اور زور لہجے میں اسے ٹھلا۔ ”تم کس امید کی بات کر رہی تھیں؟“ ”آپ ایک آدمی کو فراموش کر رہے ہیں... وہ جو بابا کا ساتھ بھٹی سے آتا تھا۔“

”تم... تم بھرجی کی بات کر رہی ہو؟“ ”جی ہاں...“

”کیا ہوا اسے...؟“ ”جس رات آپ حویلی سے گئے تھے، اسی رات سے بھی غائب ہے۔“ سیوریہ نے محتاط انداز اختیار کیا۔ ”مگر ہے، وہ شکلا جی کی کسی خاص ہدایت پر آپ اور بابا پر نظر کر رہا مگر کیا گیا ہو۔ ممکن ہے، حویلی سے آپ کو تنہا نکلے دیکھ کر بھی آپ کے تعاقب میں چل پڑا ہو۔“

”اب وہ کہاں ہے...؟“ ”میری وحشت ہے۔“ ”یہی ایک سوال سب کے لیے پریشانی کا سبب ہے۔“ ”تم کیا نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کر رہی ہو؟“

”میں نے دو روز قبل آپ کے والد کو کسی آدمی سے باز کرتے سنا تھا۔“ سیوریہ بولی۔ ”اس شخص کا یہی خیال کہ بھرجی بڑا زیرک اور مخبر ہے کار آدمی ہے۔ اپنے دشمنوں کی بے دور ہی سے سونگھ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے، وہ دشمنوں کے تعاقب میں ہو۔“

”کون تھا وہ شخص؟“ ”میرے والد رنگ رازے جیسے لگے۔“ ”میں اس کا نام نہیں جانتی۔ البتہ گفتگو کے دوران میں آدھ بار شکلا جی کا نام بھی درمیان میں آیا تھا۔“

”میں... میں اسپتال میں کب داخل کیا گیا؟“ ”جسٹیں روا ہوئے لگیں۔“ ”دو ہفتے ہو گئے...“

”کیا شکلا جی کو حالات کی بھٹک مل گئی؟“ ”سوکتے، مرجھاتے ہوئے درخت کوئی کھاد مٹی مل جائے پانی کا پھینکا لگا دیا جائے تو وہ بھی جڑ پکڑنے لگتا ہے، میں ذی ہوش انسان ہوں۔ سیوریہ کی زبانی بھرجی کی اسی رائے سے کم شدگی کی اطلاع سن کر میری امید، میری توقعات، توڑ چکی تھیں، ایک موبوم سی امید، ایک غمناک چارہ مدھم... کم زور سی طرح لرزہ بر اندام ہوئے لگیں۔ جب

”الہام مولوی شفیق کو موت کے منہ میں جانے سے نہ لے کر پھر کورا کے سلسلے میں بھی اُن سے کوئی تیر... یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ کوئی نہ کوئی، اچھی یا اس اطلاع آئی ہو لیکن... مصلحتوں کی وجہ سے مجھ تک پہنچنا...“ ”بھرجی کی بات بھی مجھے پہلی بار سیوریہ نے اس کا بھی ذکر نہیں کیا تھا۔“ ”جیسے اس کا کوئی صحیح اندازہ نہیں تھا۔“ ”بھرجی کی اس اطلاع نے ایک ڈوبے ہوئے کو نکلنے کا سہارا دیا۔ سیوریہ نے زبان نہ کھولی ہوئی، دوسروں کی طرح وہ اس زبان پر قفل ڈال رہی تھی تو میں شاید اس اطلاع سے بھی بے خبر تھا۔ میں نے بھرجی کی زبان پر امید کا لفظ سن کر دیا تھا۔ وہ سہم گئی، اب دیدہ ہوئی۔ میں اس سے اس کی کا اظہار کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر...“ ”اب وہ کہاں ہے...؟“ ”میری وحشت ہے۔“

”اب وہ کہاں ہے...؟“ ”میری وحشت ہے۔“ ”یہی ایک سوال سب کے لیے پریشانی کا سبب ہے۔“ ”تم کیا نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کر رہی ہو؟“ ”میں نے دو روز قبل آپ کے والد کو کسی آدمی سے باز کرتے سنا تھا۔“ سیوریہ بولی۔ ”اس شخص کا یہی خیال کہ بھرجی بڑا زیرک اور مخبر ہے کار آدمی ہے۔ اپنے دشمنوں کی بے دور ہی سے سونگھ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے، وہ دشمنوں کے تعاقب میں ہو۔“ ”کون تھا وہ شخص؟“ ”میرے والد رنگ رازے جیسے لگے۔“ ”میں اس کا نام نہیں جانتی۔ البتہ گفتگو کے دوران میں آدھ بار شکلا جی کا نام بھی درمیان میں آیا تھا۔“

اخفیت ناک شرافت

ایک نرس نے سرگوشی میں دوسری ہم راز نرس سے کہا، ”ڈاکٹر اکرم بڑے شریف اور بھلے ماں ہیں۔“

دوسری نرس نے پوچھا، ”وہ کیسے؟“ ”پہلی نے کہا، ”کل اتفاق سے ہم دونوں سنیما دیکھنے گئے اور آپر کلاس کی گیلری میں ایک ساتھ اٹھ کھٹے بیٹھے رہے۔ ہمارے سوا گیلری میں کوئی اور نہ تھا لیکن اس کے باوجود ان تین گھنٹوں کے دوران انھوں نے مجھ سے کسی قسم کی غیر شریفانہ اور نامناسب بات نہ کی۔“

اس پر دوسری نے بیزار سے کہا، ”اس طرح کی شرافت بھی کتنی اخفیت ناک اور صبر آزما ہوتی ہے! اس سے تو بہتر تھا کہ ڈاکٹر صاحب اکیلے ہی سنیما چلے جاتے!“

عقادون عمر صدیقی، کراچی

تھے میرے برے بھلے میں برابر کے شریک رہ چکے تھے۔ ان کی ذات سے ہزاروں بیتی باتیں وابستہ تھیں... لیکن بھرجی... وہ ڈبلا پتلا، دراز قد ڈھلا ڈھلا سا آدمی جسے دیکھ کر پہلی نظر میں کسی ریقان کے مریض کا گمان اُبھرتا ہو، وہ بھلا میرے تعاقب میں کیوں نکل پڑا تھا؟ اس کی نظروں میں ایک چمک ضرور تھی جو اس کی ذہانت اور تجربوں کی دلیل بھی جاسکتی تھی۔ مگر اسے کیا معلوم تھا کہ میں کس مہم پر روانہ ہو رہا ہوں؟ کیا محفل کے بہانے اسے میرے اوپر تعینات کیا گیا تھا... جو وہ ایک لمحے کو بھی مجھ سے بے خبر نہیں رہا۔ وہ میرا تعاقب کرتا رہا اور مجھے بھٹک بھی نہ ملی، وہ مجھے ایک کم زور آدمی نظر آیا تھا، چھلا وہ سمجھا تھا میں نے اسے، لیکن سیوریہ کی زبان سے یہ سن کر کہ بھرجی بھی اسی رات سے حویلی سے غائب ہے جس وقت میں نکلا تھا، میرے ذہن میں نیٹروں سوالات ابھر رہے تھے... کیا شکلا کے خاص آدمیوں کی ناکامی کے بعد وہ کسی کام آسکتا تھا؟ کیا اس نے سر پر سلیبانی ٹوپی اوڑھ رکھی ہوگی جو جانگ قبیلے کے ان سر فروش اور جانش موت کے ہر کاروں سے روپوش ہو سکتا تھا جنھوں نے بھاگتے بھاگتے بھی میرے وجود کو خاک میں ملانے سے دریغ نہیں کیا تھا... وہ کورا کے تعاقب میں صرف ان مذہبی دستاویز کے سبب نکلے تھے جس کے بغیر سردار کا قدم

ہو تو ہم بھی اسی انداز میں جوانی کا روانی کا فیصلہ کرتے۔ اگر میرے اندازے درست تھے تو پھر یلم پور میں جو کچھ ہوا اس ضمن میں بلوری بھی غیغہ کھا گئی ہوگی۔ اس نے مولوی شفیق کے علاوہ تین اور اجنبیوں کا بھی ذکر کیا تھا۔ ممکن ہے، بعد میں اور بھی آگئے ہوں، بلوری انہیں دیکھ نہ پائی ہو۔ ایک میرے سامنے مولوی شفیق کے ساتھ ہی پڑا زندگی سے اپنا ناتا توڑ چکا تھا۔ دوسرے نے کورا کو اپنے ساتھیوں کے قبضے میں جانے کے بعد ہی مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کی ہوگی۔

اگر سیورین کا بیان درست تھا کہ بڑی میرے ساتھ ہی حویلی سے نکلا تھا تو پھر دشمن بھی اس سے غافل نہ رہے ہوں گے۔ کچھ ہمارے تعاقب میں لگے ہوں گے، ایک دو پیچھے رہ گئے ہوں گے۔ جنہوں نے بعد میں آنے والوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی ہوگی۔ کیا درست تھا کیا غلط، یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ سیورین نے بھی پہلے یہی کہا تھا کہ بھٹل کی حالت مجھے زیادہ خون دینے کے سبب بگڑی تھی۔ جب کہ وہ خود خطرناک زخموں کے بارے میں ڈاکٹر احسان کو یاد دہانی دیتی تھی۔

”اسپتال کے لان پر جو افراد جمع رہتے ہیں وہ بھی مجھے اچھے لوگ نہیں لگتے۔“ ڈاکٹر نے بھٹل کے زخموں کی بات نظر انداز کر کے ایک نیا سوال کیا۔ ”کیا تم انہیں بھی جانتی ہو...؟ چوکی دار کا خیال ہے کہ وہ ٹپکے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“ سیورین نے ڈاکٹر کو خوب صورتی سے ٹال دیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بھٹل کے جاں نثار ساتھی ہوں گے۔ انہیں بھی کسی نہ کسی طرح حالات کی تھوڑی بہت بہت مل گئی ہوگی۔ بھٹل اڈے پاڈے کے لوگوں کے لیے بھی باپ کا درجہ رکھتا تھا۔ اسپتال میں اس کے داخلے کی اطلاع پا کر وہ بھی پچپن سے نہیں بیٹھے ہوں گے، ادھر ادھر سے سن سن لے رہے ہوں گے۔

”میں جانتا ہوں تم سند یافتہ اور تجربہ کار نرس ہو۔“ ڈاکٹر احسان کا لہجہ سنسنی خیز ہو گیا۔ ”لیکن کسی اسپتال کی سادھ بھی اپنی جگہ بڑی حیثیت رکھتی ہے۔ میں اسپتال کی بدنامی کی صورت پسند نہیں کروں گا۔“

ڈاکٹر احسان کا وہ تلخ جملہ برجھی بن کر میرے دل میں اتر گیا۔ اب آنکھیں بند رکھنا میرے لیے محال تھا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔

”پانی...“ میں نے سیورین سے کہا۔ وہ پانی کے لیے لپکی تو ڈاکٹر میری طرف متوجہ ہو گیا۔ ”اب آپ کیا محسوس کر رہے

ہیں؟“ اس کے لہجے میں یکھت نرمی آگئی۔ ”یہ بات آسانی سے سمجھ میں نہیں آئے گی ڈاکٹر۔“ میرے لہجے میں کھٹکے لگی۔ ”آٹھ روز آپ زندگی سے کنارہ کش ہو کر اسپتال کے بستر پر لیٹیں تو خود بھی اندازہ کر سکتے ہیں کہ یک سوئی، تنہائی اور بیماری کا احساس انسان کو اندر سے کھوکھلا کر رہتا ہے، ڈنڈے لگتا ہے۔“

”ڈنڈہ وری!“ اس نے خوش مزاجی سے جواب دیا۔ ”آپ تیزی سے ریکور کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ میں دو چار روز میں آپ کو گھر جانے کی اجازت دے دوں۔“

سیورین پانی کا گلاس لے آئی۔ میں نے دو گھنٹہ طرز کے بیچتا کر گلاس اسے واپس کر دیا۔ ”بھٹل کی حالت اب کیسی ہے؟“ میں نے ڈاکٹر سے

سوال کیا۔ ”انہیں ابھی کم زوری لاحق ہے۔ شاید ابھی انہیں ایک ڈیڑھ ہفتہ اور یہاں رکنا پڑے۔“

”میں اس سے فوری ملنا چاہتا ہوں۔“ میں نے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر کو باور کرانے کی کوشش کی۔ ”جو کسی کی جان بچانے کی خاطر اپنی زندگی داؤ پر لگا دے اسے آپ کی زبان میں کیا کہیں گے؟“

”میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔“ ڈاکٹر کا روانی ان میں بولا۔ ”ایسے لوگ قابلِ تکرار ہوتے ہیں۔“

میں جواب میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن ابا جان آجانے کی وجہ سے خاموش ہو گیا۔ شاید میرے چہرے پر زنا کی علامتیں واپس لوٹ آئی تھیں، ابا جان جبکہ بے قدم اٹھا میرے قریب آگئے۔

”خدا کا شکر ہے کہ آج تمہارے چہرے پر بیماری کا انجملا نظر نہیں آتا جو کل تک موجود تھا۔“

”مجھے بھی خوشی ہے کہ مضر باہر اب خطرے سے باہر ہیں۔“ ڈاکٹر احسان نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ میں دو چار دنوں میں...“ میں یہاں کی کھٹن سے اکتا گیا ہوں۔ میں نے ابا

سے کہا۔ ”شہر کے دو چار بڑے ڈاکٹر وں اور تجربہ کار نرسوں کا انتظام گھر پر بھی کیا جاسکتا ہے۔“

”کیوں نہیں...“ ابا جان نے بڑی شفقت سے پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ ”میں آج ہی حویلی کے ایک حصے کو کرا دوں گا، گھر یلو ماحول میں تمہاری صحت پر زیادہ خوش

”ہرین...!“ میں نے سیورین کو مخاطب کیا۔ ”میرے اہل چیتز کا بندوبست کرو، میں اسی وقت بھٹل سے ملنا چاہتا ہوں۔“ سیورین میری بات سن کر تیزی سے باہر کی

کوشش کر رہا تھا۔ ”ڈاکٹر احسان کے پیٹ پر شروع ہوگی۔“ مضر بھٹل کو ہم ان کی خندوش حالت نظر میں رکھ کر اسے زبردستی پر اثر کھتے ہیں۔“

”مندر نہ ہوں، میں اسے جھوڑ کر جگانے کی کوشش نہیں کرتا۔“ وہ بھیل چیتز لے آئی۔ وہ بھی تجربہ کار تھی، میری دلی

کا اندازہ اسے آتا تھا۔ بات اگر خطرے کی گھنٹہ وہ بھی میرے کمرے میں لیٹ کر بھٹل سے کام لے رہی تھی۔ ابا جان اور ڈاکٹر احسان کی مدد سے مجھے بھٹل وکیل

کہا گیا۔ ڈاکٹر احسان کچھ زیادہ ہی مضطرب نظر آ رہا تھا۔ اس کے اضطراب کی وہ کیفیت میری سمجھ سے بالاتر تھی۔

”پشت پر آکر وکیل چیتز سنبھالو تو ڈاکٹر احسان نے ہاتھ ہوتے ہوئے کہا۔ ”مضر باہر، چلیز، آپ بات کو سمجھنے کی

”ابا جان نے بھی ڈاکٹر کی کچھ... وہ...“ ڈاکٹر احسان راستے سے ہٹ گیا۔

”میں نے بھیل چیتز کمرے سے باہر نکالی۔ میرے دل میں غم ہونے لگی۔ ڈاکٹر کی تشویش اور بھٹل کے بارے میں خندوش ہونے والے جملے میرے ذہن میں گڈمڈ

کے دس قدم کے فاصلے پر دوسرا کرا تھا۔ ابا جان نے ارادہ کھول دیا۔ سیورین مجھے لے کر اندر داخل ہوئی تو

”میں نے ہی میں گنگ ہو گیا۔ ذہن پر سوالات کی یلغار میں بتایا گیا تھا کہ بھٹل نے ڈاکٹر احسان کے منع

”باد چھو مجھے کی بوتل خون دیا تھا لیکن اس کے سر پر وہ...“ میں نے بھیل چیتز سے کہا۔ ”میں نے بھیل چیتز سے

”میں نے بھیل چیتز سے کہا۔ ”میں نے بھیل چیتز سے

”میں نے بھیل چیتز سے کہا۔ ”میں نے بھیل چیتز سے

”میں نے بھیل چیتز سے کہا۔ ”میں نے بھیل چیتز سے

”میں نے بھیل چیتز سے کہا۔ ”میں نے بھیل چیتز سے

”میں نے بھیل چیتز سے کہا۔ ”میں نے بھیل چیتز سے

”میں نے بھیل چیتز سے کہا۔ ”میں نے بھیل چیتز سے

”میں نے بھیل چیتز سے کہا۔ ”میں نے بھیل چیتز سے

”میں نے بھیل چیتز سے کہا۔ ”میں نے بھیل چیتز سے

”میں نے بھیل چیتز سے کہا۔ ”میں نے بھیل چیتز سے

”میں نے بھیل چیتز سے کہا۔ ”میں نے بھیل چیتز سے

”میں نے بھیل چیتز سے کہا۔ ”میں نے بھیل چیتز سے

”میں نے بھیل چیتز سے کہا۔ ”میں نے بھیل چیتز سے

”میں نے بھیل چیتز سے کہا۔ ”میں نے بھیل چیتز سے

”جانے کون بد بخت لوگ تھے، انھوں نے ہیڈزس کو مار دیا۔“
 ”آپ سیتا کی بات کر رہے ہیں؟“ سیورین نے چونک کر پوچھا۔ ”جو ہمارے کمرے پر تعینات تھی۔“
 ”ہاں...“ ڈاکٹر احسان نے میری طرف غور سے دیکھا۔
 ”کیا آپ ان لوگوں سے واقف ہیں جنھوں نے آپ کو ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی؟“
 ”نہیں...“ میرا سارا وجود دھمکنے لگا۔ ”کیا آپ نے سیتا کو جانے کی کوشش نہیں کی؟“
 ”میں اس کے کمرے میں گیا تو وہ زندگی کی سرحدوں کو پھلانگ چکی تھی۔“

”اب آپ کیا سوچ رہے ہیں؟“ میں نے یہ غلط سوال کیا۔
 ”پولیس کو اطلاع دینی ضروری ہے۔“ ڈاکٹر ہاتھ ملنے لگا۔
 ”اسپتال کی رپورٹیں اب بھی خیال ہے۔“
 میرے ذہن میں بجلیاں سی کوئٹہ لگیں۔ دو اور دو چار کرنے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ جولوگ کورا کو لے گئے تھے، اب میرے اور نھل کی جان لینے کے درپے تھے۔ کورا کو پالنے کے بعد ان کے حوصلے بڑھ چکے ہوں گے۔ ممکن ہے، سیتا کو موت کے گھاٹ اتارنے سے پیش تر انھوں نے میرے کمرے میں بھی جھانکنا ہو۔ کسی خطرے سے دوچار ہونے کا خوف ان کے راستے میں حائل ہو گیا۔ وہ سیتا کو لاش کی صورت دے کر ہمارے لیے موت کا پیغام چھوڑ کر رخصت ہو گئے ہوں۔ میں نے اس وقت نھل کے کمرے میں آنے کی ضد نہ کی ہوئی تو شاید وہ نھل پر دار کر کے نکل جاتے، اور میں تمام زندگی کیف افسوس ملتا رہتا۔ ابا جان پر بھی اضطراری کیفیت طاری تھی۔

”ڈاکٹر احسان...“ انھوں نے کچھ سوچ کر بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”سیتا کو جو حادثہ پیش آچکا ہے اس میں میرے بیٹے یا نھل صاحب کا نام درمیان میں نہیں آنا چاہیے۔“
 ”لیکن...“

”میں، بابر اور نھل صاحب تو بلاتا خیر یہاں سے جانا مناسب سمجھیں گے۔“
 ”مگر پولیس تو بال کی کھال نکالنے کی کوشش ضرور کرے گی۔“ ڈاکٹر نے اپنی مجبوری ظاہر کی۔

”اس کے بارے میں آپ جو چاہیں بیان دیں۔“ ابا جان نے اپنا اٹل فیصلہ سنا دیا۔ ”آپ کے اسپتال کی انھیں سیکورٹی بھی ہیڈزس کی موت کی ذمہ دار ہے۔“

ڈاکٹر احسان تملاناہو اکمرے سے باہر نکل گیا۔
 بھی اس کے پیچھے چلی گئی۔ میرے ذہن میں جاگت قبیلہ لوگ گردش کرنے لگے۔ ایک کام بابی نے ان کے حوصلے کر دیے تھے۔ شاید انھوں نے سارے کانٹے درمیان نکالنے کا حتمی فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ بھی جانتے ہوں گے کہ نھل نھل کورا سے سے بٹانے کے بعد پھر کسی کورا کی ذات کوئی دل چسپی نہیں ہوگی۔ اڈے باڈے کے لوگ دو کی مار لیں گے۔ اشتعال کی آگ چمکتی ہے تو اپنے اور پرانے تیز نہیں کرتی۔ جاگت قبیلے کے سر پھرے اپنا مقصد کرنے کے بعد پہلی فرصت میں واپسی کی راہ اختیار کریں شیعے کی بنیاد پر اڈے کے سر پھرے ہنگامے سے باز نہیں آ گئے۔ بہت سے خائفین بھی بلا وجہ کام آجائیں گے، گے ہوں ساتھ گھن بھی پس دیے جائیں گے۔ سچ یا غلط کا فیصلہ ہوگا، محبت اور جنگ میں ازل سے یہی ہوتا آیا ہے!

میرے لیے ابا جان کی پریشانی بھی بے جا نہیں تھی پولیس پچھری سے ہمیشہ دور رہنے کے لیے تھے۔ میں رہا تھا کہ ڈاکٹر احسان ان کے حکم سے رُکروا کر غلط کرے گا۔ سیتا کی موت کے دس جواز تلاش کر لیں۔ ہم دونوں ہی اپنے خیالات میں گم تھے کہ سیورین آگئی۔ وہ تنہا نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ہمیں کا استاد بنار فیض آباد کا جامو بھی تھا۔ اس وقت دونوں کے لباس کوئی بھی انداز نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ کس کینڈے سر پھرے افراد تھے۔ دونوں نے باری باری مجھے اور دیکھا۔ بنارس مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ابا جان انھیں بولنے کا موقع نہیں دیا۔

”سیورین نے ذہانت کا ثبوت دیا جو آپ حضرات آئی۔ آپ دونوں ادھر ہی رہیں۔ میں ابھی بابر اور صاحب کو جو بی نھل کرنے کے انتظامات کرتا ہوں۔“
 ”سب خیریت تو ہے، بڑے صاحب؟“ جامو کھا کر پوچھا۔ ”کوئی ایسی ویسی بات ہوگی ہو تو ہم کس کی موت نے آواز دی ہے؟“

”ہم آپ کے تابع دار ہیں۔“ بنارس بھی چپ نہ رہا۔ ”آپ خالی اشارہ کر دو... باقی جھاڑ پھیرنے میں نہیں کریں گے۔“

ابا جان نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموشی سے گئے۔ سیورین نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تو جامو کا مات

”بات ہے لاڈ لے جانی...؟ یہ بڑے صاحب ہمارے پریشان کیوں ہیں، امین کو بول، کس حرام کے جنے کی بات ہے دعوت دی ہے؟“
 ”بہال نہیں...“ میں نے انھیں نالماناسب سمجھا۔ ”حویلی الہا لہینان سے باتیں ہوں گی۔“
 ”بڑے صاحب نے اچانک ادھر سے نکٹ کٹانے کا اہلہ کیوں کر لیا؟“ بنارس نے نھل پر نظر ڈالی۔ ”ابھی اسے استاد کی طبیعت ٹھیک نہیں دکھائی دیتی۔ اتنی جلدی ہاؤش آگئی؟“

”کہنا نا... حویلی چل کر اطمینان سے بات ہوگی۔“ میں نے زنی کا اظہار کیا تو دونوں خاموش ہو گئے۔
 ”نھل نیند میں چلا گیا۔“ سیورین اس کے سر ہانے بیٹھ کر رہا۔ ”سب کی اس میں نھل کے سر پر مرکوز تھیں۔“
 ”وجود میں انتقام کی چنگاریاں شعلوں کا روپ اختیار کر لیں...!“

ابا جان کی کوششوں اور اثر رسوخ کے تحت میں اور نھل دو کے اندر اندر اسپتال سے منتقل ہو کر حویلی آگئے۔ زرین ابی گمرانی میں مہمان خانے کے دو کمرے کو خالی کرانے کے لیے اسپتال کے انجنس وارڈ جیسا بنادیا تھا۔ دولت میں

سارے انتظامات مکمل کر لیے گئے تھے۔ ہم اب پولیس کے حویلی پہنچے تو باہر گھر والوں کا ہجوم ہمارا منتظر تھا۔ سب ہمیں براغضب تھا۔ نھل کی بے ہوش برقراری، اسے ہار پر ڈال کر بستر تک پہنچایا گیا۔ جامو اور بناری مجھے سہارا دے تھے۔ میں نے بستر پر لیٹ کر سکون کا سانس لیا۔
 ”کمرہ ہی ہوتا ہے۔ اسپتال کے ہوشل ماحول میں مریض تو اس صحت مند آدمی کو بھی اپنی سانس نکلتی محسوس ہوتی ہے۔“
 ”لوگوں کی گرہیں تیار داروں کی آمد و رفت اور طرح طرح کی باتیں افسانہ اور ماحول کو سوگ وار بناتے رہتی ہیں۔ گھر پر اس کا کم ہے، دوسروں کی محتاجی نہیں ہوتی، ایک اشارے سے کام لے کر انداز میں ہوتے چلے جاتے ہیں۔“

”ہمارے کمرے کے ساتھ ہی ایک کمرہ ڈاکٹروں اور نرسوں کے لیے الگ آفس ریزرو کر دیا گیا تھا۔ بارہ دری میں اڈے کے لوگوں نے قبضہ جمایا تھا۔ وہ سب جانے پہچانے کے تھے۔ ان کی آمد و رفت پر اعتراض نہیں کیا۔“

ڈاکٹر احسان کے علاوہ ابا جان نے دو ماہرین اور رات دن کی ڈیوٹی کے لیے چار نرسوں کا انتظام کر لیا تھا۔ سیورین بھی ان کے ساتھ ساتھ گھر رہتی۔

ایک دن سکون سے گزر گیا۔ نھل کی طبیعت کچھ بہتر ہو رہی تھی۔ مجھے سیورین کے ذریعے اس کی خبریں ملتی رہتیں۔ میں چاہتا تو وہیل چیئر پر بیٹھ کر اس کے کمرے میں بھی جاسکتا تھا لیکن میں خود بھی نھل سے شرمندہ تھا۔ بیماری کی کیفیت میں اس کا سامنا کرنے سے گریز ہی مناسب تھا۔ ڈاکٹر تیمارداری کر کے فنی دوائیں تجویز کر کے چلے جاتے تو اڈے باڈے کے لوگ باری باری ہماری خیریت دریافت کرنے آتے رہتے۔ اس وقت میرے پاس جبرو بیٹھا تھا۔ میری طبیعت کی بہتری کا اندازہ لگا لینے کے بعد بولا۔ ”خاموشی سے کام نہیں چلے گا لاڈلے! اگر کسی حرام کے ختم نے امین کا رستہ کھٹا کر کے کی کوشش کی ہے تو صرف اس کا نام بتادے۔ امین اسے پاتال سے بھی گھسیٹ لائے گا۔ امین نے چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں۔ اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دیا تو استاد کے نام کو بکا لگ جائے گا۔ امین کا ایک فارمولا یاد رکھ جانی۔ جب تک کسی کی ماں کے ساتھ رشتے قائم نہیں ہوتا، سالا بیٹا بھی باپ نہیں بولنے کا۔“
 ”تھوڑا وقت اور زور جائے دو، نھل ٹھیک ہو جائے تو سر جوڑ کر کوئی فیصلہ کریں گے۔“

”یہ سالا ماہرین لوگ کاٹھم کیا بولتا استاد کے بارے میں؟“

نوجوان نسل کے نمائندہ شاعر کا شرف حسین غازی کا پہلا شعری مجموعہ

ماتے گھر میں ہانے دیتے

ماہ جون 2010

153، بلاک 5، گلشن اقبال، کراچی

asifarrukhi@hotmail.com

103

فروری 2010

”ان کا خیال ہے کہ ایک دو دن میں سر کی پٹیاں محل جائیں گی۔ اس کے بعد زخم پر تھکڑے لگائے جائیں گے۔“

ہمارے درمیان بات ہو رہی تھی کہ بنارس نے آواز دے کر جھڑپا کر دیا۔ باہر سے دو تین گاڑیوں کے رکنے کی آواز آئی۔ میں نے نظر گھما کر دیکھا، وہ سب پولیس کی گاڑیاں تھیں۔ میں نے انسپٹر بلرام کو چیپ سے اترتے دیکھا تو میرا ماتھا ٹھکا۔ وہ فیض آباد میں ڈی آئی جی سریندر کپور کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ فیض آباد آنے سے پہلے وہ بمبئی میں اڈے کے علاقے کا تھانہ انچارج بھی رہ چکا تھا۔ دو تین گاڑیوں میں بارودی پولیس والے بھی ساتھ تھے۔ اس کے آگے کا کوئی خاص مقصد ضرور ہوگا۔ دوسری گاڑیوں سے دس بارہ پولیس والوں نے نیچے کود کر اس طرح پوزیشنیں سنبھال لیں جیسے پوری حویلی کو گھیرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ سیورین میرے پاس آگئی۔ میں نیکی کے سہارے پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میری نظریں انسپٹر بلرام پر مرکوز تھیں۔ وہ بڑے مطمئن سے ”کڑک وردی پہنے میرے کمرے کی طرف آیا تھا۔ باہر جو ملازم موجود تھا وہ اباجان کو خبر دینے دوڑا۔ بلرام قدم مارتا اندر آ گیا۔“

”میں نے سنا ہے کہ آپ جس اسپتال میں تھے وہاں کی ہیڈنرس کو کسی نے زہر دے کر مار دیا؟“

”انسان مرنے ہی کے لیے پیدا ہوتا ہے۔“ میرے لہجے میں تلخی تھیں۔ ”جب وقت آ جاتا ہے تو بات انسان کے بس میں نہیں رہتی۔“

”تھکنے کہاں ہے؟“ بلرام نے اگلا سوال کیا۔

میں اس کے آنے کا مطلب نہیں سمجھ سکا تھا۔ بدستور کھر درے لہجے میں بولا۔ ”وہ دوسرے کمرے میں ہے۔“

”سنا ہے وہ بھی کچھ زخمی ہے؟“

”آپ کس مقصد سے آئے ہیں؟“ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا۔

بلرام کے جواب دینے سے پیش تر اباجان بھی قدم مارتے اندر آ گئے۔ پولیس کی آمد کی اطلاع نے انھیں بھی حواس باختہ کر دیا تھا۔ ”کیا بات ہے؟“ انھوں نے بلرام پر اچھتی نظر ڈال کر مجھے مخاطب کیا۔

”پرانے واقف کار ہیں...“ میں نے طنز کیا۔ ”شاید میری اور تھکنے کی خیریت دریافت کرنے آئے ہیں۔ یہاں

آنے سے پہلے بمبئی میں تعینات تھے۔“

”آپ کھڑے کیوں ہیں... تشریف رکھیے۔“ اباجان بلرام کی طرف گھوم گئے۔

”مستر باہر...“ بلرام نے اباجان کی پٹیلی بدلی۔ ”آپ شاید کسی وجہ سے مجھ سے ناراض ہیں۔ پولیس اور جتنا کہ درمیان غلط فہمی پیدا ہونا کوئی نئی بات بھی نہیں۔ لیکن اس وقت میں آن ڈیوٹی ہوں۔“

”کیا چاہتے ہیں؟“ میں نے وضاحت چاہی۔

”آپ نے اسپتال چھوڑنے کا فیصلہ اچانک کیوں کر لیا...؟ کیا وہاں کوئی تکلیف تھی؟“

”میں سمجھا نہیں...“ میں نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

”کیا اسپتال کی تبدیلی کے لیے بھی اب پولیس کی اجازت ضروری ہو گئی ہے؟“

میرے سوال کی تکی کارنگ ایک لمحے کو بلرام کے چہرے پر نمایاں ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ انٹینشن پوزیشن میں آ گیا۔

باہر پھر کسی گاڑی رکنے کی آواز ابھری تو میری نظریں پھر دروازے کی طرف چلی گئیں۔ بلرام اور پولیس والوں کی آمد کی وجہ سمجھنے میں مجھے دیر نہیں لگی۔ لمبی سی پچھاتی گاڑی دروازہ ایک پولیس والے نے کھولا پھر اس میں سے جو شخص

عمودار ہوئی وہ ڈی آئی جی سریندر کپور کی تھی۔ میں نے اپنے انداز کو تبدیل کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ اس وقت وہ تھری ہیں سوٹ میں بھی خاصا بھاری ہتھیار ہی نظر آ رہا تھا۔

سریندر کپور اپنے گھر پر اس انداز میں ملتا تھا اس کا ایک ایک منظر میرے ذہن پر نقش تھا۔ اس وقت وہ پورے ہوٹل حواس میں ایک مہذب اور ذمے دار آفسر نظر آ رہا تھا۔ باہر کھڑے ہوئے پولیس والے اسے دھڑا دھڑکیلاٹ مار رہے تھے۔ انسپٹر بلرام بھی اس کے استقبال کو تیزی سے آگے بڑھا۔

میں نے مختصر الفاظ میں اباجان کو اس کے بارے میں بتا دیا۔ وہ بھی سمجھ گئے۔

سریندر کپور سڑھیاں پھلانگتا میرے قریب آ گیا۔

میں نے اباجان سے اس کا تعارف کرایا۔ سریندر کپور نے بڑے احترام سے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا پھر میرے قریب بستر پر بیٹھ گیا۔

”ہنگ مین... اب کیسا فیل کر رہے ہو؟“ اس کا انداز دوستانہ تھا۔ ”مجھے کچھ دیر پہلے شکلا جی کا فون ملتا تھا۔ زیادہ بات نہیں ہو سکی۔ وہ جلدی میں تھا، ایک دو دن بعد آنے کو کہہ

اس کے ذریعے مجھے تمھارے اچانک اسپتال سے گھر کی اطلاع ملی تو سمجھ گیا کہ اس اچانک فیصلے کی کوئی خاص وجہ ہوگی۔“ وہ روانی سے بولتا رہا۔ ”یہ بھی خبر مل چکی ہے کہ اس کی ایک ہیڈنرس کو زہر دے کر مارا گیا ہے۔ تمھانے کے دل میں لگے ہیں، میں تمھاری خیریت دریافت کرنے کے لیے یہی درخواست کی تھی۔“

میں نے سکون کا سانس لیا۔ انسپٹر بلرام، ڈی آئی جی کا لنگھوٹن کھڑے ہی کھڑے چہرے لگا۔

”آپ کی ذمہ داری ہے جو آپ نے زحمت کی۔ میں اس کا شکر ادا کرتا ہوں...“

”آپ میرے ساتھ آ رہے ہیں؟“ سریندر کپور نے اباجان سے دوبارہ ہاتھ ملایا۔ ”آپ کا نام کئی سال تک آچکا ہے۔ آج ملاقات بھی ہوئی، اب آنا جانا

میں یوں ہوا کے گھوڑے پر سوار آنا کچھ عجیب سا لگتا ہے۔“

”فارمیٹی...“ سریندر کپور نے مسکرا کر کہا۔ ”مستر بلرام، دوست ہیں، آپ جب بلائیں گے سر کے بل

لوں گا۔“

”اباجان نے انکار سے کہا۔“

”مستر باہر...“ ڈی آئی جی پھر میری طرف گھوم گیا۔

”اباجان، لائف لائف ہیڈنرس، انسان پوری طرح فٹ نہ ہو سکتا۔“ انجوائے نہیں کر سکتا۔“ آخری جملہ ادا کرتے

شاید اس نے پہلی ملاقات کے حوالے سے زندگی انجوائے کی بات کی جانب اشارہ کیا تھا پھر جانے کے لیے پڑا۔

”میں ایک ضروری میٹنگ میں جا رہا تھا، شکلا جی کا فون ملا۔“

”اباجان، ہائی دی وے، تمھیں اسپتال والوں کی دعا ہے؟“

”ہی نہیں...“

”میں پوری طرح ریکور ہوئے بغیر گھر آنے کی کیا بات کر رہا ہوں؟“

”وہاں کے ماحول سے آگیا گیا تھا۔“ میں نے بہانہ

بستر پر بیٹھ گیا۔

”ہنگ مین... اب کیسا فیل کر رہے ہو؟“ اس کا انداز دوستانہ تھا۔ ”مجھے کچھ دیر پہلے شکلا جی کا فون ملتا تھا۔ زیادہ بات نہیں ہو سکی۔ وہ جلدی میں تھا، ایک دو دن بعد آنے کو کہہ

بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ پولیس کی گاڑیاں بھی حویلی کے احاطے سے نکل گئیں۔ انسپٹر بلرام بھی چلا گیا۔ جب روانہ ہوتے وقت اس نے بھی میری سمت دیکھ کر دوستانہ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائی۔ سریندر کپور کے آنے کے بعد شاید اسے بھی میری حیثیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ یہ دینا بھی کیا عجیب ممتا ہے۔ یہاں انسان کی اپنی کوئی حیثیت نہیں، اسے مختلف حوالوں سے شناخت کیا جاتا ہے، تعلقات کی بنیاد پر اس کے چھوٹے یا بڑے ہونے کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔

سریندر کپور کا اباجان کی حویلی آنا ہم سب کے لیے نیک شگون تھا۔ وہ کوئی چھوٹی موٹی شخصیت کا مالک نہیں تھا۔ فیض آباد کا ڈی آئی جی تھا، بادشاہ تھا۔ اس نے گھر سے نکلے وقت یہی کہا ہوا کہ کسی اہم میٹنگ میں جانا ہے، اس کی حیثیت کے مطابق پولیس کے بارودی اسلحہ بردار سپاہی بھی بغیر کسی توقف کے پورے کیل کاٹنے سے لیس ہو کر بیچوں میں بیٹھ گئے ہوں گے۔ انسپٹر بلرام جو اس کا رابطہ افسر تھا، وہ بھی بڑے مطمئن سے ڈم چھلے کی طرح ساتھ لگ گیا ہوگا۔ راستے میں سریندر کپور نے میری حویلی کا ذکر کیا تو شاید اس کی باچھیں کھل گئی ہوں گی۔ یہی سوچا ہوا کہ شاید ڈی آئی جی کو کبھی بمبئی میں تھکنے کے ہاتھوں گوم کر قتل اور وہاں کے معاملات کے بارے میں بھٹک ل گئی ہو۔ یہ بھی پتا چلا ہوگا کہ میں تھکنے کا دست راست فیض آباد آ گیا ہوں۔ سریندر کپور کے بارے میں ایس پی شکلا نے مجھے ہی بار بار کہا تھا کہ اس کے نجی معاملات اور ذاتی حیثیت میں کارکردگی کے جوہر دکھانے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جو کوئی دوسرا آفسر نہیں کر سکتا۔ وہ سریندر کپور بے دھڑک کر گزرتا تھا۔

میں اس کی تلاش میں کوئی پتہ نہ پانچا تو مجھے دیکھ کر خود انسپٹر بلرام کی نگاہوں میں چکا چوند ہو گئی۔ اس نے بڑی رعوت سے مجھے تم کہہ کر مخاطب کیا تھا، آج سریندر کپور کی وجہ سے مجھے آپ کہنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ حویلی میں اپنے افسر کے روئے کودیکھ کر اس کی چھاتی پر سانپ ضرور لوٹے ہوں گے۔ یہ بھی جان گیا ہوا کہ سریندر کپور ایک دوست، واقف کار کی حیثیت سے میری خیریت دریافت کرنے آیا تھا، بار بار ایس پی شکلا کا نام بھی درمیان میں آیا تھا جس نے بلرام کی ڈم بھی سیدی کر دی ہوگی۔ وہ جاتے جاتے، نگاہوں نگاہوں میں مجھے دوستی کا پیغام بھی دینا نہیں بھولا تھا۔

سریندر کپور سے پہلی ملاقات میں میں نے اس کے ذاتی

کردار کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ اُس وقت وہ اپنی خواب گاہ میں محض ایک دھوپ میں تھا۔ دھوپ بھی برائے نام اس کے جسم کی ستر پوشی کر رہی تھی۔ وہ ایک بدنسی حسینہ کے ساتھ موج میلے میں مگن تھا۔ ڈرپوک آفسر ہوتا تو مجھے اس رنگن ماحول میں کبھی نہ بلاتا، غیر ملکی پھوچھڑی مجھ پر ریشہ خلی ہونے لگی تھی۔ اس نے مجھے پیٹنے پانے کی دعوت دی تھی۔ سریندر کپور نے بھی پیش کش کی تھی۔ میں ایک دو لمبے پیگ حلق کے نیچے اتار لیتا تو شاید اُس حمام میں ایک اور نگے کا اضافہ ہو جاتا۔ مجھے سریندر کپور کی موجودگی میں کھل کھینے کا موقع نہ ملتا۔ وہ یقینی طور پر ل بانٹ کر عیاشی پر بھی آمادہ نہ ہوگا۔ محتاط افسر نہ ہوتا تو اس نے ولایتی مال کا انتخاب نہ کیا ہوتا۔ تجربہ کار تھا، جانتا ہوگا کہ دیسی کبجریاں پورے لباس میں آنے کے بعد ساری رازداری کی باتوں کو طشت از بازم کر دیتی ہیں۔ اسپورٹس سارا سائن میں باتوں کا خاص خیال رکھتی ہیں۔ وہ ذاتی تعلقات میں کسی کی دخل اندازی کو پسند نہیں کرتیں۔ انسانی قدروں اور اپنی اپنی تہذیب کی روایتیں ہیں۔ مشرق میں باپ کی موجودگی میں بیوی شوہر کی طرف ایک شوخ نظر اٹھانے کو بھی بے حیائی سمجھتی ہے۔ مغرب میں شوہر کی موجودگی میں بھی کسی غیر مرد سے گرم جوشی کے ساتھ بغل گیر ہو جانے کو تہذیب کا نام دیا جاتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے نجی معاملات کے بارے میں بھی چھان پھنگ نہیں کرتے۔

یہ ہر حال، سریندر کپور سے میری ملاقات جس ماحول میں ہوئی تھی اسے سریندر کپور بھی کبھی فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ اسے شکلا کی زبانی اسپتال میں سیتا کے پُر اسرار لک کی تفصیل بھی معلوم ہو گئی ہوگی۔ اسی وجہ سے اس نے صرف مجھی سے پوچھنے پر انکشاف کی تھی کہ پوری طرح صحت یاب ہوئے بغیر میں یہ غلط حویلی کیوں آ گیا؟ سید کی موت کا اس نے جان بوجھ کر ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا ہوگا۔ کوئی اور ہوتا تو میری مزاج پر سی کے بہانے بال کی کھال لٹکانے کی کید میں لگ جاتا۔ سریندر کپور نے ایسا کچھ نہیں کیا، سب سے بڑی خندہ پیشانی سے ملا۔ جاتے جاتے یہ بھی کہہ گیا کہ اب آتا جانا لگا رہے گا۔

میں اپنے خیالات میں محو تھا کہ ابا جان دوبارہ آگئے۔ سیورین میر سے قریب ہی تھی۔

”میں ابھی تک یہی محسوس کر رہا ہوں کہ میں نے جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھا ہے۔“

”جی... میں سمجھا نہیں؟“

”سب تمہارے شکلا جی کی مہربانی ہے ورنہ میں اتنے

عرصے سے فیض آباد میں ہوں، سارے بڑے افسر اور معززین سے کسی نہ کسی طور واقف ہوں لیکن سریندر کپور بارے میں صرف ایک ہی بات سب کی زبان سے سنی ہے کہ وہ تک چڑھا اور بد دماغ ہونے کے علاوہ اپنی سرزمین مالک ہے۔ شاید بہت دور تک اس نے اپنی جزیں مضبوط رکھی ہیں۔ آئی جی اور ہوم نشرو کبھی خاطر میں نہیں لاتا۔ بھی اس سے کوئی کام کہتے ہوئے کتراتے ہیں۔“ ابا جان کچھ توقف سے گویا ہوئے۔ ”اس کا اس طرح حویلی آ تمہاری عیادت کرنا اور مجھ سے یہ کہنا کہ میں اس کے سامن ہوں، بڑی بات ہے۔“

ابا جان بڑی دیر تک سریندر کپور کے بارے میں معلومات سے آگاہ کرتے رہے۔ زرین نے بھی پہلی بارم زبان سے سریندر کپور کا نام سُن کر کسی اچھی رائے کا اظہار کیا تھا، دلی زبان میں گریز کا مشورہ دیا تھا۔ اس وقت ابام اسی کے گن گار رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ انسان کی کتنا غرض ہوتا ہے، مطلب پرست اور وقت کا پھول کی طرح زیادہ برق رفتاری سے رنگ بدلنا ہی اس کی فطرت ہے۔ کورا کے نقشے سے جاگت قبیلے کے خزانے تک خاطر وہ صرف اپنی ضرورت اور ذات سے تھی ہو گئے۔ در بدر ہو گئے، بیش بہا نہ خزانہ ہاتھ آیا تو ان کی حیثیت رکھ کر گفتگو کا انداز، اٹھنا بیٹھنا، بدن بن، طور طریق، سب کچھ گیا۔ حیثیت بھی بڑھتی، عزت و وقار کا گراف بھی بلند ہو گیا۔ اس وقت سریندر کپور کے ساتھ ایک بار گرم جوشی سے ملانے کے بعد ان کے خون کی کوئی پھرتیہ نہ ہوئی۔ سریندر کپور کو ایک غیر ملکی حسینہ کے پہلو میں درجہ حرارت کرنا دیکھ لیتے تو ناک بھونچ رہا نہ لیتے۔

”تم سے ایک ضروری بات اور کرنی ہے۔“ ابا جان سریندر کپور کا قصیدہ ختم کرنے کے بعد کہا۔ ”میں نے تم مشورہ کیے بغیر ہی اڈے پاڑے کے افراد کو عبثی دروازے وقتی طور پر سامنے سے ہٹا دیا تھا۔ پولیس کی گاڑیاں دیکھ کر ہی کے ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔ ہٹل صاحب ہوش میں تو میں انھیں وقتی مصلحت سے ضرور آگاہ کر دیتا۔“

”آپ نے جو اقدام کیا وہی مناسب بھی تھا۔ جامو اور بناری کو سمجھا دوں گا کہ وہ بھی خیال رکھیں، وقت میں دو چار آدمیوں سے زیادہ جمع نہ ہوں۔ حال ہمیشہ یکساں نہیں رہتے، آج سریندر کپور اپنی مرضی سے

صرف انسان کی زندگی ہی پانی کا بلبلہ نہیں ہوتی، حیات کا ایک ہر ہلکی سامتوں کا دست نگر ہوتا ہے۔ ایک پل میں، ایک لمحہ ہی حالات بدل جاتے ہیں، کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ اسی اکیلیت کا شکار تھا۔ ایک لمحہ قبل مجھے ابا جان

جدید لغت

بڑھاپا:... رومی کی نوکری یا نوکری کی رومی

بڈھا:... چلتا پھرتا اسپتال

مچھر:... گانا گا کر آپ کا خون چوسنے والا۔

ہارٹ اٹیک:... آخرت کے لیے شارٹ کٹ۔

موت:... ہر گم کا خاتمہ

شادی:... ہر خوشی کا خاتمہ

سونا:... مردوں کے لیے آرام... عورتوں کے لیے زیور

زبان:... اچھی چیز ہے بشرطیکہ عورت کی نہ ہو۔

سیاست دان:... وہ مرگرت جو ہر وقت رنگ بدل

سکتا ہے۔

لیڈر:... جو ہر سنگھٹ کو آم مہایت کر سکے۔

اسمبلی:... تمام جس میں سب بنگلہ شہر چاہتے ہیں۔

ابن سن جمان آبادی کے نام سے

سے شکوہ تھا کہ وہ کورا کی جانب سے بے پروا تھے۔ اب ان کی وابستگی اور وارثی کا عالم دیکھ کر میرا سارا شکوہ تمام شکایتیں دُور ہو گئیں۔ حالات اور انسان کے درمیان آنکھ بھونچ کر رشتہ ازل سے قائم ہے۔ میں اس سے ہمراہیوں کر ہو سکتا تھا۔ سامنے اور حادثات اچانک رونما ہوتے ہیں۔ انسان کا بس نہیں چلتا۔

کاٹھیا واڑ کے نام و روڈ کارکنی کار اور اس کے بیکٹروں ساتھیوں نے جس وقت سمندری جہاز پر حملہ کر کے انگریزوں کے ساتھ ہمیں بھی ان کا نمائندہ جھگڑ کر پھال بنالیا تھا اس سے چند لمبے پیش تر ہم نے کسی ایسے حادثے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ہم بیٹھے۔ پروفیسر تھا پیسن کے ساتھ

ہندوستانی تہذیب، تاریخ اور ثقافت کی باتیں کر رہے تھے جب ولایتی شراب کی خوش بو اور تیزی نے دیکھی ٹھڑے کی ایسی تیزی کر دی تھی۔ ٹوٹی کی فرمائش پر جب چھچھاتی بوتل کا کارک اڑا گیا تو زور اور جرم وہی فاقہ زدوں کی طرح اس برٹوں پڑے۔ دو تین پیگ غناغٹ حلق سے معدے میں پھٹل کرنے کے بعد ہی ٹوٹی ترنگ میں لہراتا ہوا اٹھ کھڑا

ہوا۔ نشے کی کیفیت میں چھوٹے بروں، اچھے اور برے کی تمیز بھی مٹ جاتی ہے۔ ٹوٹی بھی میجر برنارڈ کی بیوی مایا کو رقص کی دعوت دے بیٹھا۔ ٹوٹی کی جگہ کوئی ولایتی ہوتا تو میجر کی پیشانی بھی شکن آلود نہ ہوتی لیکن مایا کو ایک ہندوستانی

کے ساتھ قص کرتا دیکھ کر وہ مضطرب نہ کر سکا، کم ظرفی پر اتر آیا۔ پروفیسر کے احتجاج کے باوجود ہمیں اس حصے سے نکال باہر کیا جو صرف خاص اور اونچے طبقے کے لیے وقف تھا۔ میرا بھی خون کھول کر رہ گیا۔ پھل کی موجودگی میں، ہم خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے۔ پھل کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی ٹوٹی، جرد اور زور آئے سے باہر ہو گئے۔ جرد نے ریلنگ کے پاس آکر لڑکھرائی آواز میں کہا۔ ”تُو نے ٹھیک ہی مشورہ دیا تھا لاڈ لے جانی۔ میرا مستک پھر جاتا تو استاد اتن کو بھی معاف نہ کرتا مگر... ہم کس، اتن، اس حرامی لال بندر کو چھوٹے نہ سنبھلیں، کلف لگے کپڑے کی طرح اکڑ رہا تھا۔ اتن نے اس کا سارا ماڈ دوسرے راستے سے نہ نکال دیا تو نام بدل دینا۔“

”لیکن کیا
کرنے لگی۔

”ابا جان کی خاموشی میرے اندر دھمک“ ”ابا جان؟“ متبرک کا غذات کے حصول کے بعد

کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ تنگ دستی حد سے گزر جائے تو پھر غلامی کی حدیں شروع ہو جاتی ہیں۔

ہو حالات کو کھنگالنے والے؟“

لیکن وہ خاموش کھڑی رہی۔ میں اس کے چہرے کے تاثرات پر ہنستا رہا۔

”آپ نے وقت پر دوا نہ پی تو میں ڈاکٹر سے شکایت کر دوں گی۔“ سیورین سمجھ دھاری۔ نرس کے ہاتھوں سے دوا لے کر خود میرے قریب آگئی۔ ایک ہاتھ سے سہارا دے کر اس نے کڑی سی دوا میرے حلق کے اندر اُنڈیل دی۔ نرس خاموشی سے دوسرے کاموں میں مشغول ہوگئی۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا، میں نے دوا پی کر دوسری طرف کروٹ بدلی، آنکھ موندیں تو کورا کا بے بس تصور پھر نظروں کے سامنے ابھر آیا۔ سیورین دوبارہ سر ہانے بیٹھ کر میرے بالوں میں انگلیوں سے کھینچنے لگی۔ میرے ذہن پر غوغا کی طاری ہونے لگی! ایک دن، ایک رات اور زندگی کے کھاتے سے منہا ہو گئے۔

دوسری صبح میں ناشتے سے فارغ ہوا تو ابا جان آگئے۔ انھوں نے سیورین اور نرس کو اشارہ کیا، وہ لپک کر وھیل چیئر لے آئیں۔ میں نے ابا جان کے چہرے پر نظر ڈالی پھر ان کا اشارہ دیکھ کر اپنے وجود کو وھیل چیئر پر منتقل کر دیا۔ سیورین نے پیچھے آکر وھیل چیئر کو آہستہ سے آگے بڑھایا۔ نرس نے وہ دروازہ کھول دیا جو میرے اور ہتھل کے کمرے کے درمیان تھا۔ میرے اندر ٹوٹ پھوٹ شروع ہوگئی۔ میں جانتا تھا کہ ہتھل مجھ سے ناراض ہوگا۔ اس کی خشکی اس کی محبت کی دلیل تھی۔ وہ میرا محسن تھا، میرا اتالیق تھا، میرا استاد تھا، میری اساس تھا۔ اسی کی تراش خراش نے مجھے نئی زندگی عطا کی تھی ورنہ جیل میں کم عمری میں سزا بھگتنا میرے لیے عذاب بن جاتا۔ لیکن ہتھل نے مجھے بیٹوں کی طرح اپنا لیا تھا۔ اس کے ساتھی بھی اپنے استاد کی محبت محسوس کر کے میری دل جوئی میں لگ گئے۔ میں رد برد رہنے سے بچ گیا۔ کوئی اور ہوتا میری جگہ تو جیل کی چار دیواری میں ہی سسک سسک کر مر جاتا۔ باہر آتا تو دائمی مریض بن کر سڑکوں پر گھسٹتا پھرتا لیکن میں ہتھل کی وجہ سے ایم اے کر کے جیل سے باہر آیا تھا۔ اس کی مہربانی میری زندگی کا سرمایہ تھی۔ اس نے مجھے مٹی سے کندہ بنادیا تھا۔

میرے ذہن میں ماضی کی داستان کسی فلم کی طرح چلتی رہی۔ پھر میں دوسرے کمرے میں داخل ہوا تو ہتھل کی نظریں مجھ پر جم کر رہ گئیں۔ وہ کئی تئلیوں کے سہارے آدھا لیٹا آدھا بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی ہی ویرانی تھی۔ اس کی نظروں میں

ایسے تھتھرے میں جن کی تاب نہ لاسکا، جھل ہو کر میں جھک لیں۔ کمرے میں اس وقت جامو اور بناری بھی موجود تھیں۔ سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ کس کی جرأت تھی جو ہتھل کے معاملے میں زبان کو جنبش دیتا۔ ہتھل کی نگاہوں میں شکوہ تھا، شکایتیں تھیں۔ میں اس ان کا کوئی موثر جواب نہیں تھا۔ تا دیر کر۔ ٹھہر بیٹھنا طاری رہا پھر سیورین نے ہمت کی، وہ ”اب کیسے ہو بابا...؟“ سیورین کی آواز سے سنا چھٹنے لگا۔

”زندہ ہوں۔“ ہتھل نے گھٹی گھٹی آواز میں جواب دیا۔ ”میں سیورین ہوں بابا...“ وہ لاڈ کرنے لگی۔ ”مجھے بتائیے کہا تھا۔ یاد ہے؟“ ”سب یاد ہے رے...“ ہتھل نے مجھے ستانے ”بھول جاتا تو یہ حال نہ ہوتا۔“ ”تم ایک دودن میں بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔“

”ہاں... میں اوپر سے ٹھیک ہو جاؤں گا۔“ ہتھل گہرا طنز کیا۔ ”اندر کے حال کی کسے پروا ہے رے...؟“ ”مجھ سے بھی خفا ہو بابا...؟“ سیورین نے ان کا شہادہ سینے پر سر رکھ دیا۔ میں نے تو تھوڑی سی بار اٹکا نہیں کیا۔ ”تو تو میری گجریا بھری لاڈلی ہے۔“ ہتھل سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرے لگا۔ ”تجھے کون ناراض ہے رے۔“

”تم نے دیکھا بابا...“ سیورین اصل موضوع کی آگئی۔ ”کون آیا ہے تمھیں دیکھنے؟“ ”دیکھ رہا ہوں...“ وہ اُپٹی ہوئی آواز میں بولا۔ ”رہا ہوں اور کچھ بھی رہا ہوں۔“ ”کیا سمجھ رہے ہو...؟“ میں برداشت نہ کر سکا۔ اٹھا کر اسے گھورتے لگا۔ میرے اندر بھی شعلے لپک رہے۔ ”اب اس کے سوا کیا سمجھ سکتا ہوں رے...؟“ صاحب کا شہزادہ میرا حال کو چھپنے کو آیا ہے۔ ”ہتھل کا ہوا گیا۔“ بڑی کر بیا... بڑی مہربانی! ”اپنے لاڈ لے کو لغت ملا مت کر رہے ہو؟“ میں سگ۔ ”آپ ہی بولو بڑے صاحب۔“ ہتھل نے ابا

ایسے تھتھرے میں جن کی تاب نہ لاسکا، جھل ہو کر میں جھک لیں۔ کمرے میں اس وقت جامو اور بناری بھی موجود تھیں۔ سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ کس کی جرأت تھی جو ہتھل کے معاملے میں زبان کو جنبش دیتا۔ ہتھل کی نگاہوں میں شکوہ تھا، شکایتیں تھیں۔ میں اس ان کا کوئی موثر جواب نہیں تھا۔ تا دیر کر۔ ٹھہر بیٹھنا طاری رہا پھر سیورین نے ہمت کی، وہ ”اب کیسے ہو بابا...؟“ سیورین کی آواز سے سنا چھٹنے لگا۔

”زندہ ہوں۔“ ہتھل نے گھٹی گھٹی آواز میں جواب دیا۔ ”میں سیورین ہوں بابا...“ وہ لاڈ کرنے لگی۔ ”مجھے بتائیے کہا تھا۔ یاد ہے؟“ ”سب یاد ہے رے...“ ہتھل نے مجھے ستانے ”بھول جاتا تو یہ حال نہ ہوتا۔“ ”تم ایک دودن میں بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔“

”ہاں... میں اوپر سے ٹھیک ہو جاؤں گا۔“ ہتھل گہرا طنز کیا۔ ”اندر کے حال کی کسے پروا ہے رے...؟“ ”مجھ سے بھی خفا ہو بابا...؟“ سیورین نے ان کا شہادہ سینے پر سر رکھ دیا۔ میں نے تو تھوڑی سی بار اٹکا نہیں کیا۔ ”تو تو میری گجریا بھری لاڈلی ہے۔“ ہتھل سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرے لگا۔ ”تجھے کون ناراض ہے رے۔“

”تم نے دیکھا بابا...“ سیورین اصل موضوع کی آگئی۔ ”کون آیا ہے تمھیں دیکھنے؟“ ”دیکھ رہا ہوں...“ وہ اُپٹی ہوئی آواز میں بولا۔ ”رہا ہوں اور کچھ بھی رہا ہوں۔“ ”کیا سمجھ رہے ہو...؟“ میں برداشت نہ کر سکا۔ اٹھا کر اسے گھورتے لگا۔ میرے اندر بھی شعلے لپک رہے۔ ”اب اس کے سوا کیا سمجھ سکتا ہوں رے...؟“ صاحب کا شہزادہ میرا حال کو چھپنے کو آیا ہے۔ ”ہتھل کا ہوا گیا۔“ بڑی کر بیا... بڑی مہربانی! ”اپنے لاڈ لے کو لغت ملا مت کر رہے ہو؟“ میں سگ۔ ”آپ ہی بولو بڑے صاحب۔“ ہتھل نے ابا

ایسے تھتھرے میں جن کی تاب نہ لاسکا، جھل ہو کر میں جھک لیں۔ کمرے میں اس وقت جامو اور بناری بھی موجود تھیں۔ سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ کس کی جرأت تھی جو ہتھل کے معاملے میں زبان کو جنبش دیتا۔ ہتھل کی نگاہوں میں شکوہ تھا، شکایتیں تھیں۔ میں اس ان کا کوئی موثر جواب نہیں تھا۔ تا دیر کر۔ ٹھہر بیٹھنا طاری رہا پھر سیورین نے ہمت کی، وہ ”اب کیسے ہو بابا...؟“ سیورین کی آواز سے سنا چھٹنے لگا۔

حکایت زمانہ

ایک اندازے کے مطابق انسانی جسم کے اجزائے ترکیبی یعنی پانی، چربی، فاسفورس، آئرن، سوڈا، نشاستہ، شکر وغیرہ کو ان کی حقیقی حالت میں فروخت کیا جائے تو اس کی مجموعی قیمت چند روپے سے زیادہ نہیں... لیکن ان چند روپوں نے کتنا کھرا م چار کھا ہے۔

تعاونی عظمیٰ ارباب

ہوئے لگا۔

”نہیں ہوگا...“

”پھر... یہ دُوری کیسی ہے رے۔“ ہتھل کی نگاہوں میں جگنو چمکنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں محبت کی چمک عود کر آئی تو

لیکھت بھلا چنگ نظر آنے لگا۔ نرس نے مجھے روکنے کی کوشش کی لیکن میں وھیل چیئر سے گرنا پڑتا اُتر کر ہتھل کے سینے کی کشادگی میں گم ہو گیا۔ ہتھل نے بے اختیار مجھے اس طرح بازوؤں میں پچ لیا جیسے برسوں کے پتھر سے اچانک ملے ہوں۔ کبھی وہ واہانہ انداز میں میری پیشانی چومنے لگا، کبھی ایسی نظروں سے دیکھتا جیسے اسے میرے ہونے پر یقین نہ آ رہا ہو۔ جذبے سے بچے ہوں، ان میں کھوٹ اور ملاوٹ نہ ہو تو وارثی اور شوق کا عالم بھی دیدنی ہوتا ہے۔ میں بھی بچوں کی طرح سکھنے لگا۔ ایسے موقعوں پر زبانی جمع خرچ سے کام نہیں چلتا، دل کی دھڑکنیں زبان بن جاتی ہیں۔ ہم دونوں تا دیر اُٹھی کیفیتوں سے دوچار رہے۔ پھر ہتھل نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔ ”تجھے کچھ ہو جاتا نا لاڈلے... تو ہتھل بھی رام پوری چا تو اپنے گلے پر پھیر لیتا رے۔“

بہت دیر تک گلے شکوے ہوتے رہے۔ نرس ہتھل کے اشارے پر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں اسے پوری تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔ ہتھل کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا، ایک جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بار بار کسی خیال سے چمک اٹھتیں۔ میں نے دیر نہیں پوچھی، میں جانتا تھا، میری طرح وہ بھی کچھ نہ کچھ اندازے ضرور قائم کر رہا ہوگا۔ جامو اور بناری بھی خاموش بیٹھے ساری رُوداد سننے رہے۔ ہتھل بار بار پرہلو بدل رہا تھا، ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ اس کی ذہنی مشین پوری طرح فعال نظر آرہی تھی۔ میں خاموش ہوا تو

بھٹل نے جامو کی طرف دیکھا۔

”سن لیارے تُو نے... اب پوڑے چمار بھی سرچنے کی سوچ رہے ہیں۔ کل تک اُن کی مٹا لٹی تیر میں مری پڑی تھی۔“
”امین کے لیے کیا حکم ہے؟“ استاد جامو سٹھل کر بیٹھ گیا۔
”ابھی تک اپنے تمھارے اور لاڈلے کی بیماری کی وجہ سے خاموش تھے۔“

”ٹھنکے قد کے نکلے چپٹے جہاں بھی نظر آئیں گے جرمونی کی طرح کاٹ کر چھینک دوڑے حرام کے پٹوں کو۔“ بھٹل کی آواز میں گھن گرج جاگ اٹھی۔
”سنگی ساقیوں کو بھی ہوش یار کر دینا۔ میں بے خبری برداشت نہیں کروں گا۔“

”غم فکر ہی نہ کرو استاد۔“ بنارس آگے آگیا۔ ”انھوں نے اپنے لاڈلے پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم ان حرام کے جنوں کو ان کی میتا کے پیٹ سے نکال نکال کر ماریں گے۔“

”دو چار خاص بندے حویلی کی گرائی پر لگا دو۔“ بھٹل نے کہا۔
”ایدری آدمی کم پڑیں تو ہمیں اور نکلنے سے کام کے آدمی منگاؤ۔ ابھی لینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا ہے۔“
”ٹھیک ہے استاد۔“ جامو نے تائید کی۔ ”ابھی نفری تو بڑھانی پڑے گی۔“

دوپہر کے کھانے کے بعد میں بھٹل سے تنہائی میں ملا۔
”تم نے کیا سوچا ہے... اپنے شکلا جی تو بنرجی سے آس لگائے بیٹھے ہیں۔“
”ویسے وہ چھپکلی ہی لگتا ہے پر اس کی آنکھوں میں گرگٹ جیسی چمک بھی دیکھی ہے میں نے۔ آدمی کام کا دھتا ہے۔“
”کیا کورا کو لے جانے والے اس کی طرف سے چوکنے نہیں ہوں گے؟“

”امیل پہلوان اور گھوڑے کی کھری کوٹھی نسل کی پچان میدان میں ہوتی ہے۔“ بھٹل نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔
”بہنیں سے فیض آباد کے سفر میں وہ میرے ساتھ سائے کی طرح چٹا رہا۔ تیرے شکلا جی نے ادھری بہنیں میں اس کے کان میں ضرور کچھ چھونک دیا ہوگا۔ اکھارے میں اسے ٹوٹا رہا۔ پہلے اپنے بیوی سوچتا رہا کہ شکلا جی نے اپنا دل رکھنے کی خاطر تھلواڑ کیا ہے۔ پر ابھی انہیں ایسا لگتا ہے۔ دیکھ میں وہ سر سے پاؤں تک مردانہ لگتا ہے لیکن اس کی آنکھوں میں چمک ہے۔... شکاری عقاب کی آنکھوں جیسی۔ شکلا جی جیسے گھاگ اور تجربے کا رافتر تھا۔ اس نے اسے چٹا ہے تو

کچھ سوچ سمجھ کر ہی چٹا ہوگا۔ تو نے جو کرشانی پر احسان وہ بھی انھیں ضرور یاد ہوگا۔“

”جو لوگ مجھے مارنے کے لیے بھرے اسپتال تک پہنچتے ہیں، ان کے لیے تنہا بنرجی کی کیا اہمیت ہوگی؟“
”ایسا مت بول لاڈلے جانی... تو بھی اوڑے پاڑے سوکے مرے بندوں کی چمک منک دیکھ چکا ہے۔“
”ہو تو حوصلہ اور جو اس مرد کی کام آتی ہے۔“
”بھول چوک ہو جائے تو تخت کا تختہ بھجھو۔ جیت تھیلی پر رکھنے والے کی ہوتی ہے۔“
”مونا پتلا آدمی بس کا ہوتا ہے۔ بنرجی کو دیکھ کر امین کو ایک پرانا بندہ یاد آ رہا۔ بات بہت پرانی ہے، اس وقت اپنی عمر یا بھی پالی تھی۔“
”نظر میں ماضی میں اترنے لگیں۔“ وہ بہار کا تھا، پنڈے میں کر ملنے آیا تھا، بھلا سانا تھا... ہاں، یاد آدا... جیون داس، ہندو تھا... وہ بھی بنرجی کی طرح سوچی سمجھی جیسا دیکھتا تھا... کے اندر بجلی بھری تھی۔ پنڈے میں اس کے کچھ برادرے ڈن جیون داس کو اکیلے دیکھ پانچ چھ بٹے کے بندوں نے گھر سے بھڑے کی اولاد! مرد ہوتے تو ایک ایک کر کے آتے۔ بل کر جیون داس بھی گھبرا گیا۔ میں قریب تو تھا... جانتا ہے پھر کیا ہوا؟ جیون داس نے جان ہاتھ دھری، اس کی کھوپڑی میں ایک ہی بات آئی ہوگی۔ زاموت، مقابلہ کرنا یا کھان کی طرح ڈم دیا کرو تو دو گیارہ ہزار بازار میں تماشہ بھولنے لگا ڈال لیا، کھٹا کھٹ سات چاقو کھل گئے۔ کسی نے اس کی مدد نہیں کی۔ پھر... حرامیوں کی آنکھیں بھنے گئیں۔ تین انیس زمین پر اوڑ مڑ گریں تو بھگدڑ مچ گئی۔ جیون داس کی نظریں دشمنوں تھیں۔ پھر جیسے بجلی چمک اٹھی، جیون داس نے پھرتی اور اٹنی ٹانگ کے بل پر بیٹھ کر پھر کی طرح گھوما تو ایک لڑکھڑا گیا۔ جیون داس نے اس کا چاقو بھٹ لیا، اٹھے اس نے پناٹا ہاتھ چلایا تو ایک دشمن کم ہو گیا۔ دوسرا رام رام ست ہو تو دشمنوں کی میتا مر گئی۔ چوتھا دشمن ہوا رام کے... بھاگ لیے۔ تماشہ بیٹوں میں جانے کتنا دھوٹیاں کیلی ہو گئیں۔ وہ مرد کا بچہ جیون داس سینہ تانے بھگڑوں کو لاکار تار رہا۔ پھر وہ بھی پولیس کے ڈر سے ایک سے پھوٹنے لگا۔ میں بھی اس کے پیچھے لپکا، دور سے ٹھکانا دیکھ کر واپس آ گیا۔“

بھٹل کے سامنے جیسے پرانی فلم چل رہی تھی۔ سانس

”دو روز بعد میں اس کے گھر پہنچ گیا... چاقو کے گر اور داؤ... جیون داس کو پولیس کی پڑی... وہ پہلی گاڑی پکڑ کر پنڈے سے چوکنے کی سوچ رہا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ نکل پڑا۔ بہار پہنچنے کے بعد بھی میں نے اس کا پیچھا کیا۔ تھک بارگروہ مجھے شاگردی میں لینے پر تیار ہو گیا۔ میں اس سے بہت کچھ سکھا ہے لاڈلے۔ اسی کے داؤ پیچ آج تک کام آ رہے ہیں... ہو سکتا ہے، تیرے شکلا جی کا بنرجی بھی دوسرا امین داس ثابت ہو۔“ بھٹل نے مجھے تلی دی۔ ”میں ہوں نارے کے ساتھ۔ تو جب بولے نکل لیں اس کے پیچھے۔“
”ایک دن اور شکلا جی کا انتظار کر لو پھر...“

”اوپر والے سے امید رکھ میرے لاڈلے۔ وہ مہربانی کرے گا۔“

”میں واپس آئیں تو بھٹل نے اشارے پر شروع بدل دیا۔ جامو اور بناری اس کے گھر کے مطابق نکلے۔ اس کے سلسلے میں ضروری بندوبست کر کے چلے گئے تھے۔ اس وقت خاصا چاقو دو بند نظر آ رہا تھا۔ میرے گلے لگنے کے بعد جیسے اس کی آدھے سے زیادہ بیماری دور ہو گئی۔ میرے ذہن کی دھند بھی چھٹنے لگی، البتہ کورا کی جدائی کا میرے وجود سے چٹ کر رہ گیا تھا۔ اسے فراموش کرنا میرے ذہن سے ہٹنے نہیں دیتا تھا۔“

”لو اب رام لاڈلے... اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھ۔ وہ اللہ کی راہ کرے گا۔“

میں کچھ قناعت محسوس کر رہا تھا۔ نرسوں نے مجھے جھیل لے جانے کی پیش کش کی۔ میں نے ان کا کہا نہیں۔ اپنے قدموں پر اٹھ کر واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ میں نے جیون داس کی جو داستان سنائی تھی وہ امید کی کرن بن کر رہ گئی۔ میں آنکھیں بند کر کے خیالوں میں گم ہو گیا۔ کیا ممکن ہے کیا ناممکن، اس کا علم انسان کو نہیں ہوتا۔ اس کو خود غرض ہوتا ہے۔ اس کی مرادیں برائیاں تو ڈگدگاتا ہے۔ اس کی تسکین جاتا ہے، نتائج اس کی خواہشوں کے خلاف ہوتے۔ منافقت کی باتیں شروع کر دیتا ہے۔ جنت اور دوزخ اس کی اپنی جیت اور ہار سے جوڑتا رہتا ہے۔ پلڑوں کا اس کی یکساں نہیں ہوتا۔ کبھی ایک پلڑا اوڑھ ہو جائے تو اس کی سرشار ہو جاتا ہے، معاملہ برعکس تو امیدیں نا ہوتی ہیں۔ کل کیا ہونے والا تھا، کیا ہوگا؟

”میں؟ امیدوں کے سہارے وقت کی صلیب پر

کب تک دم سادھا جا سکتا ہے۔ کب سانپوں کا تسلسل ٹوٹ جائے، کب خوشیاں بھگنا شروع کر دیں، یہ سب حالات پر منحصر ہے۔ انسان ہمیشہ یقین اور غیر یقینی کی کیفیات میں کسی مجرم کی طرح جکڑا رہتا ہے۔ غیب کا حال صرف خدا جانتا ہے۔ بھٹل نے بھی کورا کے حوالے سے اسی سے رشتہ جوڑے رکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ سوچتے سوچتے میں سو گیا۔ نیند بھی اختیاری نہیں ہوتی، سوچتے بھٹل کی قوتیں سلب ہو جاتی تو انسان غنودگی کی کیفیت سے دو چار ہو جاتا ہے۔ کوئی گرہ اچھ جائے تو اسے سلجھانے میں نیند اچاٹ ہو جاتی ہے، روٹھ جاتی ہے۔ اسے منانے کی خاطر لاکھوں جتن کرنے پڑتے ہیں۔ کبھی تفکرات کا بوجھ نیند کا جواز بن جاتا ہے، کبھی خوشیاں بھی نیند اچاٹ کر دیتی ہیں۔ زندگی انھی ریشہ و انہوں کا نام ہے۔

شام کو بیدار ہوا تو جیون میرے کمرے میں موجود تھی۔ ”اب طبیعت کیسی ہے؟“ اس نے دم لہجے میں پوچھا۔
”سانپوں کی آمدورفت جب تک جاری رہے، انسان زندہ رہنے پر مجبور ہوتا ہے۔“ میرے جواب میں دھستوں کی تلچٹ آ گئی۔

”سب آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔“ اس نے میری ذہنی کیفیتوں کو محسوس کر کے خطاط لہجہ اختیار کیا۔ ”ابا جان نے پہلے جشن منانے کا اہتمام کیا تھا مگر بعد میں اپنا ارادہ تبدیل کر کے پچاس دیکھیں غریب اور مساکین میں تقسیم کر دیں۔ خانم نے بھی آپ کی مرادیں برائے کی خاطر پچاس کوٹڑے بھرنے کی منت مان رہی ہے۔“

”سنا ہے خانم اور کچھ دوسرے لوگ بھی تمھارے ساتھ بہنیں سے آئے ہیں۔“

”جی ہاں... گھر میں آپ کی کمی کا احساس بھی سب کو ہے۔ خدا آپ کو جلد صحت یاب کرے اور آپ کی خوشیاں برقرار رہیں۔“

”کچھ باتیں انسان کے اختیار میں نہیں ہوتیں۔“ میری آواز پھر گونجنے لگی۔

”میں آپ کی بات سے متفق ہوں لیکن دھوپ اور چھاؤں کا کھیل بہ حال، جاری رہتا ہے۔“

”دھوپ کے بعد چھاؤں کی امید پوری ہو جاتی ہے۔“ میرے لہجے میں تبدیلی آ گئی۔ ”ایک دن نہ سہی تو دوسرے دن لیکن امیدیں دم توڑنے لگیں تو دلا سے کسی کام نہیں آتے۔“

ہوتا تھا۔ خود کو فلسفی قرار دینا کچھ عجیب سا لگتا ہے لیکن اظہار حقیقت کے مقابلے میں زیادہ قابل قبول ہے۔ اب میں خود کو دھرتی کا بوجھ قرار دینے سے رہا۔ کیا میں لوگوں کو یہ بتاؤں کہ میں ایک عورت پر انحصار کرتا ہوں!

جہاں تک میرا خیال ہے، میرا المیہ وراثتیں ہیں، ایسی وراثتیں جو بغیر سوچے سمجھے مجھ پر تھوپ دی گئیں۔ پہلی وصیت ان دنوں سامنے آئی، جب میں علم معاشیات کے حصول میں مصروف تھا۔ میرے دادا آں جہاں ہوتے وقت مجھے ایک بے حد قیمتی خرد بین سوئپ گئے۔ خرد بین سوئپ میں

میرا نام المین گرانٹ ہے اور عمر بتیس سال۔ لوگ اس سے پوچھتے ہیں کہ میں کیا ہوں؟ ایسے میں دھرتی پر ہوں اور وہ لوگ برقی ثابت کرنے کے لیے مجھے کچھ نہ کچھ کہنا ہی چاہتے ہیں۔ ان دنوں میں لوگوں کو بتاتا ہوں کہ میں فلسفی ہوں۔ سن کر وہ چپ سادھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس پہلے میں خود کو سابق زمیں دار کہتا تھا۔ لیکن اس کے بعد میں بہت سارے سوالات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ بڑی باتیں کرنا پڑتی تھیں۔ اس سے بھی پہلے میں خود کو سابق زمین دار کہتا تھا۔ اور وہ زمیں داری سے بھی بدتر ثابت

تھام کر سوال کرتا۔ بتاؤ، میری کورا کہاں ہے؟ تم مجھے تو قاتل اور امیدوں کی باتیں کر رہے تھے کیا اب بھی انہیں شہد لگا کر چاہتا ہوں! میرے اندر کا آتش فشاں پھٹ پڑنے کو چل رہا تھا۔ ایک کوئی دروازے سے پاگوں کی طرح نکل گیا۔ وہ سیوری تھی، شاید دیوانی ہو گئی تھی۔ دروازے سے نکل کر کھلی تو جوں جوں کور سے ہٹائی میرے سینے سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ روئے لگی۔ جولین بھی پریشان ہو گئی۔ میرے اندر بھی طوفان ابھارنے لگے۔ اس سے پیش تر سیورین، کبھی ایسی دیوانگی کا شکار نہیں ہوئی تھی کہ ہوش و حواس بالکل ہی کھو بیٹھی ہو۔ میں اسے بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھڑا۔

”کیا ہو گیا سیورین؟“ میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔
”کون سی نفی کم ہو گئی؟“
”وہ... وہ کورا... وہ“ اس کی سانسیں دھونکی کی طرح ہلکی ہلکی تھیں۔ ایک ایک کر بولی۔ ”ابھی شکلا جی کا فون آتا تھا... وہ... وہ بتا رہے تھے کہ کورا...“
”آگے بولو۔“ میں بھی پھٹ پڑا۔ ”کیا ہو کورا؟“
”وہ... تمہاری کورا زندہ ہے۔ برنجی نے انہیں کسی سے فون پر اطلاع دی ہے۔“

میری سانسیں میرے وجود کے پتھر میں اٹکنے لگیں۔ سیورین بھی اس کی زندگی کی اطلاع سن کر دیوانی ہو گئی تھی میں بھی لنگ رہ گیا۔ ”مبارک ہو لاڈلے، میری جان!“ میں نے نظریں گھما کر دیکھا، پھل دریا دروازے کی چوکھٹ تھا۔ کورا کی زندگی خبر نے اس کے خون کی گردش بھی تیز کر دی تھی۔ میں نے سیورین کو کرکریا۔

”اور... اور کیا کہا تھا شکلا جی نے...؟“
”آدھے گھنٹے بعد دوبارہ فون کرنے کو کہہ رہے تھے۔“
سیورین نے مسکرا کر کہا پھر مجھ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ روئے لگی۔ میرا دل اٹھ اٹھ پھل پھل ہونے لگا۔

”مجھے آپ سے اتفاق ہے، میرا دل گواہی دیتا ہے کہ...“
”کوئی گواہی اور شہادت نہ دو۔“ میں ٹھنکے لگا۔ ”اب کوئی بات دل کو کھلی نہیں لگتی۔ سانسیں گتے رہنے کی بات اور ہے۔“
”میں درخواست کروں گی۔“ جولین نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔ ”تم جلدی کوئی آخری فیصلہ نہ کریں۔“

”پھر... کیا کروں؟“ میری وحشت اور فزوں ہو گئی۔
”آپ تمہیں ہیں۔ ہم سب کی دعا میں آپ کے ساتھ ہیں۔ اپنے اپنے طور پر سبھی نے تمہیں مان رکھی ہیں، وہ کسی کی توئے گا۔“
میں نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموش رہا۔ امید، توقع اور منتیں اپنی جگہ میری وحشتیں ان خوب صورت بہلا دوں سے کہیں زیادہ تھیں۔ میرے دھن جگ جگ قبیلے کے ظالم لوگ میری زندگی کی کل کا نجات چوری کر کے لے گئے تھے۔ ان کی بھی اپنی تو قعات ہوں گی، اپنی امید اور خوشیاں ہوں گی۔ کون جیتے گا، کسے مات ہوگی، کون کہہ سکتا تھا۔ سب نے ہوا اور طوفان کی زد پر امیدوں کے چراغ جلا رکھے تھے۔ پھر ہرے ہوئے سمندر کے کنارے ریت کے تاج محل تعمیر کر رہے تھے۔ میں کسی کی سنتا، کسے سمجھتا۔ سب دل کے بہلاوے تھے، سب اپنے اپنے راگ الاپ رہے تھے، میری کیفیت کا اندازہ کون کر سکتا تھا؟ پھل نے اپنے آدمیوں کو تھپوں کو چن چن کر مارنے کا حکم نامہ صادر کر دیا تھا۔ سب وقت کی راگنی تھی، دل کی بھڑاس نکالنا اور بات ہے، ہزار در ہزار، ہفتی مر جاتے تو کیا نتیجہ برآمد ہوتا؟ کیا ایک کورا ان کے مرنے سے پیدا ہو جاتی؟ یہ خوش فہمی نہیں تو اور کیا تھی۔ ایک تہا جیون داس نے چار آدمیوں کو موت کی نیند سلا دیا، باقی تین موت کے خوف سے بھاگ گئے۔ ضروری نہیں تھا کہ برنجی بھی جیون داس کی طرح کامیاب ہو جاتا۔ ایک سنسناتی ہوئی زہریلی سوئی کسی نامعلوم سمت سے ہوا میں تیرتی ہوئی آتی اور برنجی کے جسم میں اتر جاتی تو وہ چومھی لڑنا بھول جاتا۔ شکلا جی بھی ہاتھ ملتے رہ جاتے۔ منتیں دل کی دل میں رہ جاتیں، میں کس کس کے گریبان

فتنہ بلوش

ہکادے محمّد شیکری

وہ عورت جو میرے مورخہ تھی وہ میرے کتالو کا مضبوط تھا
وہ گرفت مند بہ آفتاب تھی جس کے چمکے چمکے طے چہ سلسلہ کا تھو
مسادہ لیکر کے پتھر، شوخ منگر دیر تار... ایک شعلہ رومنا تھا



کوئی برائی نہیں تھی لیکن انھوں نے وہ چیز مجھے اس یقین کے ساتھ سونپی، بلکہ مجھ پر تھوپ لی کہ میں ایک دن مایہ ناز سائنس دان بنوں گا۔ ایک روز میں نے اس نامعقول خرد بین سے استفادہ کیا۔ یعنی پیپر کا جائزہ لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میں پیپر جیسی نعمت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا۔ تنگ آ کر میں پھر حصول علم معاشیات میں مصروف ہو گیا۔

عین اس وقت جب میں دنیا کی معاشی بیماریوں کے خاتمے کے لیے میدانِ عمل میں اترنے والا تھا، میری ایک بیوہ خالہ چل بسیں۔ چل بسنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا کیوں کہ یہ دنیا سرائے فانی ہے۔ لیکن وہ پالے سے ماری ہوئی چھ سو چائیس ایکڑ زری اراضی میرے نام کر گئیں۔ ستم بالائے ستم یہ عظم معاشیات کی رو سے مجھے پتا چل گیا کہ وہ بڑی قیمتی زمین ہے۔ کم از کم گندم کی مسلسل چڑھتی ہوئی قیمت کے پیش نظر!

کینیڈا پہنچ کر پتا چلا کہ مکان اور فارم دونوں پر بن بلائے مہمان قابض ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ انھیں خالہ نے زبانی طور پر وہاں رہنے کی اجازت دی تھی۔ موسم کا یہ حال تھا کہ درجہ حرارت... اگر اسے درجہ حرارت کہا جا سکتا ہے... مئی 6 سینٹی گریڈ تھا۔ ظاہر ہے، میرے سمجھانے کے باوجود ایسے موسم میں وہ لوگ بے دخل ہونا پسند نہیں کر سکتے تھے۔ ناچار مجھے عدالت سے رجوع کرنا پڑا۔ میری تمام پوچھی عدالتی کارروائی کی نذر ہو گئی۔ اس کے علاوہ چھ قیمتی ماہ بھی میری زندگی سے رخصت ہو گئے۔ تب کہیں جا کر قانون کا کاہنہ، دھیرے دھیرے میرے حق میں گھوما۔ بالآخر مجھے قبضہ لیا۔ اب مجھے پتا چلا کہ وہاں گندم اگانا ممکن نہیں۔ ایک سال میں نے زمین کو کارآمد بنانے کی سعی ناکام میں گنوا لی۔ عین اس وقت، جب میں زمین چھوڑ کر بھاگنے کے پارے میں تنہا دی سے سوچ رہا تھا، ایک اور وارث نازل ہوئی۔ حسب سابق وہ وراثت بھی مجھ پر باغیر سوچے سمجھے تھوپ لی گئی تھی۔

اس بار کرم فرمائی پھوپھی نیپل نے کی۔ پھوپھی نیپل دو سال قبل بیوہ ہوئی تھیں۔ ترے کے میں انھیں بلٹن انڈسٹریل ٹور نامی ایک ادارہ ملا تھا۔ پھوپھی کی زندگی میں وہ ادارہ بے حد منفعت بخش ثابت ہوتا رہا تھا۔

میرے پھوپھا، جارج بلٹن کے بڑی بڑی صنعتی فرموں کے مالکان سے بہت اچھے روابط تھے۔ وہ ان لوگوں کے تعاون سے اپنے ادارے کے تحت فیکٹریوں کے ملازمین اور ان کے اہل خانہ کے لیے یورپ کا سیاحتی دورہ بذریعہ موٹر کوچ ترتیب

دیتے تھے۔ دورے کا ریٹ رعایتی ہوتا تھا۔ اس دورے میں جینیم، ہالینڈ، جرمنی، فرانس اور شاپی اٹلی کے اہم صنعتی یونٹوں کی سیر کے علاوہ، قابل دید مقامات، چرچ اور آرٹ گیلریز وغیرہ کی سیر بھی کرائی جاتی تھی۔ وہ ایک اچھا آئیڈیا تھا۔ اور اچھی تنظیم نے اسے کامیابی بخشی تھی۔

پھوپھا کے چل بسنے کے بعد پھوپھی نے ادارہ چلانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ زیادہ کامیاب نہیں رہیں۔ اب وہ یہ ادارہ مجھے سونپ رہی تھیں۔ واپسی کی شرط پر اتنا قرض مل رہا تھا کہ میں ادارے کا کام یہ آسانی سنیاں سکتا تھا۔ پیش کش قبول کرنے کی صورت میں مجھے فوری طور پر امریکا سے یورپ پہنچنا تھا۔ اگر میں کینیڈا والی زمین داری کو ترجیح دیتا تو پھوپھی کے سامنے دورستہ رہ جاتے۔ پہلے تو وہ ادارے کو فروخت کر کے کی کوشش کرتیں اور اگر بات نہ بنتی تو ادارہ پھوپھا جارج کے اس کزن کی اولاد کے سپرد کر دیتیں جو ادارے کے ابتدائی تلامذہ میں پھوپھا جارج کا شریک رہا تھا۔

قریب ترین ٹیلی گراف آفس بینا نیپل میں ڈوگلاس میں خرابی کے باوجود ایک گھنٹے میں، میں وہاں پہنچ گیا۔ اور پھر کو اطلاع دے دی کہ میں نے ان کی پیش کش قبول کر لی ہے۔ اس کے دو گھنٹے بعد ایک ایٹھ ایجنسی والے نے ایک گاؤں پر اتر دیا جس نے بڑی بے نازی ہے زمینوں کی وہ قیمت لگا کر جو زمین کی اصل قیمت کا نصف تھی۔ میں نے اس کی پیش کش جتنی تیزی سے قبول کیا، اسے دیکھ کر وہ اپنی جلد بازی پر پشیمان نظر آنے لگا۔ وہ اس قدر متنت نظر آ رہا تھا جیسے میرے ہاتھوں لٹ گیا ہو۔ میں نے رقم وصول کی، سامان لے لیا اور رات والے ٹرین پر سوار ہو گیا۔ اب میں سابق زمین دار تھا۔

مونٹریال پہنچ کر بہ ذریعہ فون تحقیق کی تو پتا چلا کہ ادارے کو سنبھالنے کے لیے سخت محنت کی ضرورت ہے۔ میں قریبی ریٹورنٹ گیا اور واحد خالی میز پر قابض ہو گیا۔ میری نظر یہ ہے کہ ہر کہانی میں کوئی نہ کوئی سبق ضرور ہوتا ہے۔ میری کہانی کا سبق یہ ہے۔ بٹھہرے ہوئے، لمبے سنبھلے ہاتھوں، ہنسی ہوئی جھلی جھلی گہری آنکھوں اور دل نواز مسکراہٹ کو بھی موقع نہ دیجیے کہ وہ آپ کی حسِ لطیف کو متاثر کر ڈالیں۔

”میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟“ اس نے پوچھا۔ عموماً چٹون پہننے والی لڑکیاں مجھے ایک آنکھ نہیں دیکھتی تھیں لیکن وہ ایسی تھی کہ چٹون اس پر جتنی تھی۔ میں زیرِ لب

کہا۔ ”اور پھر میرا چہرہ تپ سا گیا۔ اس سے اندازہ لگا لیں کہ لازماً وہ زمین اور وہاں کی بے کرائی تنہائی نے مجھے کس حد تک پراد کر دیا تھا۔“

وہ بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد ویٹر ناشتے آیا۔ اور ہم دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ وہ روم جاری تھی۔ میں بھی ہمارا تھا۔ میں نے اسے اپنی نئی کار کے متعلق بتایا اور اس نے اٹھا کہ وہ اسکوٹر پر سفر کر رہی ہے۔ ناشتہ ختم کر کے اس نے مجھے دوستانہ مسکراہٹ سے نوازا۔ لیکن وہ ایسی مسکراہٹ تھی کہ میرا ہلکا ہلکا دل میرے دل سے ہم آغوش ہو گیا۔

ایک ضلع کا مال کی وجہ سے مجھے بولون میں رکنا پڑا۔ اس کے وقت میں جس جگہ جانے والی ہو کر پرتا۔ بولون سے میں کلومیٹر آگے آیا ہوں گا کہ مجھے پھر بہت کچھ نظر آیا۔ رات... چاند، زرد رنگ کا سویٹر اور وہاں نسوانی چٹون، جو مجھے ہانپتی تھی... اور وہ مجھ سے کپڑے نہیں تھے۔ ان کے اندر وہ حسینہ کی تھی جس نے حج میرے ساتھ ہی ناشتا کیا تھا۔ وہ ایک کیراج کے باہر کھڑی تھی اور بے حد سوگوار معلوم ہو رہی تھی۔ ”کوئی گرڈ ہو گئی؟“ میں نے پُر امید لہجے میں سوال کیا۔ اس کا جواب اثبات میں سننے کے لیے بے

”جی ہاں...“ اس نے جواب دیا۔ ”کوئی گرڈ ہوٹ گیا ہے... اور ایک اور گھر سے منگوا کر لے گا۔ بہت گرڈ ہو گئی۔ آج رات میری کوئی میرا منتظر ہوگا... اور میں اس بے چاری سے رابطہ قائم نہیں کر سکتی۔“

اس کے بیان کی ابتدا تو بے حد دل شکن تھی لیکن لفظ بے چاری نے مجھے پھر سے زندہ کر دیا۔ اگر وہ بے چاری کے بجائے بے چارے کا تذکرہ کرتی تو میری طرف سے وہ اس کیراج کے باہر ساری رات کھڑی رہ سکتی تھی۔ ”آؤ... میں تمہیں لفٹ دے دوں۔ میں بھی پیرس ہی جا رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

اس نے کیراج کے مالک سے جس رواں فرانسسی میں گفتگو کی، وہ میرے لیے باعثِ رشک تھی۔ پھر اس نے چھوٹا سا سوٹ کیس ہاتھ میں لے لیا۔ اور میرے برابر والی نشست پر بیٹھی۔

ہم کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ بارش شروع ہو گئی۔ اس نے تسلیم کیا کہ ایسے موسم میں اسکوٹر پر سفر کرنا عذاب ہے۔ یو جی ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہم پیرس کے نواحی علاقوں تک پہنچ گئے۔ اس وقت رات کے نو بجے تھے۔ میں

نے جیمس ایلیسی کے ایک گیراج کے سامنے اپنی کار روکی تو دس بج چکے تھے۔

”مجھے ڈر ہے کہ میری دوست نے اتنی دیر میرا انتظار نہیں کیا ہوگا...“ اس نے کہا۔ لہجے سے پریشانی مترشح تھی۔ ”ہم نے ایک ریستورنٹ میں ملاقات طے کی تھی۔ مجھے تو اس کا پتا بھی معلوم نہیں۔“

”اس صورت میں...“ میں نے مہمان نوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میری تنہائی پر ترس کھاتے ہوئے، رات کا کھانا میرے ساتھ کیوں نہ کھاؤ۔“

لیکن اس نے یہ سوچ کر جانا ضروری سمجھا کہ ممکن ہے، اس کی دوست اب بھی اس کی منتظر ہو۔ چنانچہ میں ایک قریبی ہوٹل کی طرف بڑھ گیا۔ ہم دونوں کے درمیان بے طے پایا کہ اگر وہ آدھے گھنٹے میں واپس نہ آئی تو میں تنہا کھانا کھا لوں گا۔

میں ہاتھ منہ دھو کر، کپڑے بدل کر اپنے کمرے سے نکلا۔ لابی میں پہنچا تو اسے استقبالِ کلرک سے محو گفتگو پایا۔ وہ شاید کمرے لے رہی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ استقبالِ کلرک مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ شاید وہ میرے اور اس کے عورمیان کوئی تعلق تخلیق کر رہا تھا۔ مجھے اس وقت وہ بہت پیارا لگا۔ اس وقت میں نے اس کی نظروں کے اس تاثر کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ بس، من میں لڈو پھوٹ کر رہ گئے۔

پندرہ منٹ بعد وہ سیاہ فراک میں ملیوس، مجھے بار میں ملی۔ ایک ایک جام لینے کے بعد ہم کسی اچھے سے ریستورنٹ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ ہم دونوں ہی بے حد جھوکے تھے، کیوں کہ صبح کے ناشتے کے بعد ہم نے کچھ نہیں کھایا تھا۔

مرد... میرا خیال ہے، مردوں کی اکثریت اس امر پر مجھ سے اتفاق کرے گی... کہ مرد دہلی کی ادائیگی خواتین سے کرانا پسند نہیں کرتے۔ لیکن بعض اوقات... بعض حالات میں یہ اچھا بھی لگتا ہے۔ اس روز مجھے بھی اچھا لگا۔ میں نے کچھ دیر اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن اسے قائل نہ کر سکا۔ ”تم نے مجھے لفٹ دے کر میرے ساتھ بڑی مہمانی کی ہے...“ اس نے فیصلہ کر لیا۔ ”جیسے تمہاری مرضی...“ میں نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”ویسے... میں اپنا تعارف کرادوں۔ میرا نام ایلین گرانٹ ہے، اور شاید...“ میں نے کچھ دیر توقف کیا، لیکن جب وہ بس سے مٹ نہ ہوئی تو میں نے جملہ مکمل کیا۔ ”شاید تمہارا بھی کوئی نام ہوگا۔“

سائیں

ہمارے ہاں فقیروں کو سائیں کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔ سائیں کے معنی ہیں مالک، آقا، سائیں معنی مالک۔ رچرڈ برٹن کے خیال میں یہ لفظ منسکرت کے لفظ ”سوامی“ کی ایک صورت ہے۔ متکونی زبان میں سائیں کے معنی ہیں عایشان۔

صاحب

دو عباسیہ میں وزیر کا ایک لقب تھا۔ بعد میں حکمران کے لیے بولنے لگے۔ مالیت کے وزیر کو صاحب دیوان کہتے تھے۔

لکھنؤ

شہر ایلودھیا کی نوابی بستی تھی جسے رام کے چھوٹے بھائی لکھن کے نام پر بسایا گیا تھا۔ اس لیے لکھنؤ کے نام سے مشہور ہوئی۔

(ازلی عباس جلال پوری، مصطلحہ، مصطفیٰ ارباب)

لکھتے... ویسے بھی ایک ایسے شخص کو لون کیسے کہا جاسکتا ہے جو خود کو بے حیثیت سابق معیشت داں اور سابق زبیں دار متعارف کراتا ہو۔ بس ذرا خیال رکھو، کہیں تم سابق ٹریول ایجنٹ بھی نہ بن جاؤ۔“

اس کی یہ آخری بات مجھے چھہ گئی۔ ”میں کوئی بزنس جنینس ہونے کا دعویٰ نہیں کر رہا ہوں...“ میں نے تنہا لہجے میں کہا۔ ”لیکن میرے کاروباری معاملات جس طرح چل رہے ہیں، ان کے مطابق میرا اندازہ ہے کہ اس سال موسم گرما میں، میں چھ ہزار افراد کو یورپ کی سیر کراؤں گا۔ اور اگر مجھے ایک باؤنڈی کس بچت نہ ہو تو مجھے حیرت ہوگی۔ چھ ہزار پاؤنڈ، ممکن ہے، تمہارے نزدیک بے وقعت ہوں لیکن میرے لیے بہت ہیں۔“

اس کے بعد فلورنس، پیسا اور پھر روم کی باری آئی۔ اُسے تم، حسب سابق میرے بہت کام آئی۔ اور تمام معاملات بہ حسن و خوبی منٹ گئے، لیکن وہ معاملات جن کا روبرو باری تھے۔ رومانوی محاذ کی صورت حال بے حد حوصلہ شکن تھی۔

روم سے جینیوا جاتے ہوئے میں نے ایک کاروباری تجویز ”اے تم“ کے سامنے رکھی۔ ”مجھے علم نہیں کہ تمہاری جانب کس قسم کی ہے...“ میں نے بات شرد کی۔ ”مجھے یہ بھی پتا

”میں بہت محنت کرتی ہوں...“ اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ”میرے کام میں زبان دان کی بڑی اہمیت ہے۔“

نیورن میں، میں نے ایک پورٹریٹل ٹائپ رائٹر خریدا۔ وہ ایک خط کتابت کا کام کرتا تھا۔ اس رات میں دیر تک دو گھنٹوں کے ذریعے ٹائپ رائٹر کو شرمندہ کرتا رہا۔ ”اے تم، کو اس کا پتہ چل گیا کیوں کہ وہ سامنے والے کمرے میں مقیم تھی۔“

”تمہیں جو ٹائپ کرانا ہو، مجھے دے دو۔“ میں کر دوں گا۔“ اگلے صبح اس نے مجھ سے کہا۔ ”ٹائپنگ تمہارے بس کر لیں۔“

اس دن سے میرے مزے آگئے۔ میں انگلش میں خط و کتابت کرتا تھا۔ ”اے تم“ اسے خط و کتابت میں منتقل کر کے ٹائپ کر دیتی۔

”یہ تو بڑی زبردستی ہے...“ وینس پہنچ کر میں نے اس سے کہا۔ ”تمہاری ان مہربانیوں کے جواب میں میرا بھی کچھ کرنا ہے۔ آخر تم اپنی تعلیمات کے خوش کاروں میں میری وجہ شکر کر رہی ہو۔“

”اگر تم مصر ہی ہو تو آج کھانے کا بل تم ادا کر دینا۔“ میں مسکراتے ہوئے کہا۔

بہت خوب صورت رات تھی... میرے موڈ سے ہم ایک ایک لمحہ میں اس نے اس سے کوئی قریبی رشتہ استوار کرنے کی بات کی۔ ”تمہاری والدہ نے تمہارا بھائی میری بشریت یقیناً مشکوک ہو گیا۔ لیکن اس کا رویہ بہت نیک نہیں تھا۔“

”پلیز... اتنی خوب صورت رات کو اس طرح برباد نہ کرو۔“ اس نے بے حد سر دل لہجے میں کہا۔

کچھ دیر بعد اسے احساس ہو گیا کہ اس نے میرے احساسات کو مجروح کیا ہے اور میں بھی مجروح رہ گیا ہوں۔ ”پلیز...“ میں نے کہا۔ ”مجھے اپنے معاملات خود تک محدود رکھنا ہیں۔ بس، اتنی سی بات ہے۔ یقین کرو، کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہے۔“

”مجھے بھی یقین ہے کہ کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہے...“ میں نے کہا۔ ”میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم کوئی بہت مقبول کار ہو اور مجھ سے بدل کر سننے ناول کے لیے پلاٹ تلاش کر رہی ہو۔“ بس ایک کرم کرنا... مجھے ولن کا کردار نہ دے۔“

”میں اس ٹائپ کا آدمی نہیں ہوں۔“

”میں جانتی ہوں امین!...“ اس نے پہلی مرتبہ میرے نام سے پکارا۔ ”تم صورت سے بھی ولن نہیں

”میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہاری پیش کش قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ میں تمہاری ممنون ہوں۔“ اس نے کہا۔ لیکن درحقیقت میں اس کا ممنون ہوا تھا۔

ہمارا اگلا پڑاؤ لیٹ تھا۔ وہاں ہوٹل والے کے ساتھ معاملہ کرنے میں دشواری ہوئی۔ ہوٹل والے کی انگریزی اتنی ہی خراب تھی جتنی کہ میری فرانسیسی... پھر اے تم نے ترجمانی کے فرائض ادا کیے۔ یوں میں ہوٹل والے سے مقبول معاہدہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں دوسو افراد کے لیے سیاحتی دورہ ترتیب دے رہا تھا۔ ہوٹل کے ریٹ میں خفیہ سا اضافہ مجھے منافع سے محروم کر سکتا تھا۔

زوریچ میں پھر زبان کا مسئلہ آڑے آیا۔ اور مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اے تم کی جرمن بھی اتنی ہی اچھی ہے جتنی کہ فرانسیسی...

”تم میری ترجمانی کا کام مسلسل انجام دے رہی ہو...“ اس شام میں نے اس سے کہا۔ ”بہتر ہے کہ تمہارے قیام کے اخراجات میں برداشت کروں۔“

”ہرگز نہیں...“ اس نے سخت لہجے میں جواب دیا۔ ”معاملات یونہی چلنے دو۔ میں جو مدد کر سکتی ہوں، ضرور کروں گی۔ آخر مجھ پر بھی تمہاری لفٹ کا قرض ہے۔ میں اسے لوگوں کا احسان اپنے سر پر رکھنا پسند نہیں کرتی۔“

”معاف کرنا... اگر میں تمہارے لیے اب بھی اجنبی ہوں تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ”تم میرے بارے میں جاننے کی خواہش کرتی ہو تو مجھے بتانے میں کوئی عار نہ ہوتی۔ میں تو تم سے، تمہاری دل آزاری کی وجہ سے کچھ پوچھتا بھی نہیں۔“

”میری فطرت میں جس کا مادہ نہیں جو میں تم سے تمہاری زندگی کی داستان سنوں...“ اس نے سر دھجے میں کہا۔ ”یوں بھی اس اجنبیت میں بڑا لطف ہے۔ مجھے امید ہے، تم بھی سفر سے محظوظ ہو رہے ہو گے۔“

زوریچ سے ہم میلان پہنچے اور میلان سے نیورن... نیورن میں چند فیکٹریاں تھیں۔ وہاں میں نے اپنی پارٹی کی آمد کے سلسلے میں ضروری انتظامات کیے۔ وہاں بھی اے تم نے مددگار ثابت ہوئی۔ وہ اطالوی بھی بے حد روانی سے بولتی تھی۔ کام مکمل ہونے کے بعد ہم نے رات کا کھانا ساتھ ہی کھایا۔ کھانے کے دوران میں نے اپنا حوصلہ مجتمع کر کے اس سے کچھ پوچھنے کی کٹھانی۔ ”تم سے یہ پوچھنا ناہیا تو نہیں ہوگا کہ تم کہا کرتی ہو؟ میرا مطلب ہے، تفریح کے لیے نکلی ہو یا کسی کام سے؟“

”نام میں کیا رکھا ہے...“ اس نے جواب دیا۔ ”یوں بھی ہم اتفاقاً طور پر ملے ہیں۔ اور شاید ہی آئندہ کبھی ملیں۔ پھر یہی جانا ہے تو ناموں کا تکلف کیسا؟“

”تمہاری مرضی... لیکن تمہیں پکارنے کے لیے کچھ تو ہو... اے تم، کیسا رہے گا؟“

”شان دار...“ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ ”یہ نام مجھے اچھا لگا ہے۔ بس، تم مجھے اے تم، کہہ کر پکارا کرو۔“

اس کی وہ بے تکلفی مجھے میرا یہ احساس ڈور نہ کر سکی کہ اس نے مجھے فاصلے پر رکھ کر میری اوقات یاد دلا دی تھی... میں اس کے لیے ایک غیر اہم سا اجنبی تھا۔

مجھے پیرس میں تین مصروف دن گزارنا تھے۔ اے تم، کی اپنی مصروفیات ہوں گی۔ ہم یہ وعدہ کر کے جدا ہو گئے کہ اپنی جدا جدا منزلوں کی طرف روانہ ہونے سے پہلے کم از کم ایک بار ضرور ملیں گے۔

اگلے روز وہ مجھے نظر نہیں آئی لیکن دوسرے دن لاہی میں ہمارا ٹکراؤ ہو گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ مائٹریال کے گیراج سے اطلاع آئی ہے کہ مطلوبہ پرزہ دست یاب نہیں ہو سکا ہے اس لیے وہ اپنا سفر ملتوی کرنے پر مجبور ہو گئی ہے۔

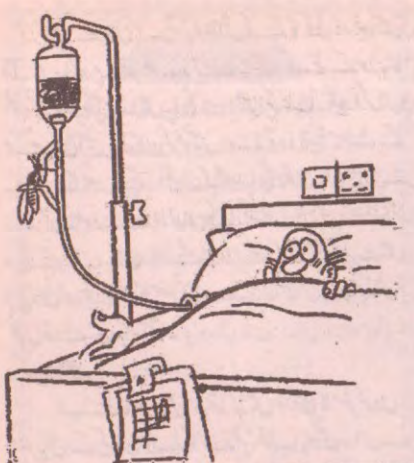
”روم تک تو میں تمہیں لفٹ دے سکتا ہوں...“ میں نے کہا۔ ”بس یہ ہے کہ ذرا گھوم کر جاؤں گا۔ یہ میرا بزنس ٹرپ ہے۔ سوچ لو... پھر مجھے بتا دینا۔ اور ہاں... آج رات کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ نا۔“

ہم رات کے کھانے کے لیے ایک ساتھ نکلے۔ وہ مجھے چھوٹے سے ریستوران میں لے گئی۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم بھاپ اڑاتی کافی سے لطف اندوز ہونے لگے۔

”میں شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے روم تک لفٹ دینے کی پیش کش کی...“ اس نے کافی کا کھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں تم پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔ ویسے بھی ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں اور...“

”میرا خیال ہے، روم پیچھے پیچھے صورت حال بدل جائے گی...“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”میں کل صبح آٹھ بجے روانہ ہوں گا۔ اگر تم میرا ساتھ دے سکو تو مجھے مسرت ہوگی۔“

اگلی صبح سات بج کر پچاس منٹ پر میں ہوٹل کا حساب صاف کرنے کے لیے استقبالیہ کاؤنٹر پر پہنچا تو ”اے تم“ اپنا حساب صاف کر رہی تھی۔



میں اس رویے کا مستحق نہیں تھا۔ میں نے اس کے ساتھ جتنا اچھا اور معقول برتاؤ روا رکھا تھا، وہ خود میرے لیے بھی حیران کن تھا۔ بلکہ ابھی بھی تو مجھے شک ہونے لگتا تھا کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اس کے باوجود اس نے مجھے خدا حافظ کہنا بھی گوارا نہیں کیا۔

میں اپنی جذباتی کیفیت، ڈرامائی انداز میں بیان کرنا پسند کروں گا۔ بس، یہ سمجھ لیں کہ ڈور سے لندن تک بہتر میل کا سفر مجھے بہت گراں گزرا۔ جب کہ ہزاروں میل کا سفر خوش گوارا یاد کی طرح میرے ذہن میں تازہ تھا۔

’انگور کھٹے ہیں‘ والا فارمولا ذہن میں بسائے، میں نے کام میں مصروف ہو جانا چاہا۔ پہلا نفرنگی دورہ جون میں ہوتا تھا۔ جب کہ ممی کے کچھ دن گزر چکے تھے۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ اُسے تم کو بھول جاؤں گا۔ جنہم میں جائے وہ برف کی موت!

لیکن یہ ارادہ بھی محض نظریاتی تھا۔ اس پر عمل کرنا بے حد دشوار تھا۔ سوئمنگ سوٹ میں لپٹے ہوئے وہ اعداد و شمار میرے تصور میں دھندلانے لگے تھے۔ البتہ ایک سنگین مسئلہ سامنے آکھڑا ہوا۔ جلدی سے غائب ہونے کے چکر میں اُسے تم میرا وہ بریف کیس ساتھ لے گئی تھی جس میں تمام کاروباری معاہدے تھے۔ اس کے علاوہ تمام خط کتابت کی کاربن کاپیاں بھی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ اُسے تم کو جب یہ پتا چلے گا تو وہ مجھے تلاش کر کے بریف کیس لوٹا دے گی۔ لیکن کب؟ ایک ایک دن، بہت جلدی تھی۔

”میرا خیال ہے، تم نے بہت اہم نکتہ نوٹ کیا ہے۔“ میں نے پُر امید لہجے میں کہا۔ ”ممی کے تم آئندہ مجھے سنگ زاد کہہ جائے آدم زاد تصور کر کے ملو گی۔“

”نہیں۔۔۔“ اس کی مسکراہٹ بے حد پُر اسرار تھی۔ ”اگلا شہ روز میں نے کاربن کی آخری شیٹ بھی استعمال کر لی۔ میں نے نوٹ کیا ہے کہ مجھے کل پہلی فرصت میں کاربن پریدہ نہیں۔“

وہ لومڑی اور انگور والا معاملہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔۔۔ انگریزوں نے! باقی سفر میں، میں نے بھی وہی دفاعی ٹیکنیک استعمال کی۔ بات اتنی سی ہے کہ خوب صورت اُسے تم، نسل انسانی سے تعارف نہیں ہو سکتی۔ ایسے انگوروں کا کیا کرنا جو کھٹے ہوں۔ ایسی خوب صورتی کا کیا کرنا چاہنا ہی نہ ہو۔ اب میں کسی لڑکی کے لیے تو بلکان ہونے سے لڑنا خواہ وہ کتنی ہی حسین ہو نہ ہو۔ اس طرح میں نے واپسی کے سفر کے دوران اپنے بلڈ پریشر کو نارمل۔۔۔ بلکہ نارمل سے بھی پیچھے رکھا۔ کہ اسی میں ہی بہتری تھی۔

مانٹریل میں میں نے اس گیراج کے سامنے کار روکی۔ میں نے اس فتنہ بدوش کو اپنا ہم سفر بنایا تھا۔ ”لو، میرا گول ہے۔ ہم یہیں سے تو چلے تھے نا؟۔۔۔“ میں نے کہا۔ ”شاید اب تمہارے اسکوٹر کے پارٹس بھی مل گئے ہوں گے۔“

”ارے۔۔۔ وہ!“ اس نے خوش دلی سے کہا۔ ”میں نے پہلے ہفتے گیراج والوں کو لکھ دیا تھا کہ میرا اسکوٹر انگلینڈ واپس آ گیا۔ ابھی مجھے تمہارے ساتھ ہی چلنا ہوگا لیکن اب رہائی کا ہے۔ مجھے بولون سے تیس کلومیٹر پیچھے اُترنا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ دانت بردانت جمالو۔۔۔ اور کچھ دیر مجھے مزید برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کر لو۔“

اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کار کے اندر کا ماحول کتنا گرم کیسا تھا! ”سفر بے حد پر لطف رہا۔۔۔ ہے نا؟“ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔

یوں معاملہ ختم ہو گیا۔ میں ڈور پر کار کے کاغذات دکھا کر اٹھا اور کشم والوں سے نہایت رہا تھا کہ اُسے تم غائب ہو گئی۔ میں نے پہلے وہ وہاں موجود تھی اور دوسرے لمحے اوجھل۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس رویے سے مجھے تکلیف پہنچی۔

کسی بڑے جرم کی محفل تو نہیں ہو سکتی تھی۔ نظریے کی حد تک بات درست تھی لیکن وہ نظریہ بھی جان دار نہیں تھا۔ اُسے تم نہیں سے بھی مجرمانہ ذہنیت رکھنے والی لڑکی نہیں لگتی تھی۔ کہ ابھی ملک کی سرحد پر اس کے انداز سے گھبراہٹ اور خوف زدگی ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا؟

پھر ہم ماربلز سے ہوتے ہوئے اسپین میں داخل ہو گئے۔ بارسلونا میں اُسے تم سے کچھ خاص مدد نہ مل سکی۔ ہسپانوی زبان سے نااہلی تھی۔ بارسلونا میں، میں نے تھوڑی سی بے ایمانی کی۔ میں نے ایک اینڈ وہاں گزارنے کے لیے ایک فرضی ملاقات کا حوالہ دیا جو پیر کے دن ہو گئی۔ حالانکہ میرا کام مکمل ہو چکا تھا۔ اب صرف واپسی کا سفر درپیش تھا۔

اتوار کا دن، ہم نے ساحل سمندر پر گزرا۔ وہ ممی کا مکان تھا۔ اور سمندر کا پانی بے حد لطف دے رہا تھا۔ اُسے تم میرا کے لباس میں جل پری معلوم ہو رہی تھی۔ پانی میں روانی ہوئے، بہترین شارٹ پینڈ ٹائیکسٹ ہونے اور اکاؤنٹنٹ رکھنے کے علاوہ وہ ایک خوب صورتی کی حامل تھی جو کسی مرد بے خواب راتیں عطا کر سکتی تھی۔

مجھے معلوم نہیں کہ اُسے تم نے گریز کی تعلیم کہاں حاصل کی تھی۔ لیکن جہاں سے بھی حاصل کی تھی، یقین کیے دنیا کی بہترین درس گاہ میں ہوگی۔ ویش کی وہ شام میں نہیں بھول سکتا۔ ہم کسی سیڑ پر گر رہے تھے اور آسمان پر چاند تانیاں اچھا اور گر رہا تھا۔ ہم کھانا کھا رہے تھے لیکن نہ طعام یاد کی۔۔۔ ذائقہ زبان پر موجود تھا۔ اس وقت تک ہمارے معدوں میں اتنا مشروب اُتر چکا تھا کہ یہ ظاہر رومانی جارحانہ کے سامنے مزاحمت کرنا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ اس پر مارا گیا۔۔۔ اور آتش شوق بھڑکانے والی مزید کئی چیزیں۔۔۔

نتیجہ کیا نکلا؟ ہتاؤں آپ کو۔۔۔ ”یہ بہت خوب صورت شام تھی ایلن۔۔۔“ اُسے تم نے کہا۔ ”تمہارا بے حد شکر ہے۔۔۔ شب بخیر!“

اس روز ساحل پر اُسے تم کو پیرا کی کے لباس میں میرا بلڈ پریشر یقیناً سو سے تجاوز کر گیا ہوگا۔ لیکن مجھے یہ نہیں کہ اُسے تم کو پتا بھی نہیں چلا ہوگا کہ میرے کانوں تک دھواں نکل رہا ہے۔ ہم پانی سے نکلے۔ اُسے تم نے تو لیے اپنے ہاتھ خشک کیے، اپنے پینڈ بیگ سے ایک کاغذ نکالا اور

نہیں کہ تمہیں اس میں کیا ملتا ہے۔ اس کے باوجود میری درخواست ہے کہ۔۔۔ تم وہ ملازمت چھوڑ دو اور میرے لیے کام کرو۔ مجھے اپنی شرائط بتاؤ تاکہ ہم اس پر گفت و شنید کر کے کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔“

”شکر ہے۔۔۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”لیکن میں نہیں سمجھتی کہ تم مجھے اتنی رقم دے سکو گے جو میں اپنے کام سے حاصل کرتی ہوں۔ ایلن، اگرچہ میں عورت ہوں لیکن میرے عزائم بہت بلند ہیں۔۔۔ پھر اس نے کچھ توقف کے بعد بے حد شیریں لہجے میں کہا۔ ”میں جو کرنا چاہ رہی ہوں اگر اس میں کام یاب نہ ہوئی تو تم سے اس سلسلے میں بات چیت کروں گی۔“

سان ریمو، موٹی کارلو، نائٹس اور کینز میں قیام کے دوران میں کاروباری معاملات میں اتنا مصروف تھا کہ کچھ اور سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ اُسے تم کا بھی یہی حال تھا۔ ہمارے شب و روز ہوٹل والوں سے بحث مباحثے میں گزر رہے تھے۔ ہوٹل والوں کے مطالبات اتنے زیادہ تھے کہ ان سے متفق ہونے کی صورت میں میرا منافع صفر ہو کر رہ جاتا۔

اس تمام عرصے میں اُسے تم میرے لیے نہ صرف بے حد اہمیت اختیار کر گئی بلکہ اس کے متعلق سوچتے ہوئے مجھے اپنی ذہنی صلاحیتیں کند ہوتی محسوس ہونے لگیں۔ کینز پیچھے پیچھے ہماری ہم سفری کا ایک ماہ مکمل ہو چکا تھا۔ لیکن مجھے اس کا نام تک معلوم نہیں تھا۔ بارہا یوں ہوا کہ کسی ہوٹل کے استقبال پر کلرک سے باتیں کرتے وقت مجھے خیال آیا کہ میں ہوٹل کے رجسٹر میں اس کا نام دیکھ لوں۔ لیکن ہر بار میری انامیرے اڑے آگئی۔ اگر وہ مجھے اپنا نام نہیں بتانا چاہتی تو مجھے کیا پڑی ہے کہ اس کا نام معلوم کرنے کی زحمت کروں۔ اس کے علاوہ اس صورت میں استقبال پر کلرک بھی مجھے اتنا حق گردانت۔ میں ایک لڑکی کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ طویل عرصے سے۔۔۔ میں یہ اعتراف کیسے کر سکتا تھا کہ میں اس کا نام تک نہیں جانتا۔

البتہ میں اس سلسلے میں سوچتا رہتا۔ اور طرح طرح کے نظریے گھڑتا رہتا۔ مثلاً، وہ کوئی بے حد اہم اور مشہور شخصیت ہے۔ لیکن میں نے اس تھیوری کو خود ہی مسترد کر دیا۔ اگر ایسا ہوتا تو اب تک کوئی نہ کوئی اسے پہچان چکا ہوتا۔ دوسری تھیوری یہ تھی کہ وہ حالت فرار میں ہے۔ یہ تھیوری مجھے بہت پسند ہی کیوں کہ اس صورت میں مجھے خود کو بڑا آدمی۔۔۔ وسیع نظر آدمی ثابت کرنے کا موقع ملتا۔ اس نے جو کچھ بھی کیا تھا میں اسے نظر انداز کر سکتا تھا، کیوں کہ وہ اس نے کیا تھا۔ ظاہر ہے، وہ

میرے پاس اے تم؟ کو تلاش کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے اور انتظار کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں پانچ دن انتظار کرتا رہا... اور اگر اس عرصے میں اس کے کان گرم نہیں ہوئے تو وہ یقیناً سینٹ کے بنے ہوئے ہوں گے... کیوں کہ ان پانچ دنوں میں میں نے اسے جن ناموں سے نوازا، ان کی بازگشت آج بھی مجھے جل کر دیتی ہے۔ اس کے باوجود مجھے احساس تھا کہ اس کی فطرت میں لا پرواہی اور خود غرضی کا عنصر نہیں ہے۔ کم از کم اس نے تم میں تو نہیں تھا جسے میں جانتا تھا۔

اب مسئلے کا واحد حل یہ تھا کہ میں واپسی کا سفر کروں۔ مائٹریال کے کیراج والے کو اے تم؟ خوب یاد تھی۔ اس نے اعتنا اف کیا کہ اسے اے تم؟ کی طرف سے ایک خط موصول ہوا تھا لیکن وہ خط اس سے ضائع ہو گیا، کیوں کہ اسکوٹر اس نے حسب ہدایت لندن پہنچا دیا تھا۔

”اسکوٹر میں خرابی کیا تھی؟“ میں نے پوچھا۔
”کوئی خرابی نہیں تھی... وہ حیران نظر آئے لگا۔“ خاتون نے کہا تھا کہ لمبے سفر کے لیے اسکوٹر مناسب نہیں ہے، چنانچہ انھوں نے ایک دوست سے بات کر لی ہے، اور کار میں سفر کریں گی۔ پھر آپ آئے اور خاتون کو اپنے ساتھ لے گئے۔ اس کے علاوہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔“

اگلا مرحلہ پیرس کا تھا۔ میں وہاں کیرل پبلش ہول کے منیجر سے ملا، جہاں ہم نے قیام کیا تھا۔ ”بات تو عجیب سی ہے...“ میں نے منیجر سے کہا۔ ”لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اس خاتون کا نام اور پتا بھول گیا ہوں جو گزشتہ ماہ میرے ساتھ یہاں ٹھہری ہوئی تھیں۔ یہ معلومات آپ کے ریکارڈ سے حاصل ہو سکتی ہیں؟“

”یقیناً موسیو... یقیناً!“ اس نے جواب دیا۔ ”میں ابھی آپ کا کارڈ نکالتا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ کمرے سے چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک کارڈ تھا لیکن وہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ اور مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ”خاتون کا نام اینابیل ہے، موسیو۔“ اس نے کہا۔

”پورا نام نہیں لکھا ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”جی ہاں... لکھا ہے۔“ اس نے ہنسنے سے کہہ دیا۔
”پورا نام مسز اینابیل گرانٹ ہے۔ پتا وہی ہے، جو آپ کا

ہے۔ ہے نا عجیب بات، موسیو؟ یادداشت بھی بڑے کام کی چیز ہے۔ کلرک کو یہ معاملہ بہت اچھی طرح یاد ہے۔ خاتون نے کہا تھا کہ موسیو سوتے ہوئے بہت زور سے خراٹے لیتے ہیں، اس لیے وہ علیحدہ کمرے رہی ہیں۔“
”ہاں، یہ بات تو ہے۔“ میں نے کہا اور وہاں سے کھسک لیا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ اگر معجزاتی طور پر مجھے بریف کیس مل بھی جاتا تو پہلا تفریحی دورہ نہیں ہو سکتا تھا۔ چلیں... دورے کو تو چھوڑیں... اگر ہوٹلوں کے مالکان جن سے میں نے معاہدے کیے تھے، معاہدے پر عمل درآمد نہ کرنے پر مجھے عدالت میں ٹھیسٹ لیتے تو میں نہیں کا نہ رہتا۔ اس کے علاوہ میری ساکھ ہمیشہ کے لیے تباہ ہو جاتی۔

اب میں اس معاملے کو اور انداز سے دیکھ رہا تھا۔ محسوس ہوا تھا کہ اس نے مجھے چکا دیا ہے۔ پھر ذہن پر زور دیا تو تمام کڑیاں ملتی چلی گئیں۔ ہر شہادت منصوبہ بندی کی طرف اشارہ کرتی تھی۔ ”اے تم؟ مائٹریال میں میری منتظر تھی۔ اسے خود چھو... اپنے چہرے پر اعتماد تھا... اور میں کتنی آسانی سے زبردام آ گیا تھا۔“

سوال یہ تھا کہ بلٹن انڈسٹریل نوکرو تباہی سے کیسے بچا جائے۔ دو دن غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ صرف ایک ہی صورت ممکن ہے اور وہ یہ کہ نوکر کے لیے تمام انتخابات از سر نو کیے جائیں۔ اس صورت میں مجھے ہول مالکان سے معذرتیں کرنا تھیں... وضاحتیں کرنا تھیں... اور یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ قبول کر لی جائیں گی یا نہیں۔ جون کے دورے کا وقت تو نکل چکا تھا۔ موسم خزاں کے دورے کے لیے کام کیا جاسکتا تھا۔ بلٹن نوکر ہمیشہ میزن سے ہٹ کر دورے پر تیار رہتا تھا۔ تاکہ تفریح کرنے والوں پر اخراجات کا بوجھ کم سے کم ہو۔ جولائی، اگست اور ستمبر کے وسط تک تو یورپ کے تمام ہوٹلوں میں قیام دھرنے کو ٹیکہ نہیں ہوتا۔ رعایت کا کوئی سوال ہی نہیں جب کہ ہمارا کمزور رہی رعایت پر تھا۔

چنانچہ میں نے پھر کار سنبھالی۔ البتہ اس مرتبہ میں تھا۔ سفر کے دوران جا بجا سڑک پر کھڑے، ہاتھ ہلاتے لوگوں نے لفٹ مانگی لیکن میں نے انھیں نظر انداز کر دیا۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ دنیا میں ایک شخصیت ایسی بھی ہے جسے میں عالم میں بھی بہر طور لفٹ دے سکتا ہوں۔ اسے دیکھ کر میرے پیروں پر ایک پر خود بخود جا میں گئے۔ ہاں... اے تم؟ مجھے شہد سے یاد آ رہی تھی۔ اس نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں

اس کے باوجود... اگر اگلے موڑ پر وہ مجھے بے بسی کے عالم میں نظر آ جائے تو چند سیکنڈ کے لیے میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں کار روکوں گا، دروازہ کھلوں گا اور اسے اپنے ہاتھوں سے خدا کا شکر ادا کروں گا۔ اے تم؟ اور اس کی لعنت ہو... اس نے نہ صرف میرا کاروبار تباہ کر دیا تھا بلکہ میری عقل کو بھی جبری رخصت پر بھیج دیا تھا... مجھے منطقی شعور کے لیے عزم کر دیا تھا۔

سوزر لینڈ کے سرحدی علاقے میں ایک چھوٹے ہوٹل کے سامنے میں نے کار روکی۔ ڈائنگ روم میں میں تنہا تھا لیکن ساری میزیں اس انداز میں آراستہ تھیں جیسے مہمانوں کی آمد متوقع ہو۔

ہول والے نے مجھ سے کہا کہ مجھے کچھ انتظار کرنا ہوگا۔ میں پہل قدمی کے لیے نکل گیا۔ ایک کونے میں واپس آیا تو ایک لائٹ میں پانچ عدد کوچ کھڑی تھیں۔ ان کے عقب میں بلٹن فرینڈزلی سوکر کوچ ٹوڑا تھا۔ کوچ میں ج ڈرائیور کا ہار بڑے حاکمانہ انداز میں اے تم؟ بیٹھی تھی۔ ان لوگوں کے اندر جانے تک میں نے خود کو چھپائے رکھا۔ پھر میں نے کوچ کے ڈرائیور سے پوچھ پچھ کی۔ مجھے پتا چلا کہ رات کو بلٹن کو سوکر کوچ کے سر نو یو ہوٹل میں ہوگا۔

میں کوچ پر کھانا کھا ہی نہیں سکا۔ میری بھوک ہی اُٹ گئی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے سوچنے کے لیے وقت درکار تھا۔ مجھے اس کا سامنا کرنا تھا... اس انداز میں کہ وہ اپنی نظروں میں اتنی اہم ہو جائے... جتنا اس وقت سے میں ہو رہا ہوں جب سے

میں پانچ بجے سر نو یو پہنچا۔ مجھے اچھا کمرال گیا۔ بالکونی کی طرف چلتی تھی۔ وہ بہت خوب صورت منظر تھا۔ میں اس میں بیٹھا انتقام کے لیے منصوبہ بندی کرتا رہا۔ لیکن پھر اس پر کچھ بھول گیا۔ میرے حلق میں گولاسا پھنس گیا۔

دور سے وہ قافلہ آتا نظر آیا تھا جس کا میں منتظر تھا۔ پھر میں نے اے تم؟ کو کوچ سے اُترتے دیکھا۔ اس کا انداز وہاں کا سا تھا جو اپنے غلے کے لیے فکرمند ہو۔ اس کے ہاتھوں میں کتنی سوز میں کوئی کمی نہیں آتی تھی۔ اس نے اپنی کار کو ہول میں دھکیلا اور سب سے آخر میں خود داخل ہوا۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ ان کے کمروں میں جانے کے بعد وہاں کچھ نہیں رہا۔ اس نے لباس غسل پہنا، تولیا اٹھایا اور

جوش و آزاد

جوش ایک آبادی ایک بار گرمی کے موسم میں مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کی غرض سے اُن کی کوشی پر پہنچے۔ وہاں ملاقاتیوں کا ایک جم غیر پہلے سے موجود تھا۔ کافی دیر تک انتظار کے بعد بھی جب مولانا سے ملاقات کے لیے جوش صاحب کی باری نہ آئی تو انھوں نے اُس کا ایک چٹ پر یہ شعر لکھ کر چچا اسی کے ہاتھ مولانا کی خدمت میں بھجوا دیا۔

نامناسب ہے خون کھولنا

پھر کسی اور وقت مولانا

مولانا نے یہ شعر پڑھا تو زربل مسکرائے، اور فی الفور جوش صاحب کو اندر طلب کر لیا۔

تخاون آزاد حسین، ملتان

”اے تم؟ نے وہی سوئمنگ سوٹ پہنا ہوا تھا، جس سے میں خوب واقف تھا۔ اے تم؟ نے ڈائوننگ بورڈ کو متوازن کیا اور پھر بہت خوب صورت قوس بناتی ہوئی پانی میں کود گئی۔ میں ڈائوننگ بورڈ پر پہنچا تو وہ کوئی سوکر کوچ ڈوڑا چاٹتی تھی۔ میں اس کے عقب میں پہنچا تو وہ اس وقت پشت کے بل تیر رہی تھی۔ اس کی نگاہیں شفاف نیلے آسمان پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک ہاتھ اس کی کمر کے نیچے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اسے پانی میں ڈبو دیا۔ دس سیکنڈ بعد میں نے اسے چھوڑا تو وہ کلیاں کرتی ہوئی اوپر ابھر آئی۔“

”شام بخیر، مسز اینابیل گرانٹ!“ میں نے نرم لہجے میں کہا۔ پھر اسے ایک اور غوطہ دے دیا۔ وہ صرف اُوہ ہی کہہ رہی تھی۔ پانی کی سطح پر بلبلے قفس کرنے لگے تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔

”تم مجھے ڈبوئے والے ہو کیا؟“ اس نے اپنی سانسیں درست کرنے کے بعد کہا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس کی آنکھوں سے خوف جھلک رہا ہے۔

”یقین سے نہیں کہہ سکتا...“ میں نے جواب دیا۔ ”اس کا اٹھارہ اس بات پر ہے کہ تم میرے سوالوں کے صحیح جواب دیتی ہو یا نہیں۔ میں سب کچھ سننا چاہتا ہوں۔ آخر تم نے ایک ایسے شخص کو تباہ کرنے کی کوشش کیوں کی جس نے تمھیں کوئی ضرر نہیں پہنچایا... بلکہ جس نے تم سے اس قدر اچھا سلوک کیا...“



سبحانہ کے منتخب کہانیاں اردو ادب کا عطر بہہ
اردو ادب سے تیار کیا گیا، طرح دار کہانیاں

پیشہ کو کہانیاں

ڈرائنگ روم

محمد حامد سراج

ڈرائنگ روم صلیب لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے... لیکن بعض
ہستیاں ایسے ہوتے ہیں جو سب سے مختلف ہوتے ہیں...
اور جن کا کوئی خاص نمبر نہیں ہوتا!

”میں سمجھتا ہوں... مجھے ثبوت چاہیے، تمہیں بات بھی کرنا ہوگی۔“
”سر...! ثبوت تو پیش کر دیتی ہوں لیکن بات... سر درست
ممکن نہیں۔“

”چلیے، ثبوت ایس ایم ایس کیجیے۔“
”سر... آپ کی تحقیق ”میا“ نے میرا دکھ بانٹا ہے۔ میرا جی
چاہتا ہے آپ سے رابطہ میں رہوں۔ ایس ایم ایس کرنے کی
ہمت نہیں ہو پارتی تھی۔“

اس ایس ایم ایس کے بعد بہت سے دن بیت گئے اور
میں بھول گیا۔ زندگی کی ذمہ داریاں بھاننا بھی ایک مستقل
نوعیت کی جاب ہے۔ قریباً مہینے بعد اس کا ایس ایم ایس آیا۔
”سر... سہ پہر کا وقت ہے۔ گہرے بادل چھائے ہیں، میں

ایک روز شام ڈھلے میں ایک میڈیکل اسٹور سے واپس
آ رہا تھا کہ موبائل پر مسڈ کال نے متوجہ کیا۔ نمبر دیکھا تو
اپنی تھا۔ رانگ نمبر معمول ہوں تو توجہ دینا عہد نہیں کرتا ہے۔
وقت کے ضیاع کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ پانچ منٹ بعد اسی
نمبر سے دوبارہ مسڈ کال آئی۔ تیسری مسڈ کال آدھ گھنٹے بعد
میرا موبائل چھا گئی۔

اگلے روز دوپہر میں اسی نمبر سے ایک مختصر سا ایس ایم
ایس روٹن اردو میں موصول ہوا۔

”کیا میں آپ کے ساتھ رابطہ میں رہ سکتی ہوں؟“
”بغیر تعارف کے رابطہ بے معنی ہوتے ہیں۔“
”میرا رابطہ بامعنی ہے۔“

”ان احقانہ باتوں میں وقت ضائع کرنے کی میری
پاس گنجائش نہیں ہے...“ وہ تنک کر بولی۔ ”یہ میت بھول کر
میرے ذمے دوسو ٹورسٹ ہیں جن کے آرام و آسائش کا
میں خیال رکھتا ہے۔“

”کس کے دوسو ٹورسٹ؟“ میں دباڑا۔ ”تم سمجھتی ہو کہ
میں تمہیں یونہی چھوڑ دوں گا؟ اگر میرے حسب منشا سمجھتا ہوں
تو یہاں سے... اس میز سے تم سیدھی کسی اطالوی پولیس اسٹیشن
رنگ کرو گی۔ اور وہاں رات گزار دو گی۔ بلکہ کئی راتیں گزار
گی۔ جعلی معاہدے، فراڈ، ہوٹل کے رجسٹر پر غلط نام لکھوانا،
میرا بریف کیس چرانا... اور خدا جانتا ہے، تمہارے جرائم
فہرست تھی لمبی ہے۔“

”ایہ... تم مذاق کر رہے ہو۔ تم میرے ساتھ
سلوک...“

”کیوں نہیں کر سکتا۔ تم انکار کر کے دیکھو۔“

پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں میں ایسی چمک نظر آئی تو میں
نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ”تمہارا مطلب ہے...“

”تم اپنے ہونے والے
کی ماں کی پیشانی پر مجرم ہونے کا ٹھپا لگواؤ گے؟“

”اگر مجبور کرو گی تو میں اس سے بھی باز نہیں آؤں گا۔“

”تب تو جان... میں جیل جانے کے مقابلے میں یہ
قید پسند کروں گی... یہ تو میرے ٹور کے لوگوں کے ساتھ زیار
ہو گی کہ وہ جیل کو موم کے تیلے بے یار و مدگار پرے
جائیں۔“

”کس کے ٹورسٹ؟“ میں دباڑا۔
”ہمارے، ڈیر...“ اس نے مجھے دیکھا تھا۔

”آؤ... اب دونوں اداروں کو قسم کر لیں۔“
میں تو اسی انتظار میں بیٹھا تھا۔ میں نے فوراً انصاف کی
کارروائی مکمل کر ڈالی۔

اب ہلٹن فرینڈز میوزک کوچ ٹور ایک کامیاب ادارہ
آئندہ ییزن کے لیے گیارہ ہزار افراد بلیک کراچے ہیں۔ اس
میرا مطلب ہے، ڈیفنر کی خواہش ہے کہ ہمارے بچے
سر دیوں میں پیدا ہوں، تاکہ وہ بغیر کسی دشواری کے، اپنے حاکم
مزاج کی تشفی گھر میں بھی کر سکیں۔ یوں مجھے فلسفی کا کردار ادا کر
کے لیے وقت مل جاتا ہے۔ ویسے سابق فلسفی بننے سے بچنے
لیے تمام جنکس پر دست خط میں خود کرتا ہوں۔



انتہا پر یان ثابت ہوا... تمہارا اتنا خیال کیا کہ جس کی تم متحقق بھی
نہیں تھیں۔ اگر تم مجھے سب کچھ سچ بتانے کا وعدہ کرو تو میں
تمہیں نہیں ڈبوؤں گا۔ اپنی بات کا تاثر دینے کے لیے میں
نے مزید سیکنڈا سے زیر آب رکھا۔

”ہاں... ایہ، میں وعدہ کرتی ہوں... میں قسم کھاتی
ہوں۔“ اس نے جلدی سے رضامندی کا اظہار کیا۔ اس وقت
تک اس کا آدھا پیٹ یقیناً جمیل کومو کے پانی سے بھر چکا تھا۔

ہم تیرتے ہوئے ساحل تک پہنچے۔ آدھے گھنٹے بعد ہم
ایک ریسٹوراں میں گئے جس کی بالکونی سے جمیل کا منظر دکھائی
دیتا تھا۔ اے تم کو حیرت انگیز طور پر زوردار بھوک لگی تھی۔ ایسا
لگتا تھا جیسے اس کے پاس ضمیر نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ بڑی
بے نیازی سے صرف کھانے کے ساتھ انصاف کرتی رہی۔

”ہاں... اب تم مقدمہ چلا سکتے ہو۔“ وہ بولی۔ ویٹرنے
میز صاف کر دی تھی اور کافی لے آیا تھا۔

”پہلا سوال... تمہارا نام کیا ہے؟ میں تمہیں اے تم
کہتے کہتے بیڑا ہو چکا ہوں۔“

”میرا نام ڈیفنر ہے۔“

”ڈیفنر کیا... میرا خیال ہے، تمہارے والد بھی یقیناً
ہوں گے۔“

”ڈیفنر ہلٹن... ایک اعتبار سے ہم کزن ہیں۔
تمہارے پچھو یا میرے چچا تھے۔ میرے والد اور چچا ہلٹن نے
مل کر یہ ادارہ قائم کیا تھا۔ بعد میں انکل جارج نے میرے والد
کو بے دخل کر دیا تھا۔“

”اگر یہ سچ ہے تو تمہارے والد نے کوئی قانونی
کارروائی کیوں نہیں کی؟“

”کیسے کرتے۔ وہ اس دنیا سے چلے جو گئے تھے تاہم
ان کے حصے کا کام میں نے نہ کر دیا۔ میں سب کچھ تم سے چھین کر
لے گئی۔ تم ننھے سے بچے تھے۔ اور میں تمہاری نرس... ویسے
تمہیں یوں آنکھیں بند کر کے دست خط نہیں کرنے چاہئیں۔
تمام معاہدے ہلٹن فرینڈز میوزک کوچ ٹور کے نام سے ہوئے
اور یہ میرا ادارہ ہے۔ اور کوئی سوال؟“

”ہاں... میں نے کہا۔“ تم کھانا پکا سکتی ہو؟“
”نہیں۔“ اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ”اور کچھ؟“

”تمہارے خیال میں ہمارے بچوں کی کم از کم تعداد کتنی
ہونی چاہیے۔ میرا مطلب ہے، ہمارے لیے کتنے بچوں کا
والدین جتنا مناسب ہے؟“

آنگن میں درخت کے نیچے بیٹھی سہ پہر کی چائے پی رہی ہوں۔ یہ میرا روز کا معمول ہے۔ یہ وہ وقت ہے جس میں میں اپنی تنہائی سے ہم کلام ہوتی ہوں۔ کیا آپ مری تنہائی بائیں گے؟ میں چائے کے کپ پر آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔

”یہ بتائیے، بات کرنا آپ کے لیے کیوں ممکن نہیں؟“

”سر، یہ کتنا ایسا ایم ایس میں نہیں ساسکتی، وقت نہ بہت دی تو دل کا دورق آپ کو بڑھا دوں گی۔ پھر وہ اکثر سہ پہر کی چائے کے دوران مختصر سائیں ایم ایس کرتی۔ چائے کے ساتھ جو بھی لوازمات ہوتے تھک، ایک سموئے کباب سب تفصیل بیان کرتی۔

”سر...! آپ کو خبر ہے میرے سامنے ہمیشہ دو کپ رہتے ہیں۔“

”دو کپ کیوں؟“

”سر... یہ بھی طویل کہانی ہے۔ میرے من کے چنک میں دکھ کا کریڈٹ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ کوئی تو ایسا آئے جو اسے کش بھی کرائے۔ سر! میں نے اپنے دکھ اسی طرح سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں جیسے الماری میں بچپن کے گڈیاں پٹولے مجھے بچپن کو لانا دیتے ہیں۔“

دن روز ڈھل جاتا... عمر کا ایک حصہ کاٹ کر۔ مینے میں دو تین ایس ایم ایس اس کا معمول تھے۔ بات کرنے کا موقع اسے میرا آنا نہ میں نے اصرار کیا۔ وہ ایک معمول کی سہ پہر تھی۔ اس نے نیل دی۔ پہلی گھنٹی دوسری تیسری، میں نے کال اٹھینا کر لی۔

”سر! سلام پیش کرتی ہوں، یہی بات نہ ہو پائے گی۔ میں ایک ایسی حویلی کی مین ہوں جس کی دیواریں آسمان کو چھوتی ہیں۔ یہاں سے غور توں کے صرف جنازے نکلتے ہیں۔ جیتے جی ان کی بھلک دیکھنا موت کی پکار پر لپیک کہنے کے مترادف ہے۔ سر! میں فون بند کرتی ہوں پھر سنی۔ اللہ حافظ۔ اپنا خیال رکھیے گا۔“

میں اکثر سوچتا... وہ کیسی تنہائی کھیل رہی ہے۔ اسے کیا غم ہے؟ میرے ساتھ اس کا ایک بے حسی رابطہ ہے، اس سے اسے کیا حاصل؟

ایک روز گفتگو کے دوران میں نے اس سے کہا۔ ”یہ تمہارا موبائل نیٹ ورک بہت منہمک ہے۔“

”سر... پیسا دراصل ہمارا مسئلہ ہی نہیں ہے۔ میرے پانچ بھائی ہیں ہر سال کار کا ماڈل بدل لیتے ہیں۔ دولت کی فراوانی ہے بزنس کے سلسلے میں بھائی شہر سے باہر رہتے ہیں۔ آپ کہیں تو میں آپ کے موبائل نیٹ ورک پر سوچ اور درک رہتی ہوں۔“

”نہیں... ضروری تو نہیں۔“

”سر... آپ کی خاطر طعنہ بھی سہہ لیں گے۔“

”میں سمجھا نہیں!“

”سر... یہ جو موبائل نیٹ ورک ہے نا، یہ بھی انٹرنس سبمل ہو گیا ہے۔ ہمارے پورے خاندان میں کسی کے پاس بھی آپ والے موبائل نیٹ ورک کی سیم نہیں، جب میں سوچ اور درکوں کی تو سب کو اچھا ہوگا۔ کرنز قبضہ لگا نہیں گے... بے چاری غریب ہو گئی ہے... کوئی کہے گا کہ بکجی کی حد ہوتی ہے۔ وہ کسی ملاقات پر اپنے نیٹ ورک کی خوبیوں میں اتنے دلائل دیں گے اتنا شور مچائیں گے کہ اس شور سے چھت اڑ جائے گی... لیکن... سر... کل سے میں آپ کے لیے سیم بدل لوں گی۔“

”پاکل نہ بنو... رہنے دو...“

”نہیں سر... دل کی عدالت میں بیٹھا جج فیصلہ سنا کر سنا پڑا روم میں جا چکا ہے۔“

اگلے روز اس نے نئی سیم سے مجھے کال کی۔

”سر... آپ کا نمبر بھی غورٹ کر لیا ہے۔ رات گزارا ہے تفصیلی بات کر دوں گی... آپ کے پاس سیم ہو... نا؟“

وقت کے ہی تو ہم اس پر ہیں۔

گر میوں کی رات تھی، آسمان پر ستاروں کے جھرمٹ ویسے تھے جیسے بچپن میں دادی ماں سے کہانی سنتے سے ہوا کرتے تھے۔ سات ستاروں کا جھرمٹ جسے دادی ماں ”ترنگو“ کا نام دیا کرتی تھیں۔ ”ترنگو“ جس میں بھوسا ڈھل کر اونٹوں پر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاتا ہے۔ ستارے پہلے زمانوں میں لوگ ستاروں کا کام لیتے اور راستے طے کرنے میں سانی رہتی۔ میں اپنے بچپن سے جو کلام تھا کہ موبائل کی مخصوص آواز سے متوجہ کیا۔

”سر... آپ ٹھیک ہیں؟“

”اللہ کا کرم ہے۔“

”سر... ایک بات کہوں؟“

”کہیے؟“

”آپ اپنے طور پر مجھے کال یا ایس ایم ایس کیوں نہیں کرتے؟“

”اچھا نہیں لگتا۔“

”میں سمجھی نہیں...“

”تمہارے ماحول کا تقاضا ہے کہ تمہاری تحریم کا خیال رکھا جائے۔“

”سر...! میں اتنی اچھی نہیں ہوں، میرا اتنا خیال نہ رکھا کریں۔ میں کیسے ہوں ایک خیال رکھنے والا تھا وہ خواب ہوا...“

”کون؟“

”سر... وہ جو... میرا نہیں تھا۔ سہ پہر کی چائے پر اپنا ادھورا کپ چائے کا چھوڑ گیا۔ میری زندگی ادھوری رہ گئی۔ تب سے میری میز پر میری چائے کے ساتھ اس کا آدھا کپ بھی موجود رہتا ہے۔ میں نے کبھی بھی اس جگہ سے نہیں اٹھائی جہاں سے وہ اٹھ کر گیا تھا، مبادا کسی نے چاکل لوٹے اور کرسی آباد ہو جائے... سر... ادھر اٹھا میرے وجود کی جھک اور... اور...!“

”سکینوں میں آواز کا تار ٹوٹ گیا۔“

”سر... کہا تھا... ناکہ ہماری حویلی کی دیواریں آسمان باتیں کرتی ہیں۔ ہم گھر سے نکلتے ہیں تو کرائٹ کو کرپشت چادر میں لپیٹ لے کر لے جاتے ہیں۔ ہم چادروں میں لپٹی لار میں بیٹھتی ہیں۔ کرسیوں پر ہر دے لگے ہیں۔ فرٹ اور ایک سیٹ کے درمیان بھی پردہ لگا ہوا ہے تاکہ آنکھوں میں اور نور کس نہ کندھ لے... سر... دم گھٹتا ہے میرا۔ لگتا ہے کسی اللہ سے کنوئیں میں قید کر دی گئی ہوں۔ کبھی کوئی زندگی ہوئی اس میں انسان اپنی مرضی سے سانس نہیں لے سکے۔ کالج الٹ میں دو نوکرائیاں مسلسل نگرانی پر مامور ہیں... ناک اتنی اچھا ہے کہ کوئی لڑکا میرے والدین کی نظر میں چٹائی نہیں اور اچھا ہے کہ چھوڑ گیا تھا اس کی جائیداد کسی میں۔“

”سر... کہاں نہیں گیا۔ وہ جا بھی کہاں سکتا ہے، میرے دل میں بیٹھا ہے۔ باتیں کرتا ہے، ہنستا ہے، روتا ہے، ناراض ہوتا ہے، روٹھ جاتا ہے۔ مناجاتی ہوں میں اسے... کاش سر! جیسے اسے میرے گھر سے نکالا گیا دل سے بھی نکال دیا جاتا تو چین سے جی لیتی سر!... یہ جو دل کے کلین ہوتے ہیں یہ دل کی ریاست سے کیوں نہیں نکلتے... سر...! آپ میری باتوں سے کیا تو نہیں گئے؟“

اس کی آواز میں غمی تھی۔ میں اس کی گفتگو انہماک سے سُن رہا تھا۔ شاید وہ اپنی تنہائی کا صحر پائنا چاہتی تھی۔

”سر... آپ چپ کیوں ہیں...؟“

”تمہاری گفتگو کا دھاگا کہیں ٹوٹ نہ جائے۔ تم کہو میں ان کو ش ہوں۔“

”سر...! آپ نے آج تک مجھ سے میرا نام نہیں پوچھا۔“

”بے نام رشتے کو، بے نام ہی سفر طے کرنے دو۔“

”ہاں... سر! میں کہہ رہی تھی گھر کیا ہے... مغلیہ عہد کی حویلی... باہر ڈیرے پر میلہ لگا رہتا ہے۔ میرے والد جاگیر دار ہیں اور ان کی...! بھائیوں کو سیاست کا چکا ہے۔ ہجرا جمعی معمول کی بات

ہے۔ میری گل کائنات میرا کرا ہے۔ کمرے میں ہلکا آسانی پینٹ ہے پردوں کا رنگ میچنگ ہے دیوار پر صادقین کی پینٹنگ کے ساتھ تاج محل کی ایک آئل پینٹنگ ہے جو ایک سیٹلی نے تجھے میں دی تھی۔ کلاسیک موسیقی کی سی ڈیز ہیں۔ سامنے الماری میں پندرہ بیس انگریزی ناول اور اردو فکشن ہے جو میرا درد پانتے ہیں۔ سر! میری ایک چھوٹی سی خواہش ہے۔

”کہو!“

”آپ سے ایک ملاقات کی خواہش... صوبہ پنجاب میں ہوتی تو شاید آسان ہوتا لیکن سر!... کہاں آسان ہوتا تھا؟ دیواریں آسمان بلندی بندشیں چھوڑے سر!... کوئی خواہش نہیں پالنا اب مجھے... آدھا کپ چائے ہی کافی ہے۔“

باتیں کرتے کرتے وہ چپ ہوئی۔ کبھی سمجھا کال کٹ گئی ہے... ”ہیلو... ہیلو!“

”جی... سر!“

”چپ کیوں سادھی؟“

”سر... میرے گاؤں کا رستہ کھن ہے۔ خواہش کا کیا ہے منہ زور ہے۔ زیادہ سے زیادہ پھاڑ کھائے گی نا... پہلے ہی وجود ادھورا ہے۔ آپ میرے شہر کا نام ذہن میں محفوظ کر لیجئے شاید کبھی وقت کی اینٹ سرک جائے اور ملاقات کا سامان نکل آئے۔ ایک بڑی شاہ راہ سے گزرتے ہوئے آپ کو سامان پورڈ نظر آئے گا جس پر ہماری حویلی کا نام درج ہے۔ شاہ راہ چھوڑ کر ڈیڑھ سڑک پر ہونے لگے گا۔ چند کلومیٹر بعد گئے درخت آپ کو خوش آمدید کہیں گے۔ کبھی زندگی میں ایک بار... سر... صرف ایک بار میرے صوبے سے گزر ہو گئے درختوں میں حویلی کے اونچے برن ہیں۔ وہاں لوگوں کا تاننا بندھا ہوگا۔ مجھے ایک ایس ایم ایس کر دیجیے گا۔ میرے لیے یہ خوشی بہت ہوگی کہ آپ ایک بار صرف میری خاطر یہاں آئے تھے۔“

وعدہ مشکل تھا۔

کال کٹ گئی۔

دن پھر اپنے سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔

سردیوں کی ایک دوپہر تھی۔

ایس ایم ایس... مختصر سا... ”سر... آپ کے صوبے میں سانس لے رہی ہوں۔“

”کس شہر میں؟“

”لاہور...“

”خیریت ہے؟“

”کزن کی شادی میں آئے ہیں۔ سر!... اللہ حافظ... رات میں

ایس ایم ایس کروں گی۔" رات گزر گئی۔ رات میں موبائل سائینٹ موڈ پر ہوتا ہے۔ صبح دیکھا تو اس کے تین ایس ایم ایس موجود تھے۔ "سر... رات کا کھانا فورٹریس اسٹڈیم کے ایک ہوٹل میں کھایا۔ بہت اچھا لگا۔"

دوسرا ایس ایم ایس: "سر... فورٹریس اسٹڈیم کی سیر کے دوران میں ایک بک اسٹال پر رُکی۔ آپ کا افسانوں کا مجموعہ 'برائے فروخت' نظر آیا۔ سرگنتی خوشی ہوئی... مت پوچھیے خرید لیا۔"

تیسرا ایس ایم ایس: "رات میں سوئی نہیں۔ 'برائے فروخت' عمل پڑھ کر سوئی۔"

میرے موبائل میں اس کے چند ایس ایم ایس محفوظ ہیں جو میں نے ڈیلیٹ نہیں کیے... کیوں ڈیلیٹ نہیں کیے اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے، بہت سارے سوال ساری عمر جواب طلب رہتے ہیں۔ میں ایس ایم ایس ترتیب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

"کسی کو آنکھوں میں نہ بساؤ آکھوں میں صرف سنبھلتے ہیں انا نانا ہے تو دل میں بساؤ کیوں کر دل میں صرف اپنے بے ہیں"

"یوں راتوں کو نہ جاگو سولیا کرو یوں دل میں آئسو نہ رو کر دلیا کرو" "سر!... کیسے ہیں۔ امید ہے ٹھیک ہوں گے۔ کبھی کبھی تنہائی اور اداسی کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔

"پھر چاند کھلا پھر رات ہوئی پھر دل نہ کہا ہے تیری کمی پھر یاد کے جھونکے مہک گئے پھر پھل رماں بہک گئے پھر گزرتے لمحوں کی باتیں پھر جاگ جاگی راتیں پھر ٹھیکری چٹکوں پٹی پھر دل نہ کہا ہے تیری کمی..."

"سر... خبر نہیں کس چیز کی کمی ہے سمجھ نہیں آتی... اپنا خیال رکھیے گا۔"

"نہ ملتا نقد جاں دے کر بھی ہم کو

گراں تھا اس قدر سودا کہ ہم بازار چھوڑ آئے"

"کوئی آئینہ رکھ لیا کہ خود بھی دکھائی دے جس میں ضروری ہوتی ہے خود سے بھی ملاقات کبھی بھی"

"حیرت تو یہ ہے بچہ گروں کے جھوم میں اک نامراد زخم ہے جو سب نہیں رہا" موبائل آف رکھنا میرے مزاج کا حصہ نہیں۔ جیسے شراب میں کہا کہ رات میں سائینٹ موڈ پر ہوتا ہے۔ ایک بار بخار کے دوران میں نے موبائل بند کر کے رکھ دیا۔ بس روز موبائل آن کیا۔ اس کا ایس ایم ایس اس کی تڑپ کی گواہی دے رہا تھا۔ "سر!... دیٹ انا زنا فیمز۔ میں بہت ڈر گئی تھی۔ آپ کا نمبر کیوں بند تھا؟ بہت ڈر لگا مجھے۔ آپ ایسا نہ کیا کریں، اوکے۔ اپنا خیال رکھیے گا۔ شب بخیر۔ اللہ حافظ۔"

زندگی رواں ہے۔ ہم زمین پر اپنے حصے کا سفر مکمل کر کے سوچا نہیں گئے تو بھی یہ رواں ہوگی۔ میرے موبائل پر آج کل کے روزانہ شخص کا پتا معلوم کرنا ہے جو میز پر آدھا کپ چائے پیا گیا اور کرسی جس کے انتظار میں نہیں اٹھائی گئی۔ جب بھی اس کی تفصیل معلوم کرنے کو بات کی، وہ طرح دے جاتی۔ "سر... آپ سمجھنے کی کوشش کیجئے نا..."

"کیسے سمجھنے کی کوشش کریں؟" "سر... جو زندگی کے نقشے کیا من کی تلاش سے واپس نہیں آئے گا۔"

وہ اپنے دکھ... منکھ میرے ساتھ باٹھی... لگتی پڑا لے گئے پھر ٹوک تک کا ذکر کرتی۔ کوئی نئی کتاب... ٹوک کی ڈی... اس نے اپنی زندگی کے سارے ورق مجھے سنائے۔ میرے دل کے ریک میں اس کی کتاب زیست محفوظ ہے۔

ارادہ باندھا، نہ خیال تھا کہ کبھی اس کے شہر کا سفر درپیش ہوگا۔ لیکن ایک دن پاؤں میں سفر باندھ ہی اٹھی راہوں سے گزرتا تھا جہاں وہ رہتی تھی۔ اسے سر پر اندر دینا چاہتا تھا لیکن خیال آیا... اگر اس روز وہ گھر پر موجود نہ ہوتی تو اسے دکھ ہوگا۔

میں نے اسے ایس ایم ایس کیا۔

"سر... ناممکن... میں نہیں مانتی کب؟ کس وقت...؟"

"ساؤن کی ایک سہ پہر میں تیرے دیس سے گزروں گا حویلی کے باہر جوڑے رہا ہے وہاں اتروں گا۔ درختوں کے درمیان

لیں ہو منکر رکھے ہیں، مٹی کے کٹورے میں پانی پیوں گا۔" شاہ راہ سے ہوتا ہوا زندگی کی بھیر میں کم ہواؤں گا۔

"سر... آپ مذاق تو نہیں کر رہے ہیں؟" "کیا تیرا میرا مذاق چلتا ہے؟" ساؤن کی سہ پہر کو نئی اتنی سافٹ پر تھی۔ بڑی شاہ راہ سے

لیں میں نے اسی راستے پر ڈال دی جو اس نے سمجھایا تھا۔ تارکول کی ایک کہیں انگوٹھ کے قافلے، سرکنڈوں کے درمیان چرتی ہیں کے ریوٹ... جب میں حویلی کی جانب مڑا، اسے کشادہ اور

لیں میں نے اسی راستے پر ڈال دی جو اس نے سمجھایا تھا۔ تارکول کی ایک کہیں انگوٹھ کے قافلے، سرکنڈوں کے درمیان چرتی ہیں کے ریوٹ... جب میں حویلی کی جانب مڑا، اسے کشادہ اور

لیں میں نے اسی راستے پر ڈال دی جو اس نے سمجھایا تھا۔ تارکول کی ایک کہیں انگوٹھ کے قافلے، سرکنڈوں کے درمیان چرتی ہیں کے ریوٹ... جب میں حویلی کی جانب مڑا، اسے کشادہ اور

لیں میں نے اسی راستے پر ڈال دی جو اس نے سمجھایا تھا۔ تارکول کی ایک کہیں انگوٹھ کے قافلے، سرکنڈوں کے درمیان چرتی ہیں کے ریوٹ... جب میں حویلی کی جانب مڑا، اسے کشادہ اور

لیں میں نے اسی راستے پر ڈال دی جو اس نے سمجھایا تھا۔ تارکول کی ایک کہیں انگوٹھ کے قافلے، سرکنڈوں کے درمیان چرتی ہیں کے ریوٹ... جب میں حویلی کی جانب مڑا، اسے کشادہ اور

لیں میں نے اسی راستے پر ڈال دی جو اس نے سمجھایا تھا۔ تارکول کی ایک کہیں انگوٹھ کے قافلے، سرکنڈوں کے درمیان چرتی ہیں کے ریوٹ... جب میں حویلی کی جانب مڑا، اسے کشادہ اور

لیں میں نے اسی راستے پر ڈال دی جو اس نے سمجھایا تھا۔ تارکول کی ایک کہیں انگوٹھ کے قافلے، سرکنڈوں کے درمیان چرتی ہیں کے ریوٹ... جب میں حویلی کی جانب مڑا، اسے کشادہ اور

"خوب، خوب!"

میں نے ان کے ساتھ اس اپنی گیٹ کی طرف قدم بڑھائے جس کے دونوں پٹ سیاہ بھاری گولڈن کنڈے ساتھ ایک متصل منقش دروازہ قدیم عہد کی تاریخ کا گواہ۔

دروازے میں میری دل چسپی دیکھ کر نواب صاحب نے کہا۔ "معاذہ سے یہ دروازہ ہم متنگی داموں خرید کر لائے تھے۔"

نواب صاحب اسی دروازے سے اندر چلے گئے۔ وہ میری محبت نہیں تھی پھر بھی عجیب سی ہے جیسی تھی... ایک نوکر نے سرگوشی کی۔ "آپ خوش قسمت ہیں۔"

"کیسے؟"

"نواب صاحب کے ڈرائنگ روم میں منسٹر اور قریبی دوستوں کے علاوہ اور کوئی داخل نہیں ہوتا..."

جب میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا مجھے سکتا ہو گیا۔ دیوار پر چیتے کی کھال، دائیں جانب نظر گھومی تو ان کے آباؤ اجداد کی منقش فریموں میں جڑی تصویریں، فرنیچر انتہائی قیمتی نفیس، شیشے کی ڈرائنگ ٹیبل کے گرد چوہیں کرسیاں...

"آپ ہمارے مہمان ہیں، گو چند لمحوں کے لیے سہی۔ ہماری کوشش ہوگی یہ لمحے آپ کو یاد رہیں۔"

موضوع سخن کتابیں تھیں، تاریخ اور سیاست! ایک نوکرانی بے آواز قدموں سے داخل ہوئی اور جوس کے دو گلاس میز پر رکھ کر اسی انداز میں موڈ باندھ لوٹ گئی۔ اگلے چند لمحوں میں اس نے میز پر فروٹ جن دیے۔ چائے میں پیڑا فروٹ ایک شکٹ، سوسے قیے والے، آلو کے ٹکڑے...

میں اس لمحے ڈرائنگ روم میں موجود نہیں تھا۔ میں کہاں تھا...؟ نہیں معلوم... میں لوٹ جانا چاہتا تھا۔ میں کیوں آیا...؟ یہاں کیوں گھڑی بھر کو قیام کیا...؟ چائے کی پیالی ابھی ہونٹوں کے قریب تھی کہ ایک نوکر رکوع کی حالت میں اندر داخل ہوا اور نواب صاحب کو کسی کی آمد کی اطلاع دی... آنے والا تھا، انا تھا کہ نواب صاحب خود چل کر گئے۔

نوکرانی ظاہر ہوئی۔ "مالکن کہہ رہی ہیں خدمت میں کوئی کمی رہ جائے تو معاف کر دیجئے گا۔"

نوکرانی کو کیا معلوم تھا کہ کسی کس چیز کی ہے! چند لمحات... ٹھانے... وقت کی مٹی سے پھل کر گرے۔ پھلے لمحوں میں خوف تھا، امید اس خوب اور نہ جانے کیا... چند ٹھانے۔ ڈرائنگ روم کے ساتھ ملحقہ کمرے کا دروازہ کھلا... پردہ مہر کا۔

ہی تھا تو ایسے لوے کے قدموں میں کیوں ڈال دیا جو ہانہوں میں سینے کا بھی حوصلہ نہیں رکھتا۔

اسی طرح کئی دن بیت گئے اور تیل نیچے ہی نیچے ایک گھونسلے کی شکل بناتی گئی جس میں اس کی ڈالیاں تکلیف سے اینٹھ اینٹھ لگی تھیں۔ میں نے اُسے قریب سے دیکھا۔ مجھے لگا، جیسے وہ ایک ایسی لڑکی ہے جس نے مہینوں سے اپنے پانوں میں لکھی نہ کی ہو۔

میں نے اُس سے پوچھا۔ ”تُو نے اپنا حلیہ کیوں بگاڑ رکھا ہے؟“

وہ تکلیف سے مسکرائی اور کہا۔ ”اپنا حلیہ تو بگڑا ہی رہتا چاہیے۔ کاہے کروں سنگار پیا بن...“

پھر اس کے ہونٹ کاٹنے اور بند ہو گئے۔

میں نے تھک کر اُس کی ڈالیوں کو پکڑا، انھیں ہلکا جھٹکا دیا اور تھوڑی کچھ تانی کے بعد اس کا رخ قریب کی چار دیواری کی طرف کر دیا۔ وہاں سے جب لوٹی تو مجھے اپنی وہ پہیلی یاد آئی جو جان بوجھ کر مائیکہ میں عمر گزار رہی ہے اور اپنی بھابی کے بچوں کی اچھی بوا ہے۔

اس دوران میں میں ایک ہفتے کے لیے باہر گئی تھی۔ جب لوٹی تو دیکھا کہ تیل تو چار دیواری پر چڑھ چکی ہے۔ اس کے تنے سیدھے اور ہرے ہو گئے ہیں۔ اُن میں پرانی نرمی آگئی ہے اور وہ جھوم جھوم کر جیسے میرا شکر ہی ادا کر رہی ہے۔

میں نے درخت کی طرف دیکھا۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں وہ مجھ سے ناراض نہ ہو کہ اس کی چاہنے والی کو میں نے گمراہ کیا... لیکن وہ جوں کا توں پرانے انداز میں کھڑا تھا۔ مجھے لگا، وہ اونگھ رہا ہے اور تھوڑی دیر میں سو جائے گا۔ پھر خڑائے بھرے گا... اور مجھے خڑائوں سے بڑی نفرت ہے، اس لیے میں وہاں سے ہٹ گئی۔ میں نے سوچا، بڑا اچھا ہوا جو تیل کو اس کا سہارا نہ ملا، نہیں تو اب تک وہ اس کے خڑائوں سے مر چکی ہوتی۔

تھوڑے دن بعد، میں نے دیکھا کہ تیل چار دیواری پار کر چکی ہے۔ مجھے کچھ شرمندگی سی ہوئی۔ حدوں کو پار کرنا مجھے پسند نہیں اور جسے میں نے راہ دکھائی، وہ آوارہ ہو جائے، یہ کتنے شرم کی بات ہے!

میرے جی میں آیا کہ جاؤں اور اسے گھسیٹ کر ادھر کھینچ لاؤں۔ میں غصے سے بھری، گئی اور میرے ہاتھ لکے بھی لیکن... اوہ! جو منظر میں نے دیکھا، اس سے میرا دل بچا تھا۔ دل ہی

چھتا، کیوں کہ آواز گلے تک نہیں آئی۔

اب ہماری تیل اپنے ان گنت پتوں کے ساتھ چار دیواری کے باہر نئے نازک سے پیڑ سے لپٹی پڑی تھی، اُسے شاید پھیلنے والی دلوں سے سہارا دیتا آ رہا تھا۔ وہ گستاخ پتھر میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا جیسے حیا شرم گھول کر لی چکا ہو۔ تیل نے مجھ سے دیکھا اور شرم کر اس کے ارد گرد ڈول گئی۔ اس کی ادا دیکھ کر مجھے محلے کی وہ کچن لڑکی یاد آئی جس کی کمر بہت پتلی ہے اور جو ہرے نیلے رنگوں کی فراک پہنتی ہے اور جو بھی اُسے دیکھتا ہے اس کی طرف ایک شرمیلی مسکراہٹ پھینک کر، اونچی تیل کی سینڈلوں پر کھینچتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے۔ پھر مجھے بال ڈانس کا کمر یاد آیا جہاں گڈے گڑیا کا ایک جوڑا تھرکتے تھرکتے لپٹ جاتا ہے۔ یہ جوڑا خدا کا بنایا ہوتا ہے نہ سماج کا، یہ اپنے دل کا جوڑا ہوتا ہے لیکن یہ بات تو انسانوں کی ہیں، اس تیل نے یہ سب کہاں سے سیکھا؟

میں یہ سوچ رہی تھی کہ اُس پیڑ کی تیل ڈالیاں ہیں جس میں تیل کے دھاگے اٹھتے ہوئے تھے۔ اس نے تیل جھک کر اس کا استقبال کیا۔ مجھے اس کا ٹھکانا، بلنا اور مستی میں اترنا بڑا پیارا لگا۔ اُس کی شکل کچھ ایسی لگ رہی تھی جیسے کسی گورے بچے آدی نے کئی دلوں سے شیونہ کیا ہو اور جس کے چہرے پر ہرے ٹکے کاٹنے بیچ رہے ہوں۔

مجھے اس طرح گھوڑے دیکھ کر وہ کچھ بد بدایا۔ شاید کہہ رہا ہو... ”باجی! تمھارا یہاں کوئی کام نہیں۔ تم اپنا فرض پورا کر چلیں۔“

سچ سچ اب میری وہاں کیا ضرورت تھی۔ میں کچھ ابھی کچھ بھی ہوئی سی واپس آئی۔ میں انھیں نیکی کا دل بھی نہیں دے سکتی تھی کیوں کہ خود آج تک نیکی کے بارے میں کوئی کتاب بھی پوری نہ پڑھ سکی تھی۔ اکثر سوچا، کم سے کم ایک دو پڑھ ہی جاؤں۔ شروع بھی کیا لیکن پانچویں صفحے تک پہنچتے پہنچتے اپنا حوصلہ ختم ہونے لگا۔ پھر اچھی بار کے لیے اُسے حفاظت سے رکھ چھوڑا ہے۔ لیکن آگے پھر بھی اس کی باری آئی ہی نہیں۔ میں نے بھی مذہبی مجلسوں میں بھی حصہ نہیں لیا۔ چاہا بھی لیکن وقت نہیں ملتا۔ سوچتی ہوں، ابھی یہی زندگی سُدھار لوں اور اگر زندگی پھر بھی باقی بچی تو پھر دوسرے جہاں کے لیے بھی کچھ کر لوں گی۔ ہاں، میرے گھر کے مغربی میدان میں اکثر تیلانی اجتماع ہوا کرتا ہے جن میں فلمی گیتوں کی دھن پر نعتیں اور

ان کی ہوتی ہیں۔ یہ سب مائیک پر ہوتا ہے اور میں اپنا گھر لڑکھائیوں میں لے کر جاتا ہوں، اس لیے مجھے سننا پڑتا ہے۔ جیسے ”پیرا پیرا“ اس طرح ہر مشہور دھن اپنی قیمت پر روتی ہے اساتھ ساتھ روتے ہیں موسیقار۔

اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ نیکی کے بارے میں ان کی کوری ہوتے ہوئے کیسے دوسرے کو کچھ کھادو؟ میں کچھ کہنا بھی چاہوں تو میرا بچہ اس قوالی کے سرے لیے اسے ماری ہوگا۔ اسی لیے میں چپکے سے اپنا منہ لے کر آئی۔

آ کر دیکھا، ہمارا پرانا درخت جوں کا توں کھڑا تھا۔ اس کی پتوں کے پاس تیل کی کچھ بھی نہیں تھی۔ اس کی کچھ بھی اس کے بڑھ چکی تھی۔ بڑے پاس سے وہ اپنے آپ کو چھٹی تھی اور اس کی جڑ دیکھ کر کوئی اس کے منظر کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک لمبی سانس میرے دل سے نکلی جس میں اُن پرانے درخت کے لیے ایک حسرت تھی۔

آدی کا دل بھی بڑا عجیب ہوتا ہے۔ میں نے مجھے اس درخت سے اُتر دیا۔ کل تک مجھ سے اس پر اس کا ہوتا تھا۔ آج جب اس کی تیل اُسے بالکل ہی بھول چکی اور پھر بھی یہ روٹھا نہیں ہے اس پر اس کا آ رہا ہے۔ ابھی میں سوچ نہیں پاری ہوں کہ میں نے اسے کیا کرنا ہے؟ میں نے اسے یاد دیا یا یہ اس کے بس کی بات تھی؟ میں نے اسے یاد دیا ہو کہ خدا نے اسے پیار کرنے کا ارادہ ہی نہ دیا ہو۔ اسے بتاتے وقت اس کے اندر دل رکھنا اور کیا ہو۔ تب بے جا رہا کیا کرے! بغیر دل کے آدی پیار کر سکتا ہے۔ میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ وہاں دل رکھ رہا تھا۔

گھر میں آئی تو دل چاہا اپنے آپ کو دیکھوں کیوں کہ میں یاد نہیں آ رہی تھی۔ جب بھی میں نے اپنی شکل یاد کرنے کی کوشش کی، وہ تیل میری نظروں سے چھائی... ہماروں طرف رہا ہی تھی جس میں میرے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ اسی لیے میں قد آدم ششے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اپنے سامنے، میں تھی... ہاں، وہی پانچ فٹ ڈھائی انچ کا وہی وزن، وہی سانا لورنگ... میں مطمئن ہو گئی۔ باہر کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ خدا کا لا لاکھ لا لاکھ احسان ہے کہ اس نے مجھے بے حس پتھر نہیں بنایا نہیں تو بھلا میں دل کے ٹوٹنے والوں کے کٹ جانے کا راز کیا ہے چھاپا پاتی؟

ابھی میری نظر اپنی آنکھوں پر پڑی۔ ان آنکھوں نے

ضیاع وقت

نیچر، ٹائٹس ہے، ”اگر تمہارے کام کی رفتار کا یہی حال رہا تو مجھے تمہاری رپورٹ میں لکھنا پڑے گا کہ تم بہت وقت ضائع کرتی ہو۔“

ٹائٹس، ”سرا مجھے یہاں آئے ہوئے صرف ایک مہینا ہوا ہے اور میں نے باس سے ملنے بھی کر لی ہے۔ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں وقت ضائع کرتی ہوں؟“

جنت

مردوں کے ایک بہت بڑے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے جو شیلے انداز میں ایک خاتون نے کہا۔ ”میرے ہم وطنو! جیسا کہ آپ کو معلوم ہے عورت ماں ہے، عورت بہن ہے، عورت بیٹی ہے، عورت عظیم ہے۔ اگر کائنات میں عورت نہ ہوتی تو آپ لوگ کہاں ہوتے؟“

جلسے کے ایک کونے سے آواز آئی۔ ”جنت میں!“

مسز ڈارلنگ

ایک حسین بیکری نے اپنے نو جوان افسر کو دیکھا اور مسکرا کر بولی۔ ”ہیلو ڈارلنگ!“

افسر کے چہرے کھڑی ہوئی خاتون نے فوراً کہا۔ ”مجھ سے بھی ملو میں ہوں مسز ڈارلنگ۔“

تعاون احمد دسم بال، کوبرا والہ

سچ سچ مجھے بڑا پریشان کر رکھا ہے۔ ان کی یہ حرکت تو دیکھیے کہ جو باتیں زبان تک بھی نہیں آتیں انھیں بھی یہ اپنی پلکوں میں بھر کر ساری دنیا کے سامنے انڈیل دینا چاہتی ہیں۔ آج چودھویں شب ہے یا ماوس ہے یا کہیں گرن لگا ہے۔ کچھ تو ضرور ہے۔ نہیں تو بھلا دل کے سمندر میں یہ اتنے جوار بھٹا کیوں اٹھ رہے ہیں؟ کیوں میری آنکھیں ان لہروں کے تھپڑوں سے تھک گئی ہیں؟ کیوں ان کے کنارے بھیگ گئے ہیں؟ کیوں مجھے ان لہروں پر تیرتی برسات کی رات یاد آ رہی ہے جس میں میری پہیلی اپنے قانونی ساتھی سے جسے اس وقت وہ چاہتی تھی، آرزو کر رہی ہے کہ وہ اسے اپنے بستر پر جگہ دے۔ کیوں کہ اتنی سردی میں تنہا نیند نہیں آئی۔ اس کے ساتھی کو نیند بہت پیاری تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر نیند ساڑھی بلاؤ تو پہنتی تو وہ اسی سے شادی کرتا۔ خیر، وہ شخص ان سب سے ناراض ہو جاتا تھا جو نیند سے اُسے جدا کرتے

کی دیا سے ہوا... گلاب گڑھ کے تمام پرانے پاس یا عدل
فیل آدی اس بات کو ماننے سے صاف انکار کر دیتے ہیں۔
بھلا وہ اس بات کا جواب تو دے کہ یہ بتانی کس طرح کھیت
میں دیا نے ہوئے ایک گھرے کو تیل کی شوگر لگ جانے سے
پیدا ہو گئیں؟ کرن جی کس طرح کتنی جی کی میل سے بن
گئے؟ رام چندر جی کے دوسرے بیٹے کش کو کشا یعنی گھاس
سے کیسے بنایا گیا؟

خواہ مادھو مٹی کے ایک ڈھیلے سے بنا تھا، پھر بھی اسے
مٹی کا مادھو نہیں کہا جاسکتا تھا۔ کیوں کہ وہ ایک بہت سمجھ دار
آدی تھا۔ اگر گھر کے آدی اسے مٹی کا مادھو سمجھتے تھے تو سمجھا
کرتے۔ گھر کا جوگی جوگڑا... گھر والوں کو یہی شکایت تھی کہ
مادھو گھر کا کام کاج کرنے کے بجائے دوسروں کا کام کر کے
زیادہ خوش ہوتا تھا اور حقیقت میں اس بات سے مادھو کی
تعریف ہی کا پہلو نکلتا ہے۔

ہاں! کچھ مادھو کی صورت کے متعلق بھی بات ہو جائے۔
وہ قد کاٹھیا تھا اور جسم کا اکہرا۔ عمر بھی کوئی چالیس پینچالیس
کے لگ بھگ ہوگی۔ چہرے پر چمک کے دار، گورے رنگ
سے کچی پھڑی ہو رہے تھے۔ کلکاری کی آنکھیں تو رسی تھیں ہی
مگر مادھو کی زیادہ دور تک مار کرتی تھیں۔ قدرے باہر کو ابھری
ہوئی تھیں... اتنی ابھری ہوئی کہ سوتے میں بھی ہمیشہ نیم باز
رہتیں۔ گلاب گڑھ کے پرانے اسکول کے مٹی بھائی گریب
داس، جو کبھی شہر میں جا کر ایک آدھ روپی فلم کے نظارے
سے مستفیض ہوا یا کرتے تھے، مادھو کی آنکھیں کو ”پلمان کی
آس“ مار کا آنکھیں کہا کرتے تھے۔ اور ان کے ہونہار شاگرد
اپنے استاد کے ارشاد پر تعظیم کرتے، یا بالکل تجدید کرتے
ہوئے مادھو کو ”چکا ڈنیا“ کہتے تھے۔

کلکاری زندگی کے روشن پہلو اور مادھو تار یک پہلو کو
دیکھنے کا عادی تھا۔ دونوں میں یہ ایک دل چپ مگر
خطرناک فطری تضاد تھا۔ اس وجہ سے اکثر ان کی آپس
میں ایک آدھ جھڑپ ہو جایا کرتی۔ مادھو کی قنوطیت اس
درجہ نمایاں تھی کہ جو کوئی اسے بازار میں ملتا تو بجائے ”جے
رام جی کی انا صاحب سلامت کے“ کہتا۔ ”کہو جی مادھو...
من کی من میں رہی؟“

فتا کا نام اندہ اور قنوطیت کا علم بردار انی الفورا ایک گہرا، خنڈا
سانس لیتا اور کہتا۔ ”ہاں بھائی! من کی من میں رہی۔“
اس قسم کا طریقہ مخاطب کلکاری کو سر سے پاؤں تک جلا

دیا کرتا۔ کیا کرتی وہ؟ گلاب گڑھ کے لوگ تو اس کی شادی سے
پہلے ہی مادھو کو اس کی یاس پسندی کی وجہ سے یوں خطاب کرنے
کے عادی تھے۔ انھیں روکنا اس پودے کو موٹوںے کے برابر تھا جو
خاصاتن آور درخت بن چکا ہو۔ بہر حال، وہ بہت ہی جھلانی
اور جو کوئی مادھو یوں خطاب کرتا، اگلے روز اس کی بیوی، ماں یا
بہن سے کلکاری کی لڑائی ہوتی اور کلکاری جواب طلب کرتی۔
آخر اس من کی من میں رہی، کا مطلب کیا ہے؟“

مادھو کلکاری کے اس احتجاج پر بہت خوش ہوتا۔ ذہنی
بجاتا اور کہتا۔ ”میری زندگی کلکاری کو کتنی پیاری ہے۔ کسی کو
من کی من میں رہی کہنے ہی نہیں دیتی۔ حالاں کہ نہ اسے
ہنسلی بنوا کر دی ہے اور نہ پازیب... ارے تین مہینے سے تو
پیٹ رہی ہے۔“

ایک دن میں نے مادھو کو یک بہ یک فلسفی بننے دیکھا۔ مٹی
گریب داس کے سامنے وہ عورت کی محبت و مروت کو سراہ رہا
تھا... ٹنگرو کی قلاچ سے زیادہ عجیب، اجڑ اور دیہاتی انداز
میں... اور کون نہیں بھانپ سکتا تھا کہ اس کا اشارہ کلکاری کی
طرف ہے۔ اس کے لفظ تھے:

بھائی گریب داس! اگر دنیا عورت کے بجائے آدی
کے پیٹ سے پیدا ہونے لگے تو دیا، پریم اور نرمی کا
نام ہی نہ رہے۔ عورت آدی کو اپنی کوکھ سے جنم
دے کر اس کے اکھڑ پن کو دھمکرتی ہے۔

کتنی حقیقت سے لبریز تھا مادھو کا عملی فلسفہ! ایسی لاکھوں
کی ایک سُن کر بھی جو مادھو کو مٹی کا مادھو بننے، کیا وہ خود مٹی کا مادھو
نہیں ہے؟

برج والے نوئیں کی بیڑ، جھرکل، ڈھول اور ٹنگرو ٹوٹ
جائے گی مگر مادھو اس کی طرف متوجہ نہ ہوگا۔ بیلوں کی جوزی
سے زیادہ سے زیادہ کام لے کر کم سے کم چار ڈال کر اس کے
مزارع دودھو سے بیلوں کی جوگ کو ایسا ناکارہ بنا دیں گے کہ کلو
شاہ کے بھرے میلے میں ان کی قیمت پچاس پچاس روپے سے
کوڑی نہ بڑھے گی۔ گھر میں کسی خوشی یا غم کے موقع پر مادھو سے
کسی قسم کی توقع بے کار ہوگی۔ مگر وہ دوسروں کی مدد کے لیے کتنی
جلدی لنگوٹ کسے گا... گلاب گڑھ میں ایک بیوہ امبورتی تھی۔

اس کے خاوند زلیا کو مرے سات سال کے قریب ہوئے تھے۔
اسی روز سے بے چاری اپنی عزت کو سنبھالنے بیٹھی تھی۔ اگر
اسے سماج کے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو بے چاری کبھی کی تار
برباد ہو چکی ہوتی۔ مادھو کو اس کی مدد کرتا دیکھ کر لوگ کئی طرح

کے بہتان لگاتے، طرح طرح کی باتیں بنا کر محصور مادھو اور بد
عصب بیوہ کو بدنام کرتے۔ سماج میں اتنی دیا کہاں کہ جس چیز کو
وہ دودھینے سے بچکا تھا ہے، اپنے کسی فرد کو دیتا دیکھے۔ امبورتی
وہ لوگوں کی مخالفت نے دونوں کی زندگی اچیرن کر دی تھی اور
اس مخالفت میں کلکاری سب کی پیشانی کرتی تھی۔

اگر یہ سچ ہے کہ کسی غیر مرد کا یوں بیوہ کی مدد کرنا پاپ ہے تو
اسی سچ ہے کہ سماج کے دائرے میں رکھ کر ایسی شکستہ حال بیوہ
کے رہے سبے کوشت پوست کو بچ کر کھانا کوئی ناپ نہیں!
ایک دن مادھو انھیں باہر سے آیا۔ وہ چہرے سے کسی گہری
دہائی میں ڈوبا دکھائی دیتا تھا۔

”مجھے نہیں دے دو کی کارنی؟“ مادھو نے گاڑھے کی
ہار کو اپنے پڑاؤ سے لٹائے کہا۔

”کیا کرو گے اسنے روپوں کا؟“
مادھو کو اس سوال کی توقع تھی۔ کلکاری کو اس بات کا وہم رہتا
تھا کہ مادھو اپنی سخاوت پر سند طبیعت کی بے جا روپیا خرچ
کر رہا تھا۔ اور اس کا عقیدہ تھا کہ جو آپکھا یا سوکھا یا، جو کھلایا
یا نہ کھلایا۔ وہ روپیا جمع بھی کرتی تو اس لیے کہ زندگی میں کبھی کام
آئے گا۔ وہ بارہ ہمیشہ جیتی رہے گی۔ اتنی کمی آس... اور شرادھ
کے دنوں کے نام پر وہ بہت سا روپیا دان بھی کرتی۔ مگر
اس کام کے دن سے مادھو متعلق نہیں تھا۔

”کیا روپے ان روپوں کا؟“ اس سوال کا جواب مادھو
پہلے ہی سے اپنے ذہن میں تراش رکھا تھا۔ فوراً بولا۔
”چند دن ہی ہوئے تو خود ہی ہنسلی اور پازیب کے لیے
کھری مٹی... میں باہر جا رہا ہوں، بنوالا ڈال گا۔“

کلکاری اچھل پڑی۔ بھلا ہنسلی اور پازیب کے لیے کون
کس روپے نہ دے گا۔ وہ فوراً گندم کے ڈھیر میں چھپائی ہوئی
مٹی اٹھا لائی اور مٹی کے پچیس روپے مادھو کی کمر میں بندھوا کر
دیا۔ ”سنوکل گرانٹ ہے... مگر سگرات۔ تمہارے بہو بیٹے کا
نام ہار ہوگا۔ ہو سکے تو سنا رہے پاس ہی بیٹھ کر ہنسلی ڈھولالیا،
اس کو اس کے عوض کوئی اور ہی لے آتا... پل کی پل کھولیں گی۔
مٹی آتا، میں نے تیرا ہمانا نہ کا بندوبست کر لیا ہے۔“

مادھو نے کمر میں بندھی ہوئی ہانسلی پر ایک چست سی
مٹی ڈالی اور چل دیا۔ سگرات بھی آ گئی۔ اس دن سورج
اسی سے نکل کر مکر راسی میں داخل ہوتا ہے، اس لیے اسے
سگرات کہتے ہیں۔ سگرات کی دیوی نے سوائے مادھو کے
کے گلاب گڑھ کو کیا تمام دنیا میں سے پاپ کی جگہ کئی

جھوٹے مرد

ایک طویل سفر کے دوران ایک بچپن ساٹھ سالہ مسافر
خاتون نے اپنے ایک ہم عمر مسافر سے محض وقت گزارنے کی
خاطر ملکہ سلک اور تھکے کے بعد پوچھا کہ کیا یہ سچ ہے کہ مرد
زیادہ جھوٹے ہوتے ہیں؟

اس پر مرد نے کہا، ”مخترم! چھوڑو! یہ ان فردی اور غیر
اہم قیاسات کو! میں تو آپ کو دیکھ کر دنگ رہ گیا ہوں کہ باوجود
اتنی عمر کے بھی آپ حسن و جمال میں اتنی پُرکشش ہیں کہ میں
کبھی نہ بھول سکوں گا۔“

خاتون کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ وہ شرم کر بولی، ”وہ
عورتیں کتنی غلط ہیں جو مرد کو خواتنہ جھوٹا قرار دیتی ہیں!“

طارق محمود کی شہنی، سعودی عرب سے

کے لیے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو بھیلایا اور ترشول تان کر دنیا کا
سفر کرنا شروع کر دیا تھا۔ سچی دھجی عورتیں تیل، گڑ، پیہ، امر وادور
گندیریاں پانت رہی تھیں۔ پریم کے اس تبادلے کو ادنیٰ بھرن
کہتے ہیں۔ ادنیٰ بھرن کرتے ہوئے وہ غیر ارادی طور پر ہماری
زندگی میں ایک روح چھوٹک دینے والا پیغام دے رہی تھیں۔
دراز سے دراز اور سیاہ سے سیاہ زبان رکھنے والی عورت بھی اپنے
چہرے کو ایک عارضی مسکراہٹ سے مزین کرتے ہوئے کہہ
رہی تھی۔ ”بیٹھا بیٹھا اور بیٹھا بیٹھا بولو۔“

چوں کہ مادھو کے بہو بیٹے کا پہلا تیار تھا۔ دونوں کو صحن
کے وسط میں ایک دھوئی اور ایک لنگوئی بندھوا کر بٹھا دیا گیا۔ جسم
پر تیل اور دہی ملا گیا۔ اس کے بعد بہو کی بہن نے بہو کو اور ڈھلا
کی بہن نے ڈھلا کو سہیلے گاتے ہوئے نہلایا۔ کونے میں بیٹھے
ہوئے آدمیوں نے چند پرانے سے تانوس اور نقیریاں بجا لیں۔
دف پر چوٹ پڑی، کلکاری نے سینڈرو مصری اور تاریل بانٹا۔
اس وقت مادھو کا بدھائی لینے کے لیے وہاں ہونا لازمی تھا مگر وہ
کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔ کلکاری کو تو اپنی ہنسلی اور پازیب کی
پڑی تھی۔ وہ رورو کر مادھو کو کتنی اور اپنے گلے اور ایڑیوں کو
ساڑھی کے پلوٹوں سے چھپاتی... کلکاری جان گئی کہ سنار نے
ہنسلی بیاتے ہوئے دیر لگادی ہوگی۔

کبھی کبھی اسے خیال آتا۔ شاید مادھو میری زیادتیوں کی
وجہ سے مجھ سے روٹھ گیا ہو۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ سگرات

کے دن روٹھے منانے جاتے ہیں۔
مگر سیدھا سادہ مادھو اتنے پھل بل کہاں جانتا تھا... سنار
کے پاس آدمی دوڑا گیا تو پتا چلا کہ مادھو وہاں پہنچا ہی نہیں۔
ماھو کی ڈھنڈپائی کوئی بچر تو تھا نہیں کہ راستہ بھول جاتا۔
کلاکارنی کی تشویش بڑھی۔ اس نے چاروں طرف آدمی بھیجے۔
اس میں شک نہیں کہ مادھو نے گھر کی طرح کلاکارنی کی کسی ہوش
یا رعونت کو سو نہ پوچھا تھا مگر وہ اتنا بے مہربانی تھا کہ اپنے بہو
بیٹے کے پہلے تیوہار کے شگون منانے سے اجتر کرتا۔
شام تک مادھو نہ پہنچا اور نہ کلاکارنی کی ہنسی اور پازیب۔
کلاکارنی کا غصہ اور فکرو دونوں سرعت سے بڑھنے لگے۔
جب شام کو دیوں کو دیاسلائی دکھائی گئی تو عورتیں سب کی
سب ایک ایک کر کے رخصت ہو گئیں۔ پہلے شور و غوغا سے آشنا
کان براہ خاموشی کو پا کر شائیں شائیں کرنے لگے۔ اس وقت
کلاکارنی کے کانوں میں ایک دھیمی سی آواز آئی۔ اس کا پردی
بجھا رہا تھا۔ ”کو بھائی مادھو! من کی من میں رہی؟“
جواب میں ایک مردہ سی آواز آئی۔ ”ہاں بھائی! من کی
من میں رہی!“

اب تک تو کلاکارنی کی فکر اس کے غصے پر غالب تھی۔ لیکن
مادھو کو بے آغوش چھیننے اور پھر برس کے برس دن ”من کی من میں
رہی“ کے الفاظ کہتے سن کر اس کا غصہ فکر پر غالب آ گیا۔ وہ سر
سے پاؤں تک راہ تھی تو ہو گئی۔ بجلی کے مانند چمکی، صحن میں
آئی۔ ڈیوڑھی میں پہنچ کر دروازے کی زنجیر اندر سے چڑھادی۔
تنگی ایڑیوں کو دیکھ کر اس کا غصہ اور بھی چمک اٹھا، اس اثنا میں
مادھو دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا اور سردی سے کانپ رہا
تھا۔ پوہ ماگھ کی سردی جگرتی تھی۔ کھینچے ہوئے مادھو نے
کلاکارنی سے درو دھکولنے کے لیے منت کی۔

اندر سے آواز آئی۔ ”جاؤ... باہر ہی رہو۔ اب تمھاری
ضرورت ہی کیا ہے؟ چھوڑنا اٹھائے ہو اور پھر چلے جاؤ... اتر
ہے تو اتر کو، دھن ہے تو دھن کو... گھر کیا ہے، ہنسی کھیل بنا رکھا
ہے۔ بڑے سونڈھ کی جز تلاش کرنے گئے تھے... اتنا بھی نہیں
سوچا! گھر میں خوشی ہے... پریشمن چاہا تو یہ من کی من میں
رہے گی... دو ایلا کیوں کرتے ہو۔“

مادھو کچھ دیر کے لیے ٹھٹک گیا پھر بولا۔ ”دروازہ تو کھولو...
کارنی، دیکھو سردی کے مارے اتر رہا ہوں۔ تمھاری ہنسی اور
پازیب بخوانے گیا تھا۔“

”میں جانتی ہوں۔ سنار کے پاس تو تمھاری پرچھائیں

تک نہیں پھسکی... سچ کہو! کیا تم اس میری سوت کے پاس نہیں
گئے تھے؟“

”کون سوت؟“
”امبو... اور میری سوت کون ہوگی؟“

حقیقت میں مادھو اسی کے پاس گیا تھا۔ کلاکارنی کے
سامنے اس بات سے انکار کرنے کی جرأت نہ پڑی۔ اور وہ
انکار کرتا بھی کیوں؟ بولا۔ ”ٹھیک ہے کارنی... امبو بہن نے کہا
بھیجا تھا“ ساہوکار نے ایک ایک روپے کے دودو اور دودو کے
تین تین بنالے ہیں، اور میں نے تیس روپے تم سے دراصل اسی
لیے مانگے تھے۔ تمھاری ہنسی میں اپنے پیسوں سے بخوادوں گا
جو ڈاک گھر میں جمع ہیں۔ فکر نہ کرو، دروازہ تو کھولو۔“

مادھو کو کوئی جواب نہ ملا۔ کلاکارنی کے بڑبڑانے کی آواز
آئی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”برس دن کے بعد ایک آدھ دن خوشی کا
آتا ہے... اس میں بھی دکھ ہی ملتا ہے... ہو بیٹے کا تیوہار روز روز
تو نہ آئے گا... سہیلے روز روز نہ گائے جائیں گے... اپنے موقع
پر خوشی کو با کر کون دن موبلے... یہ ہیں کہ یہ ہیں... کسی بہن کو
مادھو نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا۔ ”کسی بہن کو
دکھ دیکھ کر مجھ سے تو مدد اور رتی کے سہیلے نہ گائے جائیں
ہیں، نہ گائے جائیں گے!“

کلاکارنی نے دروازہ نہ کھولا...
مگر اسے نیند کہاں آئی تھی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد اس
نے آہستہ سے کواڑ کھول کر دیکھا۔ اس کا مجازی خدا دروازے
کی چوکت پر سر ٹیک کر اونٹھ گیا تھا۔ اس کے گھٹنے چھاتی سے
لگ رہے تھے۔ کلاکارنی کی آنکھوں سے ٹپٹپ ٹپٹپ آٹسو گرے
لگے۔ شرمندگی کے ایک گہرے احساس نے اس نے مادھو کا
شانہ ہلایا بولی۔ ”میں جانتی ہوں... چلو گے اندر...“

مادھو نے آنکھیں ملے ہوئے سر اٹھایا اور بولا۔ ”ہاں...
چلوں گا!“

مادھو اندر رہے میں اپنے ہاتھ کو دیکھنے لگا۔ سردی میں
ہاتھ سبز ہو رہے تھے۔ یوں لگتا ہوتا تھا جیسے وہ اس کے
اپنے نہیں ہیں۔ کلاکارنی نے جلدی سے انگلی تھکی چلائی۔ مادھو
کے کٹڑے ہوئے جسم کو گرم کیا اور اس کے پاؤں پر سر رکھ کر
دیر تک روتی رہی... اور یہ رونا دھونا کا ہے... مادھو کو تو وہ
بھی غصہ نہیں تھا!

نصف شب کے قریب مادھو کو چھاتی میں کچھ درد محسوس
ہوا۔ باقی رات وہ چھاتی کو دباتا اور کر اہتا رہا۔ کلاکارنی نے

گرم کر کے جانفل کوٹ کر ماش بھی کی مگر مادھو کا درد بڑھتا
کہا۔ ”من ہوتے ہوتے اس کی تکلیف بہت ہی بڑھ گئی۔ دور
ایک سے سیانے لائے گئے، مادھو کو نمونیا ہو گیا تھا۔ اس کے
دلوں پھیپھڑے شل ہو گئے تھے۔ سانس مشکل سے آتی تھی۔
کارنی کبھی کبھی کہ نمونیا وغیرہ کچھ نہیں۔ ابو بہت گندے تعویذ
جاتے ہیں۔ اس نے کچھ نہ کچھ دے دیا ہوگا۔ اگر وہ گزشتہ شب
کے واقعے کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اپنا تصور مان لیتی تو وہ دیوی
کے لیم لیم ہوتی۔ مگر وہ تو محض ایک عورت تھی!

دوپہر کے قریب کچھ افاقہ ہوا۔ اس نے کارنی کو بلایا اور
بولا۔ ”میں نے سنا ہے... کہ تم نے امبو کو اندر تک نہ آنے دیا۔
اب وہ میری جگہ لینے کے لیے آئی تھی... کیوں؟“
”نہ جاننا تھا۔“

”تم جانتی ہو میں امبو بہن سے بہت پیار کرتا ہوں...“
”ہاں... مگر میں جگ ہنسائی نہیں جانتی... تمام دنیا میرے
کے لئے لگائے گی... جانتے بھی ہو دنیا بھر...“

”جانے دو دنیا کو“ مادھو نے بائیں پھیپھڑے میں درد
کی ایک تیس محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”اب جب کہ میں مر رہا
ہوں، مجھے دنیا کی پروا ہی کیا ہے... میرے پاس تو اتنے بول بھی
نہیں ہیں... ہائے... تم اپنے مرتے ہوئے بچے کو چھین دو کہ
تم اپنی زندگی اس غریب کی ایسی ہی خبر گیری کرتی رہو
گی... اسے اپنے پاس بلا لو گی... کوہو...“

”میری خبر گیری کون کرے گا؟... تمھارے دشمنوں کو...“
کارنی زار و قطار روتے ہوئے بولی۔

مادھو نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی۔

مادھو دنیا کو چھوڑ رہا تھا مگر کارنی دنیا سے چٹنی ہوئی تھی۔
اس نے تو مادھو کو خالی تسکین دینے کے لیے بھی اثبات میں سر نہ
ہلایا۔ وہ بالکل اس آدمی کی طرح تڑپتا رہا جس کے دل میں
ایسی خواہشیں ہوں مگر موت اس کا گلا آدیا۔ کچھ دیر بعد
مادھو کا درد ہمیشہ کے لیے مٹ گیا۔

مرنے کے بعد آس جہانی کی جو آخری باتیں نمایاں طور پر
آرائیں، ان میں سے ایک یہ بھی تھی۔ ”کسی بھائی بہن کو دکھی
دیکھ کر مجھ سے مدد اور رتی کے سہیلے نہ گائے جاتے ہیں، نہ
گائے جائیں گے!“

”ہمارے ملک میں تہوار ہی تہوار تو ہیں، اور ہے ہی کیا؟
اس یہاں کوئی تہوار نہ ہوتا۔“

سلطان بایزید

28 ستمبر 1396ء کو کوپلر کی فضا جنگی غروں سے گونج
رہی تھی۔ سلطان بایزید کے عساکر اور فرانس، جرمنی اور ہنگری
کے عیسائی شہزادوں اور ان کی لاکھوں رضا کار سپاہ میں محرکہ
کار زار گرم تھا۔ ایک عرصے تک لڑائی پورے زور شور سے
جاری رہی۔ بالآخر بایزید نے یورپ کے عیسائیوں کی متحدہ
افواج کے دانت کھٹے کر دیے اور انھیں شکست فاش ہوئی۔
غرو کا سر نیچا ہوا، کیوں کہ وہ لوگ کہتے تھے کہ اگر آسمان بھی
گر پڑے تو ہماری فوج اُسے اپنے نیوزوں پر سنبھال لے گی۔
اس کے بعد ایک عہد نامہ مرتب ہوا۔ اُس کی ایک شرط یہ
تھی کہ فرانس، جرمنی اور ہنگری کے شہزادے اس بات کی قسم
کھائیں کہ وہ آئندہ کبھی اپنے فاتح کے خلاف لڑنے کے لیے
میدان میں نہیں آئیں گے۔

جب یورپ کے یہ شہزادے جنگی قیدیوں کی حیثیت سے
سلطان کے زور پڑوانے گئے تو سلطان نے اُن سے مخاطب
ہو کر کہا، ”میں اس عہد نامے کی یہ شرط، کہ تم کبھی میرے خلاف
تکوار نہیں اٹھاؤ گے، حذف کرتا ہوں۔ میں تمھاری قسموں اور
میرے خلاف تمھاری اٹھانے کے عہد و بیایں کو قائل ملامت
خیال کرتا ہوں۔ تم ابھی تو جوان ہو، تمھارے دل میں اپنی بے
عزتی اور شکست کا بدلہ لینے کا جذبہ پیدا ہوگا اور تم پھر
میرے مقابلے پر آنے کی تمنا کرو گے، اس لیے میں تم سے کہتا
ہوں کہ جاؤ، اپنی طاقت پھر جمع کرو اور شوق سے، جب چاہو،
میرے مقابلے پر آؤ! میں بڑی خوشی سے ایک بار پھر تم سے
مقابلہ کروں گا!“

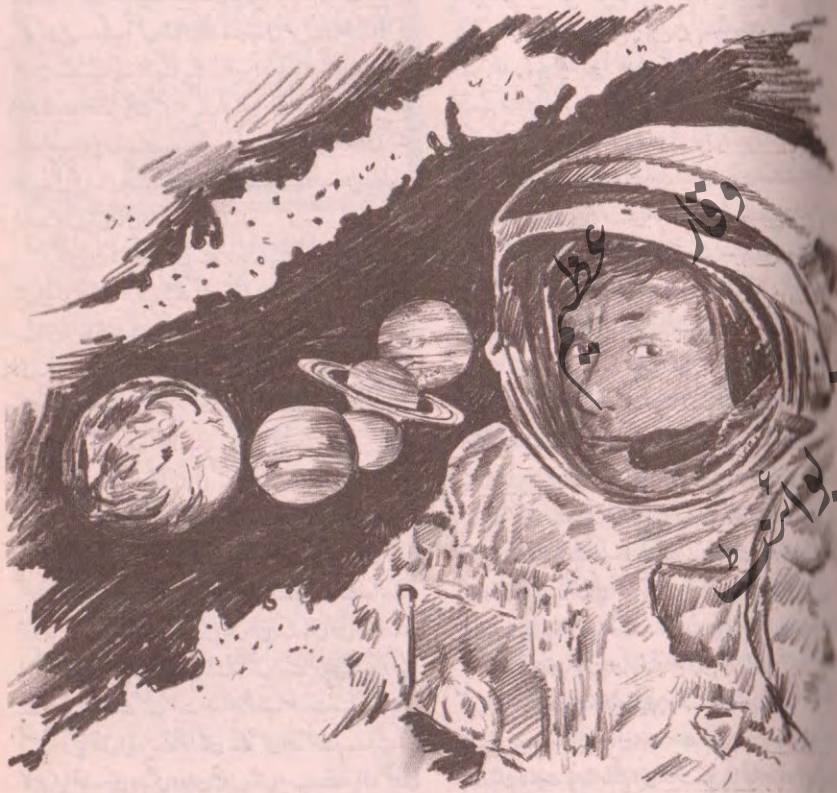
سلطنت روما کا عروج و زوال از حسن و صلاح: مسز انجاز

ہیوئیں اور تیم تو رونے سے بچ جاتے۔ پھر ایک بار سکر
سکرات آ گئی۔ پھر سورج دھن راسی سے سکر راسی میں داخل
ہوا۔ سکرانت کی دیوی نے سانج کے کلنگ یعنی ابو کے پاپ
کے سوا تمام دنیا میں سے پاپ کی تیج کٹی کے لیے اپنی بڑی بڑی
ڈراوائی آنکھوں کو پھیلا کر اور ترشول تان کر دنیا کا سفر کرنا
شروع کر دیا تھا۔ اوئی بھرن کرتے ہوئے دراز سے دراز اور
سیاہ سے سیاہ زبان رکھنے والی عورت بھی اپنے چہرے کو ایک
عارضی مسکراہٹ سے مزین کرتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ ”بیٹھا بیٹھا
کھاؤ اور بیٹھا بیٹھا بولو۔“

بل صورت مخلوق

طاہر محمود

اپنے حسن پرنازاں ایک مخلوق کی خود پسندی کا عالم
کائنات میں جیسے اُن کے سوا کچھ رکھا ہی نہ تھا!



کی کاوشوں سے آباد اور زرخیز ہو گئی تھی۔

ایک دور ایسا آیا تھا جب پورے سیارے پر سیاہ بادل چھا گئے تھے۔ لوگ بھول گئے کہ یہ سیاہ بادل کیوں چھائے تھے۔ اس دوران میں ان کی تعداد مسلسل کم ہوتی گئی تھی۔ پھر جب سیاہ بادل ختم ہوئے تو قدرت ان پر مہربان ہوئی اور ان کی تعداد پھر سے بڑھنے لگی۔ اسی وجہ سے انھوں نے اپنا کلیڈر اس تاریک دور کے خاتمے سے شروع کیا تھا۔ اُسے ڈی سے مراد آخر ڈارک تھا مگر ہر طرف بربادی اور تباہی کے ڈیرے

5070 ایڈر کلائن اپنے ساتھی سائنس دانوں کے

اطلاعی مرکز پر موجود تھا۔ اس کے یہ دونوں ساتھی موسین اور کلار آئی کٹ اس کے ساتھ عامی سائنس کونسل کے رکن تھے۔ انھیں یہ اعزاز ایسے ہی حاصل نہیں ہوا تھا بلکہ اپنے لوگوں کے لیے ایسے سائنسی کارنامے انجام دیے تھے کہ ان کی وجہ سے اس تباہ شدہ زمین کی حالت بدل گئی تھی۔ ان دنوں سال سے صرف ہر پادی تھی، اب وہاں ہر طرف اور آباد شہر تھے۔ جلی ہوئی اور بنجر زمین ان تینوں

ایک کونے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے بھی پچھلی سکرانت یاد آگئی۔ ٹھیک اسی دن امبو نے مادھو کا کلیجا نکال لیا تھا۔ مگر وہ اس سکرانت کی رات کا واقعہ بالکل بھول گئی تھی۔ صرف اسے مادھو کے وہ الفاظ یاد تھے۔ ”کسی بھائی بہن کو دیکھ کر مجھ سے مدد اور رتی کے سہلے نہ گائے جاتے ہیں، نہ گائے جائیں گے۔“

تمام عورتیں ہنستی کھیلتی رہیں۔ پھر ادنیٰ بھرن کیا گیا۔ سہاگنوں نے ایک دوسرے کی مانگ میں سیندور لگایا۔ جب کلکاری کی بہو کی مانگ میں بڑوس کی ایک دلہن نے سیندور لگایا تو امبو وہیں کھڑی رہی۔ سہاگن کے پاس بیوہ کھڑی رہے، رام رام!... کلکاری نے امبو کو دھکا دے کر برا مدے سے باہر کر دیا بولی۔ ”دیکھتی نہیں کیا ہو رہا ہے؟“

امبو نے چاروں طرف دیکھا کہ کوئی اس کی طرف تو نہیں دیکھ رہا۔ مگر سب کی نظر اس کی طرف تھیں۔ امبو نے منہ چھپا کر رونا چاہا مگر وہ رو بھی نہ سکتی تھی۔ برس کا برس دن اور رونا کلکاری جان ہی تو نکال لے گی۔ مگر رونا برس کے برس رونا اور عام دن میں کوئی بھی تیز نہیں کرتا۔ وہ آپنی آپنی باتیں کر رہی تھیں اور بیوہ اور رونا برس کے برس دن تو زیادہ آتا ہے۔ اس کی مرے ہوئے بالکل نزدیک آ جاتے ہیں۔ ساتھ ہی اٹھتے ہیں۔ ساتھ ہی بیٹھتے ہیں، ہنسوتے ہیں، رو دتے ہیں اور گلے مل کر روتے ہیں۔ کوئی انھیں دیکھتا ہے، کوئی نہیں دیکھتا۔ بڑوس کی بخارن امبو کے پاس سے گزری اور محض امبو کو سنانے کی غرض سے گنگنا رہی تھی۔ ”بتی برتا کا ایک ہے، وپچارن کے روئے!“

اور پھر سکرانت کے شور و غوغا میں شامل ہوتے ہوئے بولی۔ ”میٹھا میٹھا کھاؤ اور میٹھا میٹھا پلو!“

امبو کو زمین میں جگہ نہیں ملتی تھی کہ اس میں سہ جائے۔ اس کو گلو کی حالت میں کلکاری نے اسے دھکے دے کر باہر نکال دیا۔ وہ محض دینا سے چٹھی ہوئی تھی اور مادھو کے آخری الفاظ کا اسے کوئی خیال نہ تھا۔

اگلی صبح لوگ کہہ رہے تھے۔ ”نہ جانے امبو کہاں چلی گئی۔“ ساج کے ماتھے سے اس کلنگ کے ٹیکہ کو کلکاری نے ہی دھوا تھا۔ لوگ اس سے خوش تھے اور جب وہ بہت خوش ہو کر عقیدت سے کہتے۔ ”جی کلکاری نے اپنے نام کی لاج رکھی!“ تو سوسکا سا منہ بنا کر بھائی کریم داس ایک ٹھنڈا سا لپٹا اور کہتا۔ ”آہ اگر غریب مادھو کے من کی من ہی میں رہی!“

پھر موقع آیا کہ برسوں کے روٹھے ہوئے منائے جائیں۔ امبو سے تو گاؤں کا ہر ایک بچہ بوڑھا روٹھ گیا تھا۔ وہ کس کس کو مانتی۔ ایک زلیا اور مادھو کے روٹھ جانے سے کائنات کا ذرہ ذرہ اس سے روٹھ گیا تھا۔ ہائے! زلیا اور مادھو۔ ایسے روٹھنے والے کوئی بانے کے لیے تھوڑی روٹھے تھے!

امبو کے گھر میں کانسی کے چمکتے ہوئے برتن بالکل سونے کے بنے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ جھونپڑی میں لپ پوت یوں کیا گیا جیسے امبو کے گھر میں کوئی آنے والا ہو۔ بھی بھی وہ آنکھ اٹھا کر باہر دیکھ لیتی۔ کیا جب جو کہیں گھومتا پھرتا زلیا ہی آجائے، نہیں تو مادھو کی صورت ہی دکھائی دے جائے!

مادھو کے بیٹے میں امبو کو مادھو بھائی کی ہی روح نظر آتی تھی۔ اگرچہ وہ جانتی تھی کہ گاؤں کے لوگ عام طور پر اور کلکاری اور اس کی بہو اور بیٹا خاص طور پر، اس کی شکل دیکھنے سے بیزار ہیں۔ کیوں کہ اُن کے خیال میں اسی نے تو مادھو کو کوئی جنت منتر دے دیا تھا۔ پھر بھی اس نے کانسی کی تھالی میں کچھ گاجریں، مٹر، امرود، پیر اور گندیریاں وغیرہ رکھیں تاکہ مادھو کی بہو کو دے۔ اپنی بچی ہوئی ساڑھی کے ایک پٹے سے اس نے تھالی کو ڈھانپا اور مادھو کے گھر کی طرف چل دی۔

امبو کی ہمت نہ پڑی تھی کہ وہ دلیہز کے اندر قدم رکھے۔ ایک برس پہلے لوگوں کی مخالفت کے باوجود اس کی اس گھر میں پوچھ رہی تھی۔ آج وہ اس گھر میں کون تھی۔ ایک عورت نے اسے اندر آتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

”لو بہن... وہ رہی تمھاری سوت۔“ کلکاری اسے دیکھ کر جل بخن ہی تو گئی، آہستہ سے بولی۔ ”مرتی بھی نہیں کم بخت... مرے تو میں آنے میں لو بان اور گھی رہندھوں... دودھ کا کنورا پیوں... گنگا نہاؤں، نہ جانے کیا کیا کروں۔“

جب امبو بالکل نزدیک آگئی تو کلکاری نے اپنے چہرے کو ایک عارضی مسکراہٹ سے مزین کرتی ہوئی بولی۔ ”آؤ بہن!... میٹھا میٹھا کھاؤ اور میٹھا میٹھا پلو!“

امبو نے ان دونوں کی باتیں تھوڑی بہت سن لی تھیں۔ سوت کا لفظ کان میں پڑے ہی اس کا تمام جسم کانپنے لگا۔ بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔ ”میٹھا کہاں ہیں؟“ دوسری عورتیں مسکرانے لگیں۔

پچھلے سال ٹھیک اسی دن مادھو اس سے آخری بار ملنے گیا تھا۔ اس بات کو یاد کرتے ہوئے امبو کا دل مسلا گیا۔ کلکاری

تھے۔ وہ وسائل کی کمی کا شکار تھے۔ پھر مختلف نسلوں اور قوموں میں بٹے ہوئے کی وجہ سے آپس میں لڑتے رہے تھے۔ کوئی ہزار سال پہلے ان لوگوں کو احساس ہوا کہ وہ اسی طرح لڑتے رہے تو ان کی نسل مٹ جائے گی۔ جیسے اس سرزمین سے دوسرے جان دار مٹ گئے تھے۔ اب بس وہی پانی رہ گئے تھے۔ پھر انھوں نے ایک متحدہ کونسل بنائی۔ تمام ممالک کی سرحدیں ختم کر دیں۔ رنگ، نسل، زبان اور مذہب کی تفریق کو بھلا کر وہ اپنی بھلائی کے لیے ایک ہو گئے تھے۔ جب وہ ایک ہو گئے اور ان کے اختلافات اور لڑائیاں ختم ہو گئیں تو جو وسائل انھیں کم لگ رہے تھے، اب وہ پورے ہونے لگے۔ دولت اور تعلیم کی مساوی تقسیم ہونے لگی تھی۔ اس کے نتیجے میں انھوں نے آنے والے والے ایک ہزار برسوں میں شان دار ترقی کی تھی۔

لیکن ان کا عروج آج سے سو سال پہلے شروع ہوا جب ان میں ایڈر، مومین اور کلار جیسے عظیم سائنس دان پیدا ہوئے۔ انھوں نے دن رات محنت کی اور اپنی تحقیق سے اپنے لوگوں کی قسمت بدل دی۔ انھوں نے انجینئرنگ سے لے کر ماحولیات تک، ہر شعبے میں کام کیا تھا اور اسے بدل کر رکھ دیا تھا۔ صحت، رہائش اور خوراک کے شعبوں میں ایک انقلاب برپا ہو گیا تھا۔ جن کی عمریں پہلے پچاس سال سے زیادہ نہیں ہوتی تھیں، اب وہ دہو سو سال جینے لگے تھے۔ یہی نہیں، ان کی صحت اور جسامت بھی بہتر ہوئی تھی۔

انھیں پہلے بھی یقین تھا کہ وہ اس کائنات کی حسین ترین مخلوق ہیں۔ لیکن اب تو وہ اپنے اوپر اترنے لگے تھے۔ اعداد و شمار بتاتے تھے کہ پچھلے بیس برس میں ان کے ہاں کوئی بد صورت یا نامکمل بچہ پیدا نہیں ہوا۔ ایڈر نے بعض ایسے طریقے ایجاد کیے تھے جن کی مدد سے مکمل صحت مند اور خوب صورت بچے کا حصول ممکن ہو گیا تھا۔ ایڈر نے خواتین کے حسن اور صحت کے لیے بھی کام کیا تھا۔ یہی وجہ تھی وہ ان تینوں میں سب سے زیادہ مقبول تھا۔ ہر فرد اس سے محبت کرتا تھا۔ وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں چلا جاتا، اسے یکساں عزت اور محبت ملتی تھی۔

کلار اور مومین کی خدمات بھی کم نہیں تھیں۔ کلار نے سیارے پر موجود پانی کو صاف کرنے کا ایک ایسا طریقہ نکالا تھا جس سے پانی بہت کم خرچ میں اور کم وقت میں صاف ہو جاتا تھا۔ اس کی وجہ سے آج یہاں صاف شفاف سمندر اور دریا بہتے تھے۔ کہتے ہیں، کسی زمانے میں کسی وجہ سے پانی ہی غائب ہو گیا تھا مگر تاریک دور کے بعد دوبارہ پانی تشکیل پانے لگا تھا اور اب سیارے کا نصف حصہ سمندر پر مشتمل تھا۔ کلار نے آلودہ فضا کو

صاف کرنے کے منصوبوں پر بھی کام کیا تھا۔ آج سے سو سال پہلے ہوائی آلودہ تھی کہ ہر فرد کو نصف وقت کسی گیس ٹینک میں گزارنا پڑتا تھا۔ یہ گیس ٹینک جگہ جگہ موجود تھے۔ ایک خاص وقت سے زیادہ کھلی ہوا میں گزارنے کے بعد ان لوگوں کی حالت خراب ہونے لگتی تھی۔ اس وقت ان لوگوں کی جسامت حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ اور دن رات میں نصف گھنٹہ گزارنے کی وجہ سے وہ اتنا کام نہیں کر پاتے تھے۔

کلار نے ہوا کی آلودگی ختم کرنے کے لیے کچھ طریقے ایجاد کیے۔ اور جب ان پر عمل کیا گیا تو یہ حیرت انگیز حد تک کام یاب رہے تھے۔ ہزاروں سال سے خراب ہوا کا عشرے میں صاف ہو گئی۔ اور اب یہ دن بہ دن صاف ہوتی رہی تھی۔ ان میں پیدا ہونے والا ہر بچہ پہلے سے زیادہ ہوا میں سانس لیتا تھا۔ یہ سب کلار کی کاوشیں تھیں۔ اس وجہ سے اس کے احسان مند تھے۔ اگرچہ اسے ایڈر جیسی مقبولیت حاصل نہیں تھی مگر اس کی عزت کی طرح اس سے کم نہیں تھی۔ مومین نے زمین کی برپادی کو ختم کر دیا تھا۔ اس کا مقصد کے لیے سالوں تحقیق کی تھی۔ اس کی کوشش سے خبردار کار زمین زرخیز اور کارآمد بنی تھی۔ تاریک دور میں زمین میں ایسے کیمیائی عناصر سرایت کر گئے تھے جو کسی بھی قسم کی فصل کے زہر سے کم نہیں تھے۔ اس کی وجہ سے ان کے لیے خوراک کی فراہم بہت محدود تھی اور خوراک ہوتی تھی اس میں بھی غذائیت کم ہوتی تھی۔ اس وجہ سے ان کی تعداد بھی ابدان کی صحت بھی اچھی تھی۔ یہ کیمیائی عناصر ایسے تھے کہ ان سے پہلے سائنس دان سانس کو شش کے باوجود انھیں دور کرنے کا کوئی آسان اور کم خرچ طریقہ نہیں ایجاد کر سکے تھے۔ جو طریقہ مروجہ تھے وہ بہت ہی مہلک اور مہلک تھے۔ ان سے زمین کی صفائی بہت سست روی سے جاری تھی۔

ان سے زمین کا بہت چھوٹا سا کٹڑا ہی صاف ہو پایا تھا اور وہ بھی ہوا کی طرح صاف نہیں ہو تھا۔ مومین جب بچہ تھا تو غذائیت کی کمی کی وجہ سے اس کے بہن بھائی مر گئے تھے۔ وہ ان کی موت کا صدمہ نہیں بھولا تھا اور انہوں نے سوچ لیا تھا کہ بڑا ہو کر وہ زمین کی بہتری کے لیے کام کرے گا تاکہ خوراک کی پیداوار بڑھ سکے اور کوئی بھوک یا غدا کی کمی نہ رہے۔ بڑے ہو کر اس نے تعلیم میں اسی شعبے کا انتخاب کیا تھا۔ اس نے پورے پچاس سال اس شعبے میں کام کیا تھا جس کا کردہ ایسے طریقے ایجاد کرنے میں کام یاب ہوا تھا جن کی مدد سے زمین بہت آسانی سے اور کم خرچ میں صاف ہو سکتی تھی۔

اس کے پہلے سے زیادہ اور اچھی پیداوار دینے کے قابل ہو گیا۔ اس کے ایجاد کیے طریقوں کی مدد سے ان کی ساری زمین سالوں میں آلودگی سے پاک اور زرخیز ہو گئی تھی۔ اس کی ادارتی زیادہ اور بہتر ہو گئی کہ اب ان میں ایک فرد بھی رات کو کھانا سوتا تھا۔ پیدا ہونے والے ہر بچے کو پوری غذا ملتی تھی۔ ان میں صاف اور اعلیٰ ہوتی تھی۔

ان تینوں کے ان لازوال کارناموں کی وجہ سے انھیں کلار، مومین اور کلار کونسل کا تاحیات سربراہ بنادیا گیا تھا۔ اب ان ہی ہونے والے تمام سائنسی کاموں کی نگرانی کرتے اور حل کر آتے تھے۔ ہزاروں سال سے خراب ہوا کے لیے پروگرام تیار کرتے تھے۔ ان میں کسی بھی مسئلے کا اختلاف رائے ہوتا تھا تو اس کا حل کلار کے پاس ہی تھا۔ اگرچہ اس کی نوبت بہت کم آتی تھی۔ کیوں کہ ان تینوں میں سے ہر ایک اپنی اپنی ذمہ داریوں میں مصروف تھا۔ مومین نے اپنے لوگوں کے لیے جو رکھ رکھاؤ اور صرف خدمت کے جذبے کے تحت کیا تھا۔ انھوں نے اس کی پروا نہیں کی تھی۔

لیکن حکومت اور لوگوں نے ان کی خدمات، بلکہ احسانات اور کاموں کو بھول کر ان کی عزت دی جس کے وہ مستحق تھے۔ ان کے نام سے نام سے جگہ جگہ شہر آباد کیے گئے تھے۔ ان کے لیے تیسرے بچے کا نام ان میں سے کسی کے نام پر رکھا جاتا تھا۔ ان کے ذکر جگہ جگہ ان کے مجسمے نصب کیے گئے تھے۔ ان کی نہیں، بلکہ وہ بھی فیصلہ جس کا تعلق سائنس اور طبیعت سے ہو ان کی مرضی کے بغیر نہیں کیا جاتا تھا۔ اس میں جو پالیسی وہ بناتے تھے اس پر عمل کیا جاتا تھا۔ وہ کام کے سلسلے میں مکمل طور پر آزاد اور خود مختار تھے اور کسی کے جوابدہ نہیں تھے۔

ان دوسری طرف انھوں نے اپنے منصب اور فرائض کو ہمیشہ اپنے لوگوں اور سیارے کی بہتری کے لیے ادا کیا تھا۔ وہ پچاس برس سے سائنس کونسل کے سربراہ رہے۔ ان دوران میں ان پر کسی کو ان کی اٹھانے کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔ ان کے لیے باپ جیسی حیثیت رکھتے تھے، جن کا احترام کیا جاتا ہے اور ان کا ہر فیصلہ تنقید سے بالاتر ہوتا تھا۔ ان کے پاس برسوں میں انھوں نے جو بھی فیصلہ کیا تھا وہ ان کے لوگوں کے لیے بہترین ثابت ہوا تھا۔

انھوں نے سیارے کے بنیادی مسائل حل کر لیے تھے۔ انھوں نے اس سے باہر کی طرف توجہ دی۔ ابھی تک انھوں

ذائقہ

قلم اسرار نیک پور کے ہاں ایک دعوت میں قیاس شفا، انٹرمیڈیٹ اور جاوید اختر شریک تھے۔ دوران گفتگو جاوید اختر قیاس سے کہنے لگے، ”پنجاب کے لوگوں نے اردو زبان کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ مثلاً ہم لوگ کہتے ہیں، کھانا کھائے... اسی کو پنجاب کے لوگ کہیں گے، کھانا کھائیں...“

اس پر قیاس صاحب نے برجستہ جواب دیا، ”کھانا کھائیں کہنے سے کھانے کے ذائقے میں کیا کوئی فرق پڑ جاتا ہے؟“

اس پر سب لوگ کھکھلا کر ہنسنے لگے۔

تعاون: ڈاکٹر راجہ راوی لہندی

نے نظام قیاس کے دوسرے سیاروں کا جائزہ نہیں لیا تھا۔ کلار کا خیال تھا کہ ان کے پڑوسی سیارے پر آبادی ممکن ہے کیوں کہ وہ ان کے سیارے سے بہت ملتا جلتا تھا۔ وہ بھی ان کے سیارے کی طرح ٹھوس تھا اور سورج سے اس کا فاصلہ بھی ایسا تھا کہ وہ نہ تو بہت دور تھا کہ سردی سے ٹھہد ہو جائے اور نہ اتنا قریب تھا کہ اس کا درجہ حرارت اوون جھٹا ہو جائے۔ جیسا کہ سورج کے قریب والے دو سیاروں کا درجہ حرارت تھا۔ ان میں ایک تو آسانی سے بیک کیا جاسکتا تھا لیکن ان میں رہنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے بعد یہ دو سیارے تھے جو ایک جیسے فاصلے پر گردش کرتے تھے۔ ان میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ ان کا درجہ حرارت بھی ایک جیسا تھا اور حالات بھی ایک ہی جیسے تھے۔ پانی دونوں پر موجود تھا۔ سب سے بڑھ کر کہ اس سیارے پر رات کے وقت روشنائی نظر آتی تھیں، اس لیے کلار کا خیال تھا کہ وہاں زندگی موجود تھی۔ اور جس سیارے پر زندگی ہو وہاں کوئی نہ کوئی ذہین مخلوق ہوتی ہے۔

ایڈر کو اس خیال سے اختلاف تھا۔ ”یہ تو ممکن ہے کہ اس سیارے پر زندگی ہو لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ اس پر کوئی ذہین مخلوق ہو۔“

”کیوں نہیں ہو سکتی...“ کلار نے بحث کرتے ہوئے کہا۔ ”جب ہمارے سیارے پر ہو سکتی ہے تو وہاں کیوں نہیں ہو سکتی ہے۔“

”بس مجھے اس کا یقین ہے...“ ایڈر نے ضدی لہجے میں کہا۔ ”میرا اس پر ایمان ہے کہ اس نظام کی بلکہ اس پوری کائنات میں سب سے ذہین اور سب سے خوب صورت مخلوق ہم ہی ہیں۔“

”یہ صرف خیال ہے...“ کلار نے کہا۔ ”کسی دوسری ذہین اور خوب صورت مخلوق کی موجودگی عین ممکن ہے۔“

”میں نہیں مان سکتا۔“ ایڈر کا لہجہ اور بھی ضدی ہو گیا۔

”دوست، تم اس وقت ایک بڑے اور مشہور سائنس دان کے بجائے کوئی بچے لگ رہے ہو...“ موسین نے مداخلت کی۔ ”میں کلار کی تائید کرتا ہوں کہ نظام شمسی میں کسی اور ذہین مخلوق کی موجودگی عین ممکن ہے۔“

”نہیں ہو سکتی۔“ ایڈر نے پاؤں پٹختے۔ اسے غصہ آ رہا تھا۔

”اس خیال کی وجہ؟“ کلار نے پوچھا تو ایڈر کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

”میرا خیال ہے ہمیں اپنے پڑوسی سیارے پر توجہ دینی چاہیے۔ ممکن ہے، وہاں کوئی ذہین مخلوق موجود ہو۔“ کلار بولا۔

اس پر ایڈر نے منہ بنایا۔ ”بے کار ہے میرے خیال میں ایسی کسی کوشش سے صرف وقت اور پیسہ برباد ہوگا۔“

”ایسا نہیں ہے دوست، کبھی بھی سائنسی کام کا کبھی نہ کبھی فائدہ ضرور ہوتا ہے۔“ موسین نے کلار کی تائید کی۔

”تو یہ طے ہے کہ اب ہمیں اپنے سیارے سے باہر کی دنیا پر بھی توجہ دینی چاہیے۔“

کلار کی اس بات پر ایڈر نے کہا۔ ”اس تجویز سے میں متفق نہیں ہوں۔“

”لیکن ہم دونوں تو ہیں اور اکثر رائے کے اصول کے تحت اب یہ ہم تینوں کا فیصلہ ہے۔“

ایڈر نے بے بسی سے ان دونوں کو دیکھا۔ ”تم دونوں مجھے تکلیف دے رہے ہو۔“

”تم ہماری بات تو مانو...“ کلار نے غلو سے کہا۔ ”اگر تمہاری بات درست نکلی تو ہم تم سے معذرت کر لیں گے۔“

”نہیک ہے...“ ایڈر نے سر دھام بھری۔ ”اگر تم لوگوں کی بات درست نکلی تو میرے لیے یہ بہت حد سے کی بات ہوگی۔“

ان تینوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کر لیا تو پھر کسی کی مجال بھی کہ اسے رد کرتا۔ اگرچہ یہ سائنسی سے زیادہ سیاسی معاملہ بھی تھا کیوں کہ کسی دوسرے سیارے پر کسی ذہین مخلوق کی موجودگی کا مطلب تھا کہ ان کی حکومت کو مداخلت کرنا پڑتی۔ مگر فی الحال یہ سائنسی معاملہ تھا، اس لیے حکومت نے دخل انداز سے یہ گریز کیا۔ انھوں نے پڑوسی سیارے سے رابطے کی کوشش کا آغاز کیا۔ ان کے پاس ایسے طاقت ور آلات تھے جو خلا سے آنے

والے ہر کتل کو کوچ کر سکتے تھے۔ مگر ان کے پاس کتل والے آلات اتنے طاقت ور نہیں تھے۔ اس لیے انھوں طاقت ور نشریاتی آلات کی تیاری شروع کر دی۔ اس میں عرصہ لگا تھا لیکن جلد ان کے پاس ایسے نشریاتی آلات آ گئے جو نظام شمسی کی آخری حد تک کتل بھیج سکتے تھے۔ انھیں اس رصد گاہ میں نصب کر کے ان تینوں نے اپنے کام کا آغاز کیا۔ انھوں ہر طرح کے کتل اپنے پڑوسی سیارے کی طرف شروع کر دیے تھے۔

ان کا خیال تھا کہ شاید انھیں فوری جواب نہ ملے اور اس سیارے پر کوئی مخلوق تھی تو اسے ان کا کتل بھیجنے کے لیے کئی سال درکار تھے۔ مگر جب کتل بھیجنے کے ایک مہینہ بعد انھیں اس سیارے کی طرف سے کتل ملا تو وہ حیران رہ گئے۔ کتل ایسا تھا جسے وہ کبھی سکتے تھے اور اس کا مطلب انھوں جو نکالا تھا۔ وہ کچھ یوں تھا۔

”ہم جان گئے ہیں... ہم آ رہے ہیں۔“

کلار خوشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کہا۔ ”ایڈر، یہ کتل ایسا تھا کہ اس سیارے پر کوئی ذہین مخلوق ہے۔“

”کلتا تھا کہ اس سیارے پر کوئی ذہین مخلوق ہے۔“ بالکل درست ثابت ہوا ہے۔

”اتنا بھی نہیں...“ ایڈر نے برا سائنہ بناتے ہوئے کہا۔

صرف ایک کتل کی وجہ سے انھیں ذہین مخلوق کہہ رہے ہو۔ ”نہیں دوست، میں انھیں دو وجہ سے ذہین کہہ رہا ہوں۔ ایک تو انھوں نے ہمارا کتل اتنی جلدی کھینچ لیا۔ دوسرے ان کے پاس اتنے طاقت ور نشریاتی آلات پہلے سے موجود تھے جنہیں ہم نے ایک سال میں جا کر بنایا تھا۔“

”صرف یہ تو ذہین ہونے کی ایک مثال ہے۔“ ایڈر نے طنز یہ انداز میں کہا۔

”ایڈر تم ایک اہم بات نظر انداز کر رہے ہو۔“ موسین نے کہا۔ ”انھوں نے پیغام بھیجا ہے کہ وہ آ رہے ہیں۔“

”اور اس کا مطلب ہے کہ وہ اتنے ترقی یافتہ ہیں کہ سفر کر سکتے ہیں۔ جب کہ ہم ابھی اپنے سیارے کی طرف سے باہر نہیں نکل سکے ہیں۔“ کلار نے کہا۔ تو ایڈر کی قائل ہوتا نظر آنے لگا۔

”ہاں یہ تو ہے۔ لیکن اس کا مطلب ایک اور بھی ہے۔ انھوں نے اپنے سیارے کے وسائل اپنے لوگوں پر خرچ کر کے بجائے انھیں خلائی سفر جیسی چیزوں پر خرچ کر رکھا ہے۔ ممکن ہے، ہم ٹھیک کہہ رہے ہو...“ کلار نے کہا۔

ایس کے تو ہم دیکھ لیں گے۔“

”وہ خلا میں سفر کیسے کریں گے؟“ موسین نے سوال کیا۔

”ظاہر ہے کسی خلائی جہاز میں...“ ایڈر بولا۔ ”میں ایک ایسا منصوبہ دے سکتا ہوں۔ ممکن ہے، وہ لوگ ہم سے زیادہ ترقی یافتہ ہوں لیکن وہ ہمارے جتنے خوب صورت نہیں ہو سکتے۔ ہم اس کائنات کی سب سے خوب صورت مخلوق ہیں۔“ یہ کہہ کر ایڈر کے لہجے میں غرور آ گیا تھا۔

کلار اور موسین مسکراتے لگے تھے۔ ”جب وہ آئیں گے تو اس کا بھی پتا چل جائے گا۔“

”تم لکھ کر رکھ لو ان لوگوں کی آمد ہمارے لیے اچھی نہیں ہوگی۔ وہ کوئی بد صورت مخلوق ہوں گے جنہیں ہمارے لوگ برداشت نہیں کر سکیں گے۔“

”ہمیں اچھی امید رہنی چاہیے۔“ موسین نے شرارت سے کہا۔ ”ممکن ہے وہ ہم سے زیادہ خوب صورت ہوں۔“

”ایسا ہو ہی نہیں سکتا ہے۔“ ایڈر نے پورے یقین سے کہا۔

”اور ہاں یہ چلا گیا۔“

انھوں نے اب تیاری شروع کر دی تھی کہ جب دوسرے سیارے والے ان کے سیارے پر آئیں گے تو ان کے استقبال کی کوئی جگہ ہونی چاہیے تھی جہاں وہ اتر سکیں۔ اس کے لیے انھوں نے میدان میں ایک رن دے کی تیاری شروع کر دی تھی۔ اس کے ساتھ انھوں نے پڑوسی سیارے سے پیغام بھیجنا شروع کر دیا۔ ان پیغامات کی مدد سے وہ رفتہ رفتہ ایک ایسا طریقہ وضع کرنے میں کام یاب ہو گئے تھے کہ ایک ایسا سیارے کو اپنی بات آسانی سے سمجھا سکتے تھے۔ وہ انھیں بتا رہے تھے کہ ان ایک طاقت ور خلائی جہاز تکمیل کے آخری مرحلے میں تھے اور وہ اپنے خلا بازوں کی تربیت کر رہے تھے، تاکہ وہ یہ طویل سفر کر سکیں۔ ساتھ ہی وہ ان کے بارے میں جاننے کے لیے ان سے سوال کرتے تھے۔ ان کی طرف سے روز ہی سوالات آتے تھے اور وہ اپنی باتیں اس کے مطابق ان کے جواب دینے کی کوشش کرتے تھے۔ کیوں کہ سوالات سائنسی نوعیت کے ہوتے تھے۔ ان کے اساتذات ان کے لیے نامانوس ہوتی تھی۔

رفتہ رفتہ ایڈر بھی اس کام میں پوری دل چسپی لینے لگا تھا۔ ان کے تسلیم کر لیا تھا کہ یہ لوگ ذہانت میں ان سے کسی طرح کم نہیں تھے بلکہ شاید زیادہ ہی ذہین تھے۔ مگر دوسرے لوگوں میں ایڈر کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی کہ آنے والے کسی سیارے سے زیادہ خوب صورت نہیں ہو سکتے تھے اور موسین

اور کلار اسے چھوڑتے تھے۔

بالآخر پڑوسی سیارے کا خلائی جہاز روانہ ہوا اور دو مہینے کی طویل مسافت طے کرتا ہوا ان کے سیارے کے مدار میں داخل ہوا تھا اور آج صبح وہ ان کی طرف سے تیار کیے ہوئے مخصوص رن دے پر اترنے والا تھا۔ ایڈر، کلار اور موسین وہاں موجود تھے۔ ان کے علاوہ ان کے حکمران اور دوسرے اہم لوگ موجود تھے۔ عوام کا بھی ایک بڑا جم غفیر آنے والوں کو دیکھنے کے لیے وہاں موجود تھا۔ سب کی نظریں آسمان پر مرکوز تھیں۔ ایک نقطہ سامنوار ہوا اور پھر ایک گرین دار آواز کے ساتھ ایک دیوبہیل خلائی جہاز ان کے سامنے رن دے پر اتر گیا تھا۔ جب خلائی جہاز اتر گیا تو اس کے پہلو سے ایک دروازہ کھلا اور اس سے بیڑی نکل کر زمین پر ٹپک گئی۔ پھر اندر سے کچھ لوگ برآمد ہوئے۔ انھوں نے احتیاط کے طور پر ایک مخصوص لباس پہن رکھا تھا۔ جس کا اوپری حصہ شیشے کے گنبد پر مشتمل تھا اور وہ اس میں سے صاف نظر آ رہے تھے۔ ان سب کے منہ کھلے رہ گئے تھے اور ان میں سے بہت سوں کے چہروں پر دہشت کے تاثرات صاف نظر آ رہے تھے۔ آنے والے کچھ ایسے ہی خوف ناک اور بد صورت تھے۔

”دیکھا میں نے کیا کہا تھا۔“ ایڈر نے طنز یہ نظروں سے اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ”بہت شوق تھا تم لوگوں کو اس بد صورت مخلوق کو یہاں دیکھنے کا۔“

کلار اور موسین بھی ڈرے تھے لیکن پھر ان پر سائنسی تجسس غالب آ گیا تھا۔ کلار نے کہا۔ ”یہ جوان کے جسموں کے اوپر گول سے چیز ہے شاید اسی میں ان کا دماغ ہے۔“

”کیا بد صورت مخلوق ہے...!“ موسین نے کہا۔ ”اور اس گولے میں جو یہ ابھار اور گڑھے ہیں یہ شاید ان کے دیکھنے، سننے اور بولنے والے اعضا ہیں۔“

ایڈر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے غصے سے ان سے کہا۔ ”مجھے تو اجازت دو اور تم لوگ اس مخلوق پر تحقیق جاری رکھو، لیکن میرا ایک مشورہ ہے کہ انھیں عوام کے سامنے مت آنے دینا۔ ممکن ہے، کسی کارے سے دہشت کے انتقال ہو جائے۔“

یہ کہہ کر مرخ کے سب سے بڑے سائنس دان ایڈر نے اپنی پہلی گدلی اور گدھ نما آنکھوں تلے اپنی کوسے کی کوچ جیسی ناک ہلائی اور اپنے چکاڑ چکاڑ جیسے سیاہ پڑ پڑ پڑاتا ہوا اس جگہ سے روانہ ہو گیا جہاں زمین نامی سیارے سے آنے والوں کا استقبال کیا جا رہا تھا۔

گئی۔ ابھی مجھے وہاں بیٹھے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ ایک دلکش لڑکی داخلہ والی سائونڈ سلوٹی لڑکی جس کی عمر انیس بیس برس رہی ہوگی! آکر اسی بیچ کے دوسرے سرے پر بیٹھ گئی۔ پارک جیسی عوامی تفریح گاہ میں کسی لڑکی کا یوں کسی بیچ پر آکر بیٹھ جانا کوئی انوکھا واقعہ نہیں تھا۔

دل بھینک قسم کے نوجوانوں کو ایسے موقعوں کی تلاش رہتی ہے اور وہ اس موقع کا فائدہ اٹھا کر لڑکی سے بات کرنے کا بہانہ استعمال کرنے لگتے ہیں۔ میں ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ البتہ میں انٹرمیڈیٹ کے لڑکوں کا کہ اس لڑکی کی آنکھیں اور اس کے چہرے کے لکڑھٹے اور انتہائی دلکش تھے۔ بال بہت لمبے گھنے اور سنہرے تھے۔ قد بھی پانچ فٹ سے اوپر تھا۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کی مازمی باندھی ہوئی جاس کے کشش جسم خوب سج رہی تھی۔ اس کی جلد کی رنگت سرخ و سفید تھی لیکن اس کے اوپر وہ ایک بے حد حسین لڑکی تھی۔ اس لڑکی جس کی تمنا ہر کوئی کر سکتا تھا، ایسا دلکش چہرہ جو آنکھوں کے رستے دل میں اتر جاتا ہے زندگی میں کبھی بھی بی نظر آتا ہے۔

اس کے پیروں میں ربر کے سفید چپل تھے اور ہاتھ میں اس کا پرس تھا۔ میں نے ایک نظر میں ہی یہ ساری چیزیں یاد کر لی۔ لیڈیور کے نام پر اس کی گردن اور چہرے پر کچھ نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکے نیلے رنگ کی کالچ کی چوڑیاں تھیں۔ اس کی فیسر ساری چیزیں اس لیے جلدی جلدی دیکھ ڈالی تھیں کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ لڑکی میرے بارے میں کوئی غلط رائے قائم کر بیٹھے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس لڑکی نے بھی میری طرح جلدی جلدی میرے چہرے میرے اور لباس وغیرہ کا جائزہ لے لیا تھا۔ اس کے بعد ہم ایک دوسرے سے لا تعلق ہو کر بیٹھے۔ ویسے بھی میں اس کے لیے اور وہ میرے لیے اب کسی بات سے بے نیاز تھے۔ اس لیے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

لڑکی کی وہ بیچ کافی لمبی تھی اور ہم دونوں کے بیچ کی جگہ بالائی سی سی جس میں ابھی مزید دو لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ اس طرح چپ چاپ بیٹھے بیٹھے کچھ وقت گزر گیا۔ پھر ایک آدمی ہونے لگی۔ میں اٹھ کر وہاں سے جانے کے لیے اس موقع ہی رہا تھا کہ ایک بائیس چوبیس سالہ نوجوان لڑکا ادا ادا مارے نزدیک آ گیا۔ وہ باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھنے کے بعد دھیرے سے بولا۔ ”دیکھیے، مہربانی

کر کے آپ دونوں ساتھ ساتھ بیٹھ جائیں تاکہ میں بھی ایک طرف بیٹھ جاؤں۔“

لڑکی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے نوجوان سے کہا۔ ”آپ چاہیں تو یہاں بیٹھ جائیں“ میں نے خالی جگہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ جگہ خالی پڑی ہے۔“

میری بات سن کر نوجوان نے حیرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ تب میں سمجھا کہ نوجوان ہمیں میاں بیوی یا پھر عاشق معشوق سمجھ بیٹھا ہے۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لیے کچھ کہتا، وہ خود ہی بول پڑا۔ ”دیکھیے جناب کبھی آپس میں میٹھی میٹھی ناراضی بہت اچھی لگتی ہے... لیکن آپس کی یہ ناراضی لوگوں کے سامنے نہیں آنی چاہیے۔ اس لیے آپ دونوں اپنی ناراضی دور کر کے ساتھ ساتھ بیٹھ جائیں تاکہ میں بھی ایک کو نے پر بیٹھ جاؤں۔“

اس کی بات سن کر وہ لڑکی بھی اس کی غلط فہمی بھانپ گئی، فوراً ہی بولی۔ ”آپ کو غلط فہمی ہو رہی مسٹر۔ اگر آپ کو بیٹھنا ہے تو بیٹھ جائیں، ہم دونوں ساتھ نہیں ہیں۔“

”اوہ... آئی ایم سوری!“ نوجوان بولا اور پھر درمیان والی جگہ پر بیٹھ کر ہاتھ میں دبا ہوا ایک انگریزی میگزین کھول کر آرام سے پڑھنے لگا۔ چند منٹ بعد میں نے پھر وہاں سے چلنے کا ارادہ کیا اور اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے ایک سرسری نظر اس نوجوان اور پھر اس لڑکی پر ڈالی۔ نوجوان میگزین میں منہمک تھا اور وہ لڑکی سر جھکائے کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں اٹھنے لگا تو وہ نوجوان میگزین اپنی آنکھوں کے سامنے سے ہٹا کر بولا۔

”کیا آپ جا رہے ہیں؟“

”جی“ میں نے مختصر سا جواب دیا۔

”تو پھر آپ مجھے یہ بتاتے جائیں کہ اسٹار سنیما میں اس وقت کوئی فلم چل رہی ہے اور شام کا شو کتنے بجے شروع ہوتا ہے؟“

نوجوان کے اس ادھیات سوال پر مجھے سخت غصہ آیا۔ اکثر اس قسم کے سوالات خود ادھیات نہیں ہوتے لیکن جب وہ کسی کی انجمن اور پیشانی کی حالت میں اس سے پوچھے جاتے ہیں تو ادھیات لگنے لگتے ہیں۔

”آپ نے جواب نہیں دیا؟“ مجھے خاموش دیکھ کر نوجوان نے پوچھا۔

اس کے پیروں میں ربر کے سفید چپل تھے اور ہاتھ میں اس کا پرس تھا۔ میں نے ایک نظر میں ہی یہ ساری چیزیں یاد کر لی۔ لیڈیور کے نام پر اس کی گردن اور چہرے پر کچھ نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکے نیلے رنگ کی کالچ کی چوڑیاں تھیں۔ اس کی فیسر ساری چیزیں اس لیے جلدی جلدی دیکھ ڈالی تھیں کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ لڑکی میرے بارے میں کوئی غلط رائے قائم کر بیٹھے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس لڑکی نے بھی میری طرح جلدی جلدی میرے چہرے میرے اور لباس وغیرہ کا جائزہ لے لیا تھا۔ اس کے بعد ہم ایک دوسرے سے لا تعلق ہو کر بیٹھے۔ ویسے بھی میں اس کے لیے اور وہ میرے لیے اب کسی بات سے بے نیاز تھے۔ اس لیے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

لڑکی کی وہ بیچ کافی لمبی تھی اور ہم دونوں کے بیچ کی جگہ بالائی سی سی جس میں ابھی مزید دو لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ اس طرح چپ چاپ بیٹھے بیٹھے کچھ وقت گزر گیا۔ پھر ایک آدمی ہونے لگی۔ میں اٹھ کر وہاں سے جانے کے لیے اس موقع ہی رہا تھا کہ ایک بائیس چوبیس سالہ نوجوان لڑکا ادا ادا مارے نزدیک آ گیا۔ وہ باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھنے کے بعد دھیرے سے بولا۔ ”دیکھیے، مہربانی

کر کے آپ دونوں ساتھ ساتھ بیٹھ جائیں تاکہ میں بھی ایک طرف بیٹھ جاؤں۔“

لڑکی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے نوجوان سے کہا۔ ”آپ چاہیں تو یہاں بیٹھ جائیں“ میں نے خالی جگہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ جگہ خالی پڑی ہے۔“

میری بات سن کر نوجوان نے حیرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ تب میں سمجھا کہ نوجوان ہمیں میاں بیوی یا پھر عاشق معشوق سمجھ بیٹھا ہے۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لیے کچھ کہتا، وہ خود ہی بول پڑا۔ ”دیکھیے جناب کبھی آپس میں میٹھی میٹھی ناراضی بہت اچھی لگتی ہے... لیکن آپس کی یہ ناراضی لوگوں کے سامنے نہیں آنی چاہیے۔ اس لیے آپ دونوں اپنی ناراضی دور کر کے ساتھ ساتھ بیٹھ جائیں تاکہ میں بھی ایک کو نے پر بیٹھ جاؤں۔“

اس کی بات سن کر وہ لڑکی بھی اس کی غلط فہمی بھانپ گئی، فوراً ہی بولی۔ ”آپ کو غلط فہمی ہو رہی مسٹر۔ اگر آپ کو بیٹھنا ہے تو بیٹھ جائیں، ہم دونوں ساتھ نہیں ہیں۔“

”اوہ... آئی ایم سوری!“ نوجوان بولا اور پھر درمیان والی جگہ پر بیٹھ کر ہاتھ میں دبا ہوا ایک انگریزی میگزین کھول کر آرام سے پڑھنے لگا۔ چند منٹ بعد میں نے پھر وہاں سے چلنے کا ارادہ کیا اور اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے ایک سرسری نظر اس نوجوان اور پھر اس لڑکی پر ڈالی۔ نوجوان میگزین میں منہمک تھا اور وہ لڑکی سر جھکائے کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں اٹھنے لگا تو وہ نوجوان میگزین اپنی آنکھوں کے سامنے سے ہٹا کر بولا۔

”کیا آپ جا رہے ہیں؟“

”جی“ میں نے مختصر سا جواب دیا۔

”تو پھر آپ مجھے یہ بتاتے جائیں کہ اسٹار سنیما میں اس وقت کوئی فلم چل رہی ہے اور شام کا شو کتنے بجے شروع ہوتا ہے؟“

نوجوان کے اس ادھیات سوال پر مجھے سخت غصہ آیا۔ اکثر اس قسم کے سوالات خود ادھیات نہیں ہوتے لیکن جب وہ کسی کی انجمن اور پیشانی کی حالت میں اس سے پوچھے جاتے ہیں تو ادھیات لگنے لگتے ہیں۔

”آپ نے جواب نہیں دیا؟“ مجھے خاموش دیکھ کر نوجوان نے پوچھا۔

اس کے پیروں میں ربر کے سفید چپل تھے اور ہاتھ میں اس کا پرس تھا۔ میں نے ایک نظر میں ہی یہ ساری چیزیں یاد کر لی۔ لیڈیور کے نام پر اس کی گردن اور چہرے پر کچھ نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکے نیلے رنگ کی کالچ کی چوڑیاں تھیں۔ اس کی فیسر ساری چیزیں اس لیے جلدی جلدی دیکھ ڈالی تھیں کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ لڑکی میرے بارے میں کوئی غلط رائے قائم کر بیٹھے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس لڑکی نے بھی میری طرح جلدی جلدی میرے چہرے میرے اور لباس وغیرہ کا جائزہ لے لیا تھا۔ اس کے بعد ہم ایک دوسرے سے لا تعلق ہو کر بیٹھے۔ ویسے بھی میں اس کے لیے اور وہ میرے لیے اب کسی بات سے بے نیاز تھے۔ اس لیے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

لڑکی کی وہ بیچ کافی لمبی تھی اور ہم دونوں کے بیچ کی جگہ بالائی سی سی جس میں ابھی مزید دو لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ اس طرح چپ چاپ بیٹھے بیٹھے کچھ وقت گزر گیا۔ پھر ایک آدمی ہونے لگی۔ میں اٹھ کر وہاں سے جانے کے لیے اس موقع ہی رہا تھا کہ ایک بائیس چوبیس سالہ نوجوان لڑکا ادا ادا مارے نزدیک آ گیا۔ وہ باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھنے کے بعد دھیرے سے بولا۔ ”دیکھیے، مہربانی



پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

پس منظر

”مجھے فلموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس لیے آپ کو اس کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔“ یہ کہہ کر میں چل پڑا۔ پارک سے نکل کر میں میرین ڈرائیو پر آ گیا۔ ذرا دور چلنے کے بعد جب میں چو پانی والے راستے پر مڑا تو اچانک پیچھے سے ”اے مسٹر... اے مسٹر“ کی آوازیں آنے لگیں۔ میں چلتے چلتے رک گیا اور پلٹ کر پیچھے دیکھنے لگا۔ یہ وہی نو جوان تھا جو ہاتھ ہلاتا ہوا تیز تیز قدموں سے میری جانب بڑھ رہا تھا۔ قریب آنے کے بعد وہ رک رک کر بولا۔ ”مسٹر... یہ آپ کا رومال!“ یہ کہہ کر اس نے ہلکے گلابی رنگ کا ایک رومال میری جانب بڑھا دیا۔ ”اسے آپ اس بچہ پر ہی بھول آئے تھے۔“

میں نے رومال پر نظر ڈالنے کے بعد کہا۔ ”یہ رومال میرا نہیں ہے۔“

”لیکن یہ رومال بچہ کے نیچے اسی جگہ گر رہا تھا جس جگہ آپ بیٹھے ہوئے تھے۔“ نو جوان نے کہا۔ ”میں سمجھا کہ یہ آپ کا ہوگا۔“

”جی نہیں... شکریہ“ وہ میرے ساتھ اور باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن میرا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ بے کار کی باتوں میں اپنا سر کھپاؤں۔ آگے کچھ کہہ کر بغیر میں چل پڑا تو وہ بھی میرے ساتھ ساتھ ہی چلتے لگا۔ مگر میں نے کوئی بات نہیں کی۔ جب اس سے یہ خاموشی برداشت نہیں ہوئی تو پوچھنے لگا۔ ”آپ کہاں رہتے ہیں اور اس وقت کہاں جا رہے ہیں؟“

اس بار میں اپنے ہاتھ کو نہیں روک سکا۔ تھلا کر بولا۔ ”میں جہاں چاہے جاؤں اور جہاں چاہے رہوں، آپ کو اس سے مطلب؟ آپ کیوں میرے پیچھے پڑے ہیں؟“

”آپ تو ناراض ہو رہے ہیں۔“ وہ بڑی محصومیت سے بولا۔ ”مجھ پر ناراض نہ ہوں جناب... میں کوئی برا آدمی نہیں ہوں۔“

”لیکن کوئی اچھا آدمی کسی کو اس طرح بلاوجہ تنگ بھی تو نہیں کرتا۔“ میں نے اسی غصیلے لہجے میں کہا۔ ”آپ کو جہاں جانا ہو جائیں، میں بعد میں چلا جاؤں گا... پلیز جائیں۔“

”آپ کا مزاج بہت گرم ہے۔“ شرمندہ ہونے کے بجائے وہ بولا۔ ”گلتا ہے ابھی تک آپ کو کسی سے محبت نہیں ہوئی۔ اگر کسی سے آپ کو محبت ہوئی ہو تو آپ کے مزاج میں اتنی گرمی نہ ہوتی... کیونکہ پیار کرنے والوں کے منہ سے تو پھول جھڑتے ہیں۔“

مجھے اب وہ نو جوان پاگل لگنے لگا تھا، حالانکہ ابھی تک اس

نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی جس سے یہ شبہ یقین بدل سکا کہ وہ پاگل ہے۔

میں نے اس کی کسی بات کا جواب نہ دینے کا فیصلہ کیا اور اس خیال کے ساتھ آگے بڑھ گیا کہ اب وہ میرے پیچھے نہیں آئے گا لیکن میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ وہ پھر میرے ساتھ ساتھ چلتے لگا تھا۔ اس وقت ہم ایک رستوران کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ اس رستوران پر نظر پڑتے ہی وہ اچانک بولا۔ ”مسٹر... اچیلے! ایک ایک پیالی چائے پیتے ہیں۔“

”نہیں۔“ مجھے چائے نہیں چینی ہے۔“ میں اسی تھلا ہٹ بھرے لہجے میں بولا۔ اصل میں میں کسی طرح بھی اُس سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔

”دیکھیے پلیز... مان جائیے اور غصہ تھوک دیجیے۔“ وہ بڑی محصومیت سے میری طرف دیکھ کر کہہ رہا تھا۔ ”میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ پلیز میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں۔“

”لیکن میں اس وقت چائے پینے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ میں نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ”ورنہ میں آپ کی بات سنا کر مان لیتا۔“

”ٹھیک ہے آپ نہ نہیں... مگر مجھے تو آپ کو چائے پلانے ہے۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”دیکھیے! اگر آپ انکار کریں گے تو میں آخر تک آپ کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ مجھے سے چھٹکارا پا ہے تو میرے ساتھ اندر چلیں اور ایک پیالی چائے پی لیجیے۔“

میں عجیب کش مکش میں پڑ گیا۔ میری مجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کروں تو کیا کروں؟ اس وقت جو صورت حال میرے سامنے تھی اس نے میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی چھین لی تھی۔ دیر سے دیر سے میرے دل میں یہ محسوس پیدا ہونے لگا کہ اگر یہ نو جوان ہے کون؟ آخر اس کا مقصد کیا ہے؟ یہ مجھ سے کیا کیا چاہتا ہے؟ میرے ان سوالوں کا جواب تو مجھے اسی وقت مل سکا تھا جب میں کچھ دیر اس کے ساتھ بیٹھ کر اس کی باتیں سنتا۔

میں اس کے ساتھ رستوران کی طرف چل پڑا۔ جب اندر داخل ہونے کے بعد وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ ہم ایک خالی کونے کے سامنے بیٹھ گئے۔ اس نے میرے کولہ کر چائے کا آرڈر دیا اور پھر مسکراتے ہوئے مجھ سے بولا۔ ”دیکھیے جناب! مجھ نے ڈرنے کی بالکل بھی ضرورت نہیں ہے۔ نہ میں کوئی برا آدمی ہوں نہ ہی پاگل ہوں۔“

میں کچھ نہیں بولا اور چپ چاپ بیٹھا اس کی طرف رہا۔ ذرا دیر بعد وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”میری بات مان

ہاں اب آپ جلد سے جلد کسی سے پیار کر ہی لیجیے۔ جب تک آپ کسی سے پیار نہیں کریں گے آپ کی زندگی اسی طرح پھسکی ہوئی کڑی رہے گی۔ زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں رہے گی۔ کوئی آپ کو دل میں سما جائے گا تو دماغ کی یہ گرمی خود بخود ختم ہو جائے گی اور آپ خوش رہا کریں گے۔“

اس کی یہ بات سن کر بھی میں خود پر ضبط کیے چپ بیٹھا رہا۔ اتنے میں بیڑا چائے رکھ کر چلا گیا اور وہ نو جوان جلدی سے پیالیاں اپنے سامنے رکھ کر چائے بنانے لگا۔ میں اسیان سے اس کے معصوم چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ تب اچانک ہی میرے دماغ میں ایک زبردست دھماکا ہوا اور مجھے لگا کہ میں صبح سے جس کہانی کی تلاش میں سرگرداں رہا ہوں۔ ”نہیں وہ تو جی ان اس نو جوان کے اندر ہی چھپی ہوئی تو نہیں ہے؟ اس خیال کے ذہن میں میں ابھرتے ہی میرا تجسس اور پکڑنے لگا اور میں دلچسپی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس نے چائے کی پیالی میرے آگے رکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ مُنہ بند کیے کیوں بیٹھے ہیں؟“

”میں اس بات پر حیران ہوں۔“ میں نے مسکراتے کی کوشش کی اور بولا۔ ”آپ اگر کسی سے محبت کرتے ہیں تو یہ اچھی بات ہے۔“

”آپ مجھے محبت کرنے کا مشورہ دے کر کیوں حیران کر رہے ہیں؟“

”میں آپ کو حیران نہیں کر رہا ہوں۔“ نو جوان نے کہا۔ ”میں تو آپ کو بتا رہا ہوں کہ آپ اب بھی جوان ہیں اور ایک طویل زندگی آپ کے سامنے ہے۔ ویسے ہمارے دور کی یہ دنیا اور زندگی بے شمار مسائل سے بھری پڑی ہے۔ ایسے میں اگر کسی کو دل میں بسایا جائے تو آدمی کی آدمی سے زیادہ فکریں، دکھائیاں اور الجھنیں دور ہو جاتی ہیں کیونکہ محبت اپنے سوا کسی کو دیر سے سوچنے ہی نہیں دیتی۔“

”آپ تو محبت کے معاملے میں کافی تجربہ کار لگتے ہیں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”خیر میں آپ کے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔“

”بالکل ٹھیک۔“ یہ کہہ کر اُس نے میرے کاتھ پر چائے ڈال رکھا اور اٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ کی کامیابی کے لیے دعا کروں گا۔ اب چلیے ہم اپنے اپنے رستے پر چلتے ہیں۔ یعنی آپ کے مطابق میں آپ کا پیچھا چھوڑ رہا ہوں۔“

میں اُس پڑا اس کی بے فکری، زندہ دلی اور بے ریا گفت گو

کے انداز نے میرے تجسس کو اور بڑھا دیا تھا۔ میں چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے بارے میں کچھ بتائے لیکن ابھی تک وہ صرف پیار و محبت کی باتیں ہی کرتا رہا تھا۔ آخر کار میں نے چلتے چلتے پوچھ لیا۔ ”آپ نے مجھے تو محبت کرنے کا مشورہ دے دیا لیکن یہ تو باتیں ہیں کہ آپ خود بھی کسی سے محبت کرتے ہیں؟“

”میں...؟ میں بھی کسی سے محبت کرتا ہوں۔“ وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر ہنستے ہوئے بولا۔ ”میں ایک لڑکی سے محبت کرتا ہوں اور وہ لڑکی وہی تھی جسے ابھی آپ نے پارک میں دیکھا تھا۔“

”لیکن وہ تو آپ کو جانتی بھی نہیں ہے!“ میں حیرانی سے بولا۔ ”بلکہ آپ خود اسے میرا ساتھی سمجھ رہے تھے۔“

”وہ مذاق تھا۔“ وہ ہنس کر بولا۔ ”آج کل وہ ذرا ناراض ہے۔ لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ محبت میں تو یہ چلتا ہی رہتا ہے۔ میں جلد ہی اسے منالوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ پھر ہنسنے لگا۔ مجھے اس کی یہ بات عجیب ہی لگی۔ کیونکہ میں اس لڑکی کو دیکھ چکا تھا۔ وہ اس نو جوان سے بالکل ہی لاتعلقی نظر آ رہی تھی۔ خیر مجھے اس بات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ دونوں محبت کرتے ہیں یا نہیں۔ اس لیے میں اس سے رخصت ہو کر اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ اس بار وہ میرے ساتھ یا میرے پیچھے نہیں آیا تھا۔ ذرا آگے جا کر میں نے پلٹ کر دیکھا بھی لیکن وہ مجھے نظر نہیں آیا۔ میں سمجھ گیا کہ اپنے وعدے کے مطابق اس نے میرا پیچھا چھوڑ دیا ہے۔

اس واقعے کے دو دن بعد میں اپنے ایک دوست کے ساتھ باتیں کرتا ہوا اسی پارک کے سامنے سے گزرا تو اچانک ہی میری آنکھوں کے سامنے اس نو جوان اور اس لڑکی کا چہرہ گھوم گیا۔ میں نے اپنے دوست سے کہا۔ ”چلو ذرا دیر پارک میں بیٹھتے ہیں۔“

ہم دونوں پارک میں آ گئے۔ میری نظر سیدھی اس کونے والی بیچ کی جانب اٹھی اور میں حیرت سے اچھل پڑا کیونکہ اس بیچ پر مجھے وہی لڑکی بیٹھی ہوئی دکھائی دی۔ اس لڑکی کو پہچان لینے کے بعد میں نے اپنے دوست کو وہیں بیٹھ جانے کے لیے کہا اور ہمت کر کے اس بیچ کی جانب بڑھ گیا جس پر وہ لڑکی اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ لڑکی نے مجھے اپنے قریب آتے ہوئے دیکھ لیا تھا لیکن پھر بھی وہ انجان بنی بیٹھی رہی۔ اس کے نزدیک بیٹھ کر میں نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔ ”کیوں بہن! آج تو مجھے لگ رہا ہے کہ آپ کی ناراضی دور ہو گئی ہے۔ نہ؟“

میرا سوال کن کر پہلے تو وہ لڑکی گھبرا لی لیکن پھر میرا چہرہ اسے یاد آ گیا اور وہ مسکرا کر بولی۔ ”آپ نے چونکہ مجھے بہن کہا ہے اس لیے آپ سے بات کرنے میں کوئی حرج نہیں لگتا۔“

”جی کوئی حرج نہیں ہے۔“ میں بولا۔ ”میں نے سچے دل سے آپ کو بہن کہا ہے۔“

”تو وہ بھائی جو اس دن آپ کی موجودگی میں یہاں آیا تھا، وہ پھر آپ سے کہیں مل چکا ہے؟“

میں لڑکی کی بات سن کر چونک پڑا تھا کیونکہ یہ لڑکی اس نوجوان کو بھائی کہہ رہی ہے اور وہ نوجوان مجھے بتا چکا ہے کہ وہ اس لڑکی سے محبت کرتا ہے۔ بات کچھ عجیب سی ہو گئی تھی اور یہ

معمامیر کی سمجھ سے باہر ہو گیا تھا۔ لڑکی شاید میری خاموشی سے میری اندر کی کیفیت سمجھ گئی تھی بولی۔ ”آپ اگر روزانہ اس پارک میں آتے ہو تو آپ کو حقیقت سمجھنے میں دیر نہ لگتی۔“

اتنا کہہ کر وہ ذرا خمیر گئی پھر بچہ کی خالی جگہ کی جانب ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ”آپ بیٹھ جائیں، میں آپ کو ساری بات سمجھاؤں۔“

میں ایک اونٹنی کہانی سننے والا تھا۔ اس لیے جلدی سے بچہ پر بیٹھ گیا۔ بات شروع کرنے سے پہلے اس نے کہا۔۔۔

”بات ذرا لمبی ہو جائے گی، نہیں آپ کو پرہیز ہو جائے۔“

”جی نہیں۔“ مجھے کوئی خاص کام نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”مگر ایک منٹ میں ذرا اپنے دوست کو رخصت کر دوں۔“ یہ کہہ کر میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور وہیں سے اپنے دوست کو اشارہ کر کے چلے جانے کے لیے کہا اور پھر بیٹھ کر بولا۔ ”جی“

اب کہیے۔

”زندگی میں کبھی کبھی ایسے واقعات یا حادثات پیش آ جاتے ہیں کہ جتنی پرفسوں کرنے کے علاوہ آدمی کچھ بھی نہیں کر سکتا۔“

لڑکی نے خمیر سے لہجہ میں کہنا شروع کیا۔ ”اس دن جس نوجوان سے آپ یہاں ملے تھے وہ مجھے یہاں تقریباً روز ہی ملتا ہے۔۔۔ بلکہ آج اس پاس کے گھروں سے آنے والے بچے، عورتیں

اور مرد سب ہی اس سے واقف ہیں۔ کیونکہ وہ روزانہ ہی اسی وقت یہاں آتا ہے۔ آج بھی آیا ہی ہوگا، پارک کے اندر ہی کہیں ہوگا۔ اس کے پاس ایک ہلکے گلابی رنگ کا رومال بھی ہوتا ہے۔۔۔“

لڑکی نے گلابی رنگ کے رومال کی بات کی تو مجھے یاد آ گیا اور میں بول پڑا۔ ”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ وہ رومال اس نے مجھے بھی دکھایا تھا۔۔۔“

”یہ کہہ کر میں نے لڑکی کو وہ ساری بات بتادی جو میرے اور اس نوجوان کے درمیان راستے میں اور رستوران میں ہوئی تھی۔

اور۔۔۔ اس لڑکی کے ہونٹ مسکرتے چہرہ وہ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”اس گلابی رنگ کے رومال کے پیچھے بھی ایک کہانی ہے۔۔۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ وہ رومال اس نوجوان کا نہیں ہے۔“

”کیا؟“ میں چونک پڑا۔ ”وہ رومال اس کا نہیں ہے تو پھر کس کا ہے؟“

”سرتیا کا۔“ وہ جلدی سے بولی اور آگے کہا۔ ”سرتیا گنگولی کا نام تو شاید آپ نے نہیں پڑھایا ہوگا؟“

”سرتیا گنگولی۔۔۔!“ میں نے دھیرے سے یہ نام دہرایا اور پھر اچانک ہی چونک پڑا۔ سرتیا گنگولی بہت اچھی افسانہ نگار سی اور میں نے اس کے کئی افسانے مختلف رسائل اور جراند میں پڑھے تھے۔ یہ یاد آتے ہی میں نے کہا۔ ”ہاں ہاں میں نے آپیں پڑھا ہے یہ تو بہت مشہور نام ہے۔“

”ہاں وہی سرتیا۔“ کبھی کبھی وہ اپنے کاغذ قلم کی دنیا سے نکل کر اپنے چھوٹے بچوں اور بڑوں کے ننھے ننھے دوستوں کے ساتھ اس پارک میں آ جایا کرتی تھی۔ لڑکی نے سرتیا گنگولی کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ ”اور اکثر پارک کے

دوسرے گوشے میں جہاں بچوں کے لیے جمولے وغیرہ لگائے گئے ہیں وہیں جا کر بیٹھتی تھی۔ لیکن ایک دن وہ اپنے ننھے ننھے دوستوں کے بغیر اکیلی ہی یہاں چلی آئی تھی۔ اس روز سارے

بچے اسکول کی طرف سے پلنگ پہنچے تھے اور سرتیا اپنی کسی کئی کہانی کا پلاٹ سوچنے سوچنے لگی تھی۔ ”یہاں تک کہہ کر لڑکی اچانک ہی چپ ہو گئی۔ بول لگ رہا تھا جسے وہ

کچھ بھول رہی ہے۔ جب اس کی خاموشی طویل ہونے لگی تو میں نے کہا۔ ”آپ چپ کیوں ہو گئیں؟ سرتیا نے اسے ساتھ لیا

ہوا تھا اس بچہ پر؟“

”اس بچہ پر بیٹھنے کے ذرا دیر بعد ہی سرتیا کو لگا کہ اس پاس بہت ہی ساٹا ہے۔“ لڑکی نے بڑے گھمبیر لہجے میں کہا۔ ”چونکہ

اس روز سرتیا اپنی کسی اس لیے اُسے ڈر بھی لگنے لگا۔ اُس نے گھر چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن ابھی وہ بچہ پر سے اٹھنے بھی نہیں

پائی تھی کہ ایک نوجوان اچانک ہی پیچھے سے آیا اور بچہ پر اس کے برابر بیٹھ گیا اور پھر اُس کے چہرے کو دھیان سے دیکھ

ہوئے دیکھے اور جذباتی لہجہ میں بولا۔ ”میں جانتا ہوں آپ وہ نہیں ہیں مگر پھر بھی آپ وہی ہیں۔“ مجھے امید تو نہیں تھی کہ میں

زندگی میں دوبارہ یہ چہرہ دیکھ سکوں گا۔

”یہ آپ کیا بول کر رہے ہیں؟ آپ کو شرم نہیں آتی؟“

”اس لڑکی سے ایسی باتیں کرتے؟“ سرتیا نے غصے سے کہا اور ہلکے سے لیے اٹھ گئی۔“

”ذرا ایک منٹ۔“ میں نے ہاتھ اٹھا کر اُس لڑکی کو آگے کھینچ کر روک کر پوچھا۔ ”کیا یہ وہی نوجوان تھا جو اس دن

میری موجودگی میں اس بچہ پر آ کر بیٹھ گیا تھا؟“

”ہی ہاں۔“ لڑکی نے کہا۔ ”یہ وہی نوجوان تھا۔“

”پھر کیا وہ سرتیا کے ساتھ؟“ میں نے پوچھا۔

”سرتیا کے اٹھتے ہی وہ نوجوان بھی تیزی سے اٹھا اور

میں نے اس کے سامنے کھڑا ہو کر ہاتھ جوڑے ہوئے بولا۔ ”دیکھیے“

”میں تو بس توجہ دے رہی تھی آپ کو بری لگی ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔“ میں نے بڑے ڈر سے اُس لڑکی کو دیکھا تھا۔ ”پلیز“

”پلیز“

”لیکن سرتیا غصے میں بھری ہوئی تھی اُس نے اس کی

دھمکی کو کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر اس نے کہا کہ وہ وہاں سے

اُس کے لیے قدم بڑھاتی، نوجوان جھٹ کر سامنے آ گیا

اور اس کا راستہ روک کر بولا۔ ”میں آپ کو جانے نہیں دوں

اتنا کہہ کر وہ ذرا آگے بڑھا تو سرتیا کے منہ سے ایک

”لیکن سرتیا غصے میں بھری ہوئی تھی اُس نے اس کی

دھمکی کو کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر اس نے کہا کہ وہ وہاں سے

اُس کے لیے قدم بڑھاتی، نوجوان جھٹ کر سامنے آ گیا

اور اس کا راستہ روک کر بولا۔ ”میں آپ کو جانے نہیں دوں

اتنا کہہ کر وہ ذرا آگے بڑھا تو سرتیا کے منہ سے ایک

چیلنج

عدالت کے کٹہرے میں کھڑے، خوب جھکے ملزم سے مخاطب ہو کر، جیوری کے افراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جج نے کہا۔ ”انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے، مقدمے کی

کارروائی سے پہلے، عدالت تم سے یہ دریافت کرنا ضروری سمجھتی ہے کہ کیا تم جیوری کے کسی فرد کو بیچ کرنا چاہتے ہو؟“

ملزم نے غور سے جیوری کی طرف دیکھا پھر زیر لب مسکراتا ہوا بولا۔ ”آج کل میں قادم میں نہیں ہوں پھر بھی

کوئی بیٹھتا ہے اس موٹے شخص کو چار راؤنڈز میں ناک آؤٹ کرنے کا چیلنج کرتا ہوں۔ اس کا جاب اور جہاں جی

چاہے، مقابلہ کرے۔“

تعاون احمد سہیل، گورنر اوارڈ

ایک کر کے وہاں سے ہٹتے چلے گئے۔ سرتیا حیران حیران نظروں سے اس ادیبز عرصے کی جانب دیکھ رہی تھی۔

”جی نہیں۔“ مجھے کوئی خاص کام نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”مگر ایک منٹ میں ذرا اپنے دوست کو رخصت کر دوں۔“ یہ کہہ کر میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور وہیں سے اپنے دوست کو اشارہ کر کے چلے جانے کے لیے کہا اور پھر بیٹھ کر بولا۔ ”جی“

اب کہیے۔

”زندگی میں کبھی کبھی ایسے واقعات یا حادثات پیش آ جاتے ہیں کہ جتنی پرفسوں کرنے کے علاوہ آدمی کچھ بھی نہیں کر سکتا۔“

لڑکی نے خمیر سے لہجہ میں کہنا شروع کیا۔ ”اس دن جس نوجوان سے آپ یہاں ملے تھے وہ مجھے یہاں تقریباً روز ہی ملتا ہے۔۔۔ بلکہ آج اس پاس کے گھروں سے آنے والے بچے، عورتیں

اور مرد سب ہی اس سے واقف ہیں۔ کیونکہ وہ روزانہ ہی اسی وقت یہاں آتا ہے۔ آج بھی آیا ہی ہوگا، پارک کے اندر ہی کہیں ہوگا۔ اس کے پاس ایک ہلکے گلابی رنگ کا رومال بھی ہوتا ہے۔۔۔“

لڑکی نے گلابی رنگ کے رومال کی بات کی تو مجھے یاد آ گیا اور میں بول پڑا۔ ”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ وہ رومال اس نے مجھے بھی دکھایا تھا۔۔۔“

”یہ کہہ کر میں نے لڑکی کو وہ ساری بات بتادی جو میرے اور اس نوجوان کے درمیان راستے میں اور رستوران میں ہوئی تھی۔

اور۔۔۔ اس لڑکی کے ہونٹ مسکرتے چہرہ وہ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”اس گلابی رنگ کے رومال کے پیچھے بھی ایک کہانی ہے۔۔۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ وہ رومال اس نوجوان کا نہیں ہے۔“

”کیا؟“ میں چونک پڑا۔ ”وہ رومال اس کا نہیں ہے تو پھر کس کا ہے؟“

”سرتیا کا۔“ وہ جلدی سے بولی اور آگے کہا۔ ”سرتیا گنگولی کا نام تو شاید آپ نے نہیں پڑھایا ہوگا؟“

”سرتیا گنگولی۔۔۔!“ میں نے دھیرے سے یہ نام دہرایا اور پھر اچانک ہی چونک پڑا۔ سرتیا گنگولی بہت اچھی افسانہ نگار سی اور میں نے اس کے کئی افسانے مختلف رسائل اور جراند میں پڑھے تھے۔ یہ یاد آتے ہی میں نے کہا۔ ”ہاں ہاں میں نے آپیں پڑھا ہے یہ تو بہت مشہور نام ہے۔“

”ہاں وہی سرتیا۔“ کبھی کبھی وہ اپنے کاغذ قلم کی دنیا سے نکل کر اپنے چھوٹے بچوں اور بڑوں کے ننھے ننھے دوستوں کے ساتھ اس پارک میں آ جایا کرتی تھی۔ لڑکی نے سرتیا گنگولی کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ ”اور اکثر پارک کے

دوسرے گوشے میں جہاں بچوں کے لیے جمولے وغیرہ لگائے گئے ہیں وہیں جا کر بیٹھتی تھی۔ لیکن ایک دن وہ اپنے ننھے ننھے دوستوں کے بغیر اکیلی ہی یہاں چلی آئی تھی۔ اس روز سارے

بچے اسکول کی طرف سے پلنگ پہنچے تھے اور سرتیا اپنی کسی کئی کہانی کا پلاٹ سوچنے سوچنے لگی تھی۔ ”یہاں تک کہہ کر لڑکی اچانک ہی چپ ہو گئی۔ بول لگ رہا تھا جسے وہ

کچھ بھول رہی ہے۔ جب اس کی خاموشی طویل ہونے لگی تو میں نے کہا۔ ”آپ چپ کیوں ہو گئیں؟ سرتیا نے اسے ساتھ لیا ہوا تھا اس بچہ پر؟“

”اس بچہ پر بیٹھنے کے ذرا دیر بعد ہی سرتیا کو لگا کہ اس پاس بہت ہی ساٹا ہے۔“ لڑکی نے بڑے گھمبیر لہجے میں کہا۔ ”چونکہ

اس روز سرتیا اپنی کسی اس لیے اُسے ڈر بھی لگنے لگا۔ اُس نے گھر چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن ابھی وہ بچہ پر سے اٹھنے بھی نہیں

پائی تھی کہ ایک نوجوان اچانک ہی پیچھے سے آیا اور بچہ پر اس کے برابر بیٹھ گیا اور پھر اُس کے چہرے کو دھیان سے دیکھ

ہوئے دیکھے اور جذباتی لہجہ میں بولا۔ ”میں جانتا ہوں آپ وہ نہیں ہیں مگر پھر بھی آپ وہی ہیں۔“ مجھے امید تو نہیں تھی کہ میں

زندگی میں دوبارہ یہ چہرہ دیکھ سکوں گا۔

”یہ آپ کیا بول کر رہے ہیں؟ آپ کو شرم نہیں آتی؟“

انیل سے ملی؟

”ہاں“ لڑکی نے کہا۔ ”اس روز انیل کے ڈیڑی سریتا اس کے گھر کے باہر چھوڑ گئے تھے۔ لیکن دوسرے ہی روز انیل کی مٹی کو ساتھ لے کر سریتا کے گھر پہنچ گئے۔ اس وقت دونوں کافی پریشان اور غم زدہ لگ رہے تھے۔ انیل کے ڈیڑی نے سریتا کے والدین کی موجودگی میں یہ کہا کہ انیل کا خوش رہنا بہت ضروری ہے۔ اگر اسے ذرا بھی دکھ پہنچا تو اس کو کونسا بہت مشکل ہو جائے گا اور اس کے مکمل پاگل ہو جانے کا خطرہ بھی پیدا ہو جائے گا۔ ڈاکٹروں کا یہ بھی کہنا ہے کہ کوئی بھی اس کی مرضی کے خلاف نہ کیا جائے اور اس کی خوشی کا پورا خیال رکھا جائے۔ کچھ عرصے تک وہ اسی نارمل حالت میں رہا اور اسے کوئی صدمہ نہ پہنچا تو اس کا علاج آسان ہو سکتا ہے۔“

”اور اس کے لیے تم ہی ہماری مدد کر سکتی ہو بیٹی۔“ انیل مٹی نے سریتا کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”ایک ذرا سی قرا دے کر تم ہمارے بیٹے کو خوش رکھ سکتی ہو“

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں آنٹی؟“ سریتا نے کہا۔ ”میں ایسا کچھ نہیں کر سکتی۔“

”سریتا ٹھیک کہتی ہے۔ وہ اس سلسلے میں آپ کی مدد نہیں کر سکتی۔ سریتا کی ماں نے کہا۔ ”اور ہم اس کی اجازت نہیں دیں گے، کیونکہ چند ماہ بعد اس کی شادی ہونے والی ہے۔“

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ سریتا ہماری بھی بیٹی ہے۔ ہم اس کے لیے دعا گو ہیں گے۔“ انیل کے ڈیڑی نے لہجے میں کہا۔ ”نہ ہلائی اتنی درخواست ہے۔ سریتا کچھ روز تک پارک کی اس بچ پر آکر بیٹھ جایا کر مجھے یقین ہے کہ سریتا کو اپنے سامنے لگے گا۔“

وہ اپنی نرس کے پاس بیٹھ کر اس سے باتیں کر رہا ہے۔ اس طرح وہ خوش رہا کرے گا۔

”سریتا کے گھر میں اس وقت اُس کا منگیتا کیش موجود تھا۔ وہ سریتا کو لے کر شاپنگ کے لیے جانے والا اس نے بھی یہ ساری باتیں خاموشی سے سنی تھیں۔

”سے پہلے کہ سریتا انیل کے ڈیڑی مٹی کو کوئی جواب دینے کے لیے انیل کے ڈیڑی سے کہا۔ ”انکل آپ بالکل سچے ہیں۔ بھگوان نے چاہا تو آپ کا انیل بہت جلد ہو جائے گا۔ سریتا پارک میں جا کر ضرور انیل کے پاس آئے گی اور اس سے باتیں بھی کرے گی۔“

”کیا!۔۔۔ یہ بات سریتا کے منگیتا نے کہی؟“

ڈیڑی تو ان ہی لگاؤ دیا۔ بات یہ ہے بیٹی کہ تمہاری عمر کی اور لگ بھگ تم جیسی صورت شکل والی ایک لڑکی نرس سے اسے محبت ہوگئی تھی۔ دونوں ساتھ کالج میں پڑھتے تھے۔ مجھ سے ان کی محبت چھپی ہوئی نہیں تھی۔ میں نے دو ایک بار اس لڑکی کو اس کے ساتھ دیکھا تھا اور وہ مجھے پسند بھی تھی۔ انیل چونکہ میرا اکلوتا بیٹا ہے اس لیے میں اس کی محبت اور خوشی کے آگے دیوار بننا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن میں یہ ضرور چاہتا تھا کہ وہ پہلے دل لگا کر اپنی تعلیم مکمل کرے۔ یہاں تک کہہ کر ان کی آواز بھڑاگئی اور وہ کھائیں کر گلا صاف کرتے ہوئے آگے بولا۔ ”فائنل امتحان کے دنوں میں میں نے اس کو یہ بات بتادی کہ اگر وہ لڑکی بھی تم سے اتنی ہی محبت کرتی ہے تو پھر پوری توجہ سے امتحان دو پھر میں اسی لڑکی سے تمہاری شادی کرادوں گا۔ میری اس بات پر وہ بہت خوش ہوا اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ دل لگا کر امتحان دے گا لیکن قدرت کو میری اور میرے بیٹے کی خوشی منظور نہیں تھی۔ ایک دن کالج آتے ہوئے وہ لڑکی ٹریفک کے حادثے میں ہلاک ہوگئی۔ اس کی موت کی خبر سن کر انیل پچھاڑیں کھانے لگا اور پھر اسے چپ سی لگ گئی۔ وہ ہر وقت غلامی طور پر رہتا۔ کئی دن تک تو وہ کھائے پیے بغیر بے سندھ پڑا رہتا تھا۔ کسی سے کچھ کہتا سنتا بھی نہیں تھا۔ بیٹھے بیٹھے وہ یکا یک گھر سے نکل بھاگتا اور سیدھا اس پارک میں جا کر اسی بچ پر بیٹھ جاتا جس پر وہ اور اس کی محبوبہ نرس بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔“

”ڈرا کر کرادیں شخص نے ایک بار پھر اپنے آنسو پونچھے اور کہا۔ ”اُس بچ پر آج تم اسے بیٹھی نظر آگئیں۔ چپا نظر میں تو میں بھی تمہیں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ نرس میں اور تم میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ شاید اسی لیے نرس کے دھوکے میں انیل نے تمہیں تنگ کیا ہوگا۔ آج وہ آج تک ہی گھر سے نکل گیا تھا۔ اس کی ماں گھر میں اکیلی تھی اور کسی کام میں مصروف تھی۔ اس لیے اُسے پتا ہی نہیں چلا۔ جب میں گھر واپس آیا تو مجھے بتایا گیا کہ انیل بہت دیر سے گھر میں موجود نہیں ہے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ پارک میں ہی ہوگا۔ پھر جب میں اسے ڈھونڈتا ہوا پارک میں داخل ہوا تو اس بچ کے پاس لوگوں کی بھیڑ دیکھی۔ تو مجھے لگا کہ میرے انیل نے ہی کوئی ایسی ویسی حرکت کی ہوگی۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ اور اب مجھے یقین ہے کہ تم نے بھی اسے معاف کر دیا ہوگا۔“

”پھر کیا ہوا؟“ وہ لڑکی یہ ساری بات بنا کر چپ ہوئی تو میں نے اس سے پوچھا۔ ”کیسا تر اس واقعے کے بعد کبھی

میت سے لڑکی کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”کوئی ہونے والا شوہر لی ہونے والی بیوی کو کسی اجنبی... اور تقریباً پاگل نو جوان کے پاس تنہائی میں ملنے اور باتیں کرنے کی اجازت بھلا کیسے مل سکتا ہے؟ کیا سریتا نے اپنے منگیتا کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں کیا؟“

”ہی نہیں۔“ لڑکی نے جواب دیا۔ ”اس دن کے بعد سے ہمارا ذرا پارک میں جا کر انیل سے ملتی ہے۔“

”بڑی عجیب بات ہے؟“ میں بولا۔ ”مگر سریتا نے اس لڑکی کو جو پھر دوسرا کیسے کر لیا۔ وہ تو کسی وقت بھی سریتا کو اپنی نرس سمجھ کر کوئی زیادتی کر سکتا؟“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔“ لڑکی نے بتایا۔ ”پہلے انیل کے نظریے اور انکیش تینوں پارک میں گئے تھے۔ انیل اسی اس بچ پر چڑھا کر بیٹھ گیا۔ انیل کے ڈیڑی اور کیش بچ ذرا دور ایک درخت کے پاس بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد انیل ہی آگیا اس نے سریتا کو بچ پر بیٹھنے کے لئے دیکھا پھر اس کے بارے میں پوچھتے ہوئے دیر سے بولا۔ ”سوری مجھے آنے میں تاخیر ہوگئی۔“

”اس کے بعد وہ سریتا کو نرس سمجھ کر بڑبڑانے کے انداز میں بولتا رہا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ خود سے گفتگو کر رہا ہے۔ پارک ذرا اونچی آواز میں بولا۔ ”مگر تم مجھ سے باتیں کرنا چاہتی ہو؟ اب دیکھو نا کتنے دنوں کے بعد تم آئی ہو۔“

”جانتی ہی نہیں تم؟“ سریتا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ”کہاں چلی گئی تھیں تم؟“ سریتا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ”کہاں چلی گئی تھیں تم؟“ سریتا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ”کہاں چلی گئی تھیں تم؟“ سریتا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”ان اس وقت سریتا کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی جو اس کی طرف پر دیتی۔ بس جیکے گا بی رنگ کا ایک رومال لے کر وہاں سے ہوا اور بار بار رومال کو منگیتا لگنے۔“

”میں نے دیر سے دیر سے یہ سب باتیں مجھے بتائیں پھر انیل کی جذباتی کیفیت تو اب بھی باقی رہی ہے

قلقل سیما

استاد: ”ہم نے اپنے اعداد و شمار عربوں سے لیے، اپنی جنتی ریتوں سے لی اور اپنا بینکاری نظام اطالویوں سے لیا۔“

”زادہ اہم کوئی اور مثال دے سکتے ہو؟“

زادہ نے کہا، ”جی ہاں، ہم نے استری رحمان صاحب سے لی اور جھاڑ و مسز بیک کے گھر سے لی۔“

مسودا سن لی تاک جھانک

لیکن اب اس میں پہلے جیسی شدت نہیں ہے۔ اب اس میں بڑی حد تک سکون اور ٹھیراؤ آ گیا ہے۔ اب اُس کے تمام تر جذبات اور توجہ کا مرکز رومال ہو گیا ہے۔ وہ اس رومال سے ہی محبت کرنے لگا ہے۔ اب اسے جو بھی ملتا ہے اسے وہ کسی نہ کسی بہانے رومال ضرور دکھاتا ہے۔ آپ کو بھی وہ رومال دے رہا تھا۔ لیکن اگر آپ اُس سے وہ رومال اس سے لینا چاہتے تو وہ آپ کو بھی نہ دیتا۔ لڑکی اتنا کہہ کر چپ ہوگئی۔

”لیکن یہ کہانی تو ابھی ادھوری ہے۔“ میں بولا۔ ”آپ نے تو بتایا ہی نہیں کہ سریتا کب تک وہاں آتی رہی اور اس کا منگیتا کیش کب تک یہ برداشت کرتا رہا؟“

”سریتا کا منگیتا بہت اچھا انسان ہے۔ اس کے سینے میں ایک درد مند دل دھڑکتا ہے وہ کسی کو بھی نہیں دیکھ سکتا۔“ لڑکی نے کہا۔ ”سریتا نے اسے رومال دینے والی بات بتائی اور یہ کہا کہ اگر انیل کے پاس اس کی محبوبہ نرس کی تصویر ہو تو وہ اس تصویر کے سہارے اپنے دن سکون سے گزار سکتا ہے مگر افسوس بے چارے کے پاس کوئی تصویر نہیں ہے۔ وہ جب ایک رومال ملنے سے اتنا خوش ہے تو پھر تصویر سے تو اس کی کیفیت ہی بدل جائے گی۔ سریتا کی بات سن کر کیش کی آنکھوں میں چمک سی لہرا لی۔ اس نے فوراً ہی اس مسئلے کا حل نکال لیا۔

”کیسا؟“ میں نے پوچھا۔

”دوسرے دن جب سریتا انیل کے ساتھ بیٹھی تھی تو کیش گلے میں کیمرا اور کندھے پر بیک لٹکاے اسٹریٹ فوٹو گرافر کے جھیس میں وہاں آگیا اور سریتا سے اجازت لے کر اس نے انیل کے ساتھ اس کی دو تین تصویریں اتاریں اور پھر دونوں کی الگ الگ تصاویر بھی بنائیں۔ اگلے دن اسی جگہ تصویریں دے جانے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ دوسرے روز کیش پھر فوٹو گرافر بن

جینس

مامورِ الحق

جینیات کے ایک مامور کے ہمسایہ کا عالم، وہ والدین کے بچے کو منتقل ہونے والے موروثی خاصہ کے حوالے سے انتہائی اہم کامیاب حاصل کر چکا تھا قبل اس کے کہ اس کے تحقیق کو عالمِ مذہب دھوم مچا دے، ایک حقیقی مامورِ حق نے اسے آگے گھمادیا کہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہا

”ڈاکٹر سالوے نے اپنا ٹیکنی فاسٹ سے تہہ کر کے، اس طرف رکھا اور اٹھ کر اٹھو! اس کی بیوی ہیلن اور اسٹنٹ اس کے دستورکھانے میں منہمک تھے۔“

”ابھی مجھے گھنٹے دو گھنٹے مزید لگیں گے لیب میں۔“ یہ کہہ کر ڈاکٹر سالوے سے چلا گیا۔

”یوں کہہ کر اس نے اپنے کوئی نئی بات بتائی ہو۔ حالاں کہ اسٹنٹ نے خالی الذہنی کے عالم میں لکھ بھڑکھڑاہیلن کی طرف دیکھا پھر سر جھٹک کر بولا۔“ ڈاکٹر سالوے جب کچھ ناراض ہے تو اس طرح ہے، مجھے وہاں کی تیاری کرنی پڑی۔“

”فراموشی اسٹنٹ نے اپنی گلابی انگریزی میں کہا۔“ ہیلن نے گھور کر مارسل کو دیکھا اور بولی۔“ اب ایسا بھی نہیں ہے۔“

”جینس کے ایک مامور کے ہمسایہ کا عالم، وہ والدین کے بچے کو منتقل ہونے والے موروثی خاصہ کے حوالے سے انتہائی اہم کامیاب حاصل کر چکا تھا قبل اس کے کہ اس کے تحقیق کو عالمِ مذہب دھوم مچا دے، ایک حقیقی مامورِ حق نے اسے آگے گھمادیا کہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہا

”ڈاکٹر سالوے نے اپنا ٹیکنی فاسٹ سے تہہ کر کے، اس طرف رکھا اور اٹھ کر اٹھو! اس کی بیوی ہیلن اور اسٹنٹ اس کے دستورکھانے میں منہمک تھے۔“

”ابھی مجھے گھنٹے دو گھنٹے مزید لگیں گے لیب میں۔“ یہ کہہ کر ڈاکٹر سالوے سے چلا گیا۔

”یوں کہہ کر اس نے اپنے کوئی نئی بات بتائی ہو۔ حالاں کہ اسٹنٹ نے خالی الذہنی کے عالم میں لکھ بھڑکھڑاہیلن کی طرف دیکھا پھر سر جھٹک کر بولا۔“ ڈاکٹر سالوے جب کچھ ناراض ہے تو اس طرح ہے، مجھے وہاں کی تیاری کرنی پڑی۔“

”فراموشی اسٹنٹ نے اپنی گلابی انگریزی میں کہا۔“ ہیلن نے گھور کر مارسل کو دیکھا اور بولی۔“ اب ایسا بھی نہیں ہے۔“

”جینس کے ایک مامور کے ہمسایہ کا عالم، وہ والدین کے بچے کو منتقل ہونے والے موروثی خاصہ کے حوالے سے انتہائی اہم کامیاب حاصل کر چکا تھا قبل اس کے کہ اس کے تحقیق کو عالمِ مذہب دھوم مچا دے، ایک حقیقی مامورِ حق نے اسے آگے گھمادیا کہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہا

”ڈاکٹر سالوے نے اپنا ٹیکنی فاسٹ سے تہہ کر کے، اس طرف رکھا اور اٹھ کر اٹھو! اس کی بیوی ہیلن اور اسٹنٹ اس کے دستورکھانے میں منہمک تھے۔“

”ابھی مجھے گھنٹے دو گھنٹے مزید لگیں گے لیب میں۔“ یہ کہہ کر ڈاکٹر سالوے سے چلا گیا۔

”یوں کہہ کر اس نے اپنے کوئی نئی بات بتائی ہو۔ حالاں کہ اسٹنٹ نے خالی الذہنی کے عالم میں لکھ بھڑکھڑاہیلن کی طرف دیکھا پھر سر جھٹک کر بولا۔“ ڈاکٹر سالوے جب کچھ ناراض ہے تو اس طرح ہے، مجھے وہاں کی تیاری کرنی پڑی۔“

”فراموشی اسٹنٹ نے اپنی گلابی انگریزی میں کہا۔“ ہیلن نے گھور کر مارسل کو دیکھا اور بولی۔“ اب ایسا بھی نہیں ہے۔“

”جینس کے ایک مامور کے ہمسایہ کا عالم، وہ والدین کے بچے کو منتقل ہونے والے موروثی خاصہ کے حوالے سے انتہائی اہم کامیاب حاصل کر چکا تھا قبل اس کے کہ اس کے تحقیق کو عالمِ مذہب دھوم مچا دے، ایک حقیقی مامورِ حق نے اسے آگے گھمادیا کہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہا

”ڈاکٹر سالوے نے اپنا ٹیکنی فاسٹ سے تہہ کر کے، اس طرف رکھا اور اٹھ کر اٹھو! اس کی بیوی ہیلن اور اسٹنٹ اس کے دستورکھانے میں منہمک تھے۔“

”جینس کے ایک مامور کے ہمسایہ کا عالم، وہ والدین کے بچے کو منتقل ہونے والے موروثی خاصہ کے حوالے سے انتہائی اہم کامیاب حاصل کر چکا تھا قبل اس کے کہ اس کے تحقیق کو عالمِ مذہب دھوم مچا دے، ایک حقیقی مامورِ حق نے اسے آگے گھمادیا کہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہا

”ڈاکٹر سالوے نے اپنا ٹیکنی فاسٹ سے تہہ کر کے، اس طرف رکھا اور اٹھ کر اٹھو! اس کی بیوی ہیلن اور اسٹنٹ اس کے دستورکھانے میں منہمک تھے۔“

”ابھی مجھے گھنٹے دو گھنٹے مزید لگیں گے لیب میں۔“ یہ کہہ کر ڈاکٹر سالوے سے چلا گیا۔

”یوں کہہ کر اس نے اپنے کوئی نئی بات بتائی ہو۔ حالاں کہ اسٹنٹ نے خالی الذہنی کے عالم میں لکھ بھڑکھڑاہیلن کی طرف دیکھا پھر سر جھٹک کر بولا۔“ ڈاکٹر سالوے جب کچھ ناراض ہے تو اس طرح ہے، مجھے وہاں کی تیاری کرنی پڑی۔“

”فراموشی اسٹنٹ نے اپنی گلابی انگریزی میں کہا۔“ ہیلن نے گھور کر مارسل کو دیکھا اور بولی۔“ اب ایسا بھی نہیں ہے۔“

”جینس کے ایک مامور کے ہمسایہ کا عالم، وہ والدین کے بچے کو منتقل ہونے والے موروثی خاصہ کے حوالے سے انتہائی اہم کامیاب حاصل کر چکا تھا قبل اس کے کہ اس کے تحقیق کو عالمِ مذہب دھوم مچا دے، ایک حقیقی مامورِ حق نے اسے آگے گھمادیا کہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہا

”ڈاکٹر سالوے نے اپنا ٹیکنی فاسٹ سے تہہ کر کے، اس طرف رکھا اور اٹھ کر اٹھو! اس کی بیوی ہیلن اور اسٹنٹ اس کے دستورکھانے میں منہمک تھے۔“

”ابھی مجھے گھنٹے دو گھنٹے مزید لگیں گے لیب میں۔“ یہ کہہ کر ڈاکٹر سالوے سے چلا گیا۔

”یوں کہہ کر اس نے اپنے کوئی نئی بات بتائی ہو۔ حالاں کہ اسٹنٹ نے خالی الذہنی کے عالم میں لکھ بھڑکھڑاہیلن کی طرف دیکھا پھر سر جھٹک کر بولا۔“ ڈاکٹر سالوے جب کچھ ناراض ہے تو اس طرح ہے، مجھے وہاں کی تیاری کرنی پڑی۔“

”فراموشی اسٹنٹ نے اپنی گلابی انگریزی میں کہا۔“ ہیلن نے گھور کر مارسل کو دیکھا اور بولی۔“ اب ایسا بھی نہیں ہے۔“

”جینس کے ایک مامور کے ہمسایہ کا عالم، وہ والدین کے بچے کو منتقل ہونے والے موروثی خاصہ کے حوالے سے انتہائی اہم کامیاب حاصل کر چکا تھا قبل اس کے کہ اس کے تحقیق کو عالمِ مذہب دھوم مچا دے، ایک حقیقی مامورِ حق نے اسے آگے گھمادیا کہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہا

”ڈاکٹر سالوے نے اپنا ٹیکنی فاسٹ سے تہہ کر کے، اس طرف رکھا اور اٹھ کر اٹھو! اس کی بیوی ہیلن اور اسٹنٹ اس کے دستورکھانے میں منہمک تھے۔“

”ابھی مجھے گھنٹے دو گھنٹے مزید لگیں گے لیب میں۔“ یہ کہہ کر ڈاکٹر سالوے سے چلا گیا۔

”یوں کہہ کر اس نے اپنے کوئی نئی بات بتائی ہو۔ حالاں کہ اسٹنٹ نے خالی الذہنی کے عالم میں لکھ بھڑکھڑاہیلن کی طرف دیکھا پھر سر جھٹک کر بولا۔“ ڈاکٹر سالوے جب کچھ ناراض ہے تو اس طرح ہے، مجھے وہاں کی تیاری کرنی پڑی۔“

”فراموشی اسٹنٹ نے اپنی گلابی انگریزی میں کہا۔“ ہیلن نے گھور کر مارسل کو دیکھا اور بولی۔“ اب ایسا بھی نہیں ہے۔“

”جینس کے ایک مامور کے ہمسایہ کا عالم، وہ والدین کے بچے کو منتقل ہونے والے موروثی خاصہ کے حوالے سے انتہائی اہم کامیاب حاصل کر چکا تھا قبل اس کے کہ اس کے تحقیق کو عالمِ مذہب دھوم مچا دے، ایک حقیقی مامورِ حق نے اسے آگے گھمادیا کہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہا

”واقعی سریتا گنگولی صاحبہ اور ان کے منگیتر ملیش نے انیل کو اس کی نارل زندگی کی طرف واپس لانے میں بڑی مدد کی ہے ورنہ آج کے دور میں کون کی کے لیے ایسا کچھ کرتا ہے۔“ میں نے کہا اور پھر اچانک پوچھ بیٹھا۔ ”کیا میری سریتا گنگولی سے ملاقات ہو سکتی ہے؟ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ اور... ایک بات اور ہے۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ آپ کو یہ سب باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟ کیا آپ کا سریتا سے کوئی قریبی تعلق ہے؟“

میری بات سن کر وہ لڑکی مسکرائی ذرا دیر تک مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”آپ کے پہلے سوال کا جواب ہے کہ آپ سریتا گنگولی سے مل چکے ہیں... اور...“

”کیا؟“ میں حیرت سے بولا۔ ”میں سریتا گنگولی سے مل چکا ہوں؟“

”جی ہاں۔ ایک بار نہیں دو بار۔“ وہ لڑکی ہنس کر بولی۔ ”اب رہا آپ کا دوسرا سوال... کہ یہ سب باتیں مجھے کسے معلوم ہوئیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں خود ہی سریتا گنگولی سے مل چکا ہوں۔“

”کیا؟“ مجھے ایک بار پھر شدید جھٹکا لگا۔ پھر اس سے کہ میں کچھ اور پوچھتا ہوں اپنی جگہ سے اٹھ گئی پارک کے گیٹ کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”ملیش آگئے۔ اب مجھے جانا چاہیے۔“

”بائی!“ اتنا کہہ کر وہ چل پڑی اور میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ آج مجھے زندگی کا ایک بڑا ہی عجیب و غریب تجربہ ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ دنیا کی ایسی کتنی باتیں ہیں جو خالی نہیں ہوتی۔ ساتھ ساتھ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر اس روز میں اس کا پلاٹ، سوچے سوچے پارک کی اس بچہ کو بیٹھا ہوا دیکھ کر کیا زندگی کے ان جیتے جاگتے عظیم کرداروں کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ پاتا؟ کیا میں ملیش اور سریتا گنگولی جیسے لوگوں کو بھی بھول پاؤں گا جو صرف اپنے لیے ہی نہیں... بلکہ دوسروں کے لیے بھی جینے کا ہنر جانتے ہیں!

اس روز میں سریتا گنگولی سے اپنا تعارف نہیں کر سکا تھا۔ یہ کہانی سریتا گنگولی کی آپ بیتی ہے... جو میں نے اپنی زندگی کی زبانی سنی تھی۔ لیکن اسے قلم بند میں کر رہا ہوں۔ مجھے اس سے کہ جب سریتا یہ کہانی پڑھے گی تو اسے میرے بارے میں بھی معلوم ہو جائے گا کہ اس کی آپ بیتی کا انجانے میں میں بھی ایک کردار بن گیا تھا۔

کر وہاں آیا اور ساری رنگین تصاویر انیل کو دکھائیں اور سریتا سے پیسے لے کر چلا گیا۔ انیل وہ تصویریں دیکھ کر مارے خوشی کے اچھلنے لگا۔ سریتا کے چہرے میں اسے اپنی جیو بہ کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے اسے دنیا بھر کی دولت مل گئی ہو۔ سریتا نے جب اس کی خوشی کا یہ عالم دیکھا تو اس نے اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انیل سے کہا۔ ”دیکھو انیل! تم میری بات کا برا نہ ماننا اور نہ ہی مجھے غلط سمجھنا۔ میں ایک لڑکی ہوں اور گھر والوں سے چھپ چھپ کر میرا یہاں روزانہ آنا بہت مشکل ہے۔ ہاں ہفتے میں دو دن یعنی بدھ اور جمعرات کو ضرور آیا کروں گی۔“

”سریتا کی یہ بات سن کر انیل ذرا بھی ناراض نہیں ہوا۔ البتہ اس کے چہرے پر گہری شیدائی طاری ہو گئی تھی۔ پھر اس نے انتہائی شکایت آواز میں کہا۔ ”میں جانتا ہوں تم وہ نہیں ہو، مگر میں تو شخصیں نرس سمجھ کر ہی ہنس بول لیتا ہوں۔ کیا کروں؟“

دوبارہ جو ہوں! اور پھر تم ہو، پھر نرس ہی تو ہو... ذرا بھی تو فرق نہیں ہے۔ یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں مگر پھر بھی اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ”کوئی بات نہیں اب تو یہ تصویریں میرے پاس ہیں۔ میں انہیں نرس کی تصویریں سمجھ کر آرام سے رو لہوں گا...“

”پھر کیا ہوا؟“ لڑکی کے خاموش ہوتے ہی میں اپنا تحس کو بند کر دیا۔

”پھر یہ ہوا کہ انیل تو اس پارک میں روزانہ آتا ہے۔“ لڑکی نے مجھے بتایا۔ ”لیکن سریتا ہفتے میں دو ایک بار ہی آتی ہے۔ اس کے ساتھ اس کا منگیتر ملیش بھی ہوتا ہے جو ذرا دور کسی جھاڑی یا درخت کی اوٹ میں بیٹھ جاتا ہے۔ سریتا بچہ پر بیٹھی رہتی ہے۔ انیل کی ذہنی کیفیت اب پہلے سے بہت بہتر ہے۔ اب اس کے دل و دماغ میں وہ پہلے جیسا پیمان اور پاگل پن نہیں ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اسے اب اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ اس کی جیو بہ اب ہمیشہ کے لیے اس سے روٹھ چکی ہے۔ اسی لیے اب وہ سریتا سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کرتا مگر کبھی کبھی سریتا کے سامنے دھیرے دھیرے بڑبڑانے لگتا ہے جیسے اپنی نرس سے ہی باتیں کر رہا ہو۔ انیل کے ڈیڈی کا کہنا ہے کہ اس کا علاج ہو رہا ہے اور ڈاکٹر نے یقین دلایا ہے کہ انیل جلد ہی اس کیفیت سے نکل آئے گا۔ اس کے مئی ڈیڈی سریتا اور ملیش کے بہت شکر گزار ہیں اور ان دونوں کے شاندار مستقبل کے لیے دعا گو ہیں۔“



انگلش کے سبب وہ بات سمجھانے کے لیے آنکھوں، چہرے کے عضلات اور ہاتھوں کی حرکت سے زیادہ سے زیادہ کام لیتا تھا۔

”حالاں کرواپس جانا میرے لیے سوندن ثابت نہ ہوگا۔“

اس نے بات جاری رکھی۔ ”کل ڈاکٹر صاحب ایک سیمینار میں تقریر کر رہے تھے۔ اس میں انھوں نے اپنی تحقیق کے حوالے سے لوگوں کو بتایا جس کا عنوان تھا ’اکسانی صلاحیتوں کی موروثیت کا مشاہدہ... ہمہ عہد مقالہ تھا مگر ڈاکٹر کو اپنی بات کہتی نہیں آئی۔ وہ سمجھا ہی نہیں پائے اپنے سننے والوں کو۔ بعد میں معلوم ہوا کہ لوگ ان پر ہنس رہے تھے مذاق اڑا رہے تھے۔“ مارسل نے توقف کہا پھر بولا۔ ”مگر ہمارے ڈاکٹر صاحب بے وقوف نہیں۔ اور وہ جو کام کر رہے ہیں وہ بھی بہت قابل قدر ہے۔ مگر وہ بہت... آپ کیا کہتی ہیں انھیں... خود غرض... بہت خود غرض ہیں۔ ضرورت سے زیادہ کوئی بات کسی کو معلوم ہی نہیں ہونے دیتے۔ تاکہ ہر بات کا کریڈٹ بھی صرف انہی کے حصے میں آئے۔“

ہیلن نے اس کی تردید نہیں کی۔ ”تم یہی کہہ رہے تھے نا کہ ڈاکٹر نے اپنے نظریے کو عملی طور پر ثابت بھی کر دیا ہے۔“

”جی... لیکن یہ ثبوت ابتدائی ہیں۔ اگلا مرحلہ بڑے ثبوتوں کا ہے جو صرف بڑے پیمانے پر کیے گئے تجربات سے ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ ورنہ ڈاکٹر کی باتوں پر کوئی کان نہیں دھرے گا۔ میں یہ باتیں انھیں بتاتا رہتا ہوں۔ میں نے کہا بھی ہے کہ دوسروں کی طرح آپ بھی اپنے تجربات کے حوالے سے میڈیکل رسالے میں مضامین تحریر کریں، یونیورسٹی کو اپنے تجربات کی طرف متوجہ کریں۔ تب آپ کو آپ کے تجربات کو اہمیت اور شہرت ملے گی۔ بھی آپ کی بات کسی بھی جائے گی اور قبول بھی کی جائے گی۔“ مارسل نے تانت سے سر ہلایا۔

مگر وہ میری بات نہیں سنتے۔ بلکہ کہتے ہیں کہ اپنے کام سے کام رکھو۔ چنانچہ میں اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔“

اس نے ایک بار پھر ہیلن کا جائزہ لیا بولا۔ ”آج میں نے ان سے کہا کہ آپ کی دریافت میں، تحقیق میں میرا بھی حصہ ہے میری بھی محنت ہے۔ یہ معاملہ ہے ہی اتنا اہم۔ بس اس بات پر ذرا زیادہ غور ہوگی۔ چنانچہ چاب میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنا پورا بستر لیٹ لینا چاہیے۔“

”چچ چچ!“ ہیلن نے تانت سے سر ہلایا۔

”میرا خیال ہے کہ کل تک اس کا غصہ اتر جائے گا۔“

”مجھے نہیں لگتا کہ اب کے ایسا ہو۔ آپ کے شوہر بہت

بڑے آدمی... مگر بہت چھوٹے انسان ہیں۔ بہر حال...“

نے کندھے جھٹکے ”میرا خیال ہے، اس موضوع پر بہت بات ہوگی۔ اب آدمی کسی موضوع پر گفتگو کرتے ہیں۔ دنیا میں آدمی دل چسپ موضوعات ہیں جن پر ہمیں گفتگو کرنی چاہیے۔ اس نے بہت ہی نرم... بوج دار آواز میں کہا۔

ڈاکٹر سالوے کے گھٹے دو گھنٹے ہمیشہ کی طرح کم و بیش گھنٹوں پر محیط ہوئے۔ وہ تجربہ گاہ سے نکلا تو بارہ سے اوپر وقت تھا۔ اس کی بیوی خواب گاہ میں بستر پر دراز کسی کتاب مطالعہ کر رہی تھی۔

”بچے ٹھیک ہیں؟“ ڈاکٹر نے جوتے اتارتے ہوئے پوچھا۔ ”میں نے ابھی آتے ہوئے کھانسی کی آواز سنی تھی شاید ڈیوڈ کھانسا تھا۔“

”ہاں، اسے ذرا کھانسی ہے۔ دوا دے دی ہے۔“

نے جواب دیا۔ پھر ہم دردی سے بولی۔ ”سالوے، تم نے تھک جاتے ہو۔ مت کرو اتنی محنت! اپنا بھی خیال رکھو۔“

”ہاں، تمھیں تو محسوس کر رہا ہوں۔“

لیتے ہوئے اعتراف کیا۔ ”کام بھی بس ختم ہونے کی راہ ہے۔ اہم حصہ تو سمجھو ہو گیا۔ اب تو بس نتائج کو چیک کرنا اور کراس چیک کرنے کا مرحلہ باقی ہے تاکہ کسی ناقد کو تشبیہ کا کوئی پہلو نہ ملے۔ اس مرحلے پر مجھے ایک ایسا ثبوت درکار ہے خانی سے مبرا اور غیر متنازع ہو... ایسا جسے نظر انداز نہ کیا جاسکے اس کے لیے میں دبا دبا ہوا اور بول رہا تھا۔“

”مگر تمھارے پاس تو کوئی تصوری کئی ثبوت ہیں۔“

”کئی نہیں... کافی۔ بہت کافی ثبوت ہیں۔ مگر یہ ان لیے ہیں جو بات معقولیت سے سنتے اور سمجھتے ہیں۔ ان کے لیے جو دوسروں کی ٹانگ کھینچنے کے درپے رہتے ہیں۔ ان کے دکھانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ انھیں یہ چیز ہضم نہیں ہوتی بڑا کوئی کام کسی اور نے کیوں کر لیا... وہ کیوں نہیں کرے ڈاکٹر کا لہجہ نہ ہو گیا۔ ”میں نے کئی مرتبہ ان موٹی عقل سمجھا یا کہ میں انسان کی اکتسابی عادتوں پر نہیں... اہلیتوں کی موروثیت پر تجربہ کر رہا ہوں، جواول الذکر مختلف چیز ہے... یہ سمجھنے کے لیے انھیں اتنی ہی فہم دراز جتنی تجربہ کرنے والے کے پاس ہے۔“

”حالاں کہ تمھاری وضاحت میری سمجھ میں آئی۔“

سے آگئی۔ دونوں چیزوں میں بہت واضح فرق ہے۔

”مگر ان غیظوں میں تمھارے جتنی عقل بھی نہیں۔“ ڈاکٹر نے رورادی میں کہا۔ ”انھیں تو بس کیڑے نکالنے آتے ہیں۔ حالاں کہ جیسا کہ تم نے کہا، اس میں بہت فرق ہے۔... زمین اور آسمان کا۔ سامنے کی بات ہے کہ اگر آپ کسی چوہے کا اگلا سیدھا پاؤں کاٹ دیں اور یہ سلسلہ اس کی کئی نسلوں تک جاری رکھیں... مثلاً دس بیس پچاس نسلوں تک اس چوہے کے ہر بچے اور بچے کے بچوں کا اگلا سیدھا پاؤں کاٹتے رہیں... تو بھی کئی نسلیں ہوگا کہ اس کی آئندہ نسل بغیر اگلے سیدھے پاؤں کے پیدا ہونے لگے۔ ایسا بھی ہو ہی نہیں سکتا۔ اب اس بات کا موازنہ تم کوں کرو، کوئی ایسا پرندہ جو بہت ہی خاص قسم کا گھونٹلا ہمارا کہتا ہے اس کے آباء اجداد میں سے کسی کو صدیوں پہلے کسی نہ کسی طرح کاٹ دیا گیا ہوگا۔“

”اب سوال یہ ہے کہ جس جانداروں کی بعض اقسام ایسا کچھ کر سکتی ہیں تو دوسری اقسام کیسے کیوں نہیں کر سکتیں؟ کیا یہ عجیب نہیں لگتا کہ ککڑی جیسا چھوٹا... حقیر سا جاندار تو اپنا اگلا سیدھا پاؤں کاٹنے کی فکر کرنا صلاحیت رکھتا ہے اپنی نسل میں آگے بڑھتا رہتا ہے... مگر آدمی اپنے بچے کو محض... ریاضی میں مہارت بھی آگے منتقل کرنے پر قادر نہیں۔ لیکن میں یہ قسم تسلیم کرتا ہوں۔ یقیناً کوئی ایسا طریقہ ہوگا جسے اختیار کر کے... اس کے لیے انسان بھی اپنی حیران کن صلاحیتیں اور تجربات استعمال کر سکے۔ مجھے اپنے اس نظریے پر پورا یقین ہے اور اس طرح کی فوری دریافت بے حد ضروری ہے۔ ورنہ بنی نوع انسان کے نقصان میں روز بہ روز مسلسل اضافہ ہوتا رہے گا۔ انسانوں کا کوئی کمال محفوظ رہتا ہے نہ اگلی نسل میں پہنچ کر اس میں کوئی ترقی... کوئی اضافہ ہو پاتا ہے! ہر بچے کو سب کچھ ملتا ہے۔ شروع کرنا پڑتا ہے جہاں سے اس سے پہلے اس کے والدین یا والدین کے والدین نے کیا تھا۔ نسل در نسل ہم انسان بنے آ رہے ہیں... ہم میں سے ہر ایک پہلے اے بی سی، اے بی سی اے بی سی اے بی سی کیٹ اور بی سی اے بی سی بیٹ پڑتا ہے... اس طرح جیسے اس سے قبل یہ کی نہ نہ پڑھا ہو... کچھ نہ لکھی مضحکہ خیز صورت حال ہے یہ! حالاں کہ یہ بات سنا کر دہشت انگ کرنا اور اس جیسی دیگر آسان چیزیں کرنا آگے منتقل کرنا، اس کام کے مقابلے میں لکنا آسان کام کی کبھی اپنے ہمتے کی نہایت پیچیدہ سماجی زندگی کی خاصیتیں آگے منتقل کر کے کرتی ہے۔ میں نے ثابت کیا ہے کہ اس کا یقیناً کوئی سبب ہوگا کہ آخر وہ

وجہ کیا ہے کہ جانداروں کی بعض اقسام میں اپنی اکتسابی عادتیں آگے بڑھانے کی صلاحیت بے حد توانا ہوتی ہے... جو ممکن ہے کسی مرحلے پر چاکر جو دکھاؤ جاتا ہو... جب کہ بعض اقسام میں یہ صلاحیتیں عملاً مفقود ہوتی ہیں۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟“

”ایک ڈاکٹر کو خیال آیا کہ وہ محققین اور ناقدین کے کسی مجمع کے سامنے نہیں بلکہ اپنی بیوی کے در و دراپنی ادق تحقیق کا ماحصل بیان کر رہا ہے۔“

”ہاں... میرا خیال ہے، میری سمجھ میں آ رہا ہے۔ یہاں یہ پوچھنا بے جا نہ ہوگا کہ بعض اقسام کی مخلوقات کی جبلت اتنی پیچیدہ کیوں ہوتی ہے... اور بقیہ کی اتنی سادہ کیوں؟“

”جبلت!“ ڈاکٹر نے ہیلن کا استعمال کردہ لفظ دہرایا۔ ”لفظ جبلت میں مفہیم کا خزانہ پوشیدہ ہے... درحقیقت تم نے جو سوال کیا، اسی کا جواب جاننے کے لیے میں یہ تحقیق کر رہا ہوں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں اب تک اس کا جواب نہیں پاسکا... لیکن مجھے لگتا ہے کہ میں اس کے بہت قریب پہنچ چکا ہوں۔ تاہم اس تحقیق کے دوران کچھ اور بھی میرے سامنے آیا۔ میں نتائج ظہور میں لانے کے ذرائع تک تو پہنچ گیا... مگر وہ جوابات جاننے سے اب تک قاصر ہوں۔“ ڈاکٹر نے کام یابی اور ناکامی کا ملا جلا اظہار کیا۔ ”اب میں اس مرحلے تک پہنچ گیا ہوں کہ ثابت کر سکوں کہ جو کچھ اب تک کہتا رہا ہوں وہ درست ہے۔“

”کیا درست ہے؟“ ہیلن نے بے اختیار پوچھا۔ ڈاکٹر کے لیے سے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی بہت اہم... غیر معمولی بات بتانے والا ہے۔

”یہ کہ نسل... یعنی دودھ پلانے والے جاندار بھی اپنی کوئی صلاحیت، اپنی آئندہ نسل کو منتقل کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں! میں اس کے درجنوں تجربے کر چکا ہوں۔“

”مم... میں ٹھیک سے سمجھی نہیں۔ تم اسے کیسے ثابت کرو گے؟“

”دیکھو، اس کا سب سے آسان ذریعہ تو چوہے ہیں۔ میں نے ایک کھلونا نما چھوٹی بھول بھلیاں تیار کی اور ایک چوہے اور چوہیا کو اس میں چھوڑ دیا۔ بھول بھلیاں کے آخری سرے پر غیر وغیرہ رکھ دیا۔ چوہے اور چوہیا کو اس پیڑ تک پہنچنے کے لیے اپنا راستہ تلاش کرنا تھا۔ ابتدا میں میں نے ان کے لیے آسان بھول بھلیاں بنائی جو یہ تدریج مشکل بناتا گیا۔ جوں ہی چوہا اور چوہیا ایک بھول بھلیاں کے عادی ہو جاتے اور اپنی غذا تک کوئی ایک موڑ بھی غلط مزے بغیر پہنچ جاتے، میں بھول

بھلیاں تبدیل کر دیتا... اور اگلی بار ڈراما مشکل! پھر میں نے ان کا کچھ علاج کیا اور دونوں کا جوڑا لگا دیا۔

”جب ان کے بچے چند ہفتوں کے ہو گئے تو میں نے انھیں کچھ وقت بھوکا رکھا اور پھر انھیں باری باری اس بھول بھلیاں کے داخلی راستے پر رکھ دیا جس کے دوسرے سرے پر خوراک تھی... اور اسی بھول بھلیاں میں ان کے والدین بغیر کوئی غلط موڑ مڑے، پہلے ہی اپنی غذا تک کامیابی سے پہنچنے کا مظاہرہ کر سکتے تھے۔ اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے... ڈاکٹر نے خوشی سے معمور آواز میں کہا۔ ”کہ وہ بچے باری باری، پہلی ہی مرتبہ میں ایک بھی غلط موڑ مڑے بغیر براہ راست غذا تک پہنچ گئے۔ لگتا تھا وہ راستے سے پہنچنے آگاہ ہیں... حالاں کہ وہ پہلی بار اس بھول بھلیاں میں چھوڑے گئے تھے۔

”پھر میں نے ان بچوں کے ذرا اور بڑا ہونے پر نراور مادہ کا جوڑا لگایا۔ ان سے جو بچے ہوئے، وہ بھی بھول بھلیاں میں چھوڑے جانے پر پہلی بار میں اپنی اپنی غذا تک پہنچ گئے۔ کوئی ایک موڑ بھی غلط مڑے بغیر! تم جانتی ہو اس کا کیا مطلب ہے؟“

”ہیلن نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔ ”تم نے کہا... کہ تم نے پہلے والے چوہے اور چوہیا کا علاج کیا تھا۔ یہ علاج کیا تھا؟“

”میں سمجھتا ہوں کہ اس کی تفصیلات تمہارے سر کے اوپر سے گزر جائیں گی اور ویسے بھی فی الحال یہ راز، راز ہی رہے تو اچھا ہے۔ اور تمہیں معلوم ہے جو بات راز رکھنی ہو وہ ہر ایک سے راز رکھنی چاہیے۔ تاہم یہ بتا سکتا ہوں کہ اس کا طریق کار بہت آسان ہے۔ اس کا براہ راست انجکشن بھی لگایا جاسکتا ہے اور اسے غذا کے ذریعے بھی دیا جاسکتا ہے۔

”اگر اسے کسی انسان پر استعمال کیا جائے تو اس شخص کی اولاد کو دوسرے بچوں کی طرح سب کچھ شروع سے نہیں سیکھنا پڑے گا۔ وہ پیدا ہی ہو کر گندہ نسل کی اہلیت اور اوصاف سے متصف ہوگا۔ ذرا کسی ایسے بچے کی پیدائش کا اندازہ تو لگاؤ! اسے کتنی چیزوں پر وقت ضائع نہیں کرنا پڑے گا۔ چار برسوں پر محیط ابتدائی تربیت و معلومات کے حصول میں اسے سرنہیں کھانا پڑے گا۔ یہ سب کچھ پہلے ہی سے اس کے اندر محفوظ ہوگا۔ وہ پیدا ہوتے ہی پڑھنے پر قادر ہوگا... یا زیادہ سے زیادہ اس وقت جب اسے اپنی آنکھوں کے استعمال پر قدرت حاصل ہو جائے گی۔ زبان پر قابو پاتے ہی وہ بولنا شروع کر دے گا... اور گلتا بھی۔ ذرا سوچو، جب وہ پیدائش

طور پر اتنی منازل طے کر چکا ہوگا تو بڑا ہو کر کہاں تک پڑ کرے گا! ابتدائی چند برس میں ہی وہ آنکھوں سے فارغ ہو جائے گا۔ نو یا دس برس کی عمر تک بیوریٹی سے منٹ جائے گا۔ وہ... وہ... بچہ ہوگا... بچہ ہوگا... ایسے کسی بچے کی موجودگی کی صورت میں، انسانی اہلیت کی موروثیت کے تبادلے کے حوالے سے تمام خلک و شبہات دھل جائیں گے۔“

اس نے ذرا توقف کیا پھر اپنی بیوی کو دیکھا۔ وہ بھی منہ کھولے اسی طرف نگہ داری۔

ڈاکٹر نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”یہ قتل از وقت کہنا مشکل ہے کہ کتنی معلومات اعلیٰ نسل میں منتقل ہوئی۔ اس حقیقت کا پتہ لگانا چند دل چسپ حقائق میں سے ایک ہے۔ اور یہ کہ خواہیدہ صلاحیتوں کی شکل میں منتقل ہونے والی باتیں اس سے اگلی نسل میں منتقل ہوں گی یا نہیں، اس بارے میں میں بے یقین نہیں لیکن آگے منتقل ہو سکتی ہیں۔ یہ ناممکن نہیں ہے کہ وہ خود کو اوسط تعلیم کی حد تک ہی صلاحیتوں سے ہی متصف پائے موروثی طور پر۔“

”ہاں، واقعی!“ ہیلن بالکل اچانک بیوی کی طرف سے بھی ممکن ہے کہ وہ کسی مخصوص سگریٹ یا شراب کا عادی ہو جائے۔ کسی خاص سیاسی نظریات کا حامل! ڈاکٹر سالوے پلٹیں جھپک کر رہ گیا۔

”کیوں، ایسا نہیں ہو سکتا؟“ ہیلن نے پوچھا۔

”تمہارے پاس ایسا کوئی طریقہ ہے کہ تم اس کا انتخاب کر سکو کہ چیز آگے منتقل ہونی چاہیے یا نہ! کیا نہیں؟“

ڈاکٹر اسے گھور کر دیکھا۔ ”کچھ توقف کے بعد بولا۔ ”اس میں واقعی احتیاط کی ضرورت ہے۔“ اس نے تسلیم کیا۔ ”میرا خیال ہے کہ اگر زیر علاج شخص کسی خاص نسل کے مطابق صلاحیتیں ہی آگے منتقل کرنی چاہے اور... جیسا کہ میں نے کہا کہ ایسا خواہیدہ صلاحیتوں کی صورت میں...“

”تمہارا خیال ہے!“ ہیلن نے اس کی بات کاٹ کر طنزیہ انداز میں اس کی بات دہرائی۔ ”سالوے، تم نے اسے موروثیت کے تجربے سے متعلق آج تک ایک لفظ بھی ضروری طور پر کسی سے نہیں کہا۔ اور اب... اب میں اپنے آپ میں کچھ سوال محسوس کر رہی ہوں... اور ان کا جواب نہیں دے رہی ہوں۔ بالکل کلی اور قطعی طور پر نہیں!“

ڈاکٹر سالوے ایک بار پھر پلٹیں جھپک کر رہا۔ ”مم... مائی ڈیر! میں سمجھتا ہوں، تم کیا کہہ رہی ہو؟“

”ہم تو سالوے! تمہارا کیا خیال ہے کہ اسے

تمہارے ساتھ رہ کر میں نے جھک مارا ہے اور تمہیں بالکل نہیں سمجھتی ہوں؟ میں تمہیں اور تمہاری تحقیق کو خوب سمجھ رہی ہوں۔ بہت گھٹناؤں کی اور دہشت ناک بات ہے میرے نزدیک۔ کوئی بھی شخص جو اپنی بیوی کا احترام کرنا نہ ہو، اس بارے میں کبھی سوچ ہی نہیں سکتا۔ مجھے حیرت ہے کہ تمہیں ایسا سوچتے ہوئے خود پر شرم نہیں آتی!“

”مم... مگر مائی ڈیر! ابھی تو میں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ میں تو صرف یہ...“

”تم نے ابھی نہیں کہا... مگر مزید پانچ دس منٹ کے بعد تمہارا کمر کھٹکے گا۔ لیکن کہتے ضرور۔ میں نے زندگی میں کبھی ایسی کرنا نہیں سنی۔ تم مجھ پر... اپنی بیوی کو، معمولی کیڑوں اور چوہوں کی حیثیت دے کر، اس پر ہر کرنا چاہ رہے ہو! میرا خیال ہے کہ اب مجھے بھی تمہاری لہاری میں کسی پتھرے میں بند ہو کر رہنا چاہیے، دوسری قابل ہر اشیاء کی طرح! افسوس کی بات ہے!“

”دیکھو ہیلن... اسے اتنی جھجک سے مت لو۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں واقعی تم سے یہ سب کہنے والا تھا۔ دنیا میں غیر معمولی شہرت اور عزت کے لیے غیر معمولی قدم ہی اٹھانے پڑتے ہیں۔ اور اس شہرت اور عزت میں تم بھی میری برابر کھڑی ہو رہی۔ اور ایسا صرف میری... ڈاکٹر سالوے کی بیوی نے ہی نہیں کیا ہوگا بلکہ... اس غیر معمولی نوعیت کے بچے کی ناکامی کی وجہ سے ہوگا! میرا خیال ہے کہ اس کے لیے اگر محسوس ہوتا ہے کہ وہ توبہ جانے ہوگا۔ مم... میرا خیال ہے...“

”غوب!“ ہیلن زہر خند سے بولی۔ ”اگر تم اب تک نہیں کہو تو اب جان لو کہ میں اس بارے میں کیا سوچتی ہوں۔ یہ بات اہل علم اور گھٹاؤنا... اور شرم ناک خیال ہے۔ آج میں مارسل نے مجھے بتایا کہ لوگ کہتے ہیں کہ تمہارا دماغ کاٹا ہے۔ اور اب تمہاری سوچ سے آگاہ ہونے کے بعد میں یہ کہہ دوں گا کہ وہ لوگ غلط نہیں کہتے۔“

”مارسل نے کیا؟“ سالوے نے ہیلن کو گھورا۔

”مارسل ان سے متفق نہیں۔ وہ تمہارے تجربات سے متاثر نہیں۔ عظیم آدمی قرار دیتا ہے۔ لیکن تمہارا یہ آئیڈیالز اس بارے میں کیا خیال کرے گا، مجھے نہیں معلوم۔“

”آئیڈیالز ایسا بھی ہو... لیکن جب تک تم اسے نہیں بتاؤ گی، وہ اس کو نہیں سمجھتا۔ بات صرف ہمارے درمیان ہے۔“

”ہمارے ہی درمیان ہوئی ہے۔ لیکن ذرا تم بتاؤ گے

ازدواجیات

شوہر: مجھے لگتا ہے کہ ہمارے ذہن بچے نے دماغ میرا پایا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟

بیوی: مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے، کیوں کہ میرا چاند دماغ تو میرے ہی پاس ہے۔

”تمہاری پہلی شادی کے اختتام کی وجہ؟“

”شریک حیات کی وفات۔“

”کس شریک حیات کی؟“

تھانکس ڈاکٹر احمد نصیر

کہ اگر تم کسی سے محبت کا ڈھونڈ کرتے ہو، اس کی عزت و احترام کے محافظ ہو اور پھر اچانک اسے اپنی تجربہ گاہ کے جانوروں کی حیثیت دے کر اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک شروع کر دو، تو اس کی کیا حالت ہوگی... کیا رد عمل ہوگا؟“

”مم... میں نے نہیں کہا کہ رہا تھا۔ میں مارسل کے علم میں آنے کی بات کر رہا تھا۔ میرا مطلب ہے، اس کے علم میں نہ آنے کا کہہ رہا تھا۔ نہ جانے وہ... بہر حال، دیکھو، ہیلن! مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ بات تمہیں اتنا اپ سیٹ کر دے گی۔ میرا خیال تھا کہ دنیا میں ہلکے چمادینے والی اس دریافت میں حصے دار بننے کا موقع ملے پر تم... خیر... معاملہ اس طرح نہیں جیسے تم اسے دیکھ رہی ہو۔“

”ہاں ہاں، یہ ایسا نہیں بلکہ...“

”ہاں، ہاں، تم کہہ چکی ہو۔ میں تمہارا نکتہ نظر سمجھ گیا۔ میں اپنا تجربہ جاری رکھوں گا۔ تم اس میں حصہ نہیں لینا چاہتیں تو نہ سہی۔ اب مزید کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں۔“

”کہنے کو ابھی بہت کچھ ہے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ...“

”مائی ڈیر! میں تمہیں کہہ چکا ہوں کہ میرا مقصد تمہیں اپ سیٹ کرنا ہرگز نہیں تھا۔“ ڈاکٹر نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں تم سے واقعی شرمندہ ہوں۔ میں نے تمہارے حوالے سے سوچ کر غلطی کی تھی۔ اب ہمیں اس غلطی کو بھول جانا چاہیے، کیا خیال ہے؟“

”مجھ میں نہیں آتا۔“ ہیلن بولی۔ ”یہ غلطی تم سے ہوئی ہی نہیں چاہیے تھی۔ اسے بھلانا آسان نہیں ہے میرے لیے۔ مگر تم کیوں کہ ایک مرد ہوتا... اس لیے تم سمجھ ہی نہیں سکتے

میرے جذبات۔ اگر تم عورت ہوئے۔“
 ”اگر میں عورت ہوتا۔“ ڈاکٹر کے بولنے پر ایک بار پھر اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ ”تو ایسا کچھ ہوتا ہی نہیں۔ اور نہ ہی ہم دونوں ساتھ ہوتے۔“

”مجھے بولنے دو۔ بہر حال، پھر بھی۔“
 ”بس تم سمجھو کہ میں نے کچھ کہا ہی نہیں۔“
 ”میں... پوری کوشش کروں گی۔“

کچھ دیر بعد جب ڈاکٹر بیڈ پر لیٹا تو ہیلن بولی۔ ”مارسل کا خیال ہے کہ تم اسے نکالنے کا فیصلہ کر چکے ہو۔“
 ”مارسل کا خیال بالکل درست ہے۔“

”میرا خیال ہے، مارسل ان تمام لوگوں سے بہت بہتر ہے جنہیں تم آج تک اپنا اسسٹنٹ رکھتے رہے ہو۔ تم ذرا سی بحث کرنے پر اس سے ناراض ہو گئے۔“

”یہ بات نہیں ہے۔ میں نے مارسل کو اپنی مدد کے لیے ملازم رکھا ہے۔ نہ کہ اس لیے کہ وہ مجھے ہدایات دے۔ ہم ایک ایسے مقام پر پہنچ چکے ہیں جہاں ہمارے درمیان بنیادی پالیسی پر اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس صورت میں ہمارا مزید اگے ساتھ چلنا ناممکن ہے۔ اگر اس نے یہ اختلاف دور نہ کیا تو میں اس سے کہہ دوں گا کہ مینیجے آختر نک اپنا پور یا بستر باندھ لے۔“
 ”دھکی بات ہے۔ تمہیں اس کے کام سے تو کوئی شکایت نہیں ہے نا؟“

”بالکل نہیں۔ وہ بہت سمجھ دار آدمی ہے۔ اور وہ بہت کام کا ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر بنیادی پالیسی کے معاملات میں مداخلت کیے بغیر، اپنے کام سے کام رکھے۔ مگر اب میں اسے مزید نہیں رکھ سکتا۔ کیوں کہ وہ پاؤں لانے والا نہیں۔“

میرا دھم ہونے پر مارسل واپس چلا گیا۔ وہ اپنے وطن لوٹنے ہوئے بہت خوش تھا۔ کیوں کہ اسے انگریزی بولنے، سننے، سمجھنے اور پڑھنے سے نجات مل رہی تھی۔ اسے اس زبان میں اظہار رائے کرنے اور سمجھنے میں بے حد وقت پیش آتی تھی۔ پھر اسے یہاں کا موسم بھی سخت ناپسند تھا۔ اور چائے اور کھانے بھی۔ پھر بھی نہ جانے وہ یہاں کیسے رہ رہا تھا۔

کھانوں کی تو اس نے باقاعدہ شکایت کی تھی ہیلن سے۔ اُس کی اس بات سے ہیلن بھی متفق تھی کہ کھانوں میں ان دنوں وہ ڈانٹے نہیں رہ گئے تھے جواب سے کچھ عرصے پہلے تک تھے۔ ایسا شاید ہی کب کے آنے کے بعد سے ہوا تھا۔ پچھلا لگ اچانک

ملازمت چھوڑ گیا تھا جب ڈاکٹر سالوے نے بڑی کوششوں کے بعد یہ نئی کھانا تلاش کی تھی۔ اس دوران میں جتنے دن انھوں نے بغیر لگ کے گزارے وہ خاصے مشکل ثابت ہوئے تھے۔
 مارسل کی کبھی ہوئی یہ باتیں ہیلن نے ڈاکٹر سالوے کو بتائی نہیں س جو آخری دن اس سے ہوئی تھیں۔

”میں تو اسے ناشکرا اپن کہوں گا۔“ ڈاکٹر سالوے نے غصہ بنا کر کہا۔ ”اسے ہیشے بھانے اچھا کھانے کو مل رہا تھا نا، اس لیے بہت ختم ہو گئے تھے۔ گھٹیا فرائیسی کھانے کھانے والوں کے منہ سے تو یہ بات بھی نازیبا لگتی ہے۔“

”کھانوں میں بے لذتی تو میں بھی محسوس کر رہی ہوں سالوے۔“ ہیلن بولی۔ ”ابتداء میں تو اس نے بہت اچھے کھانے پکائے۔ شاید میں متاثر کر کے اپنی توکری بلی کرنے کے لیے۔ مگر اب... بہر حال، میں خود جائزہ لوں گی کہ وہ کیا کر رہی ہے۔“

”بالکل نہیں۔“ ڈاکٹر سالوے نے شدت سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”کوئی ضرورت نہیں اس سے کچھ کہنے سننے کی۔ تو اس کے کھانوں میں کوئی خامی نظر نہیں آتی۔“
 ”پھر بھی روک ٹوک اور سرزنش ضروری ہوتی ہے۔“

بات کروں گی۔“
 ”میں نے کہا نا تم ایسا کچھ نہیں کرو گی۔ تمہیں پتا ہے کتنی مشکل سے لگ کا انتظام ہوا ہے۔ تمہاری باتوں سے کہیں وہ چھوڑ کر نہ چلی جائے۔ اچھے لگ مشکل سے ملتے ہیں۔“

”سالوے، یہ میرا شعبہ ہے۔ تم اس میں مداخلت نہ کرو اچھا ہے۔“
 ”بالکل یہ تمہارا شعبہ ہے۔ بس یہ ذہن میں رکھو کہ یہ لگ لوگ بہت حساس اور زور درج ہوتے ہیں۔“

اس بات کے کوئی ہفتہ بھر بعد ہیلن کو علم ہوا کہ وہ امید ہے۔ ایک صبح وہ سو کر اٹھی تو ایک عجیب بلرزادینے والا خیال اس کے ذہن میں آیا۔ اس خیال کے آنے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں تھی۔ یہ علی الصباح کا وقت تھا اور اس کی آنکھ ابھی کھلی ہی تھی مگر یہ خیال کچھ اس طور اس کے ذہن میں راسخ ہوا کہ اس کے نیم خوابیدہ ذہن سے خوابیدگی لمحوں میں کا فور ہو گئی۔ لگتا تھا قدرت نے اس کے ذہن میں یہ سوچ ڈالی ہے۔ اپنی آنکھ کھلا کر کیفیت پر وہ خود بھی حیران تھی۔ پھر جوں جوں وہ اس پر غور کر گئی، اسے یقین ہوتا چلا گیا کہ یہ محض خیال نہیں، قدرت کی طرف سے اس کی رہنمائی ہے۔ پہلے تو اس نے خود کو خوف

کی کیفیت میں پایا۔ پھر رفتہ رفتہ یہ خوف اشتعال میں ڈھل گیا۔ اس اشتعال کے عالم میں وہ پلٹی اور برابر میں سوتے شوہر کی ہر طرح جھنجھوڑ ڈالا۔

”دھوکے باز... گھٹیا آدمی!“ غصے کی شدت سے اسے بالکل مشکل ہو رہا تھا۔ ”میں اتنی گری ہوئی حرکت کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتی تھی!“

ڈاکٹر ہلر برا کر جاگا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ ہی کے غصے نے اس کا غماز دور کر دیا۔ وہ بھی ہیلن کو گھورنے لگا، بولا۔ ”تم ہوش میں تو ہو! یہ طریقہ ہے کسی سوتے آدمی کی آدمی کو جگانے کا۔“

”میں ہوش میں...؟ خوب! میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم اس کی ایدہ کرو گے۔“

”تردید! کس کی تردید؟“ ڈاکٹر سالوے نے پوچھا۔
 ”اچھا! تو اب یہ بھی مجھے بتانا ہوگا! دیکھو، تم یہ اچھا نہیں کر رہے ہو۔ اور تم نے جھوٹ کا مہار لیا نا مجھے فوراً معلوم کرنا چاہیے گا۔“

”خدا کے لیے! کچھ بناؤ تو سہی، ہو کیا ہے؟“
 ”تمہیں سب پتا ہے۔ کھانوں کے معاملے میں لگ کا...“
 ”اچھا! وہ بالکل صحیح کھانے پرکاری ہے۔ تم کچھ کاری کرنا چاہتے ہو کھانوں کے ساتھ...“ علاج کے نام پر۔ تمہاری خواہشات پوری کرنے کے لیے اس حد تک کر جاؤ۔ اتنی کینٹینی پر اس کے، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ تمہیں کھانا کھانے میں تمہاری تحقیق کے بارے میں کیا سوچتی ہوں۔ شہر چلانے کے بعد تم نے یہ ذلات اختیار کی۔ تم نے اپنی مرضی کے خلاف میرا استعمال جاری رکھا۔ علاج کے نام لے کر ہانے کیا کیا مجھے کھلاتے رہے اور کھانوں کے بد مزہ ہونے اور ام بے چاری لگ پر لگتا رہا۔“

”مم... میں نے کبھی اسے الزام نہیں دیا۔ میں نے کہا تھا۔“
 ”مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سنئی۔ تمہاری مجال کیسے ہوئی؟“
 ”میانہ تجربات کے لیے مجھے استعمال کرنے کی! اوہ...“
 ”تمہارے اپنے بے حیثیت ہونے کا احساس ہو رہا ہے۔“

ڈاکٹر سالوے بولا تو اس کا لہجہ شکست خوردہ تھا۔ اس نے اپنا حال ٹھنڈا کرنے کے لیے منافقت سے کام لیا۔ ”ٹھیک! میں اعتراف کرتا ہوں، میں نے غلط کیا۔ لیکن ایسا صرف اس کے ساتھ نہیں کیا، اپنے ساتھ بھی کیا۔ اسے دھیان نہ دیا۔“
 ”کہنا محض جذباتیت ہے۔ یہ انتہائی اہم نوعیت کا تجربہ

ہے۔ اس کے نتائج ہی نوع انسان کو ایک ہی جست میں کہیں سے کہیں پہنچا دیں گے۔“

”مجھے کسی جست سے کوئی غرض نہیں۔“ ہیلن کے غصے میں بالکل کی نہیں آئی تھی۔ ”مجھے صرف خود سے اور اپنے بچے سے غرض ہے۔ تم میرے احساسات سے بخوبی آگاہ تھے۔ مگر تم نے ان کی ذرہ برابر پروا نہ کی۔ بس خود غرضانہ بے حس سے اپنا کام کرتے رہے۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں۔ مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تمہارے نزدیک میری اہمیت کیا ہے۔ اب ہمارے درمیان کچھ نہیں بچا۔ ہماری راہیں اب جدا ہیں۔ میں تمہیں چھوڑ جاؤں گی۔ میں طلاق لوں گی۔“

”آہا! ڈاکٹر سالوے کے منہ سے نکلا۔“
 ”اس آہا تمہارا کیا مطلب ہے؟“

”میں پلٹنی کے متعلق سوچ رہا تھا۔ طلاق کے مطالبے سے لوگوں میں اس تجربے کے نتائج کے حوالے سے دل چسپی کئی گنا بڑھ جائے گی۔“

وہ اسے بے یقینی سے دیکھتی رہ گئی۔ ”کتنے شفاک ہو تم! ٹھیک ہے۔ ممکن ہے کوئی قانونی رکاوٹ طلاق میں مانع ہو۔ اگر بیوی کے ساتھ تجربہ گاہ کے کسی جانور کی طرح کا سا سلوک کیے جانے کی بنیاد پر طلاق ملنے میں کوئی رکاوٹ ہے تو ہوا کرے۔ لیکن اس کے باوجود میں تمہارے ساتھ نہیں رہوں گی۔ میں جاؤں گی اور اپنے ساتھ بچوں کو بھی لے کر جاؤں گی۔ کیا پتا میرے پیچھے تم ان پر کیا جرات کرو۔ اب میں تمہارے ساتھ ایک دن کی ایک چھت سے نہیں گزار سکتی۔“

اپنے مصمم ارادے کے باوجود ہیلن اپنے کپے پر عمل نہ کر سکی۔ کئی مسائل تھے جو اس کے جانے کی راہ میں حائل تھے۔ سب سے بڑا مسئلہ تو یہ تھا کہ کہاں جائے۔ پھر بچوں کے اسکول کا مسئلہ! چیزوں کی پیکنگ تھی... اور پھر ہاتھ میں رقم نہ ہونے کی رکاوٹ۔ اس کے علاوہ بھی۔ ادھر ادھر کی باتوں کے سبب اس نے روانگی اگلے ہفتے تک کے لیے ملتوی کر دی۔ چنانچہ وہ صرف اتنا ہی کر پائی کہ اس نے اپنا بیڈ روم بدل لیا۔ روانگی کے انتظامات ہونے تک اب اسے وہیں رہنا تھا۔

بظاہر جو فیصلہ بہت سادہ و آسان لگ رہا تھا، عملی طور پر اس کی پیچیدگیوں نے اسے مشکل بنادیا تھا۔ کچھ دن مزید گزرے تو اسے اندازہ ہوا کہ مقررہ میعاد میں بھی وہ یہاں سے جانے کے قابل نہیں ہو پائے گی۔ سب سے بڑا مسئلہ اب ہونے والے بچے کے حوالے سے تھا۔ اس نے فیصلے میں تبدیلی کرتے

ہوئے، اس بچے کے دنیا میں آنے تک ہمیں رہنے کا پروگرام بنایا اور دوبارہ اپنے بیدار موم میں شفت ہوگئی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ڈاکٹر سالوے کے لیے اس کے روپے میں کوئی لچک آئی ہو۔ اس نے ڈاکٹر سالوے کا سامان دوسرے بیدار موم میں شفت کرادیا۔ وہ اس کی بددیانتی، بے ایمانی اور دھوکے بازی کے بعد اب اس پر بالکل اعتبار نہیں کر سکتی تھی۔ اس ناقابل معافی عمل کے بعد وہ اسے کوئی موقع نہیں دے سکتی تھی۔ اور جس رشتے کے مابین اعتبار اور اعتماد ہی نہ رہ جائے پھر اس رشتے کی حقیقت ہی کیا! ڈاکٹر نے اس کے اعتبار کو ٹھیس پہنچا کر، اس کے بھروسے کو توڑ دیا۔ اصل اس رشتے کی بنیاد پر ضرب لگائی تھی۔ جسے اپنے پیشروانہ مستقبل کی اونچی عمارت کی بنیاد مضبوط رکھنے کے لیے یہ نہایت گھناؤنا عمل تھا اور یقیناً ہر روز نہایت صدق دل سے یہ دعا کرتی تھی کہ ڈاکٹر کا تجربہ ناکام ہو اور اسے مایوسی اور نامرادی کے سوا کچھ نہ ملے۔

اپنے مقررہ وقت پر یقین کرنا بچہ دنیا میں آگیا۔ جب ہمیں نرسنگ ہوم لے جانی جارہی تھی، شکوک و شبہات نے اسے پریشان کیا ہوا تھا۔ نت نئے دوسرے ایک کے بعد ایک اس کے دل میں آ رہے تھے۔ ہر چند کہ اس نے ان شکوک و شبہات اور دوسروں کو ڈاکٹر سالوے پر بالکل ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ اس کے سامنے وہ ہمیشہ اعتماد اور بے یقین نظر آنے کی کوشش کرتی کہ جو کچھ بھی ہوگا، معمول کے مطابق ہوگا اور معمول کے خلاف کچھ بھی نہیں ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ بچے کے گرہر آئی تو ایک فاتحانہ احساس بھی اس کے ساتھ تھا۔ گھر آنے کے بعد اس نے ڈاکٹر کی باقی ماندہ امیدوں پر بھی پانی پھیرنے میں ڈر نہیں لگائی۔

”آخر کار تمہارے سارے احمقانہ نظریات دھرے رہ گئے۔ سراب کا پیچھا کرتے کرتے تم وہ بھی کٹوا بیٹھے جو تمہارے پاس تھا۔ میرا خوب صورت بچہ بالکل نازل ہے۔ میں نے ایک بڑے ڈاکٹر سے اس کا خصوصی معائنہ کرایا تھا۔ اس نے اطمینان کرنے کے بعد بتایا کہ بچہ بالکل نازل ہے۔ بالکل نازل، ہر لحاظ سے۔“

ڈاکٹر سالوے نے ہمیں کی گود میں موجود بچے کو دیکھا۔ پھر جیسے کچھ کہنے کو مٹھ کھولا مگر بعد میں ارادہ بدل دیا۔ وہ ہمیں کے قریب گیا اور نو زائیدہ بچے کے ننھے ننھے نازک نقوش پر غور کیا۔ اسے بھی یہ بچہ دیکر عام بچوں جیسا ہی لگا۔ اس میں کوئی

مختلف یا غیر معمولی بات نہ تھی۔ رفتہ رفتہ کھلی صورت حال معمول پر آتی گئی۔ نئے نئے گھر میں اپنی جگہ بنائی۔ ڈاکٹر سالوے کی امیدیں ہرگز رتے دن کے ساتھ کم سے کم ہوتی جارہی تھیں۔ تاہم وہ انھیں زندہ رکھنے کی شدید اور کوششیں کر رہا تھا۔ وہ دن میں کئی مرتبہ بچے کا بغور جائزہ لیتا۔ اس کی عادات اور حرکات و سکنات کا نہایت گہری نظر دل سے مشاہدہ کرتا۔

ہمیں ابتدا میں تو اس کے یہ معمولات برداشت کرتی رہی پھر پھٹ پڑی۔ ”یہ تم کیا بچے کو بار بار ٹوٹتے رہتے ہو۔ اس سے بچہ پریشان ہوتا ہے اور زرد ہو جاتا ہے۔“ اس نے لکھا بے رحمی سے کہا۔ ”بچہ خوف زدہ اور بے چین ہوتا ہے۔ خود کو اس کی جگہ رکھ کر سوچو، اگر تم اس کے جتنے ہوتے اور کوئی بڑا کھر درآچہ تم پر دن میں کئی مرتبہ دیر تک جھکا، تمہیں کد رہتا تو تم پر کیا گزرتی۔ یہ بچے کے ساتھ ظلم ہے۔“

ہمیں کے ٹوکنے سے یہ بچہ ڈاکٹر سالوے کے پاس ٹکنا اور ٹوٹنا کم کر دیا۔ پھر ہمیں نے بھی بچے کو ڈاکٹر سالوے سے بچانا شروع کر دیا۔ اب بچے سے اس کا سامنا کم ہوتا۔ کم و بیش پندرہ دن میں ایک دفعہ۔ ایک دن ڈاکٹر سالوے نے محسوس کیا کہ ہمیں نہایت لگ رہی ہے۔ ساتھ ہی اسے خیال آیا کہ کچھ دنوں سے وہ معمولی طور پر خاموش ہو گئی ہے۔ اس کے دیگر رویوں میں نمایاں تبدیلی محسوس ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر سالوے کے اس میں ایک شبہ سایہ ابھرا اور اس کے پورے وجود کو اپنے اندر میں لے لیا۔

پندرہ دن پورے ہوئے تو ڈاکٹر سالوے نے بچے کو دیکھا۔ ”یہ تم بچے کو کچھ زیادہ ہی نہیں چھپانے لگی ہو۔ تم ڈاکٹر نے اپنی بیوی سے کہا۔ اس کے سوال کے جلو میں اس کے طوفان تھے تاہم اس نے انھیں مصنوعی اطمینان کے میں چھپایا ہوا تھا۔

”چھپانے لگی ہوں!“ ہمیں نے دہرایا۔ ”یہ بات کر رہے ہو۔ میں بس یہ چاہتی ہوں کہ بچہ نہ ہو۔ اور جب تک کوئی اسے خواہ مخواہ نہ گھورے اسے کرے، یہ خوش رہتا ہے۔ یہ بہت حساس ہے۔ پریشان ہو جاتا ہے۔“

”یہ میرے سوال کا کوئی معقول جواب نہیں دے رہا۔“

”اچھا! تو پھر تم ہی بتاؤ کہ کیا جواب ہونا چاہیے۔“

”میں بتاؤں؟ ٹھیک ہے، میں ہی وضاحت کر دیتا ہوں۔ میں یہ اندازہ لگا پایا ہوں کہ تم نہیں چاہتیں کہ میں بچے سے بار بار ملوں۔ تمہاری خواہش یہ ہے کہ میں بس کچھ بھر بچے کی ایک جھلک دیکھ لیا کروں اور بس۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ ایسا اس لیے ہے مائی ڈیزر کہ تم نہیں چاہتیں کہ میں وہ علاقے دیکھ سکوں جن سے مجھے یقین آجائے کہ میرا تجربہ بالکل ناکام نہیں رہا ہے۔ بلکہ وہ کیا میں لکھ رہا ہوں۔“

”کیا فضول بات ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں لکھ رہی ہوں کہ بڑے ڈاکٹر نے کیا کیا تھا۔ اس نے بچے کو ہر لحاظ سے نازل قرار دیا۔“

”آہ! مجھے یاد ہے۔ مگر یہ بات پہلے کی ہے مائی! بعض اوقات معمول سے بھی کوئی کوئی بات فوری طور پر سامنے نہیں آتی۔ اس کے لیے یا تو انتظار کرنا پڑتا ہے یا اس تبدیلی کو کرید کر، احساس دلا کر کوئی کارنامہ پڑتا ہے۔ تم کد رہی ہونا؟“

”تم... تم احمقانہ اور ناقابل یقین باتیں کر رہے ہو، وہ بالکل نازل، بہت پیارا اور خوش باش بچہ ہے۔“

”میں نے تم سے کہا تھا کہ وہ بہت حساس بچہ ہے اور جلد اپنی بات کہتا ہے۔“

”ہاں، میں اسے مطلب یہ تھا کہ اسے بہت آسانی سے اپنا کہا جاسکتا ہے۔ چنانچہ بہتر یہی ہے کہ اسے ڈسٹر بن جائے۔“

”ہر حال، میں اس کی ایک جھلک دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”میرا خیال ہے کہ ابھی ایسا مت کرو۔ وہ ابھی

”میں مجھے اس سے دور رکھنا چاہتی ہو، مجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے۔ میں تمہیں بتا دوں کہ اس طرح وہ اور کتنا ہی طرح مناسب نہیں کہا جاسکتا۔ یہ کہ تم... بلکہ یقیناً کو اور پختہ کر رہی ہو اور نہ اور کیا وجہ ہے ہر حال، مجھے بچہ دیکھنا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ بچے کے پاس پہنچا۔

”اے مائی! میں نے تمہیں بھینچ رہی۔“

”اس سالوے کا مصنوعی اطمینان اب بے صبری میں تھا۔ اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ ہمیں کے

روئے اور اس کی حالت نے سالوے کو بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ پھر اب، بچے سے ملنے کی راہ میں مزاحم ہونے نے تو سب کچھ جیسے واضح کر دیا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ تجربہ مکمل طور پر ناکام نہیں رہا تھا۔ ہاں، یہ ضرور تھا کہ کام یابی کی حدود اور تناسب کا یقین باقی تھا۔ اور یہ بچے کو دیکھنے، جائزہ لینے اور پرکھنے کے بعد ہی کیا جاسکتا تھا۔ اسی پر اس بات کا انحصار تھا کہ وہ اس تجربے کے نتائج کے ساتھ اپنے ساتھیوں اور ناقدین کا سامنا کر سکتا ہے یا نہیں۔ اسے نظریات کے تجربے کا ثبوت وہ اپنے بیٹے کی شکل میں پیش کرتا!

وہ دھڑکتے دل سے بید کے ساتھ، زمین پر کھٹکوں کے بل بیٹھ گیا۔ بے چین و بے سکون ہمیں بھی اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئی تھی۔ بچہ جاگ رہا تھا۔ وہ سیدھا لیٹا، بچوں ہی کی طرح غول غاں کر رہا تھا۔ اس کی شفاف نیلی آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں۔ انھیں اسے قریب آتا دیکھ کر وہ اُن کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ نیلی آنکھیں اب سالوے کی جانب متوجہ تھیں۔ سالوے کو دیکھ کر بچہ مسکرایا پھر اس نے اپنا سر تکیے پر ادھر ادھر رگڑا گویا مال کو ڈھونڈ رہا ہو۔ اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی اور پھر غائب ہوگئی۔ ننھے ننھے لب و لہو اسے پھر بند ہو گئے۔ بچانے سے ڈاکٹر سالوے کا برا حال تھا۔ ڈاکٹر سالوے کو پورا پورا یقین تھا کہ بچہ بولنے کی کوشش کر رہا ہے۔

وہ جھکا اور اپنا کان بچے کے منہ کے نزدیک تر لے گیا۔ اس کی کوشش تھی کہ اگر بچے کے منہ سے کوئی بے معنی آواز بھی نکلے تو اسے بہ خوبی سُن سکے۔ ہمیں اس کے قریب، دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے، عجیب ملتجیانہ سے انداز میں کھڑی تھی۔

”ماما... بچے کے منہ سے نکلا۔ اس کے ننھے ننھے نازک سے لب کھلے اور پھر بند ہو گئے۔ ڈاکٹر سالوے کا یہ خیال سو فیصد درست تھا کہ وہ بولنے کی کوشش کر رہا ہے۔ بچے کا منہ ایک بار پھر کھلا۔ بچے نے اپنی، ننھے کچھ جیسی آنکھوں سے اپنی ماں کی طرف مشتاقانہ انداز میں دیکھا۔ ہونٹ بند ہو کر دوبارہ وا ہوئے۔ غالباً دانت نہ ہونے کی وجہ سے تلفظ واضح نہ تھا لیکن بولے گئے جملے کے الفاظ اور مفہوم بالکل صاف اور قابل فہم تھے۔

”ماما... دودھ پلاؤ۔“ بچے نے کہا۔ اور یہ جملہ فراموشی زبان میں بولا گیا تھا۔



عشق کا شین

علیم الحق حقے

عزیز قارئین! اس تحریر کا مطالعہ کرنے سے قبل خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیجیے کہ آپ ایک غیر معمولی اور طویل داستان کا آغاز کر رہے ہیں۔ یہ کوئی روایتی سلسلے دار کہانی نہیں ہے۔ تصوف کی بھول بھلیاں میں عشق کی متلاشی نگاہ کے معرفت کی روشنی تک پہنچنے کی داستان ہے۔ یہ عشق کی ابجد کے دوسرے حرف 'شین' کا ابتدائیہ ہے جو آپ ان شاء اللہ ہر ماہ قسط وار مطالعہ کریں گے۔ یہی نہیں، اللہ تبارک و تعالیٰ مصطفیٰ کو صحت و عافیت والی دراز عمر عطا کرے، آپ عشق کا شین کا اختتامیہ اور پھر عشق کا قاف بھی سب رنگ ہی میں ملاحظہ کریں گے۔

اس ابجد کا حرف اول یعنی عشق کا عین 1995ء میں شائع ہوا۔ اور قارئین کے قلب و ذہن پر ان دہشت نقوش چھوڑ گیا۔ ڈائجسٹ میں چھپنے کے بعد، کتابی صورت میں اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے اور بی سی آر میں بھی بنائی گئی۔ اس کی تاثر انگیزی کے تسلسل کا یہ عالم ہے کہ موقع پرست پبلشرز نے انہی ناموں اور ملتے جلتے ناموں سے کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ کسی اور سے عشق کا شین کا دوسرا حصہ لکھوا کر اس عظیم داستان کو مکمل کرنے کا مقصد تک دے دیا گیا۔ یہ اس کی مقبولیت کا ثبوت ہے۔ لیکن قارئین کو دھوکا ایک حد تک ہی دیا جاسکتا تھا۔ باذوق اور رمز شناس قارئین کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ محض نام کے بدل پر، لافینی اور بے روح الفاظ کا جھوم ہے جسے نیچے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ہر قلم میں وہ غر نہیں ہوتا جو الفاظ میں معانی اور تاثیر کی روح پھونک دے۔ لکھنے والے بے شمار ہیں، نقال بھی بہت ہیں... لیکن علیم الحق حقے ایک ہی ہیں... جو اپنا کام محنت، جال فشانی اور سچائی سے کرتے ہیں اور عاجزی کا دامن نہیں چھوڑتے۔ یعنی ان کے کام کو دالہا نہ سراہا جاتا ہے۔ ایسی تحریریں برسوں میں لکھی جاتی ہیں۔ اور پڑھنے والے بھی بڑے صبر و تحمل سے ان کا انتظار کرتے ہیں۔ عشق کا شین کے تحریری سفر میں علیم الحق حقے کی زندگی کے دس برس گزر چکے ہیں۔ اب یہ سفر منزل کے قریب پہنچ چکا ہے۔

غیر معمولی قبولیت عام اور سہ اعتبار کی حامل یہ داستان، خود مصنف کو بھی اپنی تحریروں میں بہت پسند ہے۔ سب رنگ کے قارئین کے لیے بطور خاص اس کی اشاعت کا اہتمام کیا گیا ہے۔ پڑھیے اور مصنف کو... اور ساتھ ہی ہم بھی اپنی دعاؤں سے نوازیے۔

مشتوبہ کے گریب آپ سونے والے تھا اکر دستار سنگھ کو کھانی

اس کے مے مے ایک چنگاری ہے جو شعلہ چنبر کے لیے بے تاجو تھے
اے عشق ہو تو ایک خود بخود آواز ہے تجبو وہ کلام الہیہ کو فانی کر دیتے تھے
اب یہاں آواز اس کے جویا ہے حق کے لیے راہ نعرے حق تھے

گھوڑا اندھیرے میں جنم لینے والی ہستی کی رودادہ اس کے وجود میں خیرہ گن روشنی موعود کی

گر دو پیش سے بے خبر وہ دونوں اس پر ضرور حیران تھے

کہ دونوں بے بہوئیوں نے اچانک ہی اپنے غنچے سمیٹ لیے۔

”یہ کیا؟“ وصال دین نے کہا۔ اس کے لہجے میں باپوی

تھی۔ اب پھر منتر پڑھنا ہوگا اور نہ جانے بے بہوئیاں پچھے

کھولنے میں کتنی دیر لگائیں۔



ان آٹھوں کو یہاں آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا اور اب وہ

ماپوس ہونے لگے تھے۔ ویسے تو وہ آئے ہی ناخوش تھے۔

جسوقت کالفا نہ ہوتا تو وہ آتے ہی نہیں۔ پندرہ سال کے ایک

عام سے لڑکے کو ٹھکانے لگانے کے لیے آٹھ آدمی! ان کے

خیال میں یہ بات تو آہ آمیز تھی۔

”یارا... یہ کام تو میں اکیلا ہی کر آؤں گا۔“ کہتا رہا

جسوقت نے کہا۔ ”کیوں ہم سب کو ذلیل کرتے ہو۔“

”دیکھو... میں بہت سوچ سمجھ کر کام کر رہا ہوں

جسوقت نے نرم لہجے میں کہا۔ ”اس میں احتیاط ضروری

صرف ٹھکانے لگانا کافی نہیں ہے۔ کام ایسے ہو کہ کوئی نشان

نہ چھوڑا جائے۔ کسی کو کچھ پتا نہ چلے۔ ورنہ ایک نشان ہی

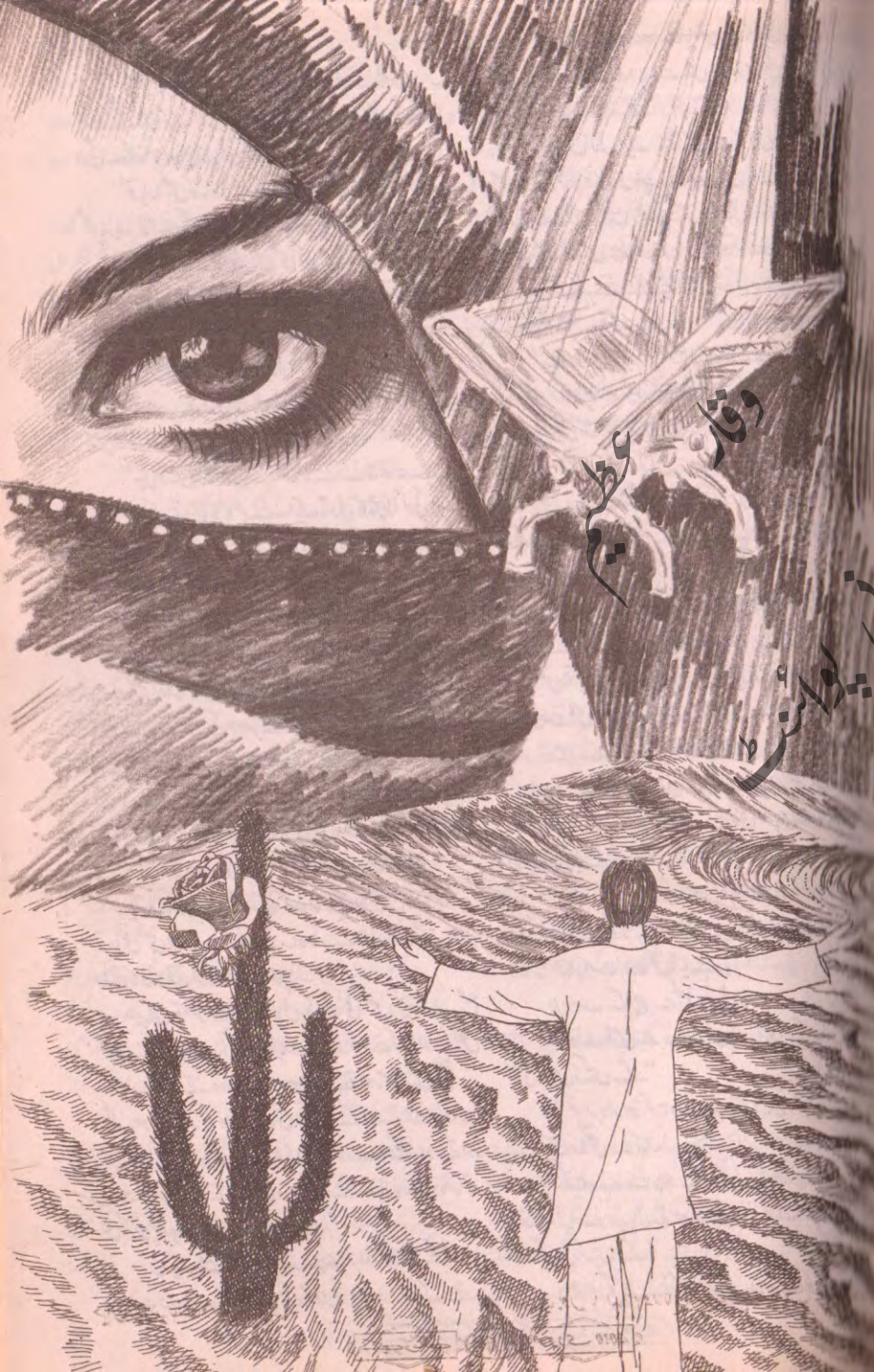
پر تاپ کو اصل آدمی تک پہنچا دے گا۔“

”اور اصل آدمی کون ہے؟“

”یہ تمہیں پتا نہ ہو اسی میں بھلائی ہے۔“

اس پر کرتارا آپے سے باہر ہو گیا۔ ”اویار جی

صاف بول نا کہ ہم کو زانی سمجھتا ہے۔ او کوئی ہم



دقار عظیم
پاکستانی پبلیکیشنز

اُگلا سکتا ہے بھلا!۔

”کام میری مرضی کے مطابق کرنا ہے۔“ جسوقت نے سخت لہجے میں کہا۔ ”میں نے کسی کو وجہ دیا ہے کہ اونچ نیچ نہیں ہوگی۔ مجھے اس وجہ کا پالنا کرنا ہے۔“

”تو یار ابھی کو مارنے کے لیے توپ چلاؤ گے۔“ اس بار گوپال نے زبان کھولی۔

”تو تم لوگ رہنے دو۔ میں کسی اور سے بات کر لوں گا۔“ یہ سُن کر کرتارا تیر کی طرح سیدھا ہو گیا۔ یہ تو بہت بڑی بے عزتی تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے اس کا یار کسی اور سے کام لے۔ ”پر یار سمجھا تو۔ یہ سب کیوں؟“

”بات یہ ہے کہ وہاں چھپنا آسان نہیں۔ وہ کوئی شہر ہے نہیں۔“

”یہی تو میں کہتا ہوں۔“ کرتارے نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ ”یہ ایک آدمی کا کام ہے۔ ایک آدمی کا چھپنا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ آٹھ آدمیوں کی کیا ضرورت ہے؟ اور آٹھ آدمی کہاں چھپ سکتے ہیں!“

”جمنی سے کام لے کرتارے! مجھے بتایا گیا ہے کہ لڑکا من کا موٹی ہے۔ کسی بھی وقت کسی بھی طرف نکل کھڑا ہوتا ہے اور نہیں نکلتا تو کوئی کئی دن حویلی سے باہر بھی نہیں آتا۔ ایک بار تو وہ راستہ بھول کر دوسرے گاؤں پہنچ گیا تھا۔ میں چاہتا ہوں تم لوگ ڈاکو بن کر جاؤ۔ موقع ملے تو بے شک کسی کو لوٹ بھی لو۔ اور تم لوگ الگ الگ رہو۔ یوں تم پورے علاقے پر نظر رکھ سکو گے۔ میں نے کہا نا کہ وہ کسی بھی وقت کہیں بھی نکل سکتا ہے۔ ایک آدمی ہو تو وہ برسوں بھی کسی کو نہیں ملے گا۔“

بات کچھ کچھ سمجھ میں آتی تھی۔ پھر بھی دل نہیں مانتا تھا۔ یہ تو واقعی کھلی کو توپ کے گولے سے مارنے والی بات تھی۔ لیکن دوستی کا لحاظ تھا۔ کرتارے کو ماننا پڑا۔

یہاں آکر وہ انشور لال کی حویلی میں ٹھہرے۔ صبح سویرے جاگ کر داس انھیں کھانا دے کر رخصت کرتا اور وہ نکل کھڑے ہوتے۔ وہ اونگوں پر سوار ہوتے اور صحرا میں پہنچ کر الگ ہو جاتے۔ دو وقت ان کی یکجائی کے ہوتے تھے۔ دوپہر میں کھانا کھانے کے لیے وہ ندی کے کنارے اکٹھے ہوتے اور رات کو واپس جاتے سہمی وہ وہیں ملتے۔ وہاں سے وہ ساتھ ہی پیش پور جاتے۔

اس ایک ہفتے میں انھوں نے چند افراد کو لوٹا تھا۔ مگر قسمت کی بات کہ وہ سب دُور پرے کے گاؤں دیہات کے لوگ تھے۔

جو یا تو شہر کی طرف جا رہے تھے یا شہر سے گاؤں واپس آ رہے تھے۔ یوں قریب کے دیہات میں ڈاکوؤں کی آمد کا ہمہ ہوسکا جو وہ چاہ رہے تھے۔

یہ ہر حال اس ایک ہفتے میں ان کا دل اُچاٹ ہو کر من موٹی لڑکا جس کی وجہ سے وہ یہاں آئے تھے اس کی ایک جھلک بھی انھیں دکھانی نہیں دی تھی۔ بس دو دن پہلے وہ تہہ خانے میں بیٹھ کر اس پر گفتگو کر رہے تھے کہ کیا مقصد حاصل کرنے کے لیے انھیں شہر پر تاپ سنگھ کی مہم میں ہی گھسیٹاؤ گے۔

”یہ تو بھول جاؤ۔“ کرتارے نے کہا تھا۔ ”دل تو ابھی یہی کرتا ہے لیکن مجبور ہے۔“

پھر کل شام مولداہار بارش شروع ہوئی۔ ان کے لیے تو وہ مسئلہ بن گئی۔ کہاں پناہ لیتے۔ مجبوراً ایک ایک کر کے معمول سے پہلے ہمیش پور چلے گئے تاہم کسی نے انھیں دیکھا۔ بارش کے نتیجے میں لوگ اپنے گھروں میں ہوئے تھے۔

بارش ان کے لیے بڑی ٹھہ ثابت ہوئی تھی۔ صحرا ہونے کے بعد ایسا مقام نہیں رہا تھا کہ جہاں چھپنا ممکن ہو۔ بعض جگہوں پر تو وہ گھنا جنگل بن گیا تھا۔ ادھر موسم کی طبیعت بھی جولائی پر آگئی۔

دوپہر کے وقت وہ کچھ پائے اور ندی کی طرف چلے گئے۔ کرتارا آگے تھا۔ جھاڑوں کی اوٹ سے نکلتے ہی اس نے دونوں نظر آئے۔ اوتار سنگھ کو اس نے پہلی نظر میں پہچان لیا۔ وہ اپنی تصویر کے عین مطابق تھا۔

کرتارے نے جھٹکے سے اپنے اوٹ کو روکا اور اٹھا کر ساتھیوں کو رُکنے کا اشارہ کیا۔ پھر پلٹ کر سرگوشی بولا۔ ”شکار بجھت سے نکل آیا ہے۔“

ان سب کے چہرے کھل اُٹھے۔

”اوٹ ہمیں باندھ دو۔ میں اور راجا آگے جائیں۔“

”تم سر دار ہو کرتارے۔ موقع ہمیں ملنا چاہیے۔“

کرتارے نے چند لمحے سوچا۔ بحث کرنا مناسب تھا۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ یہ کام اور گوپال کر سگے۔“

راجا اور گوپال نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

اپنے ہتھیاروں کو بکھو اور آگے بڑھ گئے۔

اوتار سنگھ نے آہٹیں سنی تو تھیں مگر اس کا دھیان بیر بہوٹی کی طرف تھا۔ اس لیے اس کے دماغ نے ان پر توجہ نہیں دی۔

دونوں بیر بہوٹیوں کے پچھے بند کرنے کے بعد اس کی پہلی س نے اچانک ہی اسے نامعلوم خطرے کا احساس دلایا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ ڈھانے باندھے ہوئے دو افراد تھے۔ ایک کے ہاتھ میں بڑا بلم تھا اور دوسرے کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ وہ بار بار دونوں ہاتھوں میں تول رہا تھا۔ اوتار سنگھ نے سمجھ لیا کہ وہ دھن ہیں۔

وہ دونوں بھی کھلی ٹیس قدم کے فاصلے پر تھے۔ اوتار سنگھ نے سرگوشی میں انھیں دین کو پکارا۔ ”ویری جی... جلدی کرو۔ لٹھیا اٹھالو۔“

وصال دین نے چونک کر ایک نظر اٹھا اور پھر ان دونوں کو دیکھا۔ انداز ایسا تھا جسے اس کی سمجھ میں آ رہا ہو۔

ان کی لٹھیاں کچھ دُور پیچھے کی طرف پڑی تھیں۔ اوتار سنگھ تیزی سے چھپنا اور لٹھی اٹھالی۔ اسی لمحے وصال دین بھی اپنے بک کچھ بچھ گیا۔ وہ بھی لٹھی کی طرف لپکا۔ دونوں دوست اوتار سنگھ کے بعد ایک دوسرے سے خاصا دُور چلے گئے۔ ڈھانچے پر وہ دونوں افراد اپنے ٹکے انداز میں آگے بڑھ رہے تھے لیکن ان دونوں نے جس انداز میں لٹھیاں اٹھالی تھیں اس سے وہ کچھ سمجھ گئے۔ انھوں نے پلٹ کر اس سمت دیکھا جہر سے وہ آئے تھے۔

ادھر کرتارے کی نگاہوں سے تشویش جھلکنے لگی تھی۔ لڑکوں نے جس انداز میں لٹھیاں سنبھالی تھیں اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ انھیں لٹھیا چلانی آتی ہے۔ اور یہ خطرناک بات تھی۔ اگر وہ اسے دُور سے لٹھیا باز بھی تھے تو راجا اور گوپال ان کے لیے آسانی تھے۔

”دُور آدمی اور چلے جائیں۔“ کرتارے نے اپنے ساتھیوں کو سرگوشی میں کہا۔

دُور آدمی اور آگے بڑھ گئے۔

دونوں لڑکے لٹھی سنبھالے کھڑے تھے۔ انھوں نے دو اور آدمیوں کو کھنڈ سے نکل کر آتے دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں گئی نیزے تھے۔ دونوں لڑکوں کی ملی جلی کیفیت تھی۔ وہ بڑا اعتماد لگاتے تھے۔ انھیں جمال دین جیسے ماہر فن نے یہ فن سکھایا تھا۔ ان کچھ دُور بھی تھے کیوں کہ آپس میں مشق کرنا اور بات ہے۔

اور سلحہ دشمنوں کا سامنا کرنا اور بات۔ وہ پہلا موقع تھا کہ ان کا واسطہ سچ کے کسی دشمن سے پڑا تھا۔

نئے آنے والے دونوں آدمی اپنے پہلے ساتھیوں سے آئے۔ اب ان میں سے دو وصال دین کی طرف بڑھ رہے تھے اور دو اوتار سنگھ کی طرف۔

درمیانی فاصلہ کم ہوتے ہی دونوں لڑکے تیزی سے حرکت میں آئے۔ لٹھیاں اتنی تیزی سے گردش کر رہی تھیں کہ نظر ہی نہیں آ رہی تھیں۔

پھر جو کچھ ہوا وہ لحوں میں ہوا۔ پہلے خنجر والا لیٹٹ میں آیا۔ اس کا خنجر ہاتھ سے نکلا اور اُڑتا ہوا دُور جا گرا۔ وہ ہاتھ پکڑ کر پیچ رہا تھا اور اس کا ہاتھ پیچھے کے پاس سے لٹک رہا تھا۔ دوسرا شکار کر پان والا تھا۔ اوتار سنگھ کی لٹھی اس کی کپٹی پر لگی اور وہ کٹے ہوئے شہتر کی طرح ڈھیر ہو گیا۔

دونوں نیزے والے ابھی گھبرا گئے تھے۔ وہ نیزے سے لٹھی کا کام لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن لٹھیا بازی کے فن سے نااہل تھے۔ انھیں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ زیادہ دیر نہیں ٹک سکیں گے۔ دشواری یہ تھی کہ انھیں پلٹ کر بھاگنے کا موقع بھی نہیں مل رہا تھا۔

وصال دین کچھ زور سے تھا۔ اس کا رنکا زکمل نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نیزہ اس کے بازو کو چھو کر گزرا۔ اس کی پیٹھ پھٹ گئی اور بازو پر ایک لکیر سی چھج گئی جو دیکھتے ہی دیکھتے خون سے بھر گئی۔

”تم ہمت جاؤ ویری جی۔“ اوتار سنگھ نے اسے پکارا۔ ”انھیں میں سنبھال لوں گا۔“

لیکن زندگی بھر وفاداری کا سبق پڑنے والا اس آزمائش سے مُنہ نہیں پھیر سکتا تھا۔

اُدھر کھنڈ میں صورت حال اور خراب تھی۔ دو ساتھیوں کو گرتے دیکھ کر باقی لوگ میدان میں اترنا چاہتے تھے۔ جوش تو کرتارے کا خون بھی مار رہا تھا لیکن اسے اپنے وجہ کی فکر بھی تھی۔ وہ بہت تیزی سے سوچ رہا تھا۔ ”تم میں سے کوئی آگے نہیں بڑھے گا۔“ وہ سرگوشی میں پھنکارا۔

”تو اپنے ساتھیوں کو پشٹا دیکھتے رہیں۔“ رگھیر نے غرا کر کہا۔

”اور کچھ کیا بھی نہیں کا سکتا۔ لٹھیا چلانی آتی ہے تم میں سے کسی کو؟“ کرتارے نے پہنچ کر کیا۔

وہ تینوں خاموش رہے۔

”ہم نہیں بھی ہوتے تو ان کے لیے کم تھے۔“ کرتارے نے کہا۔ ”اور سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہمیں اپنے کسی ساتھی کو یہاں چھوڑ کر نہیں جانا ہے۔... زندہ نہ مردہ۔ اور میں اکیلا سات آدمیوں کو لے کر نہیں جاسکتا۔“

اتنی دیر میں لڑکوں سے لڑنے والے ان کے دوسرے دوست بھی ڈھیر۔ چکے تھے۔

”چلو ویرجی گاؤں کی طرف...“ اوتار سنگھ نے وصال دین سے کہا۔ ”ہمیں وہاں سے لوگوں کو لے کر آنا ہے۔“

”میں یہیں رک جاتا ہوں۔“ وصال دین نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

اوتار سنگھ اس کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ان کی فکر نہ کرو ویرجی۔ یہ اٹھنے والے نہیں۔ آؤ میرے ساتھ۔ ہمیں جانے اور واپس آنے میں بس دس منٹ لگیں گے۔“

بات ماننے والا وصال دین اوتار سنگھ کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

لڑکوں کے اوجھل ہوتے ہی کرتار اور اس کے ساتھی اپنے گھرے ہوئے ساتھیوں کی طرف لپکے۔ جس کی کنٹی پرنیٹیا لگی تھی وہ بے سندھ تھا۔ باقی تین ہوش میں تھے مگر اٹھنے کے قابل نہیں تھے۔ ”جلدی کرو۔“ کرتارے نے کہا۔

انہوں نے چاروں ساتھیوں کو اونگوں پر لادا۔ ”اب کرنا کیا ہے؟“ رگھیر نے پوچھا۔

”لنگنا ہے یہاں سے۔“

”ہمیش پور چلیں گے؟“

”بے وقف نہ بنو۔ اب اس علاقے میں ہمیں ایک پل بھی نہیں رکنا ہے۔“ کرتارے نے ہنسنے لگا۔

ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے وید کو وصال دین کی مرہم پٹی کرنے کو کہا اور اپنے ساتھ کچھ آدمیوں کو لے کر اوتار سنگھ کے ساتھ چل پڑا۔ کیدار ناتھ بھی ان کے ساتھ تھا۔

وہ وہاں کوئی ایسی نشانی نہیں تھی جو اس واقعے کی گواہی دے۔

کیدار ناتھ نے ادھر ادھر دیکھا اور متسفرانہ لہجے میں اوتار سنگھ سے بولا۔ ”پتر... کہیں ایسا تو نہیں کہ تم دونوں نے خواب دیکھا ہو۔ یہاں تو ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔“ اس کا لہجہ فاتحانہ تھا۔

اوتار سنگھ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ٹھاکر پرتاپ نے اسے

گھور کر دیکھا۔ ”وصال دین کے بازو کا زخم تو اصلی ہے۔ یا وہ بھی خواب میں لگا ہے۔“

”کسی درخت کی شاخ سے خراش لگی ہوگی ٹھاکر ویر...“

کیدار ناتھ نے بڑے ادب سے کہا۔ ”ورنہ سوچو۔ اتنی سی دیر میں چار زخمی آدمی کہاں جاسکتے ہیں۔ جب کہ پتر اوتار سنگھ کا کہنا ہے کہ وہ اٹھنے کے قابل نہیں تھے۔“

ٹھاکر پرتاپ کے ساتھ ایک کھوجی بھی تھا۔ ٹھاکر نے اس سے کہا۔ ”تو ادھر ادھر دیکھ۔ مجھے لگتا ہے ان کے اور ساتھی بھی ہوں گے۔“

اس دوران میں اوتار سنگھ متوجس نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا تھا۔ ندی کے کنارے ایک چمکتی ہوئی چیز نظر آئی تو وہ اس کی طرف لپکا۔ وہ ایک حملہ آور کا خنجر تھا۔ ”یہ دیکھیں پتا جی۔“ اس نے پکارا۔

ٹھاکر پرتاپ اس کی طرف بڑھا۔ کھوجی چند لمحے ادھر ادھر جائزہ لینے کے بعد خنجر کی طرف بڑھ رہا تھا۔

ٹھاکر نے وہاں پہنچ کر وہ خنجر اٹھایا اور اسے دیکھ کر دیکھا۔ ”یہ لکیدار ناتھ کا خنجر خواب سے باہر آ گیا ہے۔“

”میں تو یوں ہی کہہ رہا تھا ٹھاکر ویر...!“ کیدار ناتھ نے کھسکا کر کہا۔ ”یہ نشانی تو نہیں دیکھی تھی میں نے۔“

ذرا ہی دیر میں کھوجی واپس آ گیا۔ ”وہ اٹھ اونگوں سوار آٹھ منٹس تھے ان داتا...“

”جائے حملہ کیا اور چار شاہ کھیتے رہے۔“ ٹھاکر نے پُر خیال لہجے میں کہا۔ ”انہیں دشوار ہوگا کہ دو لڑکوں کے لیے چار آدمی کافی ہیں۔ مگر جب انہوں نے چاروں ساتھیوں کو کر کے دیکھا تو حملہ کیوں نہیں کیا؟“ اس کے لہجے میں الجھن تھی۔

”ڈاکوؤں کے دل بہت چھوٹے ہوتے ہیں ٹھاکر ویر۔“

کیدار ناتھ نے جلدی سے کہا۔

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ ڈاکو تھے؟“ ٹھاکر نے لہجے میں کہا۔

کیدار ناتھ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اوتار سنگھ بول اٹھا۔

”ان کے چہروں پر ڈھانٹے تھے پتا جی۔“

”دیکھا تھا کرویر میں نے کہا تھا نا۔“

”میں نہیں مانتا کیدار ناتھ کہ وہ ڈاکو تھے۔“

”لیکن کیوں ٹھاکر ویر؟“

”پچھلے دنوں ادھر ادھر کے گاؤں دیہاتوں میں

کچھ نہیں سنا گیا۔ ورنہ اٹھ ڈاکو آجائیں تو شور مچ جاتا ہے۔“

ماتے میں۔ پھر وہ ڈاکو ہوتے تو میرے چھوٹے اور وصال دین پر حملہ کیوں کرتے۔ ڈاکو تو مال دیکھ کر حملہ کرتے ہیں۔“

ٹھاکر نے دہل دی۔

”تو ٹھاکر ویر تمہارے خیال میں وہ کون تھے؟“

”وہ جو کوئی بھی تھے میرے پتر کی جان لینا چاہتے تھے۔“ ٹھاکر نے کہا۔ ”صرف جان! مال سے انھیں کوئی غرض نہیں تھی۔“

”اگر وہ ڈاکو نہیں تھے تو انہوں نے ڈھانٹے کیوں باندھ رکھے تھے؟“ کیدار ناتھ نے اعتراض کیا۔

”خود کو جھبانے کے لیے اور اسی لیے انہوں نے چار آدمی کرنے کے لیے خنجر کو کوشش نہیں کی۔ بلکہ ان چاروں کو اٹھا کر لے جانا زیادہ ضروری سمجھا۔ وہ چھوٹے تھے شناخت سے بچنا چاہتے تھے۔“

”میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔“ ٹھاکر ویر۔“ کیدار ناتھ نے لہجے میں بے بسی سوتے ہوئے کہا۔

”مگر میری سمجھ میں بہت کچھ آ رہا ہے۔“ ٹھاکر بولا۔

”اب اس پر حویلی میں بات ہوگی۔“

کیدار ناتھ کے من میں کھد بھری تھی۔ وہ ٹھاکر کے چلنے پر توجہ دے رہا تھا۔

وہ لوگ کچھ دیر پڑوسی میں بیٹھے۔ ٹھاکر اپنے بیٹے کو محبت کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ”پتر اوتار سنگھ...“ بالآخر اس نے کہا۔ اس کا لہجہ بھی محبت سے چھلک رہا تھا۔ ”مجھے تم پر فخر ہے۔ تم نے ثابت کر دیا کہ تم ٹھاکر ہو۔ اصل ٹھاکر!“

اوتار سنگھ نے کچھ نہیں کہا۔ بس باپ کو دیکھتا رہا۔ اسے اٹھا کر اب اس پر پابندیاں لگیں گی۔ وہ جانتا تھا کہ پتا جی اس سے لقمی محبت کرتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اب وہ اسے اٹھ لے نہ سکیں۔

”دیکھو پتر۔“ جیون اوپر والے نے جتنا دیا ہے، منٹس اتنا ہی دیا ہے۔ نہ ایک پل کم نہ ایک پل زیادہ...“ ٹھاکر نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”راجپوت موت سے نہیں ڈرتے۔ ہاں! وہ جان لینے کے لیے لڑتے ہیں، جان دینے کے لیے جانے ہیں کہ اس ٹھیل میں جان جا بھی سکتی ہے۔ سو اٹھو! اس کی طرح جیتے اور بہادری کی طرح مرتے ہیں۔“

اوتار سنگھ اب بھی چپ تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا اس کا کیا کرنا ہے۔

”میں تم سے یہی کہوں گا پتر کہ جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ پتر ہر بات کے لیے ہر وقت تیار ہو۔ جیسے چاہو جیو، جو چاہو کرو جہاں چاہو جاؤ۔ بس یہ یاد رکھو کہ تم راجپوت ہو اور راجپوت دشمن پر دیا بھی نہیں کرتے۔“

”جی پتا جی۔“

ٹھاکر نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ ”کیا بات ہے؟ کچھ بے کل ہو پتر؟“

”جی پتا جی وہ بھنے کے لیے جانا ہے۔“

ٹھاکر بے ساختہ مسکرایا۔ پھر ہنسنے لگا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ خواہ مخواہ بیٹے کو پڑھا رہا ہے جب کہ بیٹا اس سے بھی بڑھ کر پکا ہے۔ ابھی اس پر جان لیوا حملہ ہوا تھا اور وہ... وہ پڑھائی کی فکر میں بے حال ہو رہا تھا۔ ”تو تم جاؤ۔... پڑھو۔ شاباش پتر!“ اس نے کہا۔

اوتار سنگھ چلا گیا۔

کیدار ناتھ کی بے چینی کی کوئی گمان نہیں تھی۔ اوتار سنگھ کے جاتے ہی اس نے ٹھاکر سے کہا۔ ”ٹھاکر ویر تمہارے خیال میں چھوٹے ٹھاکر کے جیون کو کوئی خطرہ ہے؟“

”جیون کے ساتھ مرن کا دھڑکا تو لگا ہی رہتا ہے کیدار ناتھ۔ جیون کا انت تو مرن ہی ہے نا۔ پل میں ہو یا برسوں میں...“ ٹھاکر نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”پر مجھے خوشی ہے کہ میرا پتر جانتا ہے... جانتا ہے کہ ٹھاکر موت سے نہیں ڈرتے۔“

”پر ٹھاکر ویر دھڑکا ہے تو اس کا آپا نے تو سوچنا ہوگا۔“

کیدار ناتھ نے کہا۔ ”اور دشمنی ہے تو اس کا کارن بھی ہوگا۔“

”ہوگا۔ اوش ہوگا۔“ ٹھاکر نے بے پروائی سے کہا۔

کیدار ناتھ کو اس کی بے پروائی بہت عجیب اور غیر فطری لگی۔ ”میں دیکھتا ہوں ٹھاکر ویر کہ تم کچھ بے پروائی کر رہے ہو۔ چھوٹا ٹھاکر تمہارا ایک ہی پتر ہے... تمہاری سسل چلانے والا! اگر اسے خطرہ ہے تو تمہیں اس کی حفاظت کی فکر کرنی ہوگی۔ پر تم تو اسے اور آزادی دے رہے ہو۔ جیسے چاہو جیو، جو چاہو کرو جہاں چاہو جاؤ۔ یہ کیا بات ہوئی؟“

ٹھاکر مسکرایا۔ ”مجھے اس کی کوئی چٹنا نہیں۔“

”پر کیوں؟“

”یوں کہ اسے کچھ نہیں ہوگا۔ کچھ نہیں ہوگا میرے پتر کو۔ وہ لمبا جیون جیے گا۔“

ٹھاکر کے لہجے کے یقین نے کیدار ناتھ کو ہلا کر رکھ دیا۔

”اس کا اتنا دشوار کیوں ہے تمہیں؟“

”تم نہیں جانتے کیدار ناتھ کہ وہ مجھے کیسے ملا ہے۔“
ٹھاکر نے کہا۔ ”مجھے بتادیا گیا تھا کہ کوئی اس کا بال بانگا نہیں کر سکے گا۔“
”پھر بھی ٹھاکر ہو۔۔۔“

”چھوڑو اس بات کو کیدار ناتھ۔ یہاں ایک تم ہی تو ہو جس سے من کی بات کر سکتا ہوں۔ جب تک اوتار سنگھ پیدا نہیں ہوا تھا میں سوچتا تھا کہ ساری زمین اپنے کارندوں میں بانٹ دوں گا۔ لیکن جب وہ پیدا ہوا تو مجھے چوں اچھا لگنے لگا۔“ ٹھاکر کہتے کہتے رک گیا۔ چند لمحے کیدار ناتھ کو غور سے دیکھتا رہا۔ ”میں اپنی وصیت تیار کر چکا ہوں۔ اگر میرے پتر کو کچھ ہو گیا تو میرا سب کچھ سرکار کے پاس چلا جائے گا۔ اوتار سنگھ کو کچھ نہ ملا تو کسی کو بھی کچھ نہیں ملے گا اور بھوکا ان نے اسے جیون دیا تو میں نے اپنی وصیت میں سب کا خیال رکھا ہے۔ کوئی محروم نہیں رہے گا۔“ کیدار ناتھ کو لگا کہ ٹھاکر جان بوجھ کر اسے یہ سنارہا ہے۔۔۔ جتا رہا ہے۔۔۔ سمجھا رہا ہے کہ اوتار سنگھ کے جینے میں ہی اس کا فائدہ ہے۔ اوتار سنگھ کورا سے سے ہٹا کر اسے کچھ نہیں ملے گا۔ ”ایسی باتیں نہ سوچو ٹھاکر ویر۔“ کیدار ناتھ نے مجھے دل سے کہا۔ ”من میں وہ سوچ رہا تھا کہ اب اسے بے پور جا کر جسونت سے بات کرنی پڑے گی۔“

مولوی برکت علی اس کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ انھوں نے کہا۔ ”اوتار سنگھ استاد ہونے کے ناتے ایک بات کا مجھے شروع ہی میں خیال رکھنا چاہیے تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہیں پڑھانے کی فکر میں اسے میں بھول ہی گیا۔“
”میں؟ انہیں مولوی صاحب۔۔۔“
”جی ہاں۔۔۔ میں تمہیں ہوم ورک بھی تو ملا ہوگا نا؟“
”اور میں نے اس کی فکر بھی نہیں کی۔ بس اپنا مضمون پڑھانے میں لگا رہا۔ بڑی غیر ذمے داری ہوئی مجھ سے۔ مگر خیر ابھی کچھ دن کی چھٹیاں باقی ہیں۔ اس کی تلافی اب کرنی ہوگی۔“

”آپ کہا کر رہے ہیں مولوی صاحب؟“ اوتار سنگھ کے لہجے میں حیرت تھی۔
”اب پہلے تم اپنا ہوم ورک مکمل کرو گے۔“
”وہ تو میں پہلے ہی مکمل کر چکا ہوں۔“
مولوی صاحب کو ایسا شک لگا کہ وہ گنگ ہو کر رہ

گئے۔ ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ بڑی کوشش کے انھوں نے خود کو سنبھالا۔ ”کک۔۔۔ کیا۔۔۔ کیا مطلب ام۔۔۔ ورک پہلے ہی کر چکے ہو؟“
”جی۔۔۔ جی ہاں۔۔۔“
”ہر مضمون کا۔۔۔ تمام مضامین کا!“
”جی مولوی صاحب تمام مضامین کا۔ لا کر دکھاؤ۔“
”آپ کو؟“

”ہاں۔۔۔ دکھاؤ تو۔۔۔“
”ابھی لاتا ہوں۔“ اوتار سنگھ نے کہا اور کمرے سے چلا گیا۔ مولوی صاحب نے پیشانی سے پسینا پونچھا۔ ہوم ورک دیکھنے میں انھیں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ انھیں یقین تھا اوتار سنگھ نے کہا ہے تو ٹھیک ہی کہا ہوگا۔ بس اس ہاں انھیں کچھ ہمت مل گئی۔ اب تو وہ یہ سوچ رہے تھے کہ کہیں لڑکا جن تو نہیں۔۔۔ کچھ دیر بعد اوتار سنگھ ہوم ورک کی کا پیاں لے کر ورت چپک کر اپنے لگا۔ مولوی صاحب بے چارے سے دیکھ کر پھر بولے۔ ”ٹھیک ہے شکر ہے کہ میں شرمندگی سے بچ رہا ہوں۔۔۔ چلیں۔۔۔ پڑھائی شروع کریں۔“ اوتار سنگھ نے ہو کر کہا۔

اب مولوی صاحب اور کیا کر سکتے تھے۔ وہ پڑھانے لگے۔
اس رات مولوی صاحب پھر اچھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے وہی مسئلہ تھا۔ اب اوتار سنگھ جب عربی میں کچھ پڑھا چاہے گا تو وہ کیا کریں گے؟ اس سوال کا تو کوئی جواب نہیں سوچ رہا تھا۔ البتہ یہ انھوں نے سوچ لیا کہ وہ اپنا پڑھائے ہوئے کو بار بار ری وائر کرتے رہیں گے۔ اوتار سنگھ ایسا شاکر گرد تو ہے نہیں کہ کوئی اعتراض کرے۔ اس سے پہلے کہ اس کی بنیاد اور مضبوط ہو جائے گی۔
لیکن اصل مسئلے کا حل ابھی تلاش کرنا تھا۔ ری وائر کرنا اس مسئلے کا حل نہیں تھا۔ سوچتے سوچتے بلا خرابیک بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ ان کے سامنے ایک ہی راستہ تھا۔۔۔ یہ کہ وہ اپنی کہانیاں اور داستانیں خود عربی میں منتقل کریں۔

یہ سوچتے کے بعد وہ مطمئن ہو گئے۔ مگر ساتھ ہی ان کا احساس ہوا کہ ان کا یہ شاگرد ان کے لیے کتنا فائدہ مند ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ سے وہ اپنی صلاحیتوں سے متاثر رہے تھے۔ ورنہ شاید انھیں بھی اردو سے عربی میں ترجمہ کرنا

ایک دن آتا۔

اس رات وہ سوئے تو بے حد مطمئن تھے۔

ایک ماں اب ختم ہو رہی تھیں۔ اسکول کھلنے سے تین چار دن وہ دہلی کے لیے روانہ ہو جاتے تاکہ وہاں رہنے کے بعد واپس کر لیا جائے۔ چنانچہ وہ گڑھی میں ان کی رات تھی۔

اوتار سنگھ معمول کے مطابق چٹائی کے پاؤں دبا رہا تھا۔ ان شاکر پر تپا سنگھ بہت بے چین تھا۔ بار بار کروٹیں لے رہا تھا۔
”کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟“ اوتار سنگھ نے پوچھا۔
”اب طبیعت کا کیا پوچھتے ہو پتر۔۔۔ حال بھرا یہی ہے۔“

”ایسی باتیں نہ کریں چٹائی۔“
”پھوڑو پتر۔ تم بس مجھ سے لپٹ کر لیٹ جاؤ۔“
اوتار سنگھ ٹھاکر سے لپٹ گیا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اب اس کی کوئی نئے معمول کی۔۔۔ اس سے لپٹ کر سونے کی بات نہیں ہے۔ یہ سال تو انھیں بہت ہی بھاری لگے گا۔ اسے یاد تھا کہ پہلی بار وہ ان سے لپٹ کر سویا تھا تو انھوں نے کہا کہ مدت سے وہ نذیر کو ترے ہوئے ہیں۔ تو کیا اب وہ پھر رات بھر جاگا کریں گے۔

اس خیال سے وہ تڑپ کر رہ گیا۔ اب وہ کیا کرے؟ کیا اسے اس کا؟
”کیا یہ نہیں ہو سکتا پتر کہ تم دو دن اور رُک جاؤ۔“ ٹھاکر کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

ٹھیک ہے چٹائی۔ جو آپ کی ایتھا۔ اوتار سنگھ نے کہا۔ ”اس بار تو میرا بالکل دل نہیں چاہتا ہے جانے کو۔“
ٹھاکر کو اس پر شدت سے پیار آیا۔ اس نے اسے پیچ لیا۔
”تم بہت اچھے ہو پتر۔ میں تو بچوں کی سی بات کر بیٹھا اس سے۔ ارے جانا ہے تو جانا ہے۔ دو دن سے کیا فرق پڑے گا۔“
”اے کیسی ہی پتا ہے نا۔“

اوتار سنگھ کا دل کٹنے لگا۔ ”چٹائی۔۔۔ ایسا ہے کہ میں اسکول آ جاؤں۔“ اوتار سنگھ نے بے حد خلوص سے کہا۔ کہنے کو تو وہ اپنی محبت میں یہ بات کہہ گیا۔ لیکن فوراً ہی اس کی نگاہوں نے ٹھاکر کی طرف گئی۔ ساعت میں وہ آواز کو گنجنے لگی۔

مشفق خواجہ

حسن مزاج مشفق خواجہ کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اُن کا ہدف عموماً میں ہی بنتا، شاید اس لیے کہ شفقت کا اظہار بھی سب سے زیادہ بھی سے فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا، ”طارق! تمہارے بچے ماشاء اللہ بہت اچھے ہیں۔ ذہین بھی ہیں اور سعادت مند بھی۔“ قدرے توقف کے بعد فرمایا، ”کیا ہی ایتھا ہوتا، اگر یہ خوبیاں اُن کے باپ میں بھی ہوتیں!“

ایک بار میں نے اُن کے ایما پر سب بھائی بہنوں کو کھانے پر مدعو کیا۔ جب سب لوگ کھانا کھا رہے تھے، اچانک انھوں نے سب کو مخاطب کر کے فرمایا، ”دیکھیں، آج طارق کس تیزی سے کھانا کھا رہا ہے اور اصل آج یہ جو کچھ کھالے گا، وہی اس کی بچت ہوگی۔“

ایک مرتبہ والد گرامی پر ایک نوٹ انھوں نے مجھ سے لکھوایا جو غلطی سے اُن کے نام سے چھپ گیا۔ میں نے ازراہ مذاق بھائی بہنوں کے اجتماع میں کہا کہ مشفق بھائی جان نے میرا ایک مضمون اپنے نام سے چھپوایا ہے، فوراً فرمایا، ”ہاں، میں بہت شرمندہ ہوں۔ کئی لوگوں نے اُسے پڑھ کر کہا کہ میری تحریر کا معیار بہت گر گیا ہے!“

آپ نے گھر کے دروازے پر ایک بورڈ آؤیز ان کر رکھا تھا۔ پیشگی اطلاع کے بغیر زحمت نہ فرمائیں۔۔۔ جب کوئی صاحب پیشگی اطلاع کے بغیر زحمت فرمائیے، اور معذرت پیش کرتے تو آپ مسکرا کر فرماتے، ”یہ بورڈ میں نے آپ کے لیے نہیں اپنی بیوی کے لیے آؤیز ان کیا ہے۔“

”جوش اور خاندان بکوش“ ازخود طارق صاحب کا شاکست حسین خان

لیکن وہ آزمائش بس ایک لمحے کی تھی۔ ٹھاکر نے کہا۔ ”ایسی بات نہ کرو پتر۔ تمہاری تعلیم میرا شوق ہے۔ اسکول تو تمہیں جانا ہے۔“

اوتار سنگھ اب شرمندہ تھا۔ اسکول جانے بغیر تو وہ خود بھی نہیں رہتا۔ یہ خیال اسے شرمندہ کر رہا تھا کہ اُس آواز والی کی محبت باپ کی محبت کے منڈ لگ رہی ہے۔
”تو چٹائی! آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔ وہیں رہیں۔“

اس نے کہا۔

”نہیں پتہ... یہ کہاں ممکن ہے۔ جیون کی بندشوں سے کہاں چھوٹتا ہے منٹ... چھوڑا اس بات کو۔“

مگر بات چھوڑ دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ آنکھیں بند کر لینے سے مسائل ختم نہیں ہو جاتے۔ یہ وہ رات تھی کہ وہ دونوں ہی نہیں سو سکتے تھے۔ یہ ان کے جاگنے کی رات تھی۔ دونوں کو معلوم تھا کہ وہ جاگ رہے ہیں۔ لیکن وہ سونے کی ادکاری کرتے رہے۔

وقت گزر رہی جاتا ہے۔ وہ رات بھی گزر گئی۔ صبح رواگئی تھی۔ وہ دو راجیوٹوں کے لیے سخت آزمائش کا وقت تھا۔ بہر حال وہ وقت بھی گزر رہی گیا۔

دہلی میں سب کچھ پہلے جیسا ہی تھا۔ بس ایک تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ سرفراز بیگم کو ایک دن بیٹھے بٹھائے خیال آیا کہ انھوں نے بچیوں کو قرآن کی تعلیم تو دلا دی تھی لیکن ان کی دینی تعلیم ابھی نامکمل ہے۔ حدیث شریف اور سیرت مبارکہ کے علم کے بغیر تو وہ مکمل نہیں ہو سکتی۔

تحفے میں ایک خاتون تھیں... مہر النساء۔ ساتھ کہ وہ ان علوم میں طاق ہیں۔ سرفراز بیگم نے ان سے رابطہ کیا۔ وہ اپنے گھر میں ہی بچیوں کو تعلیم دیتی تھیں۔ لیکن سرفراز بیگم نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی بچیاں گھر سے باہر قدم رکھیں۔

”آپ گھر پر آنے کی زحمت نہیں کر سکتیں؟“ سرفراز بیگم نے مہر النساء سے کہا۔

مہر النساء کچھ ہنسیاں نہیں۔ وہ جانتی تھیں کہ یہاں اس زحمت کی انھیں معقول فیس بھی ملے گی۔ ”آپ انھیں میرے گھر ہی بھیج دیں نا۔ اجتماعی تعلیم زیادہ موثر اور دل نشیں ہوتی ہے۔“ انھوں نے کہا۔

”آپ میری بچیوں کے لیے وقت نکالیں نا۔“ سرفراز بیگم نے اصرار کیا۔

مہر النساء سوچ میں پڑ گئیں۔ ”ان بہت ساری بچیوں کو میں نہیں چھوڑ سکتی جو میرے گھر پڑھنے کے لیے آتی ہیں۔“ انھوں نے کہا۔

”یہ تو میں چاہتی بھی نہیں۔ آپ الگ سے کوئی وقت دے دیں۔“

کچھ سوچ بچار کے بعد مہر النساء نے کہا۔ ”تو ٹھیک ہے۔ میں عصر اور مغرب کے درمیان انھیں پڑھا دیا کروں گی۔“

تینوں لڑکیاں اس نئی مصروفیت سے بہت خوش تھیں۔ کی رات وہ شب کی یکسانیت سے جان چھوٹ گئی تھی۔ یہ انھیں بہت خوش گوار لگا تھا۔

دوسری طرف حور بانو اوپر والوں کی آمد کا ایک ایک گن رہی تھی۔ اسکول کھلنے میں ایک ہفتہ رہ گیا تو اس نے انتظار شروع کر دیا۔ لیکن اس انتظار میں نہ کوئی تبدیلی آئی۔ کیوں کہ یہ بیٹی انتظار تھا۔ اسکول کھلنے سے پہلے انھیں بہر حال آنا تھا۔ سواب حور بانو کے لیے ہر حال ان کے انتظار کا تھا۔ آپ ہی آپ نمکرائی رہتی۔ بار بار چلن کی طرف جاتی۔ لکھے وہاں کھڑی رہتی اور پھر لوٹ آتی۔ وہ بہت کم گو لیکن خوش مزاج ہو گئی تھی۔

چار دن اس انتظار میں گزر گئے اور وہ نہیں آئے۔ لیکن بانو خوش تھی۔ آج نہیں تو کل... وہ آ ہی جائیں گے۔

اور پانچویں دن وہ آ گئے! ان کی آمد سے چند لمحے پہلے حور بانو کا دل انداز میں دھڑکا اور اس کے قدم خود بہ خود چلنے لگے۔ اٹھے۔ وہ وہاں جا کر کھڑی ہوئی ہی تھی کہ ایک بھٹی سامنے آ کر رکا۔

تب حور بانو نے دو ماہ کے بعد پہلی بار چھوٹے ٹھا کر وہ ان دو بیٹیوں میں وہ پہلے سے اونچا ہو گیا تھا۔ یا شاید یہ اس گمان تھا۔

اور اتار سنگھ کے دہلی جانے کے بعد وہ ٹھا کر پرتاپ گھر پہلی رات تھی۔

دن تو جیسے تیسے ادھر ادھر کی مصروفیت میں گزر گیا۔ اب رات... پہاڑ جیسی رات منہ پھاڑے کھڑی تھی۔ جس سے وہ بہت پہلے سے خوف زدہ تھا۔ سوچتا رہتا تھا کہ رات آئے گی تو وہ کیا کرے گا... کیا گزرے گی اس پر۔ اور یہ رات آگئی تھی۔

سارے معاملات نمٹانے کے بعد وہ مجبوراً اپنے گھر میں چلا آیا۔

اپنا سیف کھول کر اس نے وہ کتابیں نکالیں جو وہ کر رکھتا تھا۔ اس مطالعے میں اس کا خوب دل لگتا تھا۔ اس روز معاملہ مختلف تھا۔ وہ کتاب کھول کر پڑھ رہا تھا۔ درحقیقت وہ کچھ بھی نہیں پڑھ رہا تھا۔ اسے ایک لکھا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اس نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی۔ پھر وہ اس کے کچھ دیر سوچتا رہا۔ یہ تو پہلی رات ہے۔ ”ہا۔“ اور ایک سال میں 365 راتیں ہوتی ہیں۔

اس کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ بہت ناخوش تھا۔ کچھ سوچنے کا قابل بھی نہیں تھا۔ وہ یہ ہے کہ اس نے اتار سنگھ کے گھر میں سوچنے کی کوشش کی مگر اس سے اس کے بارے میں کچھ نہیں آتا تھا۔ سواب حور بانو کے لیے ہر حال ان کے انتظار کا تھا۔ آپ ہی آپ نمکرائی رہتی۔ بار بار چلن کی طرف جاتی۔ لکھے وہاں کھڑی رہتی اور پھر لوٹ آتی۔ وہ بہت کم گو لیکن خوش مزاج ہو گئی تھی۔

اس نے اپنی ڈائری نکالی اور بڑی بے دلی سے قلم اٹھایا۔ اس نے لکھنے میں مجھو ہو گیا۔ اس ڈائری کے قلم کے قلم کی کہانی بھی بڑی عجیب تھی۔ وہ لکھنے میں کچھ دوشی ہوتے ہیں قلم کے نہیں۔ پھر اس کا بکیر الگ۔ اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ لکھے گا۔

یاد تہ تعلیم میں اس کا روم میٹ امان ڈاڑھی لکھا کرتا تھا۔ اسے ڈائری لکھنے دیکھ کر ہمیشہ اچھا لگتا تھا۔ یہ تم کیا لکھتے ہو ڈائری میں؟“ اس نے امان سے پوچھا تھا۔

”اس بیٹی... امان نے اسے نالے کی کوشش کی۔“

”یہ ڈائری ہے پرتاپ سنگھ۔ اور ڈائری بڑی ذاتی چیز ہے۔ سوری... یہ میں تمہیں نہیں دکھا سکتا۔“

”کیوں بھی؟ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ میں بس چاہتا ہوں کہ تم اس میں کیا لکھتے ہو۔“

”میں تو میں تمہیں سمجھا رہا ہوں... امان نے کہا۔ اس کی بات میں معذرت تھی۔ ”ڈائری میں آدمی وہ باتیں لکھتا ہے جو وہ کسی سے نہیں کر سکتا۔ کسی سے بھی نہیں۔ تو جو وہ کسی سے نہیں لکھتا وہ کسی کو پڑھا بھی نہیں سکتا۔ اسی ڈائری بڑی ذاتی چیز ہوتی ہے۔“

”میں تو نہیں سمجھ پایا۔“

”میں سیدھی بات ہے۔ ڈائری خود دکھائی ہے... ایک لمحے کے لیے۔“

”تو ان گھما کر کیوں پکڑتے ہو؟ خود سے باتیں کرو۔“

امان ہنسنے لگا۔ ”یہ بتاؤ تم مجھے خود سے باتیں کرتے دیکھو گے تو کیا سمجھو گے۔“

ٹھا کر نے چند لمحے غور کیا پھر بولا۔ ”پاگل ہی سمجھ سکتا ہوں۔“

”بس اس لیے میں خود سے باتیں نہیں کر سکتا۔ وہ باتیں ڈائری میں لکھ لیتا ہوں۔“

”میری سمجھ میں ایک بات اور نہیں آئی۔“ ٹھا کر نے کہا۔ ”ایسی کون سی باتیں ہو سکتی ہیں جو منٹ کسی سے نہیں کر سکتا۔“

اس بار امان کو حیرت ہوئی۔ ”کمال کرتے ہو۔ ارے آدمی سوچنے والا جانور ہے۔ دماغ ہر وقت کام کرتا رہتا ہے۔ اس میں کیسے کیسے خیال آتے ہیں۔ اگر وہ کسی سے کہے تو وہ اسے برا بہت برا سمجھنے لگے۔ آدمی تمام باتیں کسی سے نہیں کر سکتا۔“

”اپنے سب سے اچھے دوست سے بھی نہیں؟“

امان نے نفی میں سر ہلایا۔

”میں تمہارا بہت اچھا دوست ہوں۔ اور تم جانتے ہو کہ راز رکھنا بھی جانتا ہوں۔ تم مجھے کوئی ایسی بات بتاؤ کہ تو مجھ سے آگے کسی نہیں جانے گی۔“

”میں جانتا ہوں یہ بات۔“ امان نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”مگر بھائی، بہت سی باتیں میں تم سے بھی نہیں کر سکتا۔“

”بھروسہ نہیں ہے مجھ پر۔“ ٹھا کر کے لہجے میں خفگی تھی۔

”یہ بات نہیں۔ بھروسہ ہے لیکن بہت سی باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو آدمی خود سے بھی کرے تو شرمندہ ہو جاتا ہے۔ میں وہ باتیں خود سے نہیں کر سکتا۔ تم سے کروں گا تو پھر بھی تم سے نظر نہیں ملا سکوں گا۔ تمہارا سامنا کرنے سے گھبرانے لگوں گا۔ شاید تمہیں چھوڑ ہی بیٹھوں۔“

”تب تو مجھ بتانے کی ضرورت بھی نہیں...“ ٹھا کر نے جلدی سے کہا۔ ”میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔“

”چلو بات تمہاری سمجھ میں تو آئی... امان بولا۔ ”اب یہ بتاؤ کہ ایسا تمہارے ساتھ بھی ہوتا ہوگا۔ تو تم کیا کرتے ہو؟“

”مجھے کبھی اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ ہم ٹھا کر لوگ تو ہر بات صاف کرنے کے قائل ہیں۔ میرے دل میں جو بھی آتی ہے میں کسی سے بھی کہہ دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ مجھے کسی سے ڈر نہیں لگتا۔“

امان نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ ”اتنا مت اکرؤ۔ ابھی تم اس سے محفوظ ہو۔ لیکن یہ وقت ہر

انسان پر تاج ہے۔“

”مجھ نہیں آئے گا۔“ ٹھاکر نے بڑے یقین سے کہا۔
اس کے بعد بھی برسوں گزرے۔ ٹھاکر کا یقین سلامت رہا۔ اس کی زندگی میں کبھی کوئی پوشیدہ... خفیہ موڑ نہیں آیا۔
دوسرے وہ صاحب اقتدار تھا۔ کسی سے کچھ بھی کہہ سکتا تھا۔
پھر جب ٹھاکر کی کا دیہانت ہو اور ادارت سنگھ کے تعلیم کے سلسلے میں دہلی چلا گیا تو وہ اکیلا رہ گیا۔ وہ ایسی تنہائی میں جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ زندگی جیسے رنگ رنگ کر چلنے لگی اور وہ رنگینا بھی برائے نام تھا۔ وقت گزرتا ہی نہیں تھا۔ صبح سے شام کا انتظار رہتا۔ شام رات کے خوف میں گزرتی اور رات صبح کی آرزو میں نکلتی۔ چند ہی دنوں میں وہ اندر سے بیمار ہو گیا۔

گاؤں میں جمال دین کے علاوہ کوئی ایسا نہیں تھا جس سے وہ قربت محسوس کرتا ہو۔ شام کے بعد جمال دین کا اس کے پاس آنا اور وقت گزارنا معمول بن گیا۔
ادارت سنگھ کی پیدائش سے پہلے ایک ہی خواب جو اس نے اور بچپن سے ایک ہی رات دیکھا تھا، درخت کا سونٹا، جذوب کی آمد اور اس کی باتیں ادارت سنگھ کا اس کے کمرے میں پہنچنا۔
پھر ادارت سنگھ جس خاص حال میں پیدا ہوا تھا، جس کی وجہ سے دائی راج اور شامنی کی شامت آگئی تھی، پھر ادارت سنگھ کا دودھ سے انکار اور جدیدہ کا دودھ پینا... یہ سب ایسے معاملات تھے جنہیں وہ برسوں سے سینے میں چھپائے بیٹھا تھا۔ وہ ان پر کسی سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں بے شمار سوالات تھے۔ وہ بہت کچھ واضح طور پر جانتا... سمجھنا چاہتا تھا۔

ایک اعتبار سے جمال دین اس کا ہم راز تھا۔ ان میں سے کم از کم ایک معاملے سے واقف تھا۔ پھر اپنی فطرت، اپنی عادات اور اپنے کردار سے اس نے ٹھاکر کا دل جیت لیا تھا۔ ٹھاکر تو اسے اپنا دوست ہی سمجھتا تھا۔ لیکن وہ خود اسے زمین دار کا اور خود کو رعیت کا درجہ دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے درمیان کبھی بے تکلفی کی فضا پیدا نہیں ہو سکی۔

ٹھاکر نے کئی بار جمال دین سے اس موضوع پر بات کرنے کا ارادہ کیا لیکن ہمت نہ ہوئی۔ اسے امان کی بات یاد آئی اور تسلیم کرنا پڑا کہ وہ ٹھیک کہتا تھا۔ کچھ باتیں آدمی کسی سے نہیں کر سکتا... خود سے بھی نہیں!

یوں پہلی بار اس نے ڈائری لکھنی شروع کی۔

گاؤں میں رات جلدی ہو جاتی ہے۔ ٹھاکر کے حساب

سے جمال دین جلدی گھر چلا جاتا تھا۔ وجہ یہ بھی تھی کہ ٹھاکر نیند آنی ہی نہیں تھی۔ یہی اسے مطالعے کی طرف لے گئی۔
مطالعے نے ڈائری کی اہمیت اور بڑھادی۔ اب تو قریباً کچھ ایسا تھا جس پر وہ کسی سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ ڈائری لکھنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔
ڈائری لکھنے کی افادیت تو وہ پہلے ہی سمجھ چکا تھا۔ ڈائری لکھنے کے بعد وہ بوجھل نہیں رہتا تھا۔ ہلکا ہوا جاتا تھا۔ مگر آج اس پر ڈائری لکھنے کا ایک اور فائدہ تھا۔ جس وقت وہ کمرے میں آ کر بیٹھا تھا تو سب سے پہلے اس نے مطالعے کی کوشش کی مگر وہ ارکان سے محروم تھا۔ مطالعے کے باوجود اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ دل لگ ہی نہیں رہا تھا لیکن اب ڈائری لکھنے کے بعد وہ ہلکا ہوا تو اس نے کتاب اٹھائی اور سرسری طور پر اسے دیکھا۔ فوراً ہی اس نے دل کتاب میں لگ گیا۔ وہ مطالعے میں مجھو ہو گیا۔
جو کتابیں وہ پڑھتا تھا، اپنے نفس مضمون کے اعتبار سے بہت بھاری تھیں۔ شوق ہونے کے باوجود ایک حصے سے مطالعہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس حد سے بڑھ کر مطالعہ کرتا تو کچھ نہ آتا۔ لگتا تھا، خالی لفظوں سے سرگراں ہے۔ ایسے سمجھ جاتا کہ اب مطالعہ چھوڑنے کا وقت آ گیا ہے۔ اب مطالعے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکے گا۔

اس وقت بھی یہی ہوا اور اس نے کتاب بند کر کے طرف رکھ دی۔
اس نے گہری سانس لے لڑکھڑی میں وقت دیکھا۔ رات آدھی سے زیادہ بھٹی گئی اور اس کے بال کر کے بکھڑے رہا تھا۔ وہی پرانا والا مسئلہ اس کے سامنے کھڑے کھڑے ادارت سنگھ کے جانے کے بعد اسے نیند کم ہی آتی تھی۔
وہ کمرے میں بے چینی سے، ادھر سے ادھر اور ادھر ادھر ہٹتا رہا۔ یہاں تک کہ اسے ٹھکنے کا احساس ہونے لگا۔
دماغی طور پر تو وہ پہلے ہی تھک چکا تھا۔ ڈائری لکھنے اور مطالعے کے بعد دماغی ٹھکنے تو ہوتا ہی تھی۔ اور اب جسم بھی تھک گیا تھا۔
ٹھکنے کا تقاضا تھا کہ وہ لیٹ جائے۔ سو وہ لیٹ گیا۔
کے بعد وہی کروٹیں بدلنے کا پرانا معمول... کچھ دیر وہ بدلتا رہا۔ اس وقت ادارت سنگھ اسے شدت سے یاد آ رہا تھا۔ وہ اس سے لپٹ کر لیٹتا تھا۔ اس نے ہاتھ پھیلانے اور پاؤں کے ہاتھ نے ادارت سنگھ کو چھو لیا۔

اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ ادارت سنگھ کا تکیہ تھا۔ کمرے میں رات جلدی ہو جاتی ہے۔ ٹھاکر کے حساب سے جمال دین جلدی گھر چلا جاتا تھا۔ وجہ یہ بھی تھی کہ ٹھاکر نیند آنی ہی نہیں تھی۔ یہی اسے مطالعے کی طرف لے گئی۔
مطالعے نے ڈائری کی اہمیت اور بڑھادی۔ اب تو قریباً کچھ ایسا تھا جس پر وہ کسی سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ ڈائری لکھنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔
ڈائری لکھنے کی افادیت تو وہ پہلے ہی سمجھ چکا تھا۔ ڈائری لکھنے کے بعد وہ بوجھل نہیں رہتا تھا۔ ہلکا ہوا جاتا تھا۔ مگر آج اس پر ڈائری لکھنے کا ایک اور فائدہ تھا۔ جس وقت وہ کمرے میں آ کر بیٹھا تھا تو سب سے پہلے اس نے مطالعے کی کوشش کی مگر وہ ارکان سے محروم تھا۔ مطالعے کے باوجود اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ دل لگ ہی نہیں رہا تھا لیکن اب ڈائری لکھنے کے بعد وہ ہلکا ہوا تو اس نے کتاب اٹھائی اور سرسری طور پر اسے دیکھا۔ فوراً ہی اس نے دل کتاب میں لگ گیا۔ وہ مطالعے میں مجھو ہو گیا۔
جو کتابیں وہ پڑھتا تھا، اپنے نفس مضمون کے اعتبار سے بہت بھاری تھیں۔ شوق ہونے کے باوجود ایک حصے سے مطالعہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس حد سے بڑھ کر مطالعہ کرتا تو کچھ نہ آتا۔ لگتا تھا، خالی لفظوں سے سرگراں ہے۔ ایسے سمجھ جاتا کہ اب مطالعہ چھوڑنے کا وقت آ گیا ہے۔ اب مطالعے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکے گا۔

اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ ادارت سنگھ کا تکیہ تھا۔ کمرے میں رات جلدی ہو جاتی ہے۔ ٹھاکر کے حساب

اس کا دل طمانیت سے بھر گیا۔ اس نے نیکی کو اپنی طرف سے لکھا اور یوں سینے سے لگایا جیسے وہ ادارت سنگھ ہے۔
اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ سکون اس کے لیے قابل یقین تھا۔ ادارت سنگھ جاتے جاتے مجھے یہ تحفہ دے گیا۔ اس نے سوچا۔ شاید اب اس کی جدائی کا سے اتنا سخت نہیں گزرے گا۔

اس کا خیال درست تھا۔ کچھ دیر وہ اس نیکی کو لپٹا رہا۔ پھر کب اسے نیند آئی، اسے پتا ہی نہ چلا۔ اور وہ بہت دیر ہی نیند میں رہا۔
مولوی صاحب گھرانہ سب کے ساتھ آئے تھے۔ وہ کچھ دیر بھی پھر انھوں نے کہا۔ ”ادارت سنگھ کب مل چلتا ہوں؟“
”کہاں مولوی صاحب؟ کہاں مجاہد کے آپ؟“
ادارت سنگھ نے حیرت سے کہا۔
مولوی صاحب کو اس کی حیرت پر حیرت ہوئی۔ ”ارے بھائی، گھر اور کہاں جاؤں گا؟“ انھوں نے کہا۔
”ادارت سنگھ نے حیرت سے دہرایا۔
”ہاں بھئی، جہاں میں رہتا ہوں۔ میرے بچے ہیں۔“
ادارت سنگھ کو شک لگا۔ اتنے دن مولوی صاحب اس کے گھر رہے تھے کہ وہ یہ سب بھول ہی گیا تھا۔ وہ بھول گیا تھا کہ مولوی صاحب دہلی میں رہتے ہیں۔ ان کا گھر ہے، بیوی بچے اور وہ اسی اسکول میں پڑھاتے بھی ہیں جہاں وہ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اب وہ اپنے گھر تو جائیں گے۔ اور وہیں اس کے وہ اداس ہو گیا۔ تو اب وہ ان کی خدمت سے... ان کا دل دبانے سے محروم ہو جائے گا!

کچھ دیر اور زکین نامولوی صاحب۔“ اس نے کہا۔
مولوی صاحب نے جواب نہیں دیا۔ بس بیٹھ گئے لیکن اب ان کے صرف چہرے پر نہیں تھا۔ ان کا جسم تک مرتعش تھا۔ ادارت سنگھ نے انھیں غور سے دیکھا۔ اس بار بات ایک لمحے کی سمجھ میں آ گئی۔ گھر کو اور بیوی بچوں کو ترسے ہوئے مولوی صاحب کے لیے اس وقت ایک پل بھی یہاں نہ کرنا تھا۔ ان کا بس چلتا تو اڑ کر گھر پہنچ جاتے۔ اسے احساس ہوا

اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ ادارت سنگھ کا تکیہ تھا۔ کمرے میں رات جلدی ہو جاتی ہے۔ ٹھاکر کے حساب

کہ اس وقت اس نے ان پر بڑا ظلم کیا تھا۔
”مجھے معاف کر دیجیے مولوی صاحب! آپ جائیے... گھر جائیے آپ۔“ اس نے کہا۔
”چلا جاؤں گا۔ اب تین دن بعد اسکول کھل رہے ہیں۔ اس کے بعد یہ دیکھنا ہوگا کہ میں تمہیں کب وقت دے سکوں گا۔“
”جی... جی ہاں۔“
”تو اب یہ سمجھ لو کہ ایک ہفتے کی چھٹی۔ اس کے بعد پڑھائی کا وقت طے کریں گے۔“

ایک ہفتے کے لیے عربی پڑھنے کی چھٹی! یہ ادارت سنگھ کے لیے تکلیف دہ بات تھی لیکن اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ مولوی صاحب کو اپنے پچھڑے ہوئے بیوی بچوں کے لیے کچھ وقت تو ملنا چاہیے۔ پھر اسے کٹھن کا خیال آ گیا۔ وہ بھی تو بے تاب ہو رہا تھا کہ شام ہو اور وہ کٹھن پر جائے۔
”جی مولوی صاحب جیسا آپ مناسب سمجھیں...“ اس نے کہا۔ ”میں اتنے دن اپنا سبق دہراتا رہا ہوں گا۔“
مولوی صاحب چلے گئے۔

اگلے چند گھنٹوں میں زندگی کے معمولات پھر سے جاری ہو گئے۔ گھو بازار جا کر سودا لایا۔ اتنی دیر میں رنجنا نے گھر کی صفائی کر ڈالی۔ گھو سودا لے کر آیا اور وہ رسوئی میں جا گئی۔ تین گھنٹے بعد وہ دہلی میں پہلا کھانا کھا رہے تھے۔
ادارت سنگھ کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ بہت بے چین، بہت مضطرب تھا۔ اس وقت اسے نہ اسکول کا خیال تھا نہ اسکول کی پڑھائی کا اور نہ ہی اسے عربی کی پڑھائی کی فکر تھی۔ اس کے دماغ پر تو صرف کوٹھا سوار تھا۔ وہ یونہی وقت گزاری کے لیے کاتی پرشادی سے اور کبھی وصال دین سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ اس کی بے تابی ایسی تھی کہ وقت سے کچھ پہلے ہی وہ کٹھن پر چلا گیا۔

رنجنا اوپر آ کر صفائی کر گئی تھی۔ کرسیاں اس نے جھاڑ پونچھ کر ترتیب سے رکھ دی تھیں۔ اس لیے کوٹھا دیا ہی لگ رہا تھا جیسا وہ اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس بار اس نے کتابیں ساتھ لانے کا تکلف بھی نہیں کیا تھا۔
وہ بیٹھ کر ادھر ادھر دیکھتا... جائزہ لیتا رہا۔ لیکن گرد و پیش سے درحقیقت اسے ایسی کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ وہ محض وقت گزاری تھی۔ چند منٹ میں ہی وہ اکتا گیا تو اٹھ کر ٹہلنے لگا۔
دیر ہو گئی مگر وہ آواز سنائی نہیں دی جس کا انتظار وہ دوماہ سے کر رہا تھا۔ پہلے تو وہ یہی سمجھتا رہا کہ وہ وقت سے کافی پہلے

اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ ادارت سنگھ کا تکیہ تھا۔ کمرے میں رات جلدی ہو جاتی ہے۔ ٹھاکر کے حساب

اوپر آگیا ہے۔ مگر پھر اسے گڑبڑ کا احساس ہونے لگا۔ اس کا دل اندیشوں سے بھر گیا۔ ان دو مہینوں کی ذوری میں ایسا کیا ہو گیا کہ آج وہ آواز سنانی نہیں دے رہی۔ کہیں وہ... اس کہیں وہ کے آگے متعدد امکانات تھے جن پر وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ اس کے ٹھٹھنے کی رفتار دوڑنے کے برابر ہو گئی ہے۔ اسے یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ نیچے سے کوئی اسے دیکھ رہا ہے!

دوماہ سے تری ہوئی حور بانو کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ وہ چھوٹے ٹھا کر کی ایک جھلک دیکھ چکی تھی اور اس جھلک نے اسے اور بے تاب کر دیا تھا۔ وہ بار بار دالان کے پکر لگا رہی تھی۔

پھر اس نے اون کا گولا اپنی سلاخیاں اور ادھ بٹنا سویر اٹھایا اور دالان میں پڑے تخت پر آ بیٹھی۔ لیکن اس کی سلاخیاں حرکت میں نہیں تھیں۔ اس کیفیت میں وہ بیٹے کی کوشش کرتی تو یقیناً غلط پھندے ہی ڈالتی۔

وہ وہاں بیٹھی رہی۔ اس کی نظریں ناکمل سویر پر تھیں لیکن ساعت اوپڑالے مکان کی آوازوں پر مرموز تھی۔ عقل اسے کبھی تھی کہ وہ شام کو اسی مخصوص وقت میں کوٹھے پر جائے گا۔ مگر دل مُصر تھا کہ وہ یہاں بیٹھ کر انتظار کرے۔ کون جانے آج وہ جلدی ہی آ جائے۔

زینے پر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ بغیر دیکھے وہ بتا سکتی تھی کہ وہ رنجنا ہے۔ لیکن پھر بھی اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ وہ رنجنا ہی تھی جو ہاتھ میں جھاڑو لیے کوٹھے پر جا رہی تھی۔

اس کا وہاں بیٹھنا فائدہ مند ثابت ہوا۔ اس بار قدموں کی آہٹ وہ تھی جس کے ساتھ اس کا دل بے ترتیب ہو کر دھڑکتا تھا۔ وہ اس کی توقع سے خاصا پہلے اوپر جا رہا تھا ورنہ اس کے اوپر جانے کا وقت مخصوص تھا۔

اس کی نظریں اوپر اٹھیں اور جرم کر رہ گئیں۔ چند لمحے بعد چھوٹا ٹھا کر اس کے جھٹکے گاں میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کتابیں نہیں تھیں۔ وہ اوپر پہنچا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب وہ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا جیسے گرد و پیش سے دو ماہ کا ٹوٹا ہوا اعلق پھر سے جوڑ رہا ہو۔

پھر وہ اٹھا اور ٹھٹھنے لگا۔ حور بانو کی نگاہیں اس کی ایک ایک حرکت پر جمی تھیں۔ وہ والہانہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

کچھ اور وقت گزر گیا۔ وہ اب بھی ٹھٹھ رہا تھا مگر حور بانو کو ایک غیر محسوس تبدیلی کا احساس ہو رہا تھا۔ اپنی وارث کی وجہ سے وہ شعوری طور پر تو اسے محسوس نہیں کر سکتی تھی لیکن اس کے لاشعور نے اسے سمجھ لیا تھا۔ چنانچہ اب وہ غور کر رہی تھی۔ پھر بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ چھوٹے ٹھا کر کی رفتار بڑھ گئی تھی۔ یہی نہیں اس کے جسم کا ایک ایک عضو اس کے اندرونی اضطراب کا اظہار کر رہا تھا۔

حور بانو سوچ میں پڑ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے محض چند لمحوں میں یہ تبدیلی کیسی؟ وہ آکر بیٹھا تو پُرسکون تھا۔ پھر اس نے کہا شروع کیا، تب بھی وہ اوپر تھا۔ مگر اچانک ہی وہ مضطرب ہو گیا۔ کیوں؟

وہ اس پر سوچتی۔ مگر اسے موقع ہی نہیں ملا۔ ”حور بانو عصر پڑھ لو۔ استانی جی آتی ہی ہوں گی۔“ اسی سے بکا رہا۔

”جی آئی! وضو کر کے آتی ہوں۔“

اس نے اٹھ کر سلاخیاں اون کا گولا اور ادھ بٹنا سویر اور کابلی سے غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔ وضو کرتے کرتے بھی وہ کوٹھے کی طرف دھبکتی رہی۔ چھوٹے ٹھا کر کی رفتار اس کا اضطراب اور بڑھ گیا تھا۔ وہ کسی عجیب ہی کیفیت میں تھا۔ اور حور بانو اسے سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن اس کی میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ یہ اچانک ہو گیا ہے۔

وہ نماز پڑھ رہی تھی کہ استانی جی آ گئیں۔ تینوں ہاتھوں سے پڑھنے بیٹھ گئیں۔

استانی جی بہت اچھا پڑھانی تھیں۔ ان کا انداز پڑھانے کا عجیب تھا۔ وہ ایسی فضا بناتی تھیں کہ اس سے ہاتھ پاؤں ٹھنک جاتے۔ لیکن اس دن حور بانو کا دل کوٹھے پر اٹکا ہوا تھا۔ چھوٹے ٹھا کر کے اچانک مضطرب ہونے پر غور کر رہی تھی۔ پڑھانی ختم ہوئی تو مغرب کا وقت ہو گیا تھا۔ اس نے مغرب کی نماز پڑھی۔ نماز پڑھتے ہی حور بانو دالان کی طرف لپکی۔ اس نے سلاخیوں کو اٹھانے کا تکلف بھی نہیں کیا۔ بیٹھتے ہی اس نے نظریں اٹھا کر کوٹھے کی طرف دیکھا۔ وہاں اندھیرا تھا۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ کچھ دیکھ سکتا۔ چھوٹا ٹھا کر وہاں موجود تھا۔

آس ایک بہت تلے اور کم زور دھاگے کی طرح اور وہ کبھی بھی کسی بھی تھکے وہ آواز ایک بار پھر اٹھا۔

کی۔ لیکن ہرگز روتے لمحے کے ساتھ وہ کم زور دھاگا بھی اوتار سکے کے ہاتھ سے پھسلا جا رہا تھا۔ پھر مغرب کی اذان شروع ہوئی۔ اوتار سنگھ یہ تو نہیں جانتا تھا کہ یہ کیسی آواز ہے اور اس کا کیا مطلب ہے مگر وہ اتنا جانتا تھا کہ جس آواز سے اسے عشق ہوا تھا وہ نسوانی آواز اس آواز سے پہلے خاموش ہو چکی تھی۔ آس کا وہ کم زور دھاگا بھی ٹوٹ گیا!

اوتار سنگھ کی کیفیت بہت عجیب تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی بہت اہم چیز اس سے چھن گئی ہے۔ مایوسی ایسی تھی جیسے وہ اپنی کچھ بچاوی نہ ہو۔ باہر جھٹ پنے کاں تھا لیکن اس کے اندر تو جیسے گھپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ ٹھٹھنا موقوف کر کے وہ بیٹھ گیا اور یوں بیٹھ کر خود اسے بھی اس بات کا احساس تھا۔ اس نے ہاتھ پاؤں کی کوشش کی مگر ہاتھ تو کیا، اس سے ایک انگلی بھی نہیں ہلائی گئی۔

”یہ کیا ہوا ہے میرے ساتھ؟ یہ کیا ہو گیا ہے مجھے۔“ اس نے گہرا کر سوچا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے مجھے؟ موت ماییت خوف زدہ کیا یہی موت ہے؟ کیا میں مر گیا ہوں؟ موت ساکت ہو جانے کا ہی تو نام ہے۔“

لیکن وہ پہچانتے ہوئے ذہن کا آدمی تھا۔ بدترین صورت میں اس کا ذہن کا فزنی تجربہ کرنے کی راہیں نکال لیتا تھا۔ ماں کی موت جیسے درد پر بھی اس کا ذہن سوچنا نہ تھا۔ اس کے ذہن اس کا ذہن سوچ رہا تھا۔

ہناں چہ اس کے بعد ایک تردید ابھری۔ نہیں یہ موت اس کی موت تو سب کچھ ختم کر دیتی ہے۔ ماسٹر جی کہتے تھے کہ موت اس کی زندگی کے تمام دکھوں تمام پریشانیوں کو مٹا دیتی ہے۔ منٹ تمام بکھیرلوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ نجات ملتی ہے جب کہ وہ تو اس وقت بہت زیادہ دکھی، بہت زیادہ غمزدار اور ہارے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ زندہ ہے۔

مگر جس طرح بالکل اچانک اس کے اندر گھپ اندھیرا ہوا تھا۔ اب بالکل اچانک اس گھپ اندھیرے میں روشنی کی کرنیں کرن چکی۔ وہ تھا سارا ایک روشن نقطہ تھا۔ اس کے دل میں امید جاگ اٹھی۔ شاید ایسا ہے کہ نیچے والی لڑکی نے وقت کو روک دیا ہے۔ ابھی کچھ دیر بعد یا زیادہ دیر بعد یہ بحال وہ آدمی آئے گی اور یہ اندھیرا روشنی میں تبدیل ہو جائے گا۔

اس نے انہیز بات یہ سمجھی کہ اس کے دل اور دماغ دونوں اس لمحے کے یہ بہت مہموم امید ہے۔ بے حدود راز کار۔ اس

کے باوجود اس کے اندر اس امید کے لیے قبولیت پیدا ہو گئی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے فضا بدلی اور دل نے بھی اس امید کے دھاگے کو تھام لیا۔ پڑوس کے گھروں میں کونھوں پر روشنی ہوئی تو اس کا کونھا بھی کچھ روشن ہو گیا۔ ساتھ ہی اندر کے اندھیرے میں بھی کچھ کمی ہوئی۔ کچھ یوں بھی تھا کہ اس نے اپنا دھیان اصل مسئلے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔

مگر وہ مایوس اب بھی تھا۔ دوماہ وہ اس آواز سے محروم رہا تھا اور ان دو مہینوں کے ہر دن اور ہر دن کے ہر لمحے اس نے یہی سوچا تھا کہ چھٹیاں ختم ہوں گی وہ دہلی جائے گا اور وہ آواز سنے گا۔ لیکن آنے کے بعد پہلے ہی دن اسے مایوسی ہوئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہاں سب کچھ بدل گیا ہے۔ کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہا ہے۔ اور زیادہ مایوسی کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ سوچ رہا تھا۔ شاید یہ تبدیلی مستقل ہے... شاید اب وہ بھی یہی آواز نہیں سن سکے گا اور اس کا یہ سوچنا فطری بھی تھا۔

اس مہموم امید کے تحت وہ اب بھی انتظار کر رہا تھا لیکن وہ غم دلانہ انتظار تھا۔ اندر کی مایوسی کا عکس اس کے چہرے پر صاف نظر آ رہا تھا۔

پھر اس کی سوچ کا رخ بدلا۔ اسے ایک خیال آیا۔ یہ اس کے اندر گھپ اندھیرے میں امید کی وہ ایک کرن کہاں سے آئی؟ اسے ماں کی موت یاد آئی۔ کیسے ابے لگ رہا تھا کہ سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ وہ جی ضرور رہا ہے سانس بھی لے رہا ہے لیکن زندہ ہو کر بھی زندہ نہیں ہے۔ پھر چند ہی دنوں میں وہ اتنا بزرگ خود بہ خود بچھل گیا تھا۔ اس نے پھر سے بڑنا یوں شروع کر دیا تھا۔ اس وقت اُس نے سوچا تھا کہ وہ مہمانوں کا مہمان جو دنیا کا نظام چلا رہا ہے بہت مہربان ہے۔ وہ آتما کے گھرے زخم بغیر کسی دوا کے بھردیتا ہے۔ اور آج اس نے دیکھا تھا کہ وہ مہربان گہری مایوسی کے اندھیروں کو امید کی روشنی دیتا ہے۔ جیسے وہ کسی کو مایوس نہیں دیکھنا چاہتا۔

اس کے ساتھ ہی اوتار سنگھ کو خیال آیا کہ بہت دنوں سے اُس نے اس انداز میں... اس اوپر والے بھگوان کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ حالاں کہ وہ تو اس کی جستجو کر رہا تھا۔ وہ اسے جانتا اسے سمجھتا چاہتا تھا تا کہ وہ اس سے محبت کر سکے کیوں کہ سب سے زیادہ محبت تو صرف اسی کا حق ہے۔ آخر وہ اپنی اس جستجو سے ڈور کیسے ہوا۔ کیوں ہوا؟ اس پر اُس نے سوچا تو وہ حیران رہ گیا۔ یہ تبدیلی تو اسی دن سے آئی

تھی جب اس نے پہلی بار نیچے والی لڑکی کی آواز سنی تھی۔ یہ تو طے ہے کہ اسے نہ صرف اس آواز سے... بلکہ آواز والی سے بھی محبت ہوگئی تھی۔ تو اس محبت نے اسے بدل ڈالا تھا۔ اس کے مزاج، اس کے معمولات تک کو بدل دیا تھا۔ واقعی محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔

پھر اسے ایک اور خیال آیا۔ اگر وہ اوپر والے بھگوان سے محبت کرنے کے قابل ہو جائے تو وہ محبت، یقیناً دنیا کی سب سے بڑی محبت ہوگی۔ اس کے دل نے فوراً اس کی تائید کی۔ بے شک وہ اس محبت سے بہت بڑی ہوگی جو اسے اس آواز والی لڑکی سے ہے۔ اور اس لڑکی کی محبت میں وہ اتنا کچھ بھول گیا کہ اسے اپنی جستجو بھی یاد نہ رہی تو اس محبت میں اس کا کیا ہوگا۔ کیا وہ سب کچھ بھول جائے گا، حتیٰ کہ خود کو بھی!

”بھائی، کب سے یہاں بیٹھے ہوئے ہو۔ تمہیں ہوش ہی نہیں۔ کب سے تمہیں آواز دے رہا ہوں۔ تم ٹھیک تو ہو؟“ اس نے چونک کر وصال دین کو دیکھا جو عین اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ”کیا... کیا بات ہے ویرجی؟ کیا لہجہ ہے ہو؟“ اس نے گڑبڑا کر کہا۔

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے بھائی؟“ وصال دین کے لہجے میں پریشانی تھی۔

”میں ٹھیک ہوں۔ مجھے کیا ہو گیا؟“

”اتنی آوازیں دینے لگی ہیں۔ میں تمہارے سامنے کھڑا تھا اور تم مجھ کو محبت ہی نہیں رہے تھے۔“

اب اوتار سنگھ کو احساس ہوا کہ یہ بات وصال دین نے شروع میں بھی کہی تھی۔ لیکن یہ سچ تھا کہ اس کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ اور بے شک وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ لیکن نظر اٹھا کر دیکھنے سے پہلے اسے احساس بھی نہیں تھا۔

شاید وہ اپنے آپ میں بہت زیادہ کھویا ہوا تھا۔

”اچھا اب چلو۔ کھانا کھاؤ۔“ وصال دین نے کہا۔

”ٹھیک ہے چلتا ہوں۔“ اوتار سنگھ اٹھ کھڑا ہوا۔

سچ یہ ہے کہ اسے بھوک بالکل نہیں تھی اور وہ یہاں سے جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن وہ کھانا نہیں کھاتا تو سب لوگ اور خاص طور پر ویرجی کو تشویش ہوتی اور تشویش ہوتی تو وہ اس کی وجوہات پر غور کرتے اور یہ اوتار سنگھ نہیں چاہتا تھا۔

وہ دونوں نیچے چلے آئے۔



دہلی آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا!

اوتار سنگھ کے لیے وہ بدترین محرومی کے سات سخت ترین دن تھے۔ ان سات دنوں میں نہ صرف یہ کہ وہ اس آواز کو سننے کی ہر امید کھو بیٹھا تھا اور پوری طرح مایوس ہو چکا تھا۔ بلکہ ہر لمحے اس کا دل بدترین اندیشوں سے لرزتا رہتا تھا۔ کہیں اسے کچھ ہوتو نہیں گیا۔

وہ اس راز کو راز رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے پوچھ گچھ کرنے کی ہمت بھی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن یہ معاملہ بہت سنگین اور اس کے لیے بہت اہم ہو گیا تھا۔ کہتے ہیں، جہاں چاہ ہے وہاں راہ ہے۔ پھر وہ تو تھا بھی بہت ذہین۔ اس نے ایک ترکیب سوچ لی۔

اس شام وہ پانڈی چوک گیا اور وہاں سے رس ملا لیا لایا۔ پھر اس نے کہا۔ ”نیچے بھی دے آؤ۔“

”جی چھوٹے ٹھاکر۔“

”سنو۔ ہر ایک کے لیے دو تو بولی چاہئیں نا۔ تو تم ایسا کر کہ دس رس ملائیاں قاب میں ڈال کر نیچے دے آؤ۔“ رنجنا نے چند لمحے سوچا، حساب لگا کر پھر بولی۔ ”دو کے حساب سے تو نیچے بارہ دینی ہوں گی چھوٹے ٹھاکر۔“

”وہ کیسے؟“ اوتار سنگھ نے معصومیت سے پوچھا۔

”ہا چھ ہر سر کار۔ تین لڑکیاں، ایک ماں اور دو نوکر۔“

”وہ... میں سمجھا تھا کہ آج جس کوئی ایک ان میں سے گم میں نہیں ہے۔“ اوتار سنگھ نے کہا۔

”نہیں چھوٹے ٹھاکر۔ سب لوگ موجود ہیں۔“

”چلو تو بارہ دے آؤ۔“ اوتار سنگھ کے لہجے میں اطمینان تھا۔ اس بات کی تصدیق ہوگئی تھی کہ کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔ ٹھیک ہے۔

رنجنا نیچے چلی گئی۔ اوتار سنگھ سوچتا رہا۔ اس کا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ وہ بغیر کسی تردد کے کسی طرح کی پوچھ گچھ کر سکتا ہے۔ آخر وہ لوگ اس کے ملازم اور اس کے سامنے چون و چرا نہیں کر سکتے۔ وہ تو اس ڈرتے ہیں۔ تو وہ ان سے کیوں ڈرے! بس اسے ڈرا کر اسے کام لینا ہوگا۔

مگر تھوڑی ہی دیر میں وہ پھر خوف زدہ ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی کو اس پر... اس کی محبت کے بارے میں شک ہو۔ ایسا ہوا تو ملازم جو اس سے ڈرتے ہیں، اس کے گے تو کچھ بھی نہیں۔ لیکن دل میں تو سوچیں گے اور اس بھی گوارا نہیں تھا۔

اسے خیال آیا کہ پچھلے ایک ہفتے میں پریشان ہو کر وہ خاصی بے احتیاطی کر چکا ہے۔ اس کی وجہ اس کا یہ خیال تھا کہ ممکن ہے، نیچے والی نے وقت بدل لیا ہو۔ چنانچہ وہ کھانا کھانے کے بعد دوبارہ کوٹھے پر چلا جاتا تھا۔ وہ وہاں بیٹھا رہتا۔ یہاں تک کہ نیچے اندھیرا ہو جاتا اور رات کے سنائے کے سوا کوئی آواز نہ رہتی۔ اسے یقین ہو جاتا کہ وہ سب سو چکے ہیں۔ تب وہ مایوس واپس آ جاتا۔ وہ اس آواز کے لیے ترس رہا تھا۔ مگر اس سے زیادہ اب وہ آواز والی کے لیے پریشان تھا۔ اسے رہ رہ کر ہول اٹھتے تھے کہ کہیں اسے کچھ ہوتو نہیں گیا۔ اسی لیے آج اس نے یہ بہت کر لی تھی اور اس کے نتیجے میں اسے معلوم ہو گیا تھا کہ لڑکی بہ ہر حال، اپنے گھر میں ہی ہے اور خیریت سے ہے۔

مگر اب وہ گولگی کی کیفیت میں تھا۔ کیا مزید پوچھ کچھ مناسب رہے گی۔ کچھ بھی ہو بس اس کا راز افشا نہیں ہونا چاہیے۔

رہنما واپس آئی تو اس سے رہا نہیں گیا۔ اس نے بڑے سرسری انداز میں کہا۔ ”رہنما یہ نیچے والے شام کے وقت کیا کرتے ہیں؟ کیا مصروفیت ہوتی ہے ان لوگوں کی؟“ اس کی توقع کے خلاف رہنما بالکل نہیں چوکی۔ ”بچیاں پہلے بھی پڑھتی تھیں شام کو۔ اور اب بھی پڑھتی ہیں۔ فرق یہ ہے چھوٹے مالک کہ پہلے خود پڑھتی تھیں، اب ایک ماسٹرنی آئی ہے پڑھانے۔ اور ان کی ماما اور چھمن بوارسوئی میں ہوتی ہیں۔“ اوتار سنگھ ایک دم مطمئن ہو گیا۔ بلکہ وہ خوش ہو گیا۔ حالانکہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اب وہ آواز وہ شاید ہی بھی سن سکے۔ لیکن خوشی اس بات کی تھی کہ وہ لڑکی خیریت سے ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ البتہ یہ بات اداس کن تھی کہ جب تک وہ ماسٹرنی سے پڑھیں گی وہ اس آواز کو سننے سے محروم رہے گا۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ ایسا کب ہوگا۔ مگر اس خوشی اور اطمینان کے سامنے کہ وہ لڑکی خیریت سے ہے، اس اداسی کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

اس روز اوتار سنگھ پر محبت کی ایک اور عظمت عیاں ہوئی۔ محبت ہوتو آدمی کی سب سے بڑی خوشی اس میں ہوتی ہے کہ اس کا محبوب خوش و خرم ہو اور خیر و عافیت سے رہے۔ اپنی خوشی کہیں پیچھے چلی جاتی ہے اور اوتار سنگھ جانتا تھا کہ بے غرضی بہت بڑا انسانی وصف ہے۔

اگلے روز مولوی برکت علی نے اسکول میں اس سے رابطہ

کیا۔ ”برخوردار اوتار سنگھ، اب پڑھائی کا ٹوٹا ہوا سلسلہ جوڑنا چاہیے۔“ انھوں نے کہا۔ ”جو آپ کا حکم مولوی صاحب!“ میں نے بہت سوچا۔ اسکول کی چشمی کے فوراً بعد پڑھا۔ مناسب نہیں۔ ہم دونوں ہی تھکے ہوئے ہوں گے۔ اس لیے میرے خیال میں شام کا وقت مناسب رہے گا۔ یہ بتاؤ، اس وقت تمھاری کوئی مصروفیت تو نہیں؟“ اوتار سنگھ نے چھٹیوں سے پہلے کی شام کے بارے میں سوچا۔ وہ تو اس کے لیے مقدس ترین مصروفیت کا وقت ہوتا تھا۔ لیکن اب سب کچھ بدل چکا تھا۔ وہ دن ہوتے تو وہ مولوی صاحب کو انکار کر دیتا۔

مولوی صاحب اسے بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ ”کیا بات ہے اوتار سنگھ۔ بتاؤ نا، شام کا وقت مناسب رہے گا۔“

”جی نہیں مولوی صاحب۔ یہ وقت بہت مناسب اوتار سنگھ نے کہا۔ دل میں اس نے کہا۔ ”اس وقت تو ٹھیک ہے۔ آج شام کو میں آؤں گا۔“

اوتار سنگھ گھر پر اس بارے میں سوچتا رہا۔ جتنا نام آنے والی مصروفیت اسے بہت بڑی نعمت معلوم ہوئی۔ مولوی صاحب سے وہ غرضی ہی تو سیکھ رہا تھا۔ اور محض اس کی وجہ سے سیکھ رہا تھا۔ اب وہ ان خاص وقت میں اسے سننے سے محروم ہو گیا تھا۔ تو اس وقت کا اس نے اچھا اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ اس میں مولوی صاحب سے آخر میں وہ ان سے کچھ سنا بھی کرے گا۔ واہ۔

محرومی کا مداوا بھی ہو گیا تھا! اُدھر مولوی صاحب کچھ سوچ کر جھجک اوتار سنگھ کو اس کی حویلی میں پڑھاتے رہے تھے۔ ایک کمر تھا اور پڑھائی کے درمیان انھیں مکمل تھالی یہاں معاملہ مختلف تھا۔ بہ ہر حال، پڑھانا تو تھا۔ شام کو مولوی صاحب آئے۔ وہ وہی خاص چھٹیوں سے پہلے اوتار سنگھ کو کھٹے پر جاتا تھا اور وہ اب جب کہ آواز کا سلسلہ رک چکا تھا تو اب اس وقت ہوتا تو اس کے قدم اوپر جانے کے لیے۔ ”مولوی صاحب، میرا دل چاہتا ہے کہ

مجھے پڑھائیں۔“ اس نے کہا۔

”جو تم مناسب سمجھو اوتار سنگھ۔“

”جی نہیں۔ فیصلہ تو آپ ہی کریں گے۔ چلیں... میں آپ کو کوشا دکھا دوں۔“

اوتار سنگھ مولوی صاحب کو اوپر لے گیا۔ کوشا دیکھ کر مولوی صاحب کا دل خوش ہو گیا۔ انھوں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور لہذا بیت سے سر ہلاتے ہوئے بولے۔ ”اس سے مناسب جگہ تو وہی نہیں سکتی۔“

اوتار سنگھ بھی خوش ہو گیا۔ ایک خوشی سے... بہت بڑی خوشی سے محروم ہوا تھا۔ مگر اس کا جو بہترین مداوا ممکن تھا وہ ہو گیا تھا۔ ”اور آخر میں آپ مجھے کچھ سنایا کریں گے۔“ یہ کہتے

مولوی صاحب نے اسے تو نہیں بتایا۔ مگر انھوں نے سوچا کہ عصر پڑھ کر یہاں آیا کریں گے کہ یہاں سے جاتے ہیں۔ جامع مسجد میں مغرب پڑھ لیا کریں گے۔ یہ فرمائش اس اور اچھی لگی۔ انھوں نے سوچا کہ یوں وہ مغرب کی اذان سنیں گے۔

”کیوں نہیں اوتار سنگھ...“ انھوں نے شفقت سے کہا۔

مولوی صاحب نے بہت غور سے اسے دیکھا۔ اس کی ہالی پر انھیں پیارا آ گیا۔ ”ٹھیک ہے اوتار سنگھ۔ آج ہی اس ایک معمول دوسرے معمول میں ڈھل گیا۔

مولوی صاحب نے بہت غور سے اسے دیکھا۔ اس کی ہالی پر انھیں پیارا آ گیا۔ ”ٹھیک ہے اوتار سنگھ۔ آج ہی اس ایک معمول دوسرے معمول میں ڈھل گیا۔

مولوی صاحب نے بہت غور سے اسے دیکھا۔ اس کی ہالی پر انھیں پیارا آ گیا۔ ”ٹھیک ہے اوتار سنگھ۔ آج ہی اس ایک معمول دوسرے معمول میں ڈھل گیا۔

اسے دیکھ کر حور بانو کو پہلے جیسی خوشی ہوتی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس کی دید و بار مل گئی ہے۔ لیکن اس کی اداسی دیکھ کر اس کا دل کٹنے لگا تھا۔ وہ خود بھی اداس ہو جاتی تھی۔ وہ دعا کرتی کہ چھوٹے ٹھاکر کی اداسی دور ہو جائے۔

ایک تبدیلی اور آئی تھی۔ چھوٹا ٹھاکر اب دیر تک کوٹھے پر بیٹھا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ مسلمان لڑکا اسے بلانے کے لیے آتا تھا اور پھر وہ نیچے چلے جاتے تھے۔ تیسرے چوتھے دن ایک ضرورت کے تحت حور بانو انھی اور بیت الخلا کی طرف گئی۔ اس وقت رات کافی ہو چکی تھی۔ اتفاقاً طور پر اس کی نظر انھی اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ چھوٹا ٹھاکر کوٹھے پر بیٹھا ہے۔

وہ بیت الخلا سے آ کر کچھ دیر دالان میں بیٹھی اور چھوٹے ٹھاکر کو دیکھتی رہی۔ وہ اس وقت زیادہ ہی مضطرب تھا۔ بیٹھے ہوئے بھی اس کے چہرے کا تاثر پل پل بدلتا رہتا۔ اور ہر دو منٹ بعد وہ اٹھ کر ٹھٹھنے لگتا۔

حور بانو کا بس چلتا تو وہ وہاں بیٹھی رہتی۔ لیکن وہ بے وقت تھا اور وہ ڈرتی تھی کہیں امی کی آنکھ کھل جائے اور وہ اسے یہاں بیٹھا دیکھ لیں تو وہ انھیں کیا جواب دے گی۔ وہ کیا سوچیں گی اس کے بارے میں۔ اس خوف نے دل چاہنے کے باوجود اسے ٹھہرنے نہیں دیا۔

یہ سلسلہ دو تین رات تک پونہ چلا مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اس کے لیے بہت بڑا ہچکا تھا۔

ایک شام مغرب پڑھ کر وہ دالان میں گئی تو دیکھا کہ کوشا اجڑا ہوا ہے۔ چھوٹا ٹھاکر وہاں موجود نہیں تھا۔ اسے حیرت تو ہوئی مگر کسی غیر معمولی پن کا احساس نہیں ہوا۔ وہ وہیں بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔

لیکن چھوٹا ٹھاکر نہیں آیا۔ کچھ دیر گزری تو وہ بے چین ہو گئی۔ اب ہرگز رات لچھ اسے مایوسی میں مبتلا کر رہا تھا۔ پھر بھی اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔

امی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ”حور بانو! عشا کب پڑھو گی؟“

”اٹھتی ہوں امی۔“ اس نے اٹھ کر وضو کیا، نماز پڑھی۔ پھر خلاف معمول وہ دالان میں واپس آئی۔ لیکن چھوٹا ٹھاکر اب بھی کوٹھے پر نہیں تھا۔ بہ ہر حال، وہ بیٹھ گئی۔

”حور بانو! چلو اب سو جاؤ۔ پھر صبح اٹھنے میں پریشان کرتی ہو۔“

غزالہ متین کی تحقیق، کینیڈا سے

اسی طرح دو مہینے گزر گئے۔ پھر ایک دن ایسا اتفاق ہوا
استانی جی انھیں پڑھانے کے لیے نہیں آئیں۔ یوں کہ

ابتدا میں اوتارنگھ کو اس آواز کی محرومی بہت بڑی لگی تھی۔

اس کے ہم جماعت تو آم کھانے میں مگن تھے۔

اس بار اوتار سنگھ نے باغ کے رکھوالے کو احترام کی

نظر درخت بن گیا۔ اور قلمی وہ ہیں جو ہم نے زمین میں قلم لگائی۔“

(189) فروری 2010ء

”قلم کیا ہے؟“ اوتارنگھ نے پوچھا۔ وہ بوس لکھنے والے قلم سے واقف تھا۔

”کسی درخت کی پتی ٹہنی کو تراشا جاتا ہے جیسے تم لکھنے والے قلم کو تراشتے ہو۔ اسی لیے اسے قلم کہتے ہیں۔ وہ قلم لگائی جاتی ہے۔ اس کی دیکھ بھال کی جاتی ہے پھر وہ درخت بن جاتا ہے۔“

”مگر اس کی ضرورت کیا ہے؟ جب کہ گٹھلی سے بھی وہی کچھ حاصل ہوتا ہے؟“ اوتارنگھ نے اعتراض کیا۔

”قلمی آم، چھمی آم سے کہیں زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ چھمی آم میں رس ہوتا ہے۔ اسے چوسا جاتا ہے جب کہ قلمی آم میں آم تیار ہوتے ہوتے رس گودے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسے کھایا جاتا ہے۔ پھر اس میں تریوں کی گنجائش بھی ہوتی ہے۔ دو آموں کو ملا کر ایک بنایا جاتا ہے۔ پیند کاری کی جاتی ہے۔ میں ابھی تمہیں دکھاؤں گا۔“

اوتارنگھ بہت حیران تھا۔ ”دو آموں کو ملانے کا... پیند کاری کا کیا مطلب ہے؟“

”دو مختلف قسم کے درختوں کی قلمیں بنائی جاتی ہیں اور انہیں ایک دوسرے سے ملا کر زمین میں لگایا جاتا ہے۔ یوں ایک نئی قسم وجود میں آتی ہے جس کے پھل میں ان دونوں قسموں کی خاصیتیں اور ذائقے ملتے ہوئے ہیں۔“

اوتارنگھ کے ذہن میں شادی کا خیال آ گیا۔ انسانوں میں شادی اسی طرح تو ہوتی ہے۔

”آؤ میرے ساتھ۔ میں تمہیں آم بھی کھاؤں گا اور کچھ دکھاؤں گا بھی۔“

اوتارنگھ بارگ کے رکھوالے کے ساتھ چل دیا۔

”یہ دیکھو۔ یہ سب چھمی آم کے درخت ہیں۔“ رکھوالے نے چلتے ہوئے کہا۔ ”آگے میں نے الگ الگ قلمیں لگائی ہیں۔ ابھی سب دکھاؤں گا۔“

وہ بڑھتے رہے۔ بارگ کے آگے والے حصے میں جو درخت تھے وہ دیکھنے میں ہی مختلف لگ رہے تھے۔ وہ زیادہ اونچے نہیں تھے۔ کچھ تو اتنے چھوٹے تھے کہ ہاتھ بڑھا کر ہی آم توڑے جاسکتے تھے۔ لیکن اونچے درختوں کے مقابلے میں لدے ہوئے تھے۔

اوتارنگھ نے اس کی وجہ پوچھی۔

”دیکھو۔ درخت کو غذا اتنا ہی ملتی ہے۔ اب اگر درخت اونچا ہوگا تو وہ خوراک اس کے لیے ناپسندیدہ ثابت ہوگی۔ جب

کہ چھوٹے درخت کو اتنی ہی خوراک فراوانی کے ساتھ ملے گی اس لیے اس پر پھل زیادہ ہوں گے۔“

اوتارنگھ کچھ شرمندہ ہوا۔ اگر وہ سوچتا، غور کرتا تو یہ بات خود بھی سمجھ سکتا تھا۔

”دیکھو، یہ سرخاب ہے اور وہ انور ٹول ہے۔“ رکھوالا درختوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتاتے جا رہا تھا۔ ”اور وہ آگے میں نے ان دونوں کا ملاپ کیا ہے۔ ابھی ان میں پھل نہیں آئے ہیں۔“

رکھوالے نے آم توڑے، اپنے کندھے پر پڑا کپڑا زمین پر پھیلایا اور بیٹھ گیا۔ پھر اس نے جب سے چھوٹا سا چاؤ نکالا اور ایک قاش کاٹ کر اوتارنگھ کی طرف بڑھائی۔

اوتارنگھ نے کھایا اور اس کا دل خوش ہو گیا۔ وہ بہت میٹھا تھا۔ مگر اسی درخت کے دوسرے آم میں تلخی کی کھٹاس تھی۔ ذرا دیر میں اسے اندازہ ہو گیا کہ تمام آموں کا بنیادی ذائقہ ایک سا ہے۔ لیکن ہر آم دوسرے آم سے مختلف ہے۔

”یہ تو ہوتا ہے۔ کسی ڈال پر دھوپ کر کے پھل اس سے فرق پڑتا ہے۔“ بچے کی ڈالیوں کے آم عام طور پر زمین میں

ہوتے ہیں۔ کیوں کہ غذا ان تک پہلے پہنچتی ہے اور پھر زمین ملتی ہے۔ مگر ڈالنے کا فرق تو ایک ڈال کے آم میں بھی ہوتا ہے۔ ایسے ہی جیسے ایک باپ کے بیٹے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں صورت میں بھی اور مزاج اور فطرت میں بھی۔“

اس روز اوتارنگھ نے اپنے ہم جماعتوں سے زیادہ اور بہتر آم کھائے اور سوچنے لگا کہ وہ اضافی انعام تھا۔

اس رات اپنے بستر پر لیٹ کر وہ اسی ڈالے سے سو رہا۔

”کیسی عجیب بات ہے کہ دنیا کو دیکھنے والے دوسری اور تیسری... بلکہ اُن گنت باتیں سمجھ نہ آتی ہیں بس آدمی غور تو کرے۔ دیکھو، تو سوچے تو یہ فرق صرف آم کا نہیں۔ یہ تو ہر پھل میں ہوگا۔ جیسے ہر پھل اپنی جگہ ایک ہے۔ اس کی سمجھ میں تو یہ آ رہا تھا۔ کوئی اس کے اندر بیٹھا رہا تھا۔ یہ سب نشانیاں ہیں، اس ہستی کی جس نے کچھ بنایا ہے۔ یہ مربوط نظام قائم کیا ہے۔ مگر اس سے آگے وہ کچھ سمجھ نہیں پاتا تھا۔

پھر ایک دن اس نے کیلنڈر پر غور کیا۔ وہ تو اہم چیز تھا۔ اسی سے آدمی وقت کا حساب رکھتا تھا۔

میں ترتیب اور تنظیم کیلنڈر کے دم تھی۔ اس پر اس کا فانی پرشاد سے گفتگو بھی کی۔ ”جب کیلنڈر نہیں

”یہ کام چلتا ہوگا ماسٹر جی؟“

”کام تو چلتا تھا اوتارنگھ۔ اس لیے کہ اُس وقت زندگی بہت سست رفتار تھی۔ گھنٹے، منٹ اور سیکنڈ پرانے زمانے کا ادنیٰ نہیں جانتا تھا۔ اس کی اُسے اتنی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اسے تو بس بنیادی ضروریات کی فکر کرنا اور زندہ رہنا تھا۔ تو رات اور چاند تو موجود تھے نا۔ دن اور رات کا تو اسے معلوم تھا۔ پھر اس کے پاس اور پیمانے بھی تھے۔ موسم کے پیمانے۔ رات، گرمی، بہار اور ترزاں۔ تب لوگ کہتے ہوں گے۔ دو بہار ہو گئے۔ میرا بیٹا پیدا ہوا تھا۔ پھر آدمی نے مشاہدے سے یہ بھی سمجھ لیا کہ آج یوں اتنا فائدہ مند ہوتا ہے۔ کب فصل کٹی جائے۔“

”کیلنڈر مختلف کیوں ہیں ماسٹر جی؟“

”ایک کیلنڈر ہے اور دوسرا قمری۔“

”فرق کیا ہے دونوں میں؟“

”زمین سورج کے گرد چکر لگاتی ہے۔ 365 دن اور چند گھنٹے میں زمین کا ایک چکر مکمل ہوتا ہے۔ اسی لیے قمری سال دن کا ہوتا ہے۔“

”تو چند گھنٹوں کے فرق کا کیا بنتا ہے؟“

”ماسٹر جی مسکرائے۔“ وہ اضافی گھنٹے تین سال میں ایک بار آتے ہیں۔ اسی لیے تو ہر چوتھا سال لیپ ہوتا ہے۔“

”اور قمری کیلنڈر؟“

”ہمارے زمانے کے گرد چکر لگتا ہے۔ وہ 28 دن اور چند گھنٹے میں اپنا ایک چکر مکمل کرتا ہے۔ تو قمری مہینہ 29 یا 30 ہوتا ہے۔ اور سال وہی بارہ مہینوں کا۔“

”مگر معلوم کیسے ہوا ماسٹر جی؟“

”اللہ سے... جسے علم ریاضی کہا جاتا ہے۔ یہ بہت بڑا علم ہے۔ اس سے آدمی نے زمین کا سورج کا فاصلہ معلوم کیا۔ درمیانی فاصلہ بھی معلوم کیا۔ زمانہ قبل از ولادت معلوم کیا۔ چاند اور سورج گرہن کا حساب لگایا تھا۔“

”اور ہزار بیسویں تک کے تمام گرہنوں کا وقت لکھ دیا۔ اس کیلنڈر کے دسویں حصے تک کا فرق نہیں ہے۔“

”اس اوتارنگھ اس پر غور کرتا رہا۔ واقعی دنیا کا نظام اتنا دقیق حساب کتاب سے قائم کیا گیا ہے۔ لگتا تھا کہ ہر وقت ایک خاص رفتار سے حرکت کر رہی ہے۔“

”اسے ایک سسٹم کے تحت چل رہے ہیں اور وہ سسٹم اس میں کبھی ایک سیکنڈ کا فرق بھی نہیں پڑتا۔“

یہی وجہ ہے کہ علم رکھنے والے انسانوں کو معلوم ہوتا ہے کہ کب چاند کہاں ہے اور کوئی اور ستارہ کہاں ہے۔ اس کا ثبوت جنتریاں ہیں جن میں چاند سورج اور تمام ستاروں کی آگے کے وقت تک کی ہر لمحے کی پوزیشن موجود ہے۔ یہ علم فلکیات ہے جو علم نجوم میں بھی کام آتا ہے۔

وہ خیال اور راز ہو گیا کہ جس نے یہ پورا نظام قائم کیا ہے وہ ہستی بہت مہمان ہے۔ اس کی ہنسی کی کوئی حد نہیں۔ اور منٹس جو کچھ بھی جانتا ہے وہ اسی مہمان ہستی نے اسے سکھایا ہے۔ مگر جو کچھ منٹس نہیں جانتا، وہ بہت زیادہ ہے۔

اس شام ٹھاکر پتاپ سنگھ بیٹھا اپنی کارندوں سے باتیں کر رہا تھا کہ پندرہ روپ سہائے آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک بہت بوڑھا آدمی تھا جس کی بھوس تک سفید تھیں۔

ٹھاکر نے سر اٹھا کر ذرا غصے سے اسے دیکھا اور سر دلچے میں بولا۔ ”روپ سہائے، تم تو اس دن آنے کا وعدہ کر کے ایسے غائب ہوئے کہ میں تمھاری صورت بھی بھول گیا۔“

”شکر کر دو ٹھاکر جی۔ پر میں نے وعدہ پورا کر دیا ہے۔“

”سو تو ابھی دیکھ رہا ہوں۔ پر بیچ میں سولہ سال ہیں... پورے سولہ سال!“

”میں نے کہا تھا نا ٹھاکر جی کہ میں اپنے گرو جی کو لے کر آؤں گا تو میں تمھیں تلاش کر رہا تھا۔ یہ ہیں میرے گرو جی۔“

روپ سہائے نے اپنے ساتھ آئے ہوئے بوڑھے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ ”بڑے گیانی ہیں۔ مگر سیلانی بھی ہیں۔ بڑی مشکل سے ہاتھ آئے ہیں۔“

ٹھاکر نے بوڑھے کو غور سے دیکھا۔ ”آپ کا ٹھکانہ؟“

بوڑھے نے ہاتھ جوڑ کر اسے نمسکار کیا۔ ”میں رام دیال ہوں ٹھاکر جی۔“

”آپ نے بڑی کرپا کی کہ ہمیں درشن دیے۔“

”نہ ٹھاکر جی۔ یہ تو میرا بھائی ہے کہ آپ کے درشن ہوئے۔ میں تو تڑپ رہا تھا یہاں آنے کے لیے۔“

ٹھاکر کی نگاہوں میں ایک لمحے کی حیرت جھلکی۔ پھر اس نے سوالیہ نظروں سے روپ سہائے کو دیکھا۔

”میں نے گردو یو کو پھوٹے ٹھاکر کی جہم کنڈلی دکھائی۔ تب سے یہ بے چین ہیں انھیں دیکھنے کو...“ روپ سہائے نے کہا۔ ”اب تو وہ جوان ہو گئے ہوں گے۔“

”مجھے راج کمار کے درشن تو کرنا ہی تھے ٹھاکر جی۔“ رام

دیال کی آواز زری تھی۔

”اوتار سنگھ تو دہلی میں رہتا ہے۔ وہیں اسکول میں پڑھتا ہے۔“ ٹھاکر نے کہا۔ ”بس گرمی کی چٹھیوں میں گھر آتا ہے۔“

پنڈت رام دیال نراش نظر آنے لگا۔ ”میں سوچتا تھا کہ ان کی دید ہوگی تو بھاگ جاگ جائیں گے۔ پرتو مجھے سمجھتا چاہیے تھا کہ میرے ایسے بھاگ کہاں۔ ٹھیک ہے ٹھاکر جی، چلتے ہیں۔“

وہ اٹھنے لگا تو ٹھاکر نے اس کا ہاتھ تھام کر بٹھالیا۔ ”اب میں آپ کو ایسے تو نہیں جانے دوں گا۔“ اس نے کہا۔ ”یہ تو بتائیں، آپ کہاں سے آرہے ہیں؟“

”بنارس سے۔“

”اتنی دُور سے...!“ ٹھاکر کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”اتنا کٹھ اٹھا کر آپ یہاں آئے میرے پتر کو دیکھنے کو۔ اور میں نہ روکتا تو ایسے ہی واپس چلے جاتے!“

”ٹھاکر جی، میں اسی کی خاطر تو آیا ہوں اتنی دُور سے...“ پنڈت رام دیال بولا۔ ”جب چاند ہی نہیں نکلا تو رکنا کیسا؟“

”نہیں پنڈت جی۔ آپ دو چار دن یہاں رکیں۔ مجھے خدمت کا موقع دیں۔ آپ ایسے نہیں جاسکتے۔“

ٹھاکر کے بے حد اصرار پر پنڈت رام دیال نے ایک رات رُکنے کی ہائی بھری۔ مگر اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ محض مروت میں آمادہ ہوا ہے۔ ورنہ وہ رُکنا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ پنڈت روپ سہائے رُکنا چاہ رہا تھا۔ اور وہی اسے لے کر آیا تھا۔

ٹھاکر نے مہمان خانے میں ان کے ٹھہرنے کا بندوبست کر دیا۔ رات بھوجن بھی اس نے ان کے ساتھ کیا۔

بھوجن کے بعد اس نے کہا۔ ”آپ مجھے اوتار سنگھ کے بارے میں نہیں بتائیں گے؟“

”کیا بتاؤں؟ کیا بتا سکتا ہوں؟“ پنڈت رام دیال کے لہجے میں بے بسی بھی تھی اور عاجزی بھی۔ ”میں تو خود سمجھتا چاہتا ہوں۔“

”مگر مہاراج، اس کی کنڈلی دیکھ کر کچھ تو سمجھ میں آیا ہوگا۔“ ٹھاکر نے کہا۔

”بہت مشکل ہے۔ ایسی ہی کنڈلیاں تو گیاں دیتی ہیں۔ مگر جیون میں ایک ایسی کنڈلی بھی مل جائے تو بڑی بات ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے ایسی کنڈلی بھی نہیں دیکھی۔“ پنڈت رام دیال عجیب سی کیفیت میں بول رہا تھا۔ ”میرے بے

شار چیلے ہیں۔ میں روپ سہائے کو اپنا اچھا چیلہ مانا ہوں پرتو یہ کنڈلی دیکھی تو مجھے اس پر شک ہوئے لگا۔ مجھے لگا کہ اس سے کوئی غلطی ہوئی ہے کنڈلی بنانے میں۔ یا پھر ختم کا وقت تاریخ غلط ہے۔“

”دیکھیں مہاراج، اس کے جنم کی تاریخ اور وقت تو بھول ہی نہیں سکتا۔“ ٹھاکر نے تیز لہجے میں کہا۔

”میری آپ سے ایک بیتی ہے ٹھاکر جی۔“

”آپ حکم کر میں مہاراج۔“

”میں آپ کی اور چھوٹے ٹھاکر کی... دونوں کی کنڈلی چاہتا ہوں۔“ رام دیال نے کہا۔ ”بلکہ آپ کی بیتی کی بھی۔“

”ضرور بنائیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔“ ٹھاکر نے پھر اپنی رنجیتا کی اور اوتار سنگھ کی تاریخ پیدائش اور وقت بتا دیا۔

پنڈت رام دیال کنڈلیاں بنانے میں مصروف روپ سہائے بڑے تشویش نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

رام دیال نے پہلے اوتار سنگھ کی کنڈلی بنائی۔ پھر اس اپنے تھیلے سے ایک اور کنڈلی نکالی اور وہ کنڈلی سے اسے موازنہ کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھتی گئی۔

پھر اس نے سر اٹھایا اور روپ سہائے کو ستائی۔ ”دیکھا۔ تمہاری کنڈلی میں رتی بھر فرق نہیں ہے۔ اس کی پٹھ پٹکتے ہوئے کہا۔“

روپ سہائے ہلکی بار مسکرایا۔ ”جو بھی سیکھا ہے، آپ سے سیکھا ہے مہاراج۔“ وہ بولا۔

رام دیال دوسری کنڈلی کی کنڈلی میں مصروف وہ کنڈلیاں بنانے کے بعد اس نے اوتار سنگھ کی کنڈلی رکھی اور اسے بہت غور سے دیکھنے لگا۔

”کیا خبر نہیں۔“ ٹھاکر اسے متوقع نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”جسم میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ لگتا تھا کچھ عجیب ہلنے والے بڑے ہجیر!“

پھر اچانک پنڈت رام دیال نے کئی بار سر ہلاتا شروع کیا۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ اپنے آپ میں اور وہ کسی کو سننا نہیں رہا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ اپنے آپ

کر رہا ہے۔ ”عجب... بہت عجیب...!“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”کنڈلی میں راج یوگ ہے۔ اور بہت شگفتی والا راج۔“

”تو چھوٹے ٹھاکر راج تو کریں گے راجا تو نہیں۔“ کنڈلی میں سنت یوگ بھی ہے۔ اور وہ بھی بڑا

”میں نے سیکھوں جو کچھ ہوگا۔“

ای کوئی بات نہیں کہ یہ کوئی انہونی ہو۔ میں نے سیکھوں جو کچھ ہوگا۔ کنڈلیاں دیکھی ہیں جن میں یہ دونوں یوگ موجود تھے۔ پرتو اوتاویں ہے کہ دونوں یوگ ایک دوسرے کو ناکارہ کر دیتے ہیں۔ منٹ نہ راجا رہتا ہے نہ بھکاری۔ بس عام سائنس بن کر رہ جاتا ہے۔ یا یوں ہوتا ہے کہ وہ من کا راجا ہوتا ہے اور بھائی کا

یوں سمجھ لو کہ دونوں یوگ شگفتی میں برابر ہوں تو ایک دوسرے کو مفر کر دیتے ہیں۔ اگر راج یوگ کی شگفتی 4 ہو اور سنت

یوگ کی 3 تو راج یوگ کا اثر ایک درجے کا رہ جاتا ہے۔“

”اوتار سنگھ کی کنڈلی میں راج یوگ کی شگفتی کتنی ہے؟“

”ٹھاکر جی، ہوتا یوں ہے کہ منٹ جیون میں بہت کچھ کماتا ہے۔ دولت، عزت، شہرت۔ پر جب وہ مرتا ہے تو کیوں راہ کرہ جاتا ہے۔ سب کچھ ختم۔ چھوٹے ٹھاکر کو جیون میں سب کچھ ملے گا، دولت بھی، عزت بھی اور شہرت بھی۔ پر وہ ہر چیز سے بھاگیں گے۔ پریم کی تلاش میں وہ ہر چیز کو ٹھکرا دیں گے۔ اور جب ان کا سہ آئے گا تو موت ہی انھیں سب کچھ دے گی۔ وہ مرنے کے بعد بڑا مقام پائیں گے۔ ان کی بڑائی ان کے جینے سے بڑھ کر ان کے مرنے میں ہوگی۔“

ٹھاکر کو اکھوتے سینے کے مرنے کی باتیں بہت گراں گزر رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر درشتی ابھرنے لگی۔ مگر اسے یاد تھا۔ پنڈت رام دیال نے شروع میں ہی بتا دیا تھا کہ چھوٹے ٹھاکر کو لبا جیون ملے گا۔

”اب میں ذرا آپ کی اور سوگ باش ٹھاکر ان کی کنڈلی دیکھ لوں۔“ پنڈت نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

”ہماری کنڈلیاں کیوں دیکھتے ہیں مہاراج۔ ٹھاکر ان تو جا چکی۔ اور میرا بھی کیا ہے۔“ ٹھاکر نے اعتراض کیا۔

”بات یہ ہے ٹھاکر جی کہ جب کوئی کنڈلی سمجھ میں نہ آئے تو اس کے لیے مانتا پتا کی یا پتر کی کنڈلی دیکھی جاتی ہے۔“ پنڈت نے وضاحت کی۔ ”میں چھوٹے ٹھاکر کی کنڈلی کو ان دونوں کنڈلیوں سے سمجھوں گا تو زیادہ سمجھ سکوں گا۔“

ٹھاکر خاموش ہو گیا۔ پنڈت دونوں کنڈلیوں کو بہت غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر گہرے وچا کا اثر تھا۔ مگر پھر اچانک اس نے جھرجھری لی اور بڑی طرح چونکا۔ اس کے چہرے پر بے یقینی تھی۔ اس نے سر اٹھایا ایک لمحے کو نظریں اٹھائیں۔ مگر فوراً ہی جھکا لیں۔ ”شما چاہتا ہوں ٹھاکر جی۔ پرتو میں اور کچھ نہیں بتا سکتا۔“

ٹھاکر اسے بہ غور دیکھتا رہا تھا۔ اس نے پنڈت کے

”میں نے سیکھوں جو کچھ ہوگا۔“

”میں نے سیکھوں جو کچھ ہوگا۔“

”میں نے سیکھوں جو کچھ ہوگا۔“

”میں نے سیکھوں جو کچھ ہوگا۔“

”میں نے سیکھوں جو کچھ ہوگا۔“

چہرے کے تاثر کی تبدیلی دیکھی تھی۔ اس نے جان لیا کہ کوئی بہت بڑی بات سامنے آئی ہے اور وہ بات ایسی ہے کہ پنڈت بتانا نہیں چاہتا... جب کہ وہ جانتا چاہتا تھا۔ ”مہاراج، آپ کو بتانا ہوگا۔ میں بے خبر نہیں رہنا چاہتا۔“

پنڈت نے ہاتھ جوڑ لیے۔ ”ایسی کوئی بات نہیں تھا کرجی جو بتانے کے قابل ہو۔“

”بنانے کے قابل نہیں، تب بھی بتائیں۔ میں اپنے پتر کے متعلق سب کچھ جانتا چاہتا ہوں۔“

”یہ بات چھوٹے تھا کر کے متعلق نہیں۔ میرا دشواں کریں ٹھاکر جی۔“

اس پر ٹھاکر کا تجسس اور بھڑک اٹھا۔ یعنی اس کے بارے میں متعلق تھی۔ ”تب تو ضرور بتائیں مہاراج۔“

”میں ششما چاہتا ہوں ٹھاکر جی۔“ پنڈت نے پھر ہاتھ جوڑ دیے۔

پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”وہ لے پالک تو نہیں؟ آپ نے کسی کا بچہ لے کر آیا ہو۔ اسے اپنا بیٹا بنالیا ہو۔“

ٹھاکر کا چہرہ تھمتا اٹھا۔ اس کا پتر... ٹھاکر اوتار سنگھ... بھگوان کا شیر باد... بھگوان کا سب سے بڑا تھتہ۔ وہ یہ کیسے گوارا کرتا کر دینا میں ایک شخص بھی اس تھتے کو کچھ اور سمجھے... اس کے بارے میں کچھ اور گمان کرے۔ مگر اسے اپنے دلچسپی کا بھی احساس تھا۔ چنانچہ اسے اپنے لہجے پر بھی قابو رکھنا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنی آواز اور لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہم رانجھو اپنے خون پر بہت ناز کرتے ہیں مہاراج۔ ہم اپنے خون میں ملاوٹ گوارا نہیں کر سکتے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اُداس ہو گیا۔

یاد تھا کہ پتر تو اوتار سنگھ اس کا اور نوجو کا تھا۔ پر دودھ اس نے کھایا تھا۔ خون میں ملاوٹ تو ہوئی تھی۔

”جانتا ہوں ٹھاکر جی۔ پر کوئی اصل رانجھوت بچہ لے سکتا ہے۔“

اسے سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ”آپ کی پتی کا اہانت تین ورش پہلے... ہوا تھا۔“ اس نے تاریخ تک بتاتے ہوئے کہا۔

ٹھاکر وہ دن کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ وہ تو اس کے دل پر لکھا تھا۔ اس نے اُداسی سے اثبات میں سر ہلادیا۔

پنڈت نے کنڈلیوں کو مزید چند لمحوں تک بد غور دیکھا۔

”یہ سچ ہے کہ کنڈلی کے حساب سے آپ دونوں کے بھائی میں اولاد نہیں۔ لیکن آپ کی کنڈلیوں میں چھوٹے ٹھاکر کی آمد کی گواہی ملتی ہے۔“

ٹھاکر نے چونک کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”چھوٹے ٹھاکر کے جنم کے ساتھ آپ کا اور آپ کی پتی کا دور شروع ہوا۔“

ٹھاکر نے دل ہل گیا۔ آپ کی پتی کے لیے تو یہ سچ نہیں تھا۔ لیکن اس نے ہنسی خوشی اسے مان لیا۔ بلکہ آپ خود ہی نے راستے میں بڑے۔“

امتحان کا نتیجہ نکلا۔ اوتار سنگھ نے امتیازی نمبروں سے امتحان پاس کیا۔ اس دوران ٹھاکر پرتاپ سنگھ کا بچوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے کوئین میری کالج کو اپنے بیٹے کے لیے چن لیا۔ داخلہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اوتار سنگھ کے نمبر ایسے تھے کہ اسے کہیں بھی داخلہ مل سکتا تھا۔

اوتار سنگھ کا کالج میں داخلہ ہوا۔ پھر وہ کالج جانے لگا۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کا دل تو نہیں چاہتا تھا لیکن اسے واپس لو جانا ہی تھا۔ فصول کا حساب کتاب، گاؤں کی دیکھ بھال کا کام وہ کیدار ناتھ پر چھوڑ کر آیا تھا۔ اور کیدار ناتھ پر اسے بھروسہ نہیں تھا۔

چنانچہ چودہ ماہیں چلا گیا!

اوتار سنگھ کو اس تبدیلی کو قبول کرنے میں کچھ دن لگے۔ وہ تبدیلی تھی بھی بہت بڑی۔ اب وہ کالج کا اسکول سے موازنہ کرتا تو ایسا لگتا تھا کہ وہ ایک چھوٹے سے تالاب سے نکل کر ایک بڑے دریا میں آ گیا ہے۔ اسکول میں رہ کر کالج کا جو تصور اس نے قائم کیا تھا، حقیقت میں کالج اس سے یکسر مختلف تھا۔ اسکول میں ہر چیز ریڈ لیٹا ضروری تھا۔ جب کالج میں وہ آزاد تھا۔ یہاں خالی غیر ریڈ بھی ہوتے تھے جنہیں طالب علم اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکتا تھا۔ چاہے وہ لائبریری میں جا بیٹھے اور مطالعہ کرے۔ چاہے وہ کامن روم میں چلا جائے اور ٹھیک لے۔ چاہے وہ لان میں جائے اور دوسرے طلباء کے ساتھ گپ شپ کرے۔ بلکہ کالج میں وہ تو اپنی مرضی سے کوئی بیئر ریڈ چھوڑ بھی سکتا تھا۔ یعنی وہ آزاد تھا۔

ایک اور اعتبار سے بھی کالج بڑا دریا تھا۔ وہاں لڑکے لڑکیاں ساتھ پڑھتے تھے۔ یہی نہیں، طلباء اور طالبات کی اس کمیونٹی میں تمام رنگ موجود تھے۔ مذہب کے اعتبار سے بھی اور زبان اور علاقے کے اعتبار سے بھی۔ انگریز، ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، پنجابی، گجراتی، بنگالی، مدراسی... اور جتنے کیا کیا۔ ایک اور بات بھی تھی۔ اوتار سنگھ کو اسکول میں دوست بنانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ سنجیدہ طالب علم تھا۔ کلاس میں جان پہچان تو ہوئی مگر باقاعدہ دوستی نہیں ہوئی۔ صرف اسے باف نام میں موقع ملتا تھا لیکن وہ وقت وہ وصال دین کے ساتھ گزارتا تھا۔

اب معاملہ مختلف تھا۔ کالج میں سوشل لائف ضروری تھی۔ اور وصال دین وہاں تھا نہیں۔ پھر اوتار سنگھ کی فطرت میں تجسس

”یہ خیال آپ کو کیسے آیا مہاراج۔“

”آپ کے اور سوگرباشی ٹھاکر کرانے کے بھائی کے لیے ہے ہی نہیں۔ جنم کنڈیاں یہی بتاتی ہیں ٹھاکر جی۔“

ٹھاکر کا دماغ جیسے بھک سے اُڑ گیا۔ ”آپ سے کوئی تو نہیں ہوئی ہے مہاراج؟“

”میں نے بڑی احتیاط سے کام کیا ہے ٹھاکر جی۔“

ٹھاکر کا غصہ غائب ہو گیا۔ اس کی جگہ عاجزی لے لی۔ ”اوتار سنگھ میرا ہی چہرہ ہے مہاراج۔ اس کی پیدائش پہلے میں نے اور ٹھاکر کرانے نے ایک ہی بات ایک دیکھا تھا۔ اس سنے میں ہمیں خوش خبری ملی تھی۔ اور وہ تو پتی کی کوکھ میں رہا اور اس کی کوکھ سے جنم لیا۔ مگر اسے پورا ریکارڈ موجود ہے۔ پورا گاؤں گواہ ہے اس کا۔“

”میرے لیے آپ کا کہنا ہی کافی ہے ٹھاکر جی۔“

پنڈت رام دیال نے کہا۔ ”پتر تو کوئی بڑی بات نہیں بھائی لکھتا ہے وہ اسے کبھی بدل بھی دیتا ہے اور میں چلتا۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ پراتھنا میں بڑی شمشیدی سے بھائی بھی بدل جاتا ہے۔ ٹھیک ہے ٹھاکر جی۔“

”اور دیکھتا ہوں۔“

ٹھاکر نے سکون کی سانس لی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مزید کوکھ کرے۔ مگر اسے روک بھی نہیں سکتا تھا۔ پنڈت سر جھکائے کنڈلیوں میں الجھا رہا تھا۔

پنڈت رام دیال نے کہا۔ ”پتر تو کوئی بڑی بات نہیں بھائی لکھتا ہے وہ اسے کبھی بدل بھی دیتا ہے اور میں چلتا۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ پراتھنا میں بڑی شمشیدی سے بھائی بھی بدل جاتا ہے۔ ٹھیک ہے ٹھاکر جی۔“

”اور دیکھتا ہوں۔“

ٹھاکر نے سکون کی سانس لی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مزید کوکھ کرے۔ مگر اسے روک بھی نہیں سکتا تھا۔ پنڈت سر جھکائے کنڈلیوں میں الجھا رہا تھا۔

پنڈت واضح طور پر ہنچکا رہا تھا۔ جیسے یہ سوچ کر الجھ رہا ہو کہ کچھ بولے یا نہیں۔ لیکن تجسس تو اسے بھی تھا۔ اور وہ تجسس اسے اکسار ہاتھ کہ جودل میں ہے کہہ دے۔ بالآخر تجسس جیت گیا۔ ”بات یہ ہے ٹھاکر جی کہ آپ کی اور ٹھاکر کرانے کی کنڈلی دیکھ کر میری وڈیا نے مجھے ایک ایسی بات بتائی ہے جو سننا آپ کو اچھا نہیں لگے گا اور میں آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔“

ٹھاکر نے چند لمحوں سوچا پھر بولا۔ ”میں وچن دیتا ہوں کہ آپ سے ناراض نہیں ہوں گا۔ اور پھر یہ تو علم کی بات ہے۔ علم آپ کو کچھ بتاتا ہے تو آپ کی ذاتی بات تو نہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے ٹھاکر جی پر۔“ پنڈت اب بھی ہنچکا رہا تھا۔ اور روپ سہارے پریشان نظر آ رہا تھا۔

”آپ چھٹانا کریں مہاراج۔ آپ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ میں برائیاں مانوں گا۔“

پنڈت ہنچکا یا سگر پھر اس کے چہرے پر استقلال نظر آنے لگا۔ ”میں آپ سے ایک بات پوچھوں ٹھاکر جی؟“

”ضرور پوچھیں مہاراج؟“

”چھوٹے ٹھاکر آپ کے اپنے پتر تو نہیں ہیں؟“

ٹھاکر کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ لگا پنڈت نے اسے گالی دی ہے۔ شدت غیظ و غضب سے وہ اندر اندر لرزنے لگا لیکن ایسے میں بھی اسے یاد رہا کہ وہ ناراض نہ ہونے کا وچن دے چکا ہے۔ ”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ اس نے خود پر قابو

دوسروں سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ اب اسے مختلف لوگوں کے ساتھ گھلنے ملنے اور بہت کچھ جانے کا موقع مل رہا تھا تو اسے کیسے ضائع کرتا۔ اس کے لیے موقع اسے فوراً ہی مل گیا۔ کالج کی یونین کے ایکشن ہو رہے تھے۔ وہاں پہلی بار اسے پتا چلا کہ سیاست کیا ہوتی ہے... سچے سے اوپر تک۔ کالج میں ایک اور کام کا رویہ اسے ملا جو اسکول میں نہیں تھا اور وہ تھا اختلاف رائے۔ ابتدا ہی میں اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اختلاف رائے سے معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوتا ہے۔

کالج لائف میں آتے ہی پہلے تو اسے یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ لڑکیوں کے لیے ایک خاص کشش رکھتا ہے۔ ایف اے سال اوّل کی تمام لڑکیاں اس سے دوستی کی... اس کی قربت کی متنی تھیں۔ بلکہ سال دوم کی بھی کئی لڑکیوں نے اس سے دوستی کی۔ کوشش کی۔ پھر اسے اندازہ ہوا کہ لڑکیوں کے اس کی طرف کھینچنے کی وجہ سے لڑکے بھی اس کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ یعنی لڑکے ان لڑکیوں سے دوستی کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں جن کی طرف لڑکیاں ہنپتی ہوں۔

بہت جلد اوتار سنگھ کو اندازہ ہو گیا کہ صحیح معنوں میں تعلیم اب شروع ہو رہی ہے۔ اس کے لیے جانے اور سیکھنے کے مواقع بڑھ گئے ہیں۔ وہ والوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور یہاں سب کے جواب موجود تھے۔

اوتار سنگھ بہت خوب صورت اور وجہہ لڑکا تھا۔ وہ بے حد متناسب الاعضا تھا۔ ساکت رہتا، تب بھی جسم توانائی کا پاور ہاؤس نظر آتا۔ پھر وہ خوش لباس بھی تھا... اور اس کا لباس اس کے متحمل کا مظہر تھا۔ خود اعتمادی کی اس میں کمی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ ساری زندگی اس نے کبھی "نہ" نہیں کہی تھی۔ اس کی کوئی بات کبھی مانی نہیں گئی تھی... رو نہیں کی گئی تھی۔ اس نے خود کو کبھی کسی سے کم نہیں جانا تھا۔ یہ الگ بات کہ اس کی فطرت میں عاجزی تھی، انکسار تھا۔ لیکن بہت بڑا اعتماد انکسار!

ابتدا ہی اس نے دیکھا کہ سب لوگ اس کی دوستی کے خواہاں ہیں... کیا لڑکے، کیا لڑکیاں۔ یعنی اس کے پاس دوست منتخب کرنے کے لیے بڑی وراثی تھی۔ اور وہ کوئی سطحی انداز میں دیکھنے اور سوچنے والا لڑکا نہیں تھا۔ چنانچہ لپکنا تو درکنار، اس نے گرم جوشی تک نہیں دکھائی۔ وہ اپنے دوستوں میں کچھ خوبیاں ضرور سمجھتا تھا اور اس کے لیے پکھنا ضروری تھا۔

دہلی میں تین سال گزارنے کے باوجود بنیادی طور پر وہ گاؤں کا لڑکا تھا۔ مطالعہ اس کا وسیع تھا۔ وہ جانتا تھا کہ

ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے۔ وہ ہندوستان کی تاریخ خوب واقف تھا۔ لیکن موجودہ سیاسی منظر سے وہ اتنا خبردار نہیں تھا۔ کالج میں اس کی سمجھ میں بہت کچھ آنے لگا۔

اسے معلوم تھا کہ ہندوستان پر انگریز حکومت کر رہے ہیں۔ مگر اس سے زیادہ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ کیوں کہ کورس کی کتابوں میں جنگ آزادی کا تذکرہ نہیں تھا۔ ان میں اسے اندازہ کہا جاتا تھا... بغاوت! اور وہ جس طبقے سے تعلق رکھتا تھا، وہاں انگریزوں کی مذمت نہیں کی جاتی تھی۔ تاہم وہ اپنے طور پر اس بات پر غور کرتا تھا کہ انگریز اتنی دُور سے یہاں آئے اور اب اتنے بڑے ملک پر اتنی بڑی آبادی پر حکومت کر رہے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ کہ اس ملک کے لوگ نااہل ہیں؟ ان میں نااہل ملک سنبھالنے کی، اسے چلانے کی اہلیت نہیں؟ اور ان میں غیرت بھی نہیں؟ وہ یہ نہیں سوچتے کہ دوسرے باہر سے... اُلی دُور سے آئے، ان کے ملک پر قابض ہوئے اور ان پر حکومت کر رہے ہیں۔ اس کے ذہن میں غدار کا تصور بھی غائب تھا۔ بغاوت! ایسی بغاوت؟ بنیادی طور پر انگریزوں کی ان کا دشمنی کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ اگر کچھ لوگوں نے ان کا دشمنی کرنے کی کوشش کی تو وہ بغاوت کیسے ہوئی۔ وہ تو اپنا دل کی جان بڑھ کر کوشش تھی۔ اور جنھوں نے کوشش کی، وہ غیرت لوگ تھے۔ انھیں مجرم تو نہیں کہا جاسکتا۔

یہ سب کچھ وہ سوچتا رہا تھا۔ اب کالج میں یہ سب کچھ سمجھنے کے لیے فضا موجود تھی۔ چند دنوں میں ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ ملک میں آزادی کے لیے تحریک چل رہی ہے۔ انگریز، انگریز بھی وہی طور پر اس کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ یونین کے ایکشن میں مقابلہ دو پارٹیوں کے درمیان تھا۔ اور دونوں پارٹیوں کا اختلاف نظریاتی تھا۔ وہ حقیقت وہ کی دو بڑی سیاسی جماعتوں کی ذیلی جماعتیں تھیں۔ ان کا تعلق بھی جس میں بھی مذاہب کے لوگ تھے۔ اور مسلمان لیگ تھی جو صرف مسلمانوں کی جماعت تھی۔ لیکن مسلمانوں کی آزادی کا مطالبہ کر رہی تھی۔ جب کہ مسلمانوں کے لیے علیحدہ مسلمان مملکت چاہتی تھی۔

اوتار سنگھ کی سمجھ میں مسلمانوں کی منطق نہیں آئی۔ مذہب کی بنیاد پر الگ الگ مملکتیں بنانی تھیں تو ہندوستان کیسے بھی تھے، عیسائی بھی اور پارسی بھی۔ تاریخ بتاتی تھی کہ مسلمانوں نے برصغیر میں مسلمان حکومت کر رہے تھے۔ حالانکہ اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ اس وقت ہندوستان ایک متحد تھا اور

یہ کیوں ہو؟

دوستی اور تعلقات کے معاملے میں اوتار سنگھ کی کچھ باتیں تھیں۔ اسے ذہین، علم دوست اور محسوس لوگ اچھے لگتے تھے۔ اسی اعتبار سے اس نے اپنے لیے دوستوں کا انتخاب کیا۔ اور اس کے دوستوں میں بھی لوگ تھے... انگریز، ہندو، مسلمان اور کھڑے۔ ذہانت، علم کی لگن اور محسوس ان سب کے ساتھ قدر مشترک تھا۔

ان سب کے درمیان بہت شدید نظریاتی اختلافات تھے۔ ان کے درمیان تہذیبی تفریقیں ہوتیں۔ کبھی تو ایسا لگتا کہ اب ان کی باتیں کی۔ لیکن ذہین، علم دوست اور محسوس لوگوں میں ایسی باتیں ہوتی ہیں کہ وہ روشن خیال ہوتے ہیں۔ اختلاف اپنی جگہ ہے، لیکن وہ ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست تھے۔

کالج یونین کا ایکشن ہوا اور کالج میں اس کی ذیلی جماعت کی۔ اوتار سنگھ نے بھی کووٹ دیا تھا۔ ایکشن کے لیے اس روز وہ لان میں بیٹھ گئے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ میر غازی خان تھے۔ رام گوپال نے محمود کو پھیر دیا۔ "دیکھا ہے؟ اس ایکشن نے دودھ کا دودھ پانی کا پانی کیا۔" اس نے فاتحانہ لہجے میں محمود سے کہا۔ "اس ملک میں ہوش مندوں کی ہے، جو آزادی چاہتے ہیں۔" انھیں پتا نہیں چاہتے۔

"اس نے اتفاق نہیں کرتا۔" محمود نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "یہ تو وہی یونین کا ایکشن تھا اور بس۔" اوتار سنگھ نے تو وہی بات ہوئی تاکہ انھیں سمجھتے تھے... "ختم سنگھ بات سمجھتی تو ایکشن کیوں لڑا تم نے؟"

"دیکھنے کے لیے کہ ہمارے لوگ اس موقف کی تائید کرتے ہیں۔ دوسرے ہم رائے عامہ بھاری کرنا چاہتے ہیں۔"

"تو تمہیں پتا چل گیا کہ لوگ تمہارے ساتھ نہیں ہیں۔" رام گوپال نے کہا۔ "اس شکست نے تمہاری سبک دین؟"

"ہاں، ہمیں پتا چل گیا کہ قوم جاگ رہی ہے۔" محمود کا جواب تھا۔ "کالج میں 58 طلباء اور طالبات مسلمان ہیں۔ 50 ووٹ ملے۔"

"ام کو بال کاٹ ڈالو۔" یہ تو تنگ نظری ہے تمہاری۔ انھیں جوتو تو نہیں دیا۔

لگ نظری نہیں، حقیقت پسندی ہے۔ ہمیں اپنی اندازہ ہونا چاہیے۔

تب اوتار سنگھ نے پہلی بار مداخلت کی۔ "وہیے محمود، میری سمجھ میں تم لوگوں کی منطق نہیں آتی۔ اصل مسئلہ آزادی ہے۔ ملک کو تقسیم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"یہ فہم و فراست کی بات ہے۔ جب ایک جنگ سے کام چل سکتا ہے تو پھر دے دو جنگیں لڑنے کی کیا ضرورت ہے۔" "کیا مطلب؟" رچرڈ پارسن نے بھوئی اچکا نہیں۔

"مجھے ابھی ہم آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں اور آزادی کے فوراً بعد ہمیں علیحدگی کے لیے لڑنا ہوگا۔ تو یہ کام ابھی کیوں نہ کر لیں۔"

"بنیادی سوال یہ ہے کہ علیحدگی کی ضرورت کیوں ہے؟" رام گوپال بولا۔

"ضرورت اس لیے ہے کہ ہمیں اپنا دینی اور قومی تشخص برقرار رکھنا ہے۔" محمود نے جواب دیا۔

"یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔" رام گوپال نے متعثرانہ لہجے میں کہا۔ "تمہارا قومی تشخص کیا ہے؟ یہی ناکہ تم ہندوستانی ہو۔" "نہیں۔ ہم ہندوستانی مسلمان ہیں۔ ہمارا قومی تشخص دینی تشخص سے جڑا ہوا ہے۔" محمود نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہم اگر صرف ہندوستانی رہ گئے تو گویا ہم نے اپنی شناخت کھودی۔ اور یہ ہم گوارا نہیں کر سکتے۔"

"تو بھائی، اتنی صدیوں سے جو ہم اسی ہندوستان میں رہ رہے ہو، پہلے کبھی تمہیں یہ فکر نہیں ہوئی۔ نہ تم اپنی شناخت سے محروم ہوئے۔" رام گوپال نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

"قسم واگوروی رامو، تو تو کچھ سمجھتا نہیں۔ اے اتنی صدیوں سے صرف حکومت ہی تو کرتے رہے ہیں۔ یہ فکر کیوں ہوئی انھیں۔" فتح سنگھ بولا۔

"یہ ہوئی نابات۔" رام گوپال کا لہجہ فاتحانہ تھا۔ "جب تک حکومت کرتے رہے، یہ پریشانی نہیں رہی۔ اب ہماری باری آئی تو دم نکل رہا ہے ان کا۔"

"ہاں یہی بات ہے۔ اچھا ہوا کہ تم نے خود ہی کہہ دیا۔" اوتار سنگھ کی توقع کے برعکس محمود کا لہجہ فاتحانہ تھا۔ ورنہ وہ تو سمجھتا تھا کہ اس دلیل کے بعد محمود مدافعتی انداز اختیار کرے گا مگر وہ تو اس دلیل کی تائید کر رہا تھا۔

اب وہ سب محمود کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"اب ذرا اس کی وجہ بھی تو بتاؤ کہ ہماری حکومت آنے سے پہلے ہی... تجربہ ہونے سے پہلے ہی مسلمان عدم تحفظ کا شکار

لگ تھے۔ کیوں؟ ایک طاقت ور کا اتنے کم وقت میں دل جیت لینا سمجھ میں آتا ہے؟ جو مسلمان ہوا، اپنی خوشی سے ہوا۔ کردار

طرف ہاتھ بڑھا لے ہوئے کہا۔ اچھا دوست ہے۔
پھر کبھی بات ہوگی۔“

ہو اس کے لیے بھائی تھا اور چاچا جمال دین، جس

بھی محبت ہو جائے تو محبت ضرور کرو۔ لیکن جب محبت نہ
 ہو تب بھی یہ بات اس پر ظاہر نہ ہونے دو۔ کیوں کہ کچھ چھن

اس سے پتا چلتا تھا کہ چاچا جی عقل والے ہیں۔ لیکن وہ دیکھ بھی تھے۔ اپنی عقل کا اظہار کم ہی کرتے تھے۔ جمال دین اس معاملے میں ان سے بھی آگے تھا۔ اس کے بارے میں تو اوتار سنگھ عقل مند کی گمان کر بھی نہیں سکتا تھا۔ کبھی ایسی کوئی علامت ظاہر ہی نہیں ہوتی تھی۔

مگر اب کالج میں محمود کو دیکھنے کے بعد اوتار سنگھ کو مسلمانوں کے بارے میں اپنی رائے پر نظر ثانی کرنی پڑی۔ محمود جرأت مند بھی تھا اور سیکھے ہوئے ذہن کا مالک بھی۔ جس طرح شخصہ دل اور دماغ سے اس نے اپنے موقف کا دفاع کیا تھا، وہ قابل رشک تھا۔

لیکن اس بحث نے اوتار سنگھ کو الجھا بھی دیا تھا۔ اس کے ذہن میں کئی سوالات ابھرے تھے۔ یہ احساس بھی ہوا تھا کہ ملک کے سیاسی منظر نامے سے وہ ناواقف ہے۔ یہ تو پتا چل گیا تھا کہ مسلمان ہندوستان میں اپنے لیے الگ خطہ زمین کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہ بھی ملے تھا کہ انگریز ہندوستان سے رخصت ہونے والے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اقلیت میں ہونے کے باوجود مسلمانوں نے صدیوں ہندوستان پر حکومت کی ہے۔ اور وہ بھی مرکزیت کے ساتھ۔ پورے ہندوستان پر!

اوتار سنگھ نے اسی بات پر غور کیا تو وہ یہ ماننے پر مجبور ہو گیا کہ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ اتنی بھاری اکثریت پر اقلیت کا حکومت کرنا ایک غیر معمولی بات تھی۔ یوں تو انگریز بھی اقلیت میں ہونے کے باوجود مدت سے ہندوستان پر حکومت کر رہے تھے۔ لیکن ہندوستان کی تاریخ بتاتی تھی کہ مسلمانوں کے دور حکومت میں امن و امان تھا، خوش حالی تھی۔ لوگوں کو انصاف ملتا تھا اور وظائف الملوکی پھیلنے سے پہلے رعایا مسلمان حکمرانوں سے محبت کرتی تھی۔ اس حکومت میں طاقت تو تھی لیکن جبر نہیں تھا۔ جب کہ انگریز بہ جبر حکومت کر رہے تھے۔ انھیں ایک بہت بڑی اور ملک گیر بغاوت کا سامنا کرنا پڑا تھا جسے انھوں نے بڑی سختی اور بے رحمی سے چل دیا تھا۔ اوتار سنگھ کے خیال میں اسے بغاوت کہنا زیادتی تھی۔ ہندوستانی لوگ... کیا ہندو، کیا مسلمان... بجا طور پر اسے تحریک آزادی کہتے تھے۔

اوتار سنگھ کے لیے مسلمانوں کی کشش اور بڑھ گئی۔ ان میں خوبیاں ہوں گی بھی تو انھوں نے اتنے طویل عرصے حکومت کی تھی۔ شیر شاہ سوری نے صرف پانچ سال میں اتنی اصلاحات کی تھیں۔ اور اتنی بڑی اور اہم اصلاحات کہ اس کے

مختصر دور کو بلاشبہ شہر اور کہا جاسکتا تھا۔ گذشتہ بحث کے بعد اوتار سنگھ کے اندر کا طالب علم بری طرح بھڑک چکا تھا۔ اب وہ جلد سے جلد سب کچھ جان لینا اور سمجھ لینا چاہتا تھا۔ گذشتہ بحث میں دو فریق تھے... محمود اور رام گوپال۔ اس نے فیصلہ کیا کہ دونوں سے الگ الگ گفتگو کرے گا۔

پھر اسے رام گوپال سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ اسے کینٹین میں لے گیا۔ چند لمحے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے مطلب کی بات چھیڑی۔ ”اس روز تمھاری اور محمود کی جو بحث ہوئی، وہ مجھے بڑی دل چسپ لگی۔“

”کچھ بھی ہو، مسلا تو مسلا ہی رہے گا۔“ رام نے بے حد نفرت سے کہا۔ ”اور یہ مسئلے سالے ہوتے ہی مٹ جاتے ہیں۔“

رام کے لہجے کی نفرت نے اوتار سنگھ کو ہلا کر رکھ دیا۔ بظاہر تو وہ معمولی سا اختلاف رائے تھا۔ لیکن یہ اتنی شدید نفرت اس کے لیے ناقابل فہم تھی۔ ”ایسے تو نہ ہو رام۔ آخر وہ ہمارا دوست ہے۔“ وہ بولا۔

”ارے کا بے کا دوست۔“ رام نے بے زاری سے کہا۔ ”چھپاؤں کھواسے۔“

”تم اور وری ایک کر رہے ہو رام۔ وہ محض ایک نظریاتی بحث تھی۔“

”نظر یہ... ہنہ!۔“ رام کے لہجے میں حقارت تھی۔ ”ہندوستان جغرافیہ سے کوئی نظریہ نہیں۔ وہ نظریاتی بحث نہیں، جغرافیائی بحث تھی۔ یہ ہماری دھڑکی ہے، ہمارا دماغ ہے۔ جو نظریہ اس کے ٹکڑے کر کے کی بات کرے، اسے نہیں مانتا۔ نظریے کو جغرافیہ تبدیل کرے گا۔ اس میں ذرا سوچو، اس دھڑکی پر ان مسلمانوں کا کیا حق ہے۔ باہر سے آئے اور ہندوستان پر قابض ہو گئے۔ غلام بنالیا۔۔۔ انگریز کی طرح۔“

”میرے خیال میں تو فرق ہے دونوں میں۔“ اوتار سنگھ نے کہا۔ ”مسلمانوں نے حکومت کی، غلام نہیں بنایا۔ بہت کچھ کیا انھوں نے۔ اس ملک کو اپنا وطن بنایا۔ اس کی اور خوش حالی کے لیے کوشش کی۔ انگریزوں کا معاملہ اور وہ یہاں رہ کر بھی برطانیہ کی عظمت کے کن گاتے ہیں۔ یہاں کی دولت برطانیہ منتقل کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو کچھ نہیں کیا۔“

”مسلمان بھی یہاں بیٹھ کر اسلام کی عظمت

گاتے ہیں۔“

”تو یہ تو نظریاتی بات ہوئی، جغرافیائی نہیں۔“ اوتار سنگھ بولا۔ ”مسلمانوں نے ہندوستان کو انگریزوں کی طرح بدیش... تو بادی نہیں سمجھا۔ انھوں نے اپنے عمل سے ثابت کیا کہ وہ اسے اپنا بدیش سمجھتے ہیں۔“

”سمجھنے سے یہ ان کا بدیش ہو گا نہیں۔“ رام گوپال نے لڑوے لہجے میں کہا۔ ”اب انگریز یہاں سے جانے والے ہیں۔ بدیش آزاد ہو گا۔ اور یہاں وہ لوگ حکومت کریں گے، ان کا حق ہے۔ ان مسلمانوں کی بوا خراب ہو رہی ہے تو صرف ان کی وجہ سے۔ یہ ہماری حکومت میں رعایا بن کر نہیں رہنا چاہتے۔“ اوتار سنگھ نے دل میں اس بات کی معقولیت کو تسلیم کیا۔ ”مگر وہ اپنے ذہن میں یوں کر تپ رہے ہیں۔“

”ذرا ان کا سچا ہے۔“ رام گوپال نے کہا۔ ”اب ہماری باری ہے اور ہم ان سے کن کن کر بدیش بنیں گے۔ انھوں نے صدیوں ہم پر حکومت کی اور ہمیں دبا کر رکھا۔ اب ہماری باری ہے۔ یہ تو سب کا چکر ہے۔ تو اب وہ ذرے کیوں ہیں۔ جو ان کے لیے کیا، اب انھیں سہنا ہو گا۔“

”اور یہ شدمی تحریک کیا ہے؟“

اس کی بنیاد اس پر ہے کہ ہندوستان میں صرف دو گروہ ہیں۔ یہ دھڑکی ہندوؤں کی ہے۔ تو مسلمانوں کی دھڑکی ہے۔ انھیں شدمی شدمی کیا جا رہا ہے تاکہ وہ اس دھڑکی پر بڑھ سکیں۔ ”شدمی کیا جا رہا ہے کہ مطلب ہندو بنایا جا رہا ہے انھیں؟“

رام گوپال بڑی بے رحمی سے ہنسا۔ ”ہندو بنایا نہیں جاتا۔ غلام لوگ ہیں۔ ماں کے پیٹ سے ہندو پیدا ہوتے ہیں۔ مسلمانوں میں یہ تصور نہیں۔ اسی لیے یہ شوروں کو بھی ماننا پڑتا ہے اور برابری کا دعوہ دیتے ہیں۔“ اوتار سنگھ اس بات پر غور کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس وقت اتنی بات نہیں تھی۔ اس نے سوچا، اس پر بعد میں غور کرے گا۔ ”تو کیا بنایا جاسکتا انھیں۔ پھر شدمی کرنے کا کیا مطلب ہو گا؟“

”ایک مرحلہ ہے۔ وہ مسلمان نہیں رہتے اور شور دھجیے

کے دھرم میں واپس لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ ”مگر شدمی تو مسلمانوں کو کیا جا رہا ہے۔“ اوتار سنگھ الجھنے لگا۔

”وہ مسلمان جو پہلے ہندو تھے۔ ارے مسلمان آئے تو ان کی تعداد ہی کمی گئی۔ انھوں نے زور زبردستی سے ہندوؤں کو مسلمان بنایا۔ ورنہ آج مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد کیسے ہوتی؟“

اوتار سنگھ کے لیے یہ بات بھی قابل غور تھی۔ لیکن ابھی وقت نہیں تھا۔ ”تو تمھارے خیال میں شدمی تحریک جائز ہے؟“ اس نے رام گوپال سے پوچھا۔

”مگر اس دن تم کھڑے تھے کہ وہ انتہا پسند ہندوؤں کی تحریک ہے۔ ایک طرح سے تم نے اس سے بے تعلقی ظاہر کی تھی۔“

”ارے یار اسے ڈبیلوٹی کہتے ہیں۔“ رام گوپال آنکھ مارتے ہوئے مسکرایا۔ ”وہ نہ ہندو انتہا پسند ہے۔“ پھر وہ ایک دم خبیث ہو گیا۔ ”اس دھڑکی پر بڑے پاپ کیے ہیں ان مسلمانوں نے۔ اب سب کچھ نہیں ہو گا۔ ہم گنہگار بن کر رکھنا کریں گے۔“ بات ختم ہوئی کیوں کہ ان کا بیڑ شروع ہونے والا تھا۔ اس گفتگو سے اوتار سنگھ نے نتیجہ اخذ کیا کہ رام گوپال تنگ نظر بھی ہے اور مکار بھی۔ لیکن یہ ہر حال، وہ فرد تھا۔ ضروری نہیں کہ ہندوؤں کی اکثریت ایسی ہی ہو۔ آخر وہ خود بھی تو ہندو ہی تھا۔ لیکن نہیں... اس نے سوچا۔ ”میرا معاملہ مختلف ہے۔ میں جوں کو نہیں پوجتا۔ میں انھیں مانتا بھی نہیں۔ میں تو اس مہمان ہستی کی کھوج میں ہوں جس نے یہ دنیا بنائی، اس کا مربوط نظام قائم کیا۔“

اس کے بعد کافی دنوں تک اسے محمود سے تنہائی میں گفتگو کا موقع نہیں ملا۔ تاہم اس دوران اس نے متعدد ہندو طلباء سے بات کی۔ ان کا نکتہ نظر بالکل وہی تھا جو رام گوپال کا تھا۔ اس بات نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔

پارن فیلی طویل عرصے سے ہندوستان میں تھی۔ رچرڈ اور ریٹا یہیں پیدا ہوئے تھے۔ دونوں میں صرف ایک سال کا فرق تھا۔ یہی وجہ تھی کہ زیادہ تر لوگ انھیں بڑواں بہن بھائی سمجھتے تھے۔

خیبر پارن دہلی کی انتظامیہ میں ایک کلیدی عہدے پر فائز

تھے۔ دونوں بچوں کو تعلیم کے لیے انھوں نے نینی تال بھجوا دیا تھا جہاں وہ بڑھتے تھے۔ وہ ایک بڑا کانونٹ اسکول تھا۔ وہاں اکثریت انگریزوں کی تھی۔ لیکن مسلمان اور ہندو بھی بہ ہر حال موجود تھے۔

رچرڈ اور ریٹا دونوں کو ہندوستان بہت پرکشش لگتا تھا۔ ہندوستان کی رنگارنگ ثقافت ان کے لیے مسحور کن تھی۔ انھیں یہاں کی زبان میں بھی شروع ہی سے دل چسپی تھی۔ یہ دل چسپی ہی کی بات تھی کہ انھوں نے ادھر ادھر سے سیکھ سیکھ کر اردو میں اچھی خاصی استعداد بنائی تھی۔

اسکول میں عام طور پر انگریز بچوں کا رویہ ایسا تھا کہ وہ بس ایک دوسرے سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ ویسے بھی ان کی اکثریت تھی۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ہندوستانی بچے سب سے الگ تھلگ، ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے۔ مگر کچھ بچے ایسے بھی تھے جو فطرت کے اعتبار سے گھٹنے ملتے والے تھے۔ وہ انگریز بچوں کی طرف بڑھتے تھے۔ مگر رچرڈ اور ریٹا کے سوا ان کی حوصلہ افزائی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ رچرڈ اور ریٹا کے لیے اپنے ہم نسلوں سے بڑھ کر ان میں اور ان سے وہ بہت کچھ سیکھتے تھے۔ ان کی معلومات میں اضافہ ہوتا تھا۔ پھر یہی نہیں، انھیں جب بھی موقع ملتا، وہ اسکول سے نکلتے اور مقامی لوگوں میں گھلتے ملتے۔ انھوں نے دیکھ لیا کہ مقامی لوگ بہت سادہ اور ملنے لارہیں۔

دونوں بہن بھائیوں کو ہندوستان سے گہری دل چسپی تھی۔ وہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے بارے میں سوچتے تھے۔ ان کا مشاہدہ بھی بہت اچھا تھا۔ انھوں نے دیکھا تھا کہ چند اکاؤنٹا افراد کو چھوڑ کر ہندوستانیوں میں ایک اجتماعی احساس کمتری تھا۔ یہ فطری تھا۔ وہ باہر سے آنے والے اور خود سے ہر اعتبار سے مختلف انگریزوں کی رعایا تھے۔ کچھ انگریزوں کا حد سے بڑھا ہوا احساس برتری بھی ان کے احساس کمتری کو اور بڑھا دیتا تھا۔

بہ ہر حال، رچرڈ اور ریٹا نے اسکول میں بھی خود کو اپنے ہم نسلوں تک محدود نہیں کیا۔ بلکہ انھوں نے ہندوستانیوں سے بھی دوستی کی۔

اسکول کی تعلیم مکمل ہوئی تو جیمز پارسن نے انھیں دہلی واپس بلانے کا فیصلہ کیا۔ حالاں کہ وہ نینی تال میں مزید پڑھ سکتے تھے۔ لیکن ایک تو وہ اور الٹ تھ اپنے بچوں کو بہت زیادہ مس کرنے لگے تھے۔ اور دوسرے سیاسی صورت حال بہت تیزی

سے بدل رہی تھی۔ انگریزوں کا ہندوستان سے رخصت ہونا اب نوعیت دیوار تھا۔ جیمز پارسن کے بس میں ہوتا تو وہ ابھی انگلینڈ واپس چلا جاتا۔ ایسے میں وہ کم از کم یہ تو کر سکتا تھا کہ اپنے بچوں کو اپنے پاس واپس بلانے کا تا کہ انگلینڈ واپسی کا فیصلہ ہو تو کوئی پیچیدگی نہ ہو۔

دہلی بڑا شہر تھا۔ وہاں انگریزوں کی اپنی سوشل لائف تھی۔ اب بچے جوانی کی سرحد میں قدم رکھ چکے تھے۔ چنانچہ جیمز اور الٹ تھ نے انھیں کلب لے جانا شروع کیا اور انھیں ان کے ہم نسلوں سے متعارف کرانے لگے۔ لیکن رچرڈ اور ریٹا کو کلب میں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔

ریٹا بالخصوص پراسٹی رومینگ تھی۔ اس کی جمالیاتی حس بڑی توانا تھی۔ وہ نازک طبع، نازک خیال اور ازلتک تھی۔ وہ اتنی رومان پرست تھی کہ کبھی ہی سے اس نے اپنا ایک آرٹیزیل بنا رکھا تھا۔ اس کے خوابوں کا ایک شہزادہ تھا جس کی وہ راہنمائی تھی۔

کلب میں لوگوں نے جس طرح اس کی پذیرائی کی، اسے اچھا نہیں لگا۔ جبلی طور پر ہر عورت بواہوس نگاہوں کو بھانپ لیتی ہے۔ وہ تو پھر ایسی لڑکی تھی جسے مشرقیت اچھی لگتی تھی اور وہاں پہنچا بھی تھا۔ چنانچہ وہ کلب سے بے زار ہو گئی۔ کلب کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ خوش تھی۔ کلب میں دوست ہنس مچاتی، دل چسپیاں ہوں گی۔ اچھا وقت گزارا اور کون جانے۔

لیکن ابتدا میں اسے بڑی مایوسی ہوئی۔ کلب میں ہندوستانیوں کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی۔ مگر حیرت انگیز بات یہ کہ نینی تال کے مقابلے میں یہاں ہندوستانیوں کا احساس کمتری بڑھا ہوا تھا اور جو لوگ اس سے محفوظ تھے وہ انگریزوں کو اچھا سمجھتے تھے۔ یہاں دوست بنانا زیادہ دشوار ہو گیا۔ ریٹا سے سوچتی، جذباتی اعتبار سے یہ کتنے غیر متوازن لوگ۔ یا تو احساس کمتری میں مبتلا ہوں گے... یا اپنے ہمدردی کے ہر ہم نسل سے نفرت کریں گے جیسے وہ بھی اپنے ہم نسل کے ساتھ شریک استحصال ہو، جیسے وہ بھی ان کے ہم نسل میں برابر کا شریک ہو۔

مگر پھر دیر دیر سے رچرڈ کے دوستوں کا ہونا بن گیا۔ اور اس حلقے میں ہر رنگ موجود تھا۔ قدرتی طور پر اس کا حلقہ بھی تھا۔ اس میں پشپا، نادرہ اور امرتا جی رام گوپال، اوتار سنگھ اور فتح سنگھ بھی تھے۔ پہلی بار وہ

اور جب پہلی بار اس نے اوتارنگھ کو دیکھا تو اسے ایسا لگا کہ اس کے خوابوں کا شہزادہ اس کے سامنے کھڑا ہے۔ مگر اس نے پہلی نظر کے اس تاثر کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے نزدیک آدمی کی ظاہری شخصیت سے زیادہ اہم اس کی باطنی شخصیت تھی اور باطنی شخصیت ذرا دیر میں ہی کھلتی ہے۔

لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اس کی شخصیت کے سحر میں الجھتی گئی۔ اوتارنگھ ظاہری طور پر جتنا خوب صورت تھا، باطنی طور پر اس سے زیادہ خوب صورت تھا۔ اس کی شخصیت غیر معمولی طور پر متوازن تھی۔ وہ بنیادی طور پر طالب علم تھا۔ زندگی کا طالب علم۔ کالج کا چڑا اسی ہو یا کنجرا، اپنا کوئی ہم جماعت ہو یا دوست، وہ سب کی بات ایسی توجہ سے سنتا کہ لگتا عبادت کر رہا ہے۔ جیسے ہر اہم، غیر اہم بات سے وہ کچھ سیکھ رہا ہے۔ اس کے مزاج میں عجیب سا انکسار اور عاجزی تھی۔ لیکن وہ ڈرپوک نہیں تھا۔ جس بات کو درست سمجھتا، اس کا برملا اظہار وہ کسی کے بھی سامنے کر سکتا تھا۔ خود اعتمادی کی اس میں کمی نہیں تھی۔ مگر وہ بات نظر سے جھکا کر کرتا تھا۔ اس کی نگاہیں نہ چور کی نگاہیں تھیں اور نہ ہی کسی بواہوں کی۔ ان میں عجیب سی پاکیزگی، معصومیت اور جستجو تھی۔ وہ ایک طالب علم کی مجلس نگاہیں تھیں۔ ایسا طالب علم جو سب کچھ جان لینا چاہتا تھا۔

مگر ایک بات تھی۔ دوستوں کے حلقے میں بھی وہ بہت ریزور ہوتا تھا۔ کبھی بہت زیادہ بے تکلف نہیں ہوتا تھا۔ یہ بات نہیں کہ اس سے اس کے بارے میں بات کی جائے تو وہ اس سے بچے۔ نہیں... اپنے بارے میں وہ ہل کر بات کرتا تھا۔ البتہ دوسروں کے معاملے میں وہ پرائیویسی کا بہت خیال رکھتا تھا۔ وہ کسی کی نجی زندگی کے بارے میں تجسس نہیں کرتا تھا۔ اس کا تجسس خالصتاً علمی تھا۔

رینا کو پتا بھی نہیں چلا کہ وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ کب وہ اسے مختلف نظر سے دیکھنے لگی۔ جب اسے اس بات کا احساس ہوا تو اسے کوئی پریشانی بھی نہیں ہوئی۔ وہ مغرب کی لڑکی تھی۔ اپنی زندگی کے فیصلے کرنا، اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزارنا اس کا حق تھا۔ بس اہمیت اس بات کی تھی کہ اوتارنگھ کے نزدیک بھی اس کی کوئی اہمیت ہے یا نہیں۔

اس معاملے میں اسے مایوسی ہوئی۔ اوتارنگھ سب سے ایک طرح سے ملتا تھا۔ بلکہ بھی تو ایسا لگتا تھا کہ دوستوں میں اس کے نزدیک جنس کی تفریق تھی ہی نہیں۔ وہ بہت خوش اخلاق تھا، مہذب تھا۔ اس کے اندر برکھ رکھا تھا۔ بس اس

سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ مایوسی وقتی تھی۔ رینا نے سمجھ لیا کہ اوتارنگھ ایک ایسا لاکا ہے جس نے ابھی جوانی کی سرحد میں قدم نہیں رکھا ہے اور ابھی وہ جوانی کے تقاضوں سے نا آشنا ہے۔ وہ اسے اہمیت نہیں دیتا تو کوئی بات نہیں۔ اسے خود کو کش کرنی ہوگی کہ وہ اسے اہم سمجھے لگے۔ وہ بہت خوب صورت اور شاداب لڑکی تھی۔ اسے خود بہت بھروسہ تھا۔ کلب میں وہ دیکھ چکی تھی کہ مرد کیسے دیوانہ وار اس کی طرف لپکتے ہیں۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب اس سلسلے میں اسے کچھ کرنا ہے۔ لیکن اس سے پہلے ہی اس پر ایک دھماکا خیز انکشاف ہو گیا۔ اس نے دیکھ لیا کہ وہ تو ایک انار سو بیمار والا معاملہ ہے۔ اس معاملے میں لڑکیوں کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ اس نے دیکھ لیا کہ دوستوں کے اس حلقے میں تمام لڑکیاں صرف اور صرف اوتارنگھ کی تمنائی ہیں۔ کیا پشپا، کیا امرتا اور کیا نادرہ۔ اس کا مقابلہ بہت سخت تھا۔ مگر رینا کو یقین تھا کہ جیت اسی کی ہوگی۔

اوتارنگھ کو اکیلے میں محمود سے بات کرنے کا موقع ملا۔ لیکن اس دوران ایک اور اہم واقعہ ہو گیا۔ ہفتے کے روز نما پیر یڈ میں وہ مل بیٹھے۔ چند لمبے ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ رچرڈ نے کہا۔ ”آج رینا کا تھڑے ہے۔“

اس پر سب نے چونک کر رینا کو دیکھا۔ رینا مسکرائی۔ اسے سب کی توجہ کا مرکز بننا بہت اچھا لگتا تھا۔ سب نے اسے پٹی برتھ ڈے کہا۔

”نہیں... مجھے یہ مبارک باد نہیں چاہیے۔“ رینا نے کہا۔

”ہر چیز کا ہر بات کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ یہ کیا کہ یہاں ہمارا ”تو پھر؟“ محمود نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

رینا کو احساس تھا کہ محمود اسے خصوصی توجہ دیتا ہے۔ مسکرائی۔ ”اب یہ تو تم سوچو۔“ اس کے لہجے میں چٹنی تھا۔ ”چلو... میں تمہیں تھوہ دوں گا تب وش کروں گا۔“

محمود بولا۔

”میں بتاتا ہوں۔“ رچرڈ نے مداخلت کی۔ ”آج رینا گھر پر رینا کی تھڑے پانی ہے۔ تم سب کو آنا ہے۔“

”برتھ ڈے پارٹی!“ رام کو پال نے فکر مند کی۔

”پھر وہی احساس کتری!“ رینا نے سوچا۔

”اس پارٹی میں ہم دوستوں کے علاوہ کوئی نہیں

چرڈ نے وضاحت کی۔

”اوہ... میری گڈ!“ پشپا نے چپک کر کہا۔

رام کو پال نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ وہاں بہت سارے لوگ ہوں گے... بے شمار انگریز۔ ”کیوں نہیں؟ ہم ضرور آئیں گے۔“

”پارٹی کا وقت کیا ہے؟“ محمود نے پوچھا۔

”رات آٹھ بجے، ڈنر سب بجے۔ پھر ڈانس اینڈ میوزک!“ رینا بولی۔

”یہ تو لمبا پروگرام ہے۔“ نادرہ کے لہجے میں فکر مند کی تھی۔

”تو کیا؟ آج سیڑھے ہے۔ کل کالج کی چھٹی ہوگی۔“ رات اپنی ہی سے بے فکر تھی۔

”نہ بابا... میں رات بھر نہیں رہ سکتی۔“ نادرہ بولی۔

”مجھے تو پارٹی میں شرکت کی اجازت مل رہی ہے۔“ رینا نے نہیں ملے کی۔ ہم لوگ ایسے آزاد خیال نہیں ہیں۔“

”اوکم آن۔“ ڈونٹ بی سو بیک ورڈ۔“ رینا نے کہا۔

”نادرہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ محمود نے تائیدی۔ ”میں بھی مل رہی جانا چاہتا ہوں گا۔“

چرڈ نے غور سے ان دونوں کو دیکھا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ رات کا موقع اسے کتنا چاہیے ہوگا۔ ”اوکے۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

اپنے کرادوں کو۔

”تب تو ٹھیک ہے۔“ نادرہ نے کہا۔

رینا نے اوتارنگھ کو دیکھا۔ ”تم نے کچھ نہیں کہا۔ کیا بات آگے گئی؟“

”نور و آؤں گا۔ میں تو آزاد آدمی ہوں۔“ اوتارنگھ نے کہا۔

”اور اچھا لگا تو پوری رات بھی رُک سکتا ہوں۔“

”میں بھی۔“ رچرڈ نے اوتارنگھ اور امرتا نے بیک آواز کہا۔

”میں بھی آؤں گی اور پوری رات رُکوں گی۔“

”اس تو طے ہو گیا۔ آج رات آٹھ بجے۔“

رینا نے ان دونوں بہت پریشان تھی!

”تو استانی صاحبہ کی پڑھائی نے اس کا معمول تبدیل کر دیا۔ پھر پوٹوٹھا کر کا معمول بھی بدل گیا۔ اس نے کچھ اعداد پر کوٹھے پر آنا اور دیر تک بیٹھنا چھوڑ دیا تھا۔ اس نے اس پر سوچا۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ پھر اتفاقاً اس کی چھٹی کی تو اسے پتا چلا کہ چھوٹا ٹھکانہ عربی پڑھ

رہا ہے۔ یہی نہیں، وہ اپنے مولوی صاحب سے قرآن پاک کی تلاوت بھی سنتا ہے۔

اس انکشاف نے حور بانو کے سامنے امکانات کی ایک روشن دنیا لا کر رکھ دی۔ خوش فہمی کے سرسبز باغ اسے نظر آنے لگے۔ اسے لگا کہ نہ جانے کیسے... مگر چھوٹا ٹھکانہ بھی اس سے محبت کرنے لگا ہے اور اسی کی خاطر وہ عربی سیکھ رہا ہے۔ اور تلاوت سننے کے بعد اگلا مرحلہ تو قبول اسلام ہی کا ہے۔

معصوم لڑکی اس معاملے میں نہ کسی کورا دار دینا سکتی تھی، نہ کسی سے مشورہ لے سکتی تھی۔ آپ ہی آپ سوچتی، اندازے لگاتی اور خوش ہوتی۔ اور عربی پڑھنے والی بات سے تو وہ اتنی خوش ہوئی تھی کہ اس نے چھوٹے ٹھکانہ کی دید سے محرومی پر بھی صبر کر لیا تھا۔ بڑے کام کے لیے بڑی قربانی بھی دینی پڑتی ہے۔ یہ دید سے محرومی تو بہت چھوٹی بات تھی۔

لیکن ایک صبح اسے برا دھچکا لگا۔ اس نے دیکھا کہ وصال دین اکبلا اسکول جا رہا ہے۔ وہ پریشان ہو گئی۔ کہیں چھوٹے ٹھکانہ کی طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی؟ وہ بے چین رہی۔ چھٹی کے وقت وہ پھر دروازے پر پہنچ گئی۔ وصال دین اسکول سے اکیلا ہی واپس آیا تھا۔

اس معمول کو ایک ہفتہ ہو گیا۔ حور بانو کی پریشانی کی کوئی حد نہیں تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ چھوٹا ٹھکانہ زیادہ ہی بیمار ہے۔ لیکن اوپر یہ ظاہر سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ کافی دنوں سے رنجنا بھی نیچیں آئی تھی۔

وہ پہلا موقع تھا کہ حور بانو نے ایک ہفتے تک چھوٹے ٹھکانہ کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی۔ اس شام وہ پڑھائی کے دوران پانی پینے کے بہانے سے اٹھی اور برآمدے میں چلی آئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اوپر کوٹھے پر چھوٹا ٹھکانہ اپنے مولوی صاحب سے عربی پڑھ رہا تھا۔

حور بانو کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہاں سے بٹے۔ لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو شبہ ہو۔ چنانچہ وہ پانی پی کر واپس چلی آئی۔ اسے یہ اطمینان تو ہو گیا کہ چھوٹا ٹھکانہ بیمار نہیں ہے۔ لیکن یہ ابھمن برقرار رہی کہ وہ اسکول کیوں نہیں جا رہا ہے۔

اس روز رنجنا نیچے آئی تو حور بانو ہر احتیاط بھول بیٹھی۔ ”اتنے دن بعد آئی ہو؟ کیا بات ہے؟“ اس نے رنجنا سے پوچھا۔

”بس موقع ہی نہیں ملا۔“

”سب خیریت ہے؟“ حور بانو نے بے تابی سے پوچھا۔

”ہاں... سب ٹھیک ہے۔“

اس سے زیادہ پوچھنے کا موقع نہیں تھا۔ رنجنا بیٹھ کر اماں سے بات کرتی رہی اور حور بانو بے تاب سی ادھر سے ادھر پھرتی رہی۔ رنجنا جانے لگی تو حور بانو اس کے پیچھے برآمدے تک چلی آئی۔ ”رنجنا... تمھارے چھوٹے ٹھاکر نے پڑھنا چھوڑ دیا ہے کیا؟“ اس نے بے حد سرسری انداز میں پوچھا۔ لیکن اسے احساس تھا کہ بات سرسری نہیں ہے۔

رنجنا بہت بری طرح چونکی پھر بولی۔ ”لو... انھیں تو پڑھنے کے سوا کچھ ہی نہیں ہے۔ ہر وقت پڑھتے ہی رہتے ہیں۔“

”تو گھر پر ہی پڑھتے ہیں؟ اسکول چھوڑ دیا کیا؟“

”نہیں تو... روز جاتے ہیں۔“ رنجنا نے کہا۔ پھر بہت غور سے اسے دیکھا۔ ”پر تم نے یہ کیسے سوچ لیا؟“

حور بانو چوری ہوئی۔ مگر اب پیچھے بھی نہیں ہٹ سکتی تھی۔

”آ کامیاں کہہ رہے تھے کہ اب وصال دین اسکول اکیلا جاتا ہے۔“

”ارے ہاں... وہ چھوٹے ٹھاکر تو پاس ہو گئے نا۔“

اچانک رنجنا کو خیال آیا۔ ”اب وہ اسکول نہیں... وہ کیا کہتے ہیں... ماسٹر جی بتا رہے تھے... ہاں کالج اب چھوٹے ٹھاکر کالج جاتے ہیں۔“

”یہ کالج کیا ہوتا ہے؟“ حور بانو نے مزید ٹھولا۔

”ماسٹر جی کہہ رہے تھے، بڑا اسکول ہوتا ہے... بہت بڑا۔“ رنجنا نے دونوں ہاتھ آخری حد تک پھیلاتے ہوئے بتایا۔

”اور ماسٹر جی یہ بھی بتا رہے تھے کہ وہاں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتے ہیں۔“

”ہائے اللہ!“ حور بانو نے بے ساختہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہم تو آ کامیاں کے سوا کچھ ہی کسی کے سامنے نہیں آئے۔“

”وہاں تو انگریز لڑکیاں بھی ہوتی ہیں۔ پر میری سمجھ میں نہیں آتا۔ صبح چھوٹے ٹھاکر زادیر سے جاتے ہیں اور واپسی کا کچھ پتا نہیں۔ کبھی جلدی بھی آ جاتے ہیں... لیکن زیادہ تر دیر ہی ہوتی ہے۔ کبھی تو شام بھی ہو جاتی ہے۔ پھر واپس آ کر کبھی پڑھتے ہی رہتے ہیں۔ سوکھ کے کاغذ ہو گئے ہمارے چھوٹے ٹھاکر۔ ارے میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنا پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنی زمین داری ہی سنھائی ہے نا انھیں۔“

اچھا... اب میں چلتی ہوں۔“

رنجنا چلی گئی۔ حور بانو دیر تک بہت بے بسی ویں کھڑی رہی۔

ایک مسئلہ تو حل ہو گیا تھا۔ یعنی اب وہ چھوٹے ٹھاکر کو جانے آتے دیکھنے کی کوشش تو کر سکتی تھی۔ لیکن دوسری پریشانی لائی ہو گئی۔ کالج میں لڑکے لڑکیاں ساتھ پڑھتے تھے۔

یہ بات اس کے دل کا بوجھ بن گئی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ اس بوجھ کو کسی کی سامنے ہلکا کیسے کرے۔ خود ہی سوچتے رہے۔

سے تو انھیں اور بڑھ جاتی ہے۔

اگلے روز اسے موقع مل گیا۔ استانی جی پردے کی اہلیہ کے متعلق ایک حدیث شریف پڑھا رہی تھیں۔

”مگر استانی جی، میں نے تو سنا ہے کہ کالج میں لڑکے لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتے ہیں۔“ اس نے بات نکالی۔

”ہاں، یہ انگریزوں کی لائی ہوئی لغت ہے۔“ استانی جی نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”اب ہندوؤں کے ہاں تو پردہ ہے نہیں۔ وہ بھی آنکھیں بند کر کے انگریزوں کے پیچھے چل پڑے ہیں۔ یہ تو بے حیائی ہے۔ میں نے تو سنا ہے کہ کالج میں لڑکیاں سرسری پوڈر لگا کر جاتی ہیں بے حیائی کے کپڑے پہنتی ہیں اور ان کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر گھومتی ہیں۔“ استانی جی نے جواب دیا۔

آگ بریل کا چھڑکاؤ کر دیا۔

”مگر استانی جی، سنا ہے کہ کالجوں میں مسلمان لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں۔“ حور بانو نے کہا۔

”کچھ موئے مسلمان ہیں جو انگریزوں کے ٹوڈی پھرتے ہیں۔“ استانی جی بھٹک کر بولیں۔ ”ان کی اولاد میں ایسے کالجوں میں پڑھتی ہوں گی۔ وہ کم بخت اپنی پہچان کھو بیٹھے۔ بس کلمہ پڑھنے کے مسلمان رہ گئے ہیں وہ۔“

”پھر بھی استانی جی، میں تو وہ مسلمان ہی ہوں۔“

”ہاں، یہ تو ہے۔“ استانی جی نے جواب دیا۔

پھر ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ”صحبت کا اثر ہے۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ اسی طرح مسلمان پاکستان بنارہے ہیں... تاکہ وہاں پوری آبادی سے اپنے طریقے سے زندگی گزار سکیں۔ کسی کی مثال کریں۔ اچھے مسلمان بن کر رہیں۔“

استانی جی سے بات کر کے حور بانو اور پریشان ہو کر کالج اس کے لیے تو سوا ہاں روح بن گیا۔

اگلی صبح وہ وصال دین کے جانے کے بعد دروازہ منڈلاتی رہی۔ بالآخر اس نے چھوٹے ٹھاکر کو جانے دیا۔

وہ انگریزوں کی طرح سوٹ پہنے ہوئے تھا اور بہت اچھا تھا۔ اسے دیکھ کر یہ احساس بھی ہوا کہ وہ بڑا ہو گیا۔

چند روز میں یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اسے کالج سے آتے دیکھنا بہت مشکل ہے۔ اس کی واپسی کا کوئی وقت ہی نہیں تھا۔

اب رات کے وقت حور بانو سونے کے لیے لیتی تو تصور میں اسے کالج نظر آتا۔ حالاں کہ کالج اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کالج میں بس وہ ایک ہی منظر دیکھتی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہاں چھوٹے ٹھاکر کے سوا کوئی لڑکا نہیں ہے اور وہ اسے بھانٹ بھانٹ کی لڑکیوں میں گھرا نظر آتا۔ لڑکیاں جو عجیب و غریب لباس پہنے ہوئیں اور چھوٹے ٹھاکر کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کرتیں۔ وہ بے چارہ انھیں جھٹکتا رہتا۔

لیکن تصور سے ہٹ کر جب وہ سوچتی تو خوف زدہ ہو جاتی۔ وہ سوچتی کہ چھوٹا ٹھاکر کتنا ہی اچھا سہی ہے تو انسان۔

کے۔ تنک ان لڑکیوں سے بچے گا۔ جب کہ وہ لڑکیاں تو ہیں ہی بے حیا۔ اور چھوٹا ٹھاکر لاکھوں میں ایک ہے۔ کوئی نہ کوئی لڑکی اسے لکھا ہی لے گی۔ اور پھر ہو سکتا ہے کہ وہ خود بھی ایک کوچھوڑ کر دوسری اور دوسری کوچھوڑ کر تیسری کے چکر میں پڑ جائے۔ اور اسے بھول جائے تو کیا وہ اتنی آسانی سے اسے کھو بیٹھے گی۔

اس آخری بات پر اسے خود بھی ہنسی آ گئی۔ لمبوت نہ کیا اس اور غلا بے سے ٹھمکھا۔ اسے بھولنے کا کیا سوال، جب اسے تو معلوم ہی نہیں کہ کہیں کوئی حور بانو بھی ہے جو اس سے بھگ لاتی ہے۔ اس نے تو اس کی ایک جھلک بھی کبھی نہیں دیکھی۔ وہ تو ابھی جانتا بھی نہیں اور کھونے کا کیا سوال! جب کہ وہ اس کا بے بسی۔ اس مقابلے میں وہ تو نہیں ہے ہی نہیں۔ اس سوچ کے بعد بس وہ اس فکر میں لگ گئی کہ کس طرح ہونے ٹھاکر کے سامنے آ جائے... وہ اسے دیکھ لے۔ تب شاید وہ اس سے جیا لڑکیوں سے محفوظ رہ سکے۔

براہ راست چھوٹے ٹھاکر کے سامنے جانے کا تو وہ اندر بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ہاں، وہ چلمن کے پیچھے سے یا ہالوں کے عقب سے اسے اپنی جھلک دکھا سکتی تھی۔ سو اس نے اس کا اہتمام کر لیا۔

اس روز اس نے اپنا سرخ کا مدانی کا جوڑا پہنا۔ چھوٹا ٹھاکر دو بجے سے پہلے کبھی کالج سے نہیں آتا تھا۔ چنانچہ وہ دو بجے تک تیار ہو کر ڈیوڑھی میں آ گئی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اسے کتنا انتظار کرنا ہوگا۔ وہ تمام وقت کیا، زیادہ دیر بھی ڈیوڑھی میں ہی نہیں رہ سکتی تھی۔ چنانچہ وہ بے مشکل پانچ منٹ کھڑی ہوئی اور پھر ہٹ جاتی۔ پھر پانچ منٹ بعد وہ دوبارہ ڈیوڑھی پہن چلی جاتی اور اس دوران اسے یہ انھیں ستانی کہ شاید چھوٹا

ٹھاکر آ کر اوپر جا بھی چکا ہے... اس دوران جب وہ گھر میں تھی۔ خوش قسمتی سے چھوٹا ٹھاکر اس روز کالج سے جلد ہی گیا۔

ورنہ حور بانو پر نہ جانے کیا ہینتی۔ اور خوش قسمتی سے اس وقت وہ ڈیوڑھی میں آئی تھی... یہی سوچتی ہوئی کہ شاید چھوٹا ٹھاکر اوپر جا چکا ہوگا۔

آتے ہوئے چھوٹے ٹھاکر کی پہلی جھلک دیکھی تو حور بانو کا دل سینے میں یوں دھڑا دھڑایا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ اور سانسیں اتنی تیز ہوئیں کہ ان کے شور سے اسے خود بھی گھبراہٹ ہونے لگی۔ اس کا جسم یوں سنسنار ہا تھا جیسے رگ رگ میں کوئی برقی رودور رہی ہو۔ اس کے ہاتھ پاؤں کیا، پورا جسم کانپ رہا تھا۔

چھوٹے ٹھاکر کو آتے جاتے اس نے بار بار دیکھا تھا۔ مگر اس کا یہ حال پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ آج جو کرنے کا اس نے ارادہ کیا تھا، وہ پہلے بھی سوچا تنک نہیں تھا۔ آج وہ جا چکی تھی کہ چھوٹا ٹھاکر اسے دیکھے۔ وہ اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتی تھی۔

مگر اب موقع ملا تو وہ پریشان کھڑی تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے! ایسا کیا کرے وہ؟ کیسے کرے؟ اس کے ہاتھ پاؤں جواب دینے لگے۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے چلمن کی طرف بڑھی۔ لیکن ناگلوں کی لڑش اتنی بڑھ گئی کہ اسے لگتا تھا، وہ گر جائے گی۔

اور وہ صرف چند لمحوں کا کھیل تھا۔ اس موقع کی طوالت نہ ہونے کے برابر تھی اور اختصار ایسا تھا کہ مشکل سے چار بار پلکیں جھپکی جاسکتی تھیں۔

چھوٹا ٹھاکر دور سے آتا دکھائی دے رہا تھا اور وہ پہچانوں کی طرح لرزاں تھی۔ اس کا دماغ سانسیں سانسیں کر رہا تھا۔ وہ قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ اور اب ایک پل کی بات تھی۔ پل گزرتا اور وہ آگے نکل جاتا۔

حور بانو سوچ رہی تھی کہ کیا کرے۔ وہ تنگ تھی۔ ہونٹ سوکھ گئے تھے۔ اس نے آواز نکالنے کی کوشش کی۔ مگر آواز بھی جیسے غائب ہو گئی تھی۔ اور پل نکلنے ہی والا تھا۔ اس نے پھر بولنے کی کوشش کی... اور اسے چندا لگا گیا!

چھوٹے ٹھاکر نے آواز سن کر نظر اٹھائی۔ لیکن پوری طرح اٹھنے سے پہلے ہی اس کی نظر جھک گئی۔ اور پھر وہ آگے نکل گیا۔

حور بانو کی مایوسی کی کوئی حد نہیں تھی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ چھوٹے ٹھاکر کی نظر خطراری طور پر اٹھ رہی تھی۔ مگر درمیان

207

206

206

207

206

207

206

207

میں ہی اس نے خود پر قابو پایا تھا اور نظر جھکا لی تھی۔ معصوم لڑکی نہیں جانتی تھی کہ وہ نظر بھر کر دیکھ لیتا تو بھی اسے نہ دیکھ پاتا۔ باہر دھوپ بھی اور اندر اندر اندیر۔ پھر درمیان میں چلن۔ ایسے میں چھوٹے ٹھاکر کو تخرک سرخ رنگ کے سوا کیا نظر آ سکتا تھا۔

اس رات وہ بستر پر لیٹی یہی کچھ سوچتی رہی۔ وہ منظر اس کے تصور میں بار بار آتا... چھوٹے ٹھاکر کا اضطرابی طور پر نظر اٹھانا... اور فوری ٹھٹک کر نظر جھکا لینا۔ اچانک اس کے ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ ارے... یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں۔ یہ تو چھوٹے ٹھاکر کی شرافت کا ثبوت ہے۔ وہ تو نگاہ سنبھالنے والا آدمی ہے۔ اس رویے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کالج میں وہ کس طرح رہتا ہوگا۔ حور بانو کے دل کو ایک اطمینان سا ہو گیا۔

لیکن محبت میں خطرے کا احساس بہت توانا ہوتا ہے۔ اس کا سکون محض فقی تھی۔ بعد میں اس نے مختلف انداز میں سوچا تو بے سکون ہو گئی۔ وہ تو چلن کے پیچھے تھی۔ چھوٹے ٹھاکر نے اٹھتی نظر پر قابو پایا۔ لیکن کالج میں تو بے حجاب لڑکیاں دھڑ سے اس کے سامنے آ جاتی ہوں گی۔ تب تو نظر جھکتے جھکتے بھی بڑھ جاتی ہوگی۔ اور پھر یہ معمول ہو تو کیا کوئی ہر وقت... بار بار نظریں جھکا تا رہے گا نہیں... یہ تو ممکن نہیں۔

کچھ بھی ہو، حور بانو نے یہ تسلیم کر لیا کہ اس کے پاس اس کا کوئی تو نہیں۔ وہ کچھ بھی کر لے، کبھی چھوٹے ٹھاکر کے سامنے نہیں آ سکے گی۔ اور اسے ایک اور خیال آیا۔ اس نے وجود کی پوری سچائی کے ساتھ اس پر سوچا۔ یہ حقیقت تھی۔ بہت بڑی سچائی تھی کہ اس محبت پر اس کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ یہ اس نے کی نہیں تھی، اسے خود بخود ہوئی تھی۔ اس میں اس کے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ تو یہ محبت اللہ نے اس کے دل میں ڈالی تھی۔

تب اسے یہ سوچ کر شرمندگی ہوئی کہ چھوٹے ٹھاکر کے سامنے آنے کی، خود دکھانے کی کوشش اس کی اپنی تھی اور بلارادہ تھی۔ یہی نہیں اس کا ارادہ اور اس کی کوشش اللہ کے حکم سے متصادم تھی۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے اور وہ خود کو چھوٹے ٹھاکر کو دکھا دے، تب بھی اس بات کی ضمانت نہیں کہ چھوٹا ٹھاکر کالج میں بے پردہ لڑکیوں کے شر سے محفوظ رہے گا۔ یہ ضمانت تو وہی دے سکتا ہے جس نے اس کے دل میں چھوٹے ٹھاکر کی محبت ڈالی ہے۔ وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتی۔

اس سوچ کے بعد بس یہ ہوا کہ وہ کئی دن تک اللہ سے توبہ کرتی رہی۔ پھر اس کے دل کو سکون ہو گیا۔ جس نے اس کے

دل میں وہ محبت ڈالی ہے، وہی جانے۔ وہی فیصلہ کرنے والا ہے۔ اب اسے کچھ نہیں کرنا۔ جو ہو سو ہو۔

پارٹی میں شریک ہونے کے لیے وہ بھی ٹھیک وقت پر پہنچے۔ سب سے پہلے آنے والا محمود تھا اور امرتا سب سے آخر میں آئی تھی۔ اوتار سنگھ سب سے زیادہ ہمدرد تھا۔ ورنہ اس کے علاوہ سبھی کو یہ خیال تھا کہ وہاں بہت سے انگریز مہمان ہوں گے۔ بلکہ وہ تو ریٹائرڈ چرڈ کے والدین کا سامنا کرتے ہوئے بھی احساس کمتری میں مبتلا ہو رہے تھے۔ جب کہ اوتار سنگھ کو اس سے غرض نہیں تھی کہ وہاں کون کون ہوگا۔

لیکن وہاں پہنچ کر ان سب کے دل خوش ہو گئے۔ اس پارٹی میں سوائے ان لوگوں کے کوئی اور شریک نہیں ہو رہا تھا۔ چرڈ کے کمی اور ڈیڑی بھی گھر میں موجود نہیں تھے۔ وہاں نوکروں کی سوا کوئی نہیں تھا۔ ان سب کی جھجک دور ہو گئی۔ وہ پرسکون اور خوش نظر آنے لگے۔

پھر بھی ایک پھاس دلوں میں پچھ رہی تھی۔ پھر پھر پارس نہ جانے کب آ جائیں۔ اوتار سنگھ ان سب کی اس کھینچاؤ کو سمجھ رہا تھا۔ وہ ان کے اندر جیسے احساس کمتری سے تو پہلے ہی واقف تھا۔ اور وہ اس پر غور کرتا رہتا تھا۔

پھر وہ پھاس بھی نکل گئی!

”تمہارے می ڈیڈی کہاں گئے ہیں؟“ امرتا نے ریٹائرڈ سے پوچھا۔

”کلب گئے ہیں۔“ ریٹائرڈ جواب دیا۔

”واپس کب آئیں گے؟“ نادرہ نے سوال اٹھایا۔

”آج سیر ڈے نائٹ ہے“ ریٹائرڈ مسکراتی ہوئی رات کے بعد ہی واپسی ہو گئی۔

اجتماعی طور پر سکون کی سانس لی گئی۔

”تو کیک کاٹنے کے لیے تم ان کا انتظار کرو گی؟“ فتح سنگھ نے پوچھا۔

”ارے نہیں، یو سلی!“ ریٹائرڈ نے آنکھیں نکالیں۔ ”میں نے انھیں بتا دیا تھا کہ یہ ایک پرائیویٹ پارٹی ہوگی۔ صرف ہمارے منتخب دوست اس میں شریک ہوں گے اور کیک تو اکی

ذرا دیر میں کاٹا جائے گا۔“

اس کے بعد ماحول ہلکا ہوا گیا۔ سب کے سب بے خوش مزاج ہو گئے۔ کالج کی پڑھائی کی، کالج کے ساتھیوں کی باتیں ہونے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد بٹر کیک لے آیا۔ ہال کی

افسانہ گئی۔ کیک کے گرد سولہ موم بتیاں روشن کر دی گئیں۔ ریٹائرڈ نے کیک کا ٹا۔ سب نے اسے مبارک باد دی اور تحفے پیش کیے۔ کیک کاٹنے اور اس سے ٹکٹے کے بعد ٹکٹے کھولنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک دوسرے کے تحفوں پر فخرے چست کیے گئے۔

”ارے واہ... رام نے تاج محل کا ماڈل دیا ہے۔“ نادرہ بولی۔

رام گوپال کا چہرہ تھما اٹھا۔

”اوہ... اس بیوٹی فل!“ ریٹائرڈ نے محور ہو کر کہا۔

”اینڈ اس آف آئیٹ!“ امرتا نے وضاحت کی۔

رام گوپال بھی طرح کھسیا رہا تھا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہے۔“ وہ بولا۔ ”اور یہ مجھے بہت خوب

سورت لگا۔“

”ایسے صفائی کیوں پیش کر رہے ہو جسے تم نے کوئی جرم کیا ہے۔“ محمود نے کہا۔

”مجھے تو یہ بہت اچھا لگا ہے۔“ ریٹائرڈ نے۔

رام گوپال کے چہرے پر ریگ دوڑ گیا۔ تحفہ کھلنے کے بعد ہال پر اس نے سکون کی سانس لی تھی۔

اس ایک بعد پارٹی اگلے دور میں داخل ہو گئی۔ بٹلر نے کیک کی ٹکٹیں کی بوتلیں اور جام لاکر میز پر رکھ دیے اور باہر

اٹھ گیا۔ بٹلر نے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور ہاتھ میں ٹکٹین کی

ہال لیے کھڑا ہوا اور اعلان کرنے والے انداز میں بولا۔

”ایندز اینڈ جنٹلمین، آج کی یہ خوب صورت شام میری سویٹ

ان ریٹائرڈ کے نام۔ اور اس شام کا آغاز ہم ٹکٹین کی بوتل سے

کر لیں گے۔ کہتے ہیں کہ ٹکٹین کی بند بوتل جوانی کے جوش کی

اندھ کی کرتی ہے۔ جیسے جوان آدمی زندگی کے جوش کو دبائے

لے لے رہا ہوتا ہے، ویسے ہی کارک ہونے تک ٹکٹین کی بوتل بھی اپنا

ال پھانپاے رہتی ہے اور کارک پھٹتی ہی... اس نے بوتل کا

لوک کھول دیا۔ شراب یوں اچھل کر، پچل کر نکلی جیسے اس کا

ہر جواب دے گیا ہو۔

وہ سب تالیاں بجانے لگے۔ وہ منظر انھیں خوب صورت

رچرڈ جام بھرنے میں مصروف ہو گیا۔ پھر اس نے پہلا

رام گوپال کو پیش کیا۔ ”نارم آؤ آن... پوری باڈی۔“ اس نے

ہال کی۔

ہال اٹھانے کے لیے بڑھنے والوں میں نادرہ، محمود اور

اٹھانے کے لیے بڑھنے والوں میں نادرہ، محمود اور

اٹھانے کے لیے بڑھنے والوں میں نادرہ، محمود اور

اٹھانے کے لیے بڑھنے والوں میں نادرہ، محمود اور

اٹھانے کے لیے بڑھنے والوں میں نادرہ، محمود اور

اٹھانے کے لیے بڑھنے والوں میں نادرہ، محمود اور

اوتار سنگھ نہیں تھے۔ پشپا، امرتا، رام گوپال اور فتح سنگھ نے جام اٹھا لیے۔

رچرڈ کی نظروں میں الجھن تھی۔ ”کیا ہوا؟ تم لوگ شامل نہیں ہو گے؟“ اس نے پوچھا۔

”تم جانتے ہو رچرڈ۔ ہم شراب نہیں پیتے۔“ محمود نے کہا۔

”اور تم اوتار سنگھ؟ تمہارا مذہب تو تمہیں منع نہیں کرتا۔“

رچرڈ نے اوتار سنگھ کو دیکھا۔

”ہاں... مگر مجھے یاد ہے بتائی نے ایک بار مجھے سمجھایا تھا

اور میں کبھی نہیں بھولا۔“ اوتار سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”پتا

جی کہتے ہیں، دنیا میں سب سے قیمتی چیز آدمی کی عزت ہوتی

ہے۔ انھوں نے کہا تھا، آدمی نشتے میں ہوش و حواس

کھو بیٹھتا ہے۔ نہ اسے اپنی عزت کا خیال رہتا ہے، نہ بے

عزت کا پتا چلتا ہے۔ اسی طرح اسے دوسروں کی عزت کی بھی

پر دانتیں ہوتی۔ بس اسی لیے پتا جی نے کبھی شراب نہیں پی۔

اور میں بھی کبھی نہیں پیوں گا۔“

اس دوران سب اسے غور سے دیکھتے رہے تھے۔ سب

کے تاثرات مختلف تھے۔ پشپا، امرتا، رام گوپال اور فتح سنگھ کی

نگاہوں میں استہزا تھا۔ نادرہ اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ

رہی تھی۔ محمود کی نگاہوں میں اس کے لیے عزت تھی۔ ریٹائرڈ

زود ہی نظر آ رہی تھی اور اس کی نگاہوں میں دل چسپی تھی۔ رچرڈ

کا انداز ایسا تھا جیسے اسے یقین نہیں آ رہا ہو۔

”ریش... کو اس!“ رام گوپال بڑبڑایا۔

”یہ تو امرت رس ہے ٹھاکر جی۔“ فتح سنگھ نے پٹخا رالیے

ہوئے کہا۔

لڑکیوں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ بہ ہر حال، وہ سب اپنے

اپنے جام ہاتھ میں لیے کھڑے تھے۔

رچرڈ نے ابھی تک جام نہیں اٹھایا تھا۔ ”بہ ہر حال، یہ تو

مہمان نوازی کے اصول کے خلاف ہوگا کہ ہم نہیں اور تم دیکھتے

رہو۔“ رچرڈ نے کہا۔

”تو ہم باہر چلے جاتے ہیں۔“ نادرہ بولی۔

”ارے نہیں... تم غلط سمجھ رہی ہو۔“ رچرڈ نے بے ساختہ

مسکرایا۔ ”میرا مطلب ہے، تم لوگوں کو تمہارے ذوق کے

مطابق کچھ ملنا چاہیے۔“ یہ کہہ کر اس نے ہتھی کا بن دیا۔

چند لمحوں کے بعد بٹر اندر آیا۔ ”کیا حکم ہے صاحب؟“

”اور تم جو اس نے لکھا تو... بڑھنے والوں میں نادرہ، محمود اور

اٹھانے کے لیے بڑھنے والوں میں نادرہ، محمود اور

اعلان گم شدگی

آپ ریڈیو سے آئے دن سچوں کی گم شدگی کے اعلانات سنتے رہتے ہوں گے۔ یہ اعلانات پولیس اسٹیشن سے رپورٹ کی کاپی ملنے کے بعد شائع کیے جاتے ہیں، یعنی جس کا پتہ کھوجا نہ ہو، وہ پہلے پولیس میں رپورٹ کرے۔ اس رپورٹ کی کاپی لے کر ریڈیو اسٹیشن آکر گم شدگی کا فارم پُر کرے۔ اس کے بعد اسے نشر کر دیا جاتا ہے، اور پولیس رپورٹ کی کاپی اور گم شدگی کے اعلان کا فارم قائل کر دیا جاتا ہے۔ یہ اعلانات صرف بارہ سال تک کی عمر کے بچوں کی گم شدگی پر نشر کیے جاتے ہیں۔

بارہ سال سے زیادہ عمر کے صرف ان اشخاص کی گم شدگی کے اعلانات کیے جاتے ہیں جن کا ذہنی توازن درست نہ ہو، اس لیے پولیس کی رپورٹ کے ساتھ ڈاکٹر کا شکیلیت بھی لانا لازمی ہوتا ہے۔ اس میں منظر کے بعد وہ واقعہ سنیں، جو سمجھ پریتا۔

”مصلحتی زیدی کے ایک دوست ہیں، حامد صاحب۔ بزرگ اور سنجیدہ آدمی، ایک پریس کے مالک اور کئی بچوں کے باپ، بلکہ دادا، نانا۔ زیدی کی وجہ سے میرے بھی اچھے تعلقات تھے۔ ایک روز انھوں نے مجھے فون کیا۔ ”مظفر صاحب! میرے ایک دوست دو تین دن سے لاپتہ ہیں۔ ان کا ذہنی توازن خراب ہے۔ وہ بغیر بتائے گھر سے کہیں چلے گئے ہیں۔ آپ گم شدگی کا اعلان کر دیجیے۔“

انھوں نے مجھے اپنے دوست کا پورا نام بتایا اور میں نے وہ اعلان نشر کر دیا، محض اُن کے کہنے پر۔ نہ کوئی رپورٹ لی، اور نہ ڈاکٹر کا شکیلیت۔ باقی وقت مجھے غصہ ہوا کہ میں کیسی کمزور آکا۔

”دوسرے روز زیدی نے مجھ سے دریافت کیا، ”تم نے کل کوئی گم شدگی کا اعلان حامد صاحب کے کہنے پر نشر کیا تھا؟“

میں نے بے تابی سے دریافت کیا، ”کیا وہ صاحب مل گئے؟“

زیدی نے بتایا، ”خاصا ہنگامہ ہوا اس حال پر۔ وہ حامد صاحب نے اپنے دوست سے مذاق کیا تھا۔ اُن کے دوست نے اپنے بارے میں اس بات پر ہنسی میں جب وہ اعلان سنا تو فوراً ہنسی سے بٹھا اور روانہ ہو گئے۔ اُن صاحب کے بیٹے دوڑے دوڑے اپنے والد کے دوست حامد صاحب کے پاس آئے اور اعلان کا ذکر کیا۔ حامد صاحب نے کہا، تم فکر نہ کرو، میں معلوم کرنا ہوں۔ شام تک حامد صاحب کے دوست ہنڈی سے آ گئے۔ ان کی ہنڈی پر سی کے لیے آئے، اتنا ہی زیادہ غصہ اُنھیں آتا، اور کیفیت کچھ ایسی ہوتی کہ مارے غصے کے، وہ بچ آچے سے باہر ہونے لگے۔“

”وہ اعلان حامد صاحب کے پاس آئے، اور کہا، ”تم نے ریڈیو اسٹیشن سے اعلان کے بارے میں کیا معلوم کیا؟“

حامد صاحب نے اُن کے لیے چائے منگوائی، کچھ ٹی مذاق کرنے کی کوشش کی، مگر اُن کا غصہ کسی طرح کم نہ ہوا تھا، آخر کار حامد صاحب نے اس بتا دی کہ یہ کچھ مذاق تھا۔

حامد صاحب کے دوست یہ سب سن کر ہنرگاہ بن گئے، ”میں اعلان کرنے والے کو نوکری سے نکالوا کر چھوڑ دوں گا۔ میرے گھر میں لوگوں کا مجمع ہے۔ سب لوگ اُن کو ہر گزیر کی خبریت دریافت کرنے چلے آ رہے ہیں۔ میں چھوڑوں گا نہیں اس کو جس نے میرے بارے میں ایسا بے ہودہ اعلان نشر کیا ہے۔“

حامد صاحب نے بڑی مشکل سے اپنے دوست کا غصہ ٹھنڈا کیا اور انھیں میری شکایت نہ کرنے پر راضی کر لیا۔

اس تمام واقعے میں ایک قانونی پہلو تھا جس کا مجھے کوئی علم نہ تھا، ورنہ میں کسی صورت بھی، بغیر پولیس رپورٹ اور ڈاکٹر کی شکیلیت کے، ایسا اعلان ہرگز نہ کرتا۔

قانونی پہلو یہ تھا کہ اگر کسی صاحب جائیداد شخص کو عدالت میں باطل ثابت کر دیا جائے تو عدالت اُسے اس کی جائیداد سے محروم کر کے اُس کے اراکین میں تقسیم کر سکتی ہے۔ اور غالباً یہی وجہ تھی کہ حامد صاحب کے وہ دوست غصے سے پاگل ہوئے نظر آ رہے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُن کا غصہ تھا۔ حامد صاحب مجھ سے بہت شرمندہ تھے اور بار بار معذرت کرتے تھے۔ اُس دن میں نے کبھی مرتبہ اپنے آپ سے یہ عہد کیا کہ

”عرض وسامع“ از سید مظفر حسین نقوی، تعاون: اشتیاق خان

تم لوگ اپنی دیوالیہ میں الجھے ہوئے ہو۔ ریٹا نے پھانی کوٹا کا۔ وہ اوتار سنگھ کو معذرت طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”نو... اس آل رات۔ آئی ڈیوٹ مائنڈ بلکہ مجھے اچھا لگا۔“ اوتار سنگھ کا اور دوسروں کا تو خیال کرو۔

میں کہا۔ ”اور مجھے لگتا ہے کہ آج میرے پتا جی کی بات درست ثابت ہو جائے گی۔“

”اب یہ سوچو دوست کہ میرا دھرم مجھے شراب پینے سے نہیں روکتا۔“ رام گوپال رچڑے سے مخاطب تھا۔ ”اور تمہارا دھرم بھی تمہیں نہیں روکتا۔ مگر محمود کا دھرم کچھ عجیب ہے... ہے نا؟“ زندگی کو انجوائے کرنے سے روکتا ہے۔“

محمود نے کچھ کہا نہیں۔ لیکن رچڑے پارس کو ایسی چھیٹی ہوئی نظروں سے دیکھا کہ وہ شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ ”نہیں رام تمہارا خیال غلط ہے۔“ رچڑے نے نظریں جھکاتے ہوئے دھنسنے لگے۔

”شراب کی ممانعت تو ہمارے مذہب میں بھی ہے۔“ رام گوپال چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر اس کے ہونٹوں پر شریری مسکراہٹ نظر آئی۔ ”تو یہ ثابت ہو گیا کہ ہمارا دھرم سب سے بہتر ہے۔“ اس نے کہا۔

اس کا لہجہ ایسا تھا کہ رچڑے کا چہرہ تھمتانے لگا۔ اس نے محمود کو دیکھا۔ وہ بڑی بے نیازی سے مسکرا رہا تھا۔ اس کے انداز میں بے پروائی اور درگزر تھا۔

اوتار سنگھ اپنی جگہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اسے اندازہ ہوا کہ آج اسے بہت کچھ معلوم ہو جائے گا۔ اسے کئی مذاہب کے بارے میں قیمتی معلومات حاصل ہوں گی۔ یہ موقع اس کے خوش آنند تھا۔

رام گوپال نے بڑھ کھانچے لیے ایک اور جام اٹھا لیا۔ ”تو آپ سب نے میری بات سنی چائی تو تسلیم کر لیا۔“ اس نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

رچڑے نے محمود کی طرف ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھا۔ ”نہ کدھ سے جھٹک دیے۔“ میرا مذہب ملے دوسروں کے مذہب پر تنقید کرنے سے بھی روکتا ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں میزبان ہونے کے خیال سے خاموش تھا۔“ رام گوپال کی طرف متوجہ ہوا۔ ”لیکن اب بولنے پر مجبور ہوں۔“

ورنہ تمہارا بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔ یہ مجھے گوارا نہیں۔ ”کیا مطلب؟ کس نقصان کی بات کر رہے ہو؟“

”تم اپنے دھرم کے بارے میں بہت بڑی گستاخاں شکار ہو جاؤ گے۔“ رچڑے نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

بڑے فخر سے اپنا دھرم کہتے ہو، وہ ہمیں عجیب اور ناقابل فہم لگتا ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ اسے منافقانہ

کہنا چاہیے۔ اس تیسری صدی میں جب کہ

اوتار سنگھ مسکراتا رہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”تم خاموش ہو اوتار سنگھ۔ کچھ بولتے کیوں نہیں؟“ فتح سنگھ نے اسے اُکسایا۔

”میں وقت آنے پر بولوں گا۔“ اوتار سنگھ نے نرم لہجے

اور سچ جس آیا تو رچڑے نے ان تینوں کے لیے گلاسوں میں جوس اٹھایا اور انھیں دیا۔ ”تھینک یو رچڑے۔“ نادرہ نے کہا۔

اب رچڑے نے اپنے لیے جام اٹھایا اور اسے فضا میں بلند کیا۔ ”لیٹ اس ٹوئسٹ ناؤ۔“ ریٹا کی صحت اور خوشیوں کے نام۔“

سب نے گھونٹ لیے اور پارٹی شروع ہو گئی۔ جوس والے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہے تھے۔ جب کہ شراب والے لٹل کر رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب تیسرے جام پر پہنچ گئے۔ چہرے تھمتانے لگے۔ آوازیں لڑکھانے لگیں۔

”اب یہ دیکھو رچڑے۔“ رام گوپال نے کہا۔ ”یہ میرا بے وقوف دوست ملک کا بیٹا اس لیے چاہتا ہے تاکہ یہ آزادی کے ساتھ شراب نہ پیے۔“ اس کا اشارہ محمود کی طرف تھا۔ ”اب بتاؤ، کیا ہم نے اس کے ساتھ زیردستی کی؟ بھی نہیں پیتا تو نہ پیے۔ کوئی پابندی نہیں ہے۔ اتنی سی بات کے لیے ملک کا بیٹا... یہ تو کوئی بات نہیں۔“

اس نے بات اس انداز میں کی تھی کہ سب ہنسنے لگے۔ لیکن محمود سنجیدہ تھا۔ ”تم غلط سمجھے ہو رام۔ ہم پاکستان اس لیے بنا رہے ہیں کہ وہاں اسلامی قانون ہو۔ نہ کوئی شراب پیے، نہ کسی دوسرے کو شراب کی ترغیب دے۔ ہم اس لیے پاکستان بنا رہے ہیں تاکہ تم ہندوستان میں آزادی سے شراب پیو اور ہم پاکستان میں شراب نہ پیئیں۔“

”شراب پینے والے تو پھر بھی پیئیں گے... دیکھ لینا، پاکستان میں بھی پیئیں گے۔“ فتح سنگھ نے انگلی نچاتے ہوئے کہا۔ اس کے انداز میں چیلنج تھا۔

لیکن رام گوپال نے جیسے محمود کی بات سنی ہی نہیں۔ ”اب ہمارے ہندو بھائی اوتار سنگھ کو ہی دیکھ لو۔“ وہ بولا۔ ”اسے تو دھرم منع نہیں کرتا۔ مگر اس کے پتا ہی منع کرتے ہیں۔ یہ نہیں پتی رہا ہے تو کیا ہم نے اسے مجبور کیا؟ نہیں کیا۔ اور کیا ہم نے کسی کی بے عزتی کی یا اپنی عزت کا خیال نہیں رکھا؟ نہیں... ایسا کچھ بھی نہیں کیا ہم نے۔ اس لیے کہ اب ہمارا ہندوستان یکسر بیکور ہو گا اور یہاں جہوریت ہوگی۔“

اوتار سنگھ مسکراتا رہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”تم خاموش ہو اوتار سنگھ۔ کچھ بولتے کیوں نہیں؟“ فتح سنگھ نے اسے اُکسایا۔

والوں کو پیاس کے سوا کچھ نہیں ملتا۔“

”تمہیں یہ بات ریٹا سے کہنی چاہیے۔ اوتارنگھ کے تاثرات دیکھ رہے ہو۔ وہ بے چارہ بس مرڈت کر رہا ہے۔“

”اوتارنگھ کو میں نے کبھی کسی لڑکی میں دل چسپی لیتے نہیں دیکھا۔“ رام گوپال نے سر دلچے میں کہا۔

”دیکھتے رہو۔ جو تک پھر میں بھی لگتی ہے۔“

”وہ مجھے پھر نہیں لگتا اور تم بھی جو تک نہیں لگتیں۔“ رام گوپال نے سادگی سے کہا۔

”پلیز۔ تم خاموش ہی رہو۔“ پشپا نے بھٹا کر کہا۔ ”آج پہلے ہی تم بہت شرمندہ کرا چکے ہو۔“

اُدھر ریٹا نے بھی اوتارنگھ سے کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ”مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے اوتارنگھ۔“ اس نے مخمور آواز میں کہا۔ ”مجھے کبھی کسی کے ساتھ رخص کرنا اتنا اچھا نہیں لگا۔ جانتے ہو، میں تمہیں بہت پسند کرتی ہوں۔“

”میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔“ یو آرا نے گڑبڑ سے کہا۔

”مگر میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ وہ بہت جوان عورت ایک مرد سے کرتی ہے۔ وہ محبت میں نے پہلی بار تم سے کی۔“

اب کسی اور سے کبھی نہیں کر سکو گی۔ میں تمہارے لیے کبھی کر سکتی ہوں اوتارنگھ۔ میں خود کو بدل بھی سکتی ہوں۔“

بات اس قدر اچانک اور اتنی صاف گوئی اور دو ٹوک انداز میں کی گئی تھی کہ اوتارنگھ ہلکا سا ہلکا ہوا۔ چند لمحوں کو وہ کچھ سوچنے لگا۔ کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں رہا۔ پھر اس نے بڑی تیزی سے خود کو سنبھالا۔ ”سوری ریٹا، وہ محبت تو مجھے بھی پہلے ہی ہو چکی ہے کسی سے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اب میں ابھی کسی سے اس طرح محبت نہیں کر سکو گی۔“ اس نے کہا۔

ریٹا کے چہرے پر اُداسی چھا گئی۔ ”ماں! ملک!“ اس نے آہ بھر کے کہا۔ پھر بولی۔ ”کون ہے وہ خوش نصیب، بہت...

بہت خوب صورت ہوگی۔“

”ہاں نہیں۔ میں نے کبھی اسے دیکھا نہیں۔“

”کیا مطلب؟“ ریٹا کی آنکھیں فرط حیرت سے پھیل گئیں۔

”دیکھا نہیں تو محبت کیسے ہوگی؟“

”میں نے بس اس کی آواز سنی ہے۔“

ریٹا کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ ”تب تو اس محبت کا کوئی اعتبار نہیں۔ کبھی تم اسے دیکھو اور وہ تمہیں اچھی نہیں لگی تو تمہاری محبت ختم ہو جائے گی۔“

”میں بھی یہی سوچتا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔“ اوتار

نگھ نے کہا۔

”اسے دیکھو بغیر تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”میں حسن پرست ہوں۔ خوب صورتی ہر روپ میں مجھے اچھی لگتی ہے۔ اسی لیے مجھے شبہ ہوتا تھا کہ اگر وہ خوب صورت نہ ہوئی تو میری محبت ختم ہو جائے گی۔ لیکن ریٹا، میں سچ کہہ رہا ہوں کہ تم بہت خوب صورت ہو۔ اس کے باوجود مجھے تم سے محبت نہیں ہوئی۔ تو میں نے سمجھ لیا کہ محبت میں کوئی شرط نہیں ہوتی۔ وہ تو بس ہو جاتی ہے... اور ہو گئی۔ اب تو مجھے اس کی آواز سنے ہوئے بھی عرصہ ہو گیا۔ لیکن وہ آواز اب بھی میری سماعت میں گونجتی ہے اور اسے سن کر میری اب بھی وہی کیفیت ہوتی ہے۔ یہ بات سنو، وہ تو شاید آج میں تمہاری محبت کا جواب محبت سے دیتا۔“

”تم بہت عجیب، بہت انوکھی عورت ہو اوتارنگھ۔“

”اور ریٹا... اصل میں تو محبت میں کسی اور سے کرنا چاہتا تھا۔“ اوتارنگھ نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”بہت برسوں سے میں اس دنیا کے نظام پر غور کرتا رہا ہوں۔ میں نے بہت کچھ سمجھ لیا تھا کہ کوئی کامل قوت ہے جس نے یہ سب کچھ بنایا اور مکمل نظام ترتیب دیا۔ وہ قوت والی ہستی واحد ہے۔“

”ماں! اللہ خود مختار۔ اس جیسا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ ہمارے

مہربان ہے... ماں سے زیادہ شفیق... باپ سے زیادہ مہربان کرنے والی۔ اور ضرورت پوری کرنے والی۔ میں نے بہت غور کیا اور سمجھا کہ میرے پاس جو کچھ بھی اچھا ہے... میرے

ماں باپ سمیت، وہ اس کا دیا ہوا ہے۔ میں والدین کی مہربانیوں کے جواب میں ان کا شکر گزار ہوتا ہوں اور اس کے اظہار کے لیے ان سے محبت کرتا ہوں۔ تو ان سے زیادہ...

سے زیادہ شکر گزار اور محبت تو اس کا حق ہے۔ مگر کچھ تو محبت نہیں ہوتی... یا مجھے نہیں ہو سکی۔ چنانچہ میں اسے محبت کی جستجو میں لگ گیا۔ اب درمیان میں مجھے یہ محبت ہو گئی۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اس محبت کو ختم کر دیتا کیوں کہ یہ اصل منزل تو وہ بڑی محبت ہے۔“

ریٹا حیرت زدہ ہو کر سن رہی تھی۔ ”مجھے یقین نہیں آتا کہ اس نے کہا۔“ تمہیں ہمارے مذہب کے بارے میں کچھ

چاہیے۔ میں تمہیں بتاؤں گی۔“

اسی وقت ریکارڈ ختم ہو گیا۔ رچرڈ نے کہا۔ ”اب اپنا

کر لیں۔“

وہ چاروں واپس آ گئے۔

کچھ دیر سنانے کے بعد دوبارہ سلسلہ شروع ہوا تو اس بار میدان میں تین جوڑے تھے۔ اوتارنگھ اور امرتا، رچڑ اور پشپا، رام کوپال اور ریٹا۔ نادہ اور محمود نے رقص میں دل چسپی ہی نہیں لی۔ اس پر رام کوپال زہریلے انداز میں مسکرایا تھا۔ انداز ایسا تھا جیسے ان پر مذہب کے حوالے سے طنز کرنا چاہتا ہو۔ لیکن پچھلے تجربے کے پیش نظر اسے بصرے کی ہمت نہیں ہوئی۔

رقص کا سلسلہ کافی دیر چلتا رہا۔ اوتارنگھ نے محض مروتا ایک ایک راؤنڈ امرتا اور پشپا کے ساتھ رقص کیا اور پھر اپنی جگہ فتح سنگھ کو دے دی۔ اس دوران محمود رچڑ سے اجازت لے کر اس کی لائبریری میں چلا گیا تھا۔ نادہ اکیلی بیٹھی تھی۔ اوتارنگھ اس کے پاس چلا گیا۔ اسے وہ رات بہت طویل لگ رہی تھی۔ امرتا اور پشپا نے بھی رقص کے دوران اس سے اظہار محبت کیا تھا۔ نہ جانے کیوں اس نے ریٹا کی طرح ان سے تفصیل سے بات نہیں کی تھی۔ بس یہ کہہ کر نال دیا تھا کہ وہ پہلے ہی کسی سے محبت کرتا ہے۔

”کیا بات ہے، تم نے رقص نہیں کیا؟“ اوتارنگھ نے نادہ سے پوچھا۔

”مجھے دل چسپی نہیں ہے۔“ نادہ نے جواب دیا۔

”تمہارا مذہب تمہیں اس سے روکتا ہے؟“

”ہاں روکتا ہے۔ لیکن ہم بہت سے ایسے کام کرتے ہیں جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔ اس وقت میرے انکار کا اصل سبب یہ ہے کہ مجھے رقص میں کوئی دل چسپی نہیں ہے۔“

”اللہ تمہیں کن کن باتوں سے روکتا ہے؟“

”اب تمہیں کیا بتاؤں۔ بہ ہر حال، سب سے بڑا گناہ شرک ہے۔ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا۔“

اوتارنگھ چند لمحوں سوچتا رہا پھر بولا۔ ”مجھے کوئی ایسی بات بتاؤ، جو تم اللہ کے منع کرنے کے باوجود کرتی ہو؟“ اسے

احساس ہوا کہ وہ بار بار اللہ کہہ رہا ہے۔ اور اللہ کہتا اسے اچھا بھی لگ رہا ہے۔

مگر اس سوال پر نادہ کھیا گئی۔ ”بہت ساری باتیں ہیں۔ ہم کوئی بہت اچھے مسلمان تو نہیں ہیں۔ ماحول ہم پر

اثر انداز ہوتا ہے، ہمارے ایمان کی کم زوری کی وجہ سے۔ اب اسی وقت دیکھو۔ میں اس محفل میں شریک ہوں۔ حالانکہ اللہ

نے مرد اور عورت کے اختلاط کو منع فرمایا ہے۔“

اس جواب سے اوتارنگھ کو لمبی ڈور کا وہ راصل گیا جسے تمام کر اس کے اندر کا محسوس انسان ڈور تک جاسکتا تھا۔ ”اس میں

کیا برائی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”عورت اور مرد جھٹنا فریب ہوں گے، بے حیائی اور گناہ کا امکان یقین کی حد تک بڑھ جائے گا۔“

”مگر دونوں کے درمیان کشش تو قدرتی ہے، فطری ہے۔“ اوتارنگھ نے اعتراض کیا۔ اس کا ذہن الجھ رہا تھا۔

”اس کے لیے شادی ہے۔ شادی گناہ اور بے حیائی کا راستہ بند کر دیتی ہے۔“

”اور محبت کے بارے میں تمہارا مذہب کیا کہتا ہے؟“

”محبت پاکیزگی کے ساتھ ہوتی برائی نہیں۔ مگر صل شادی ہی ہے۔“

اوتارنگھ کا دماغ روشن ہو گیا۔ اسی وقت اسے ایک یاد آ گئی۔ اس کا مشاہدہ شروع ہی سے غیر معمولی تھا۔

اس نے پہلے ہی کیا تھا لیکن آج اسے پختہ یقین ہو گیا تھا۔ ”ایک بات بتاؤ تمہیں!“ اس نے کہا۔ ”مرچرڈم میں غیر معمولی

دل چسپی رکھتا ہے۔“

نادہ کچھ محجوب ہو گئی۔ اس کی نظریں جھک گئیں۔ ”جانتی ہوں۔ وہ مجھے بتا چکا ہے۔“ وہ بولی۔

”اب یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ میں تم سے کچھ پوچھ سکتا۔“ اوتارنگھ نے کہا۔

”مگر میں تمہیں بتا سکتی ہوں۔ مجھے اس سے کوئی شے نہیں۔“ نادہ بولی۔ ”اور اگر ایسا کچھ ہوتا تو بھی میں اس

حوصلہ افزائی نہ کرتی کیوں کہ اس سے شادی نہیں کر سکتی۔“

”کیوں؟“ اوتارنگھ نے پوچھا۔ ”مذہب کے اصول کی وجہ سے؟“

”ہاں۔ مشرکوں سے شادی کرنا ناجائز ہے۔“ اوتارنگھ نے کہا۔

”لیکن شرک کرتے ہیں۔“ مشرک کے بارے میں نادہ نے شروع ہی کیا تھا۔

وضاحت بھی کی تھی۔ لیکن یہ ابلی کتاب کی اصطلاح کے لیے نئی تھی۔ ”ابلی کتاب کا مطلب؟“

”وہ لوگ جن کے پاس اللہ کا کلام موجود ہے۔“

”یہ تو میں موجود ہیں۔ یہودی، عیسائی اور مسلمان۔“

”تینوں کے پاس اللہ کا کلام ہے تو وہ اللہ کیسے کیوں ہیں؟“

”یہ بہت لمبی بحث ہے۔ چھوڑو اسے۔“

مشرک سے شادی نہیں کر سکتی۔ ”لیکن محبت تو ہو سکتی ہے تمہیں!“

نادہ یوں چوٹی جیسے اسے کرٹ لگا ہو۔ پھر تسخیر کر بولی۔ ”ہاں... ہو سکتا ہے۔ لیکن اس صورت میں میں اس محبت سے لڑوں گی۔ اسے دل سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کروں گی اور دعا کروں گی کہ وہ مسلمان ہو جائے۔“

”کوئی مسلمان کیسے ہو سکتا ہے؟“

”دو ٹکے ہیں ہمارے ہاں۔ ایک ناپاک کی کو دور کرنے والا کلمہ ہے۔... لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ اور دوسرا گواہی دینے والا۔... اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمد عبدہ ورسولہ۔“ آدی دل

کی گہرائیوں سے ایمان لائے، زبان سے یہ کلمے پڑھے تو مسلمان ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اسے اللہ کے احکامات پر عمل

کرنا ہوتا ہے جو اللہ کی کتاب میں موجود ہیں۔“

اوتارنگھ نے پوچھا۔ ”یہ تو عربی زبان میں ہیں؟“

”ہاں۔ اللہ کا نام بھی عربی زبان میں ہی نازل ہوا ہے۔“ اوتارنگھ کا حافظ بلا کا تھا۔ دونوں نے اسے یاد ہو گئے۔

اب وہ ان کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ابھی اس کی استعداد اتنی نہیں تھی اور پھر مشن بھی نہیں تھی۔ اس نے انک

آلک کر ترجمہ کیا۔ ”اللہ کے روا کوئی الہ نہیں۔ اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اور دوسرا... میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے

واحد وہ ایک ہے۔“

نادہ اسے بہت غور سے... بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ یہ وہ نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول

ہیں۔ اس نے جمل پورا کیا۔ وہ اب بھی اس کی آنکھوں میں

گہری رہی تھی۔ ”تم غیر معمولی آدی ہو اوتارنگھ۔ کاش... کاش

یہ کہتے ہوئے اس نے نظریں جھکا لیں۔

اوتارنگھ اتنا ناچشم نہیں تھا کہ اس کا جملہ مکمل نہ کر پاتا۔ اس

وقت وہ چوتھا اظہار محبت تھا جو اس سے کیا گیا۔ لیکن یہ آخری

اظہار ضرور تھا۔

اسی وقت رقص کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔ وہ سب یکجا ہو گئے۔

”بس ڈرا دیر سستا لیں۔ پھر کھانا کھائیں گے۔“ رچڑ

الفاظ کیا۔

وہ باری اوتارنگھ کو سوچنے کے لیے بہت کچھ دے گئی۔ اس نے اس آواز والی کی محبت کو پھر سے توانا کر دیا۔

نادہ کی بات سنتے ہوئے اسے احساس ہوا تھا اور اب وہ اس پر سوچ رہا تھا۔

محبت ایک آفاقی جذبہ تھا۔ اس کے بے شمار روپ تھے۔ ایک انسان کی دوسرے انسان سے محبت، دوستوں کی محبت،

بھائی بہن کی محبت، ماں باپ کی محبت، اولاد کی محبت اور سب سے بڑھ کر مخلوق کی اپنے خالق سے محبت۔ یہ سب محبتیں ہیں جو

انسان کرتا ہے... کرتا رہے گا۔ غور کرو تو ان میں سے کوئی بھی محبت بے غرض نہیں ہے۔ انسان کتنا ہی بے غرض ہو مگر کسی

دوسرے انسان سے محبت کرتے ہوئے عمل طور پر بے غرض نہیں ہو سکتا۔ کوئی غرض نہ ہو تو تباہی دور کرنے کی غرض تو ہے۔

ایک تو کوئی نہیں رہ سکتا۔ انسان معاشرتی جانور ہے تو تعلق رکھنے کی غرض تو ایک بڑی سچائی ہے۔ دوستی کا بھی یہی حال

ہے۔ کوئی ہم خیال جو اچھا بھی لگتا ہو اس سے مل کر... بات کر کے دل خوش ہوتا ہے۔ غرض تو ہوئی نا! اور اختلاف

ہو جائے... سنگین نوعیت کا اختلاف تو آدی اس دوست کو چھوڑ دیتا ہے۔ کوئی اور دوست تلاش کر لیتا ہے۔ بھائی بہن کی محبت کا

اسے تجربہ نہیں تھا۔ یہ نعمت اسے ملی ہی نہیں تھی۔ لیکن وصال دین کے حوالے سے وہ اسے سمجھ سکتا تھا۔ بھائی دوست سے

بڑی ضرورت ہوتا ہے۔ ایک بہت اپنا جو ہر کڑے وقت میں ساتھ رہے... ہمارا دکھ بانٹے... ہمیں تسلی دے۔ اب اولاد کی

محبت کو لیں۔ تو ماں باپ سے تو اولاد کی غرض ہوتی ہی ہے۔ بلکہ اس کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ آدی کو اتنا کچھ ملتا ہے ماں باپ

سے۔ وہ ان سے محبت نہ کرے تو کیا کرے۔ اور خدا کی محبت! وہ تو ہے ہی محتاج کی محبت جو وہ اس سے کرتا ہے، جو اس کی ہر

ضرورت پوری کرتا ہے۔ وہ ماں باپ سے بڑھ کر خیال رکھنے والا، ضرورتیں پوری کرنے والا ہے۔ بس ماں باپ کی اولاد

سے محبت سب سے مختلف ہے۔ مگر نہایت بے غرض ہونے کے باوجود غرض سے بالکل پاک وہ بھی نہیں ہے۔ باپ کو اولاد سے

ایک معصوم سی غرض ہوتی ہے کہ وہ اس کی نسل کو آگے بڑھائے، مرنے کے بعد بھی اس کے نام کو زندہ رکھے۔ ہاں ماں کی محبت

شاید بالکل بے غرض ہوتی ہے۔ اس کا بس چلے تو اولاد کا ہر دکھ خود لے لے اور اسے اس دکھ سے محفوظ کر دے۔

ماں باپ کی محبت پر اس نے سوچا تو اسے سب کچھ بنانے والے کی... خالق کی اپنی مخلوق کے لیے محبت کا خیال آیا۔ وہی

سب سے خالص، سب سے بے غرض اور پاک محبت ہے۔ کیوں کہ اسے تو کسی سے کچھ نہیں چاہیے۔ وہ جو سب کچھ بنانے

اچانک رچڑنے کہا۔ ”میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔ کسی کا کافی پیٹنے کا موڈ ہے؟“
 سب نے انکار کر دیا۔ ”میں چلتا ہوں۔“ اوتارنگھ نے کہا۔
 ”تو آؤ... چلیں۔“
 وہ دونوں لائبریری سے نکلے اور کینیڈین کی طرف چل دیے۔
 کینیڈین میں رچڑنے کا کافی کا رڈر دیا۔ اوتارنگھ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کیسے شروع کرے۔ پھر اس نے بلا واسطہ بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ”رچڑ... مجھے اپنے مذہب کے بارے میں بتاؤ۔“
 رچڑ نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”یہ خیال کیسے آ گیا تمہیں؟“

”اس روز پارٹی میں تم نے ہندو دھرم کے بارے میں جو کچھ کہا، وہ میں بہت پہلے سے سوچتا رہا ہوں۔“
 ”ہر معقول آدمی کو سوچنا چاہیے۔“ رچڑ نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ ”میں غور کرتا ہوں تو تم لوگوں کا دھرم مجھے مذہب کہیں سے نہیں لگتا۔ ہاں اسے ثقافت کہا جاسکتا ہے۔ بھلا بتاؤ تو، پتھر کے یوں کی پوجا کرنا، انھیں بھینٹ دینا اس عہد کے شایان شان تو نہیں۔ تم لوگ اتنے دہمی اور ضعیف الاعتقاد ہو کہ درختوں تک سے اولاد مانگتے ہو۔“

اوتارنگھ کو یاد آیا کہ اس کے ماما اور پتانے اس کے لیے برگد کے درخت پر منت مانی تھی اور وہ چڑی ہی سوکھ گیا تھا۔ ”میں اس سلسلے میں بہت شروع سے سوچتا رہا ہوں۔ میں نے بھی دل سے پوچھا نہیں کی اور چار سال سے تو میں نے مورتیوں کو ماننا ہی چھوڑ دیا۔“
 ”تم مجھے شروع ہی سے غیر معمولی لگے تھے۔“ رچڑ کے لہجے میں سناٹا تھی۔

”مگر رچڑ، یہ کائنات کا نظام خود بہ خود تو نہیں چل رہا ہے۔ کوئی تو ہے جو اسے چلا رہا ہے۔“
 ”بے شک۔ اور وہ خدا ہے جس نے چھ دن میں یہ نظام قائم کیا۔“

”تو تم اسے خدا کہتے ہو۔ کیوں؟“
 ”آسمانی کتاب میں یہی نام ہے اس کا... گاؤ... خدا۔ اس نے اپنے بیٹے مصلوب کو دنیا میں اپنی کتاب دے کر بھیجا کہ انسانوں کو محبت کی تعلیم دے اور انھوں سے نجات کا راستہ دکھائے۔“
 اوتارنگھ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”خدا کا بیٹا

بھی ہے۔ ایہ کیسے ہو سکتا ہے؟“
 ”اسے مقدس کنواری ماں نے جنم دیا تھا... پاک دامن میری نے۔ چرچ کے باہر بڑی صلیب پر تم نے ان کا مجسمہ دیکھا ہوگا اور ورجن میری کی شبیہ بھی دیکھی ہوگی... کم سن لڑکی گود میں لیے ہوئے۔ چہرے کے گردور کا ہالا۔“
 اوتارنگھ نے دونوں چیزیں دیکھی تھیں۔ ”میں نے دیکھا ہے۔“ وہ بولا۔ ”یہ بتاؤ کہ یہ کئی پرانی بات ہے؟“
 ”ہمارا سن عیسوی سن کی پیدائش سے شروع ہوتا ہے۔ یہ 19 صدی پہلے کی بات ہے۔“
 ”تو تمہیں کیسے معلوم کہ مقدس ماں اور مسیح ایسے تھے؟“
 اوتارنگھ نے اعتراض کیا۔

”اس کی کیا اہمیت ہے۔ اس زمانے میں کوئی تصور ہوگا جس نے انھیں دیکھ کر ان کی تصویر بنالی ہوگی۔“
 اوتارنگھ کی تسلی نہیں ہوئی۔ ایک تو یہ خدا اس کے تصور خدا سے بہت مختلف تھا۔ اس پر یہ شبیہ اور مورتی والی ”تمہارا مذہب ہم سے کچھ زیادہ مختلف تو نہیں ہے۔ اس کی بات ”بت تو تم بھی بناتے ہو۔“
 ”مگر ہم بت پرست نہیں ہیں۔“ رچڑ نے سخت براہ کرم کہا۔

”پہلے بت بناتے۔ پھر بت پرستی ہی ہوتی ہے۔“
 ”میں ایسی باتیں نہیں کہتا۔“ رچڑ ڈبدرہ ہو گیا۔
 ”کیوں؟ میں نے جو بت چاہا ہے بھگوان کی مورت دیکھی تھی تو اپنی ماما جی سے یہی سوال کیا تھا۔ اور ان کے ہاتھ سے مجھے تسلی نہیں ہوئی تھی۔ پھر میں نے بھی بھگوان کو دل نہیں مانا۔ تم کیوں برا مانے ہو۔ میں تو ایک خدا کی بات کر رہا ہوں۔“

”خیر... چھوڑو اس بات کو۔“
 ”اور یہ تمہیں کیسے بتا چلا کہ مسیح خدا کے بیٹے تھے؟“
 ”ہمارے پاس آسمانی کتاب بائبل ہے نا۔“
 ”اس میں یہ لکھا ہے؟“
 رچڑ گڑبڑا گیا۔ ”ظاہر ہے، اس میں لکھا ہوگا۔“
 یہ بات مانتے ہیں۔
 ”تم نے نہیں پڑھی بائبل؟“
 ”نہیں۔“ رچڑ کچھ شرمندہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے پیالی خالی کر کے ہٹا دی۔ ”آؤ... اب چلیں۔“
 ہونے والا ہے۔

اوتارنگھ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

اب اس کے پاس سوچنے کو کافی کچھ تھا۔ کئی دن تک وہ سوچتا رہا۔ اس کا جو خدا کا تصور تھا، وہ رچڑ کے تصور سے بالکل مختلف تھا۔ اس کا خدا سب سے الگ، سب سے منفرد اور مختلف اور ہر چیز پر قدرت رکھنے والا تھا۔ یہ اولاد والا معاملہ تو اسے بہت برا لگا۔ کیا خدا نے شادی بھی کی ہوگی؟ اور اگر کی ہوگی تو کس سے...؟ کسی عورت سے؟ اپنی مخلوق سے؟ یا اپنی ہی جیسی کسی ہستی سے؟

دونوں ہی امکان اس تصور سے متصادم تھے۔ اس کے نزدیک خدا جیسا تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ہوتا تو اس کی انفرادیت ختم ہو جاتی۔ اور اگر مسیح خدا کے بیٹے تھے تو یہ تو طے ہے کہ وہ انسان کی ماں انسان ہی ہوگی۔ خدا تو انسان نہیں ہو سکتا۔

اسے ہندوؤں پر ترس آنے لگا۔ ہندو مشرک تھے۔ دیوی دیوتاؤں کی... بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ اس لیے انھیں مشرک کہا جاتا ہے اور مشرک کا مطلب نادرہ ہے۔ اسے بتایا تھا اس کے مطابق تو عیسائی بھی مشرک تھے۔ انھوں نے خدا کی جیملی بنادی تھی۔ اور مورتیاں تو وہ بھی بناتے تھے۔ مگر یہ بت پرست نہیں ہیں۔ رچڑ نے سخت براہ کرم کہا۔

پاس آسمانی کتاب ہو تو مشرک کرنا اس کے لیے جرم نہیں رہتا۔ یہ تو بے انصافی ہے۔
 اور یہ آسمانی کتاب والا معاملہ بھی وہ پوری طرح نہیں سمجھ لیتا تھا۔ کیا وہ کتاب خدا کی لکھی ہوئی تھی؟ خدا کی تحریر تھی؟ اور اس کی کتنی کتابیں ہیں دنیا میں؟ ہندوؤں کو کوئی کتاب کیوں نہیں ملے؟ سوچنا ختم ہوا تو اس کے پاس سوال ہی سوال تھے۔ جواب سے تلاش کرتے تھے۔

وصال دین کے امتحان بھی ہو چکے تھے اور نتیجہ بھی نکل آیا تھا۔ وہ پاس ہو گیا تھا۔
 ”مبارک ہو ویرجی۔ تمہیں تو آزادی مل گئی۔“ اوتارنگھ اس سے کہا۔
 ”آزادی کیسی؟ میں تو تمہارے ساتھ ہی آزاد ہوں گا۔“
 ”ال دین نے کہا۔“
 ”نہیں ویرجی۔ اب یہ ممکن نہیں۔“ اوتارنگھ نے گہری آواز سے کہا۔ ”دیکھو نا... اب تمہاری دو مہینے کی چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں اور میرے امتحان میں ابھی تیس دن باقی

ہیں۔ مجھے تو کوئی ڈیڑھ ماہ بعد آزادی ملے گی۔ اس کے بعد امتحان کا نتیجہ آنے تک چھٹیاں ہوں گی۔ لیکن میری آزادی کے چند دنوں کے بعد ہی تمہارا اسکول کھل جائے گا اور تمہیں واپس آنا پڑے گا۔“

وصال دین کی سمجھ میں یہ پیچیدہ حساب نہیں آیا۔ ”میں نہیں سمجھا بھائی۔ کیا اس بار ہم گاؤں صرف دس بارہ دن کے لیے جائیں گے؟“ اس نے پوچھا۔
 ”ارے نہیں۔ گھبراؤ نہیں ویرجی۔ تم ابھی گاؤں چلے جاؤ گے۔ میں ڈیڑھ ماہ بعد گاؤں آؤں گا۔ ہم دس بارہ دن ساتھ رہیں گے پھر تم دہلی واپس آ جاؤ گے اور میں وہیں رکوں گا۔ رزلٹ آنے تک۔“

”تو ہم صرف دس بارہ دن ساتھ رہیں گے۔“ وصال دین نے تانف سے کہا۔ ”ڈیڑھ مہینے یہاں اکیلے رہو گے۔ نہیں بھائی، میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ میں تمہارے ساتھ ہی گاؤں چلوں گا۔“
 اوتارنگھ کو اس پر پیارا گیا۔ ”نہیں ویرجی۔ یہ زیادتی ہوگی۔ وہاں اماں اور چاچا تمہارا انتظار کریں گے۔ ان کی خوشیوں کے لیے اتنے سارے دن میں تم سے نہیں چھین سکتا۔ تمہیں جانا ہوگا۔“

وصال دین نے اماں اور ابا کے بارے میں سوچا اور نکمکش میں بڑ گیا۔ وہ اوتارنگھ کو اکیلا بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا اور اماں اور ابا کی یاد بھی ستانے لگی تھی۔ پھر اس نے فیصلہ کر ہی لیا۔ وہ سر جھٹکتے ہوئے بولا۔ ”نہیں بھائی، میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گا۔“

اس لمحے وصال دین کی خالص محبت کو اوتارنگھ نے اپنے دل میں اترا محسوس کیا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ”متم بہت اچھے ہو ویرجی... اور مجھے بہت پیارے ہو۔ لیکن یہ میں نہیں ہونے دوں گا۔ تمہیں جانا ہی ہوگا۔“

اوتارنگھ کا بچہ فیصلہ کن تھا اور وصال دین نے کبھی اس کی بات نہیں مانی تھی۔ ”بھائی... صرف تمہاری خاطر میں نے پڑھائی میں دل چسپی لی۔ ورنہ میرا دل نہیں لگتا تھا پڑھنے میں۔“ اس نے اُداس لہجے میں کہا۔ ”لیکن اب میں پچھتا رہا ہوں۔ کاش میں نے پڑھائی میں دل چسپی لی ہوتی تو آج یوں تمہیں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاتا۔ یہ سزا ملی ہے مجھے بے دلی کی۔“
 ”میں سمجھا نہیں ویرجی۔“

”میں دل لگا کر پڑھتا تو کالج میں تھارے ساتھ ہوتا نا۔“
یہ بھی اس کی محبت تھی۔ اوتار سنگھ کا دل خوش ہو گیا۔ ”اب
چھپتا ہے کیا ہوت ویری جی۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔
”لیکن بھائی، میں اکیلا تو گاؤں جا بھی نہیں سکتا۔“
وصال دین نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”مجھے تو راستے بھی نہیں
معلوم۔“

”تو تم اکیلے تھوڑا ہی جاؤ گے۔ رگھو ساتھ جائے گا اور
تمہیں گاؤں چھوڑ کر واپس آجائے گا۔“
”مگر پھر یہاں رگھو کا کام کون کرے گا؟“ وصال دین
پریشان ہو گیا۔

”تم فکر بہت کرتے ہو ویری جی۔ ارے ایک ہی دن کی
تو بات ہے۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

وصال دین نے ذہن تو بنالیا۔ لیکن جاتے وقت وہ اوتار
سنگھ سے لپٹ کر اتار دیا کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ ”میں تمہارے
بغیر کیسے رہوں گا بھائی۔ میرا وہاں دل نہیں لگے گا۔“ وہ بار بار
کہہ رہا تھا۔

اوتار سنگھ کو بھی رونا آ رہا تھا۔ لیکن اس نے آنسو پی لیے۔
جانتا تھا کہ وہ رو دیا تو وصال دین کو گاؤں نہیں بھیج سکے گا۔ وہ
جانے گا ہی نہیں۔ ورنہ سچی بات یہ ہے کہ اس کا بھی برا حال
تھا۔ آج تک وہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے ہی نہیں تھے۔

”تم اماں سے میری باتیں کیا کرنا ویری جی۔ اور ہاں
میرے پتا جی کا بہت خیال رکھنا۔ وہ بہت اکیلے ہیں۔ ان کے
پاس روز چایا کرنا۔“ اوتار سنگھ نے اسے گاؤں جانے کا گواہ ایک
اور مقصد بھی دے دیا۔ ”پتا جی کو تمہاری صورت میں میری
صورت نظر آیا کرے گی۔“

”یہ تو میں کروں گا ہی بھائی۔ یہ کہنے کی تو ضرورت ہی
نہیں۔“

یوں وصال دین گاؤں چلا گیا۔ اگلے روز رگھو اسے
چھوڑ کر واپس آیا تو تھا کر کے تنھوں سے لدا پھندا تھا جو
اس نے اوتار سنگھ کے لیے بھیجے تھے۔ مگر اوتار سنگھ کو سب
سے قیمتی چیز وہ حلوہ لگا جو اماں نے اس کے لیے اپنے
ہاتھوں سے بنا کر بھیج تھا۔

جب سے اوتار سنگھ کالج میں گیا تھا۔ اس کا وصال دین
سے ملنا بہت کم ہو گیا تھا۔ کالج کا طویل دورانیہ پھر زیادہ پڑھائی
کی وجہ سے مصروفیت۔ اتوار کو چھوڑ کر کس وہ کھانے پر ہی ساتھ
ہوتے تھے۔ لیکن اب وہ چلا گیا تو اوتار سنگھ کو گھر سونا سونا لگنے

لگا۔ امتحانوں کی وجہ سے پڑھائی کی بہت زیادہ مصروفیت
ہوتی تو شاید وہ بہت تڑپا۔ جدائی کی پہلی رات وہ اپنے کمرے
کی تنہائی میں جی بھر کر رویا۔ اس نے وہ آنسو بھی بہا دیے۔
ویری جی کے سامنے نہیں بھاسکا تھا۔ پھر بہ ہرحال، پڑھائی
جدائی کے اس احساس کو کم... بہت ہی کم کر دیا۔

وصال دین گاؤں پہنچا تو سب سے پہلے اس کی ملاقات اماں
سے ہوئی جو کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ اس نے ابا کو سلام
کر دیا۔ رگھو نے انھیں پر نام کیا۔
”کب آیا وصال دین؟“ جمال دین نے پوچھا۔

”ابھی آ رہا ہوں ابا۔“
جمال دین کی نظریں ادھر ادھر بھٹکیں۔ پھر ان میں مایوسی
اور حیرت کا تاثر ابھرا۔ ”چھوٹے ٹھاکر کہاں ہیں؟“

”وہ تو نہیں آئے ابا۔ ابھی تو ان کے امتحان بھی نہیں
ہوئے ہیں۔ مہینا بڑھ کے بعد آئیں گے وہ۔“

”تب تو تجھے بھی نہیں آنا چاہیے تھا۔ وصال دین نے
چھوٹے ٹھاکر کو اکیلا چھوڑ آیا۔“ جمال دین نے سخت لہجے میں
”میں نہیں آ رہا تھا ابا۔ چھوٹے ٹھاکر نے زبردستی
ہے مجھے۔“ وصال دین نے ندامت سے کہا۔ ”چاہے رگھو
پوچھ لو ابا۔“

جمال دین نے سوالیہ نظروں سے رگھو کو دیکھا۔ ”وصال
دین ٹھیک کہہ رہا ہے چاہے۔“

لیکن جمال دین نے اسے دیکھ کر ہی نہیں آئی۔ ”اور
رگھو کو بھی لے آیا۔ انھیں بالکل اکیلا کر دیا تو۔“

”میں تو چاہا وصال دین کو چھوڑنے کی بجائے کل واپس
چلا جاؤں گا۔“ رگھو نے کہا۔

”تجھے تو بالکل نہیں آنا چاہیے تھا رگھو۔“ جمال دین
کی طرف مڑا۔ ”اب پہلے کہ نہ جانا۔ ٹھاکر جی کے پاس جا۔“

”میں وہیں جا رہا ہوں ابا۔“
جمال دین نے پہلی بار بیٹے کو نظر بھر کر دیکھا۔ وہ
جوان ہو گیا تھا۔ قد بھی اونچا ہو گیا تھا اور جسم بھی بھرپور تھا۔

اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ وہ اس کے جسم کو چھو کر دیکھا
تھا۔ اس کا لرزنا ہوا تھا سر سے اتر۔ لیکن کنبہ سے تک
آتے ٹھک کر رہ گیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے ہاتھ پٹا لیا۔

اب چلا جا۔ یہاں دیر نہ کر۔“ وہ سخت لہجے میں بولا۔
وصال دین سال بھر کے پچھڑے باپ سے ملنا

ملن اس نے خود روک لیا۔ باپ کا حکم ماننے کی عادت ہو چکی۔ وہ
کمرے کے ساتھ حویلی کی طرف چل دیا۔ جمال دین نے کہتا تو بھی وہ
پلے حویلی ہی جاتا۔ اس کی تربیت ہی ایسی ہوئی تھی۔

جمال دین اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ شکر اور مسرت
جھلکتی آنکھوں سے۔ اس کا وصال دین اب مرد بن چکا
تھا۔ اے اللہ... تیرا شکر ہے۔ اس نے زیر لب کہا۔ یہ سب تیرا

اعمال ہے۔ تیری عنایت ہے۔
ٹھاکر پر پتا پتنگھ دیوان خانے میں تھا۔ منیم جی اسے کچھ
مساب کتاب بتا رہے تھے۔ وصال دین کو دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

”آؤ پتر وصال دین، کب آئے؟ کیسے ہو؟“ اس نے وصال
دین کے سر پر ہاتھ رکھے۔

”ٹھیک ہوں ابا۔“ وصال دین نے جواب دیا۔
”وہ امید کر رہا تھا کہ ٹھاکر بھائی کے سامنے میں حیرت سے
دیکھ گا کہ وہ کیوں نہیں آیا۔“

”اوتار سنگھ تو امتحان کی تیاری میں لگا ہوگا۔“ ٹھاکر نے
حیران کر دیا۔

وصال دین کو احساس جرم ہونے لگا۔ کاش وہ نہ آیا ہوتا۔ ”میں
ابا تھا ٹھاکر جی پر بھائی نے مجھے مجبور کر دیا۔ مجھے معاف۔“

”اے بیسی بات کرتے ہو پتر!“ ٹھاکر نے اس کی
”اے کاش۔“ یہ تو زیدیاتی ہوتی تمہارے ساتھ۔ دیکھو
اوتار سنگھ نے اسے گاتو دہرے جانے گا بھی۔

”اساتے ہی دن لڑکے گا وہ۔“ جب کہ تمہیں جانا بھی اس
پہلے ہی ہوگا۔ اس نے اچھا کیا کہ تمہیں بھیج دیا۔ یہ
وہ ٹھیک تو ہے نا؟“

”جی ٹھاکر جی۔ ٹھیک ہیں۔ بس آج کل فرصت نہیں ہے
میں۔“

”میں جانتا ہوں۔ پر اس کا پھل بھی اچھا ملے گا اے۔“
وصال دین آؤ بیٹھو تو۔“

”ہی... میں... میں نہیں ٹھیک ہوں ٹھاکر جی۔“
ٹھاکر نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ بیٹے کیسے باپ پر
ہیں۔ جمال دین بھی بیٹھے سے گھبرا تھا۔ اس نے

اپرا پانک اسے ایک خیال آیا۔ ”ارے وصال دین، تم
کی گئے ہو یا نہیں؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”نہیں۔“
”میں نے چونک کر سر گھمایا تو رگھو پر نظر پڑی۔“ میرے
لیے کیا حکم ہے مالک؟ چھوٹے ٹھاکر کا حکم تھا کہ وصال دین کو
پہنچا کر آؤں۔ اب حکم ہو تو واپس چلا جاؤں۔“

”نہیں۔ تم کل صبح واپس جانا۔ اب جاؤ اور شانتا کو یہاں
بھیج دو۔“ ٹھاکر نے کہا۔

رگھو نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”جو حکم اُن داتا۔“
باہر وصال دین گھر کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اس کا بس
نہیں چلتا تھا کہ اُنکر ماں کے پاس پہنچ جائے۔

”سیدھا ہی نہیں آیا ہوں ٹھاکر جی۔“
”حمیدہ بہن سے نہیں ملے؟ جمال دین سے نہیں۔۔۔“
”ابا سے تو کھیت میں ملاقات ہو گئی تھی۔“

”او... پر پہلے ماں سے ملنا تھا نا۔“ ٹھاکر نے تڑپ کر کہا۔
”بس تم فوراً گھر جاؤ اپنے۔“

”جاتا ہوں ٹھاکر جی۔ پر ایک بات کرنی ہے آپ سے۔“
”بولو۔ کیا بات ہے؟“

”مجھے اجازت دے دیں کہ میں ہر روز کچھ دیر کے لیے
آپ کے پاس آ جایا کروں۔“

ٹھاکر کھل اٹھا۔ ”اجازت کی کیا بات ہے پتر۔ یہ تمہارا
گھر ہے۔ جب چاہے، آ سکتے ہو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے
کہا۔ پھر اچانک کسی خیال سے خمیدہ ہو گیا۔ ”پراپنے ماں باپ
کا حق نہ مارنا۔ وہ کب سے ترس رہے ہیں تمہیں۔“

”جی ٹھاکر جی... میں خیال رکھوں گا۔“
”بس اب جاؤ تم۔“ ٹھاکر نے شفقت سے کہا۔

وصال دین چلا گیا۔ مگر ٹھاکر دیر تک دروازے پر نظریں
جمائے رہا۔ ”کیا میرا اوتار سنگھ بھی ایسا ہی بڑا ہو گیا ہوگا۔ وہ سوچ
رہا تھا۔ پچھلی بار جب وصال دین کو دیکھا تھا تو وہ اتنا بڑا نہیں
تھا۔ اس کا دل چلنے لگا اوتار سنگھ کو کیسے کے لیے۔ پھر اس نے
سوچا۔ تھوڑے ہی دن کی تو بات ہے۔ امتحان ختم ہوں گے اور
وہ آجائے گا۔“

اس کا جی چاہا کہ دہلی چلا جائے اور اوتار سنگھ کو جی بھر کر
دیکھے۔ یہ کوئی ایسی بڑی بات بھی نہیں تھی۔ لیکن امتحان کے
دنوں میں مناسب نہیں تھا۔ وہ بھی پیاسا رہ جاتا اور اوتار سنگھ کی
پڑھائی میں بھی خلل پڑتا۔

اس نے چونک کر سر گھمایا تو رگھو پر نظر پڑی۔ ”میرے
لیے کیا حکم ہے مالک؟ چھوٹے ٹھاکر کا حکم تھا کہ وصال دین کو
پہنچا کر آؤں۔ اب حکم ہو تو واپس چلا جاؤں۔“

”نہیں۔ تم کل صبح واپس جانا۔ اب جاؤ اور شانتا کو یہاں
بھیج دو۔“ ٹھاکر نے کہا۔

رگھو نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”جو حکم اُن داتا۔“
باہر وصال دین گھر کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اس کا بس
نہیں چلتا تھا کہ اُنکر ماں کے پاس پہنچ جائے۔

”نہیں۔“
”میں نے چونک کر سر گھمایا تو رگھو پر نظر پڑی۔“ میرے
لیے کیا حکم ہے مالک؟ چھوٹے ٹھاکر کا حکم تھا کہ وصال دین کو
پہنچا کر آؤں۔ اب حکم ہو تو واپس چلا جاؤں۔“

”نہیں۔ تم کل صبح واپس جانا۔ اب جاؤ اور شانتا کو یہاں
بھیج دو۔“ ٹھاکر نے کہا۔

رگھو نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”جو حکم اُن داتا۔“
باہر وصال دین گھر کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اس کا بس
نہیں چلتا تھا کہ اُنکر ماں کے پاس پہنچ جائے۔

”نہیں۔“
”میں نے چونک کر سر گھمایا تو رگھو پر نظر پڑی۔“ میرے
لیے کیا حکم ہے مالک؟ چھوٹے ٹھاکر کا حکم تھا کہ وصال دین کو
پہنچا کر آؤں۔ اب حکم ہو تو واپس چلا جاؤں۔“

”نہیں۔ تم کل صبح واپس جانا۔ اب جاؤ اور شانتا کو یہاں
بھیج دو۔“ ٹھاکر نے کہا۔

رگھو نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”جو حکم اُن داتا۔“
باہر وصال دین گھر کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اس کا بس
نہیں چلتا تھا کہ اُنکر ماں کے پاس پہنچ جائے۔

”نہیں۔“
”میں نے چونک کر سر گھمایا تو رگھو پر نظر پڑی۔“ میرے
لیے کیا حکم ہے مالک؟ چھوٹے ٹھاکر کا حکم تھا کہ وصال دین کو
پہنچا کر آؤں۔ اب حکم ہو تو واپس چلا جاؤں۔“

زنانه

آخرت شہماجی

ایک مرد ناتواں کے پیچھے نامے کا قصہ، ایک واقعہ اس کے ساتھ ایسا پیش آیا کہ اسے اپنے مرد ہونے پر شک ہو گیا۔



سکسٹن

دکھ

آ میر قلم کا حصہ بنادیا ہو، یا پھر وہ یونیٹ پر موجود کسی کا پیریکٹر ہو۔
محض چند گز کے فاصلے اور چند لمحوں کے گزرتے ہی اس دم ایک نئی دنیا اور اک نئے ماحول میں داخل ہونے والے احساس کا تجربہ دُڑانی کو اس سے پہلے بھی نہیں ہوا تھا۔
دُڑانی کو اس دن کا منظر یاد آ رہا تھا جب کریم آباد پل سے اترتے ہی اک لرزہ خیز منظر اس نے دیکھا تھا۔
پل سے اترتے ہی دُڑانی کو لوگوں کا اک ہجوم نظر آیا تھا۔
تجسس نے اسے موٹر سائیکل روکنے پر مجبور کر دیا تھا۔
پراسے معلوم ہوا تھا کہ ایک لوڈ سوزنی کا پچھلا ٹائر پھٹا ہوا

دُڑانی کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے ارد گرد کا ماحول اچانک بدل گیا ہے۔ جیسے وہ کسی نئی دنیا میں آ گیا ہے جو وقت حالات اور زمانے کے لحاظ سے اس کی موجودہ دنیا سے بالکل مختلف ہے۔ ایسا شاید وہاں پر موجود کسی ان دیسی غائم مشین کی وجہ سے ہوا ہے جس نے اچانک اسے اس نئی دنیا میں پہنچا دیا ہے۔ ایسی دنیا جو اس کی نہیں ہے۔ جو شاید ماضی قریب یا ماضی بعید کا کوئی منظر ہے۔ یا پھر یہ مستقبل کا کوئی وقت ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ منظر یا یہ واقعہ اس کے ملک میں وقوع پذیر ہو رہا ہے یا ہندوستان میں۔ یہ عراق کا منظر ہے یا صومالیہ کا... یا پھر تہری دنیا کے کسی اور ملک کا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے مٹن دبا کر اسے سینما ہال میں چلتی کسی تشدد

اور سوزنی کا ڈرائیور جب تک لگا کر ٹائر بدلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے آنے والی کار اسے بری طرح زخمی کرتے ہوئے نکل گئی۔ اس لیے جس کا ڈرائیور نے رکنے کی زحمت بھی نہ کی تھی مگر لوگوں کا ہجوم زخمی کی مدد کو جمع ہو گیا تھا۔ خاص طور پر وہاں سے گزرنے والا ہر موٹر سائیکل سوار رک کر حالات کا جائزہ لیتا اور مدد دینے پر تیار ہوتا تھا۔

اس وقت بھی کوئی زخمی کے سر پر کپڑا لپیٹ رہا تھا، کوئی اس کے زخمی بازو پر پٹی باندھنے میں لگا ہوا تھا۔ کوئی آنے جانے والی گاڑیوں کو روک کر زخمی کو اسپتال لے جانے کی درخواست کر رہا تھا۔ کوئی زخمی سے اس کے رشتے داروں کا پتا پوچھ رہا تھا اور وہاں پر معلوم کر رہا تھا تاکہ اس کے رشتے داروں کو اطلاع دے سکے۔ کوئی زخمی کے ساتھ ساتھ لے جاتے ہوئے سے ہم دردی کر رہا تھا۔ ہر شخص اس پریشان تھا جیسے اس کا کوئی قریبی عزیز زخمی ہو گیا ہو۔

دُڑانی نے بھی اس کا خیر میں شامل ہونے کی کوشش کی اور جب ان کے روکنے کے باوجود کوئی گاڑی والا اس زخمی کو اسپتال لے جانے پر رضامند نہ ہوا تو دُڑانی نے ایسولوس کو ان کیا۔ آن کی آن میں ایک ایسولوس آئی اور زخمی کو لے کر روانہ ہو گئی۔ زخمی کے جانے کے بعد ایک موٹر سائیکل زخمی کے بیٹے کو موٹر سائیکل پر بٹھا کر اس کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے پیچھے دو اور موٹر سائیکل سوار بھی اس کی مدد کے لیے روانہ ہو گئے۔ دُڑانی بھی مطمئن ہو کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

دُڑانی کے لیے یہ منظر، یہ ماحول، یہ ہجوم کوئی اچھے کی بات نہ تھی۔ یہ اس کا اپنا ماحول تھا۔ یہ اس کی اپنی دنیا تھی۔ یہ اس کے اپنے لوگ تھے۔

وہاں سے روانہ ہوتے وقت دُڑانی کو خیال آیا کہ ایک بار اس کے ایک دوست نے اس سے سوال کیا تھا۔ ”کیا تم بتا سکتے ہو کہ کراچی میں سب سے بڑی، سب سے متحد اور سب سے زیادہ ہم درد برادری کون سی ہے... یا وہ کون سی این جی او ہے جو رنگ، نسل اور مذہب کا خیال کیے بغیر سب کی مدد کرتی ہے۔ بلکہ اگر پولیس کی چیرہ دستیوں کا خیال نہ ہو تو وہ مدد کے مستحق لوگوں کو ان کے گھروں تک پہنچا دے گی۔“

دُڑانی نے بہت سوچا بہت سی برادریوں کے نام لیے مگر اس کے دوست نے سب کو مسترد کر دیا۔
”اچھا، اب خود ہی جواب بھی دے دو۔“ دُڑانی نے تنگ کر کہا۔

”وہ ہے کراچی کی موٹر سائیکل برادری!“ اس کے دوست نے انکشاف کرنے والے انداز میں کہا۔ ”تم نے خود بھی مشاہدہ کیا ہوگا کہ سڑک پر اگر کسی کے ساتھ کوئی مسئلہ ہو، کوئی زخمی ہو، کسی کی گاڑی خراب ہو یا کوئی حادثہ ہو جائے تو ہر گزرنے والا موٹر سائیکل سوار رک کر حسبِ مقتدرہ مدد کرے اور پھر مطمئن ہو کر ہی وہاں سے آگے روانہ ہوتا ہے۔“

یہ بات تو واقعی دُڑانی کے مشاہدے میں آئی تھی کہ موٹر سائیکل سوار سڑک پر کوئی مسئلہ دیکھتے ہی رکنے لگتے تھے۔ ایسا ایک واقعہ تو خود دُڑانی کے ساتھ پیش آ چکا تھا۔

اس دن دُڑانی اپنے چھوٹے بیٹے کو موٹر سائیکل پر پیچھے بٹھا کر اور درمیان میں ایک خالی سوٹ کیس رکھ کر اپنے گھر لا رہا تھا۔ اس کے بیٹے نے بجائے دُڑانی کو پکارتے ہوئے سوٹ کیس کو سنبھالا ہوا تھا۔ وہ اپنے معمول کی رفتار سے گھر کی طرف رواں تھا کہ اچانک برابر سے گزرنے والی تیز رفتار بڑی بس کے ایک جھونکے نے اس کا توازن خراب کر دیا اور دُڑانی کا بیٹا سوٹ کیس کو سنبھالنے کی کوشش میں موٹر سائیکل سے پھسل کر سڑک پر جا گرا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ جب وہ گرا تو سوٹ کیس اس کے نیچے آ گیا لہذا وہ چوٹ اور خراشوں سے محفوظ رہا۔ مگر پیچھے سے آئی ہوئی ٹریفک کے بارے میں سوچ کر دُڑانی خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے فوراً بریک لگا کر موٹر سائیکل روکی۔ پھر مڑ کر دیکھا تو پیچھے کا منظر دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ وہ منظر ہمیشہ کے لیے اس کی آنکھوں میں منجمد ہو گیا تھا۔

دُڑانی نے دیکھا، اس کے پیچھے آنے والے ایک آدمی عمر منہدی رنگی ڈاڑھی والے شخص نے اس کے بیٹے کے قریب موٹر سائیکل روک لی تھی اور موٹر سائیکل پر بیٹھنے کے بجائے کھڑے ہو کر اس کے بیٹے کو بچانے کے لیے اس نے دونوں ہاتھ یوں پھیلائے ہوئے تھے جیسے خالی ہاتھوں سے وہ پیچھے سے آنے والی تمام ٹریفک کو روک لے گا۔ یہ تو خدا کی مہربانی تھی کہ پیچھے سے آنے والی ٹریفک ہلکی تھی ورنہ اس کے بیٹے کو بچاتے ہوئے شاید وہ بھی مارا جاتا۔

اس شخص کی ہم دردی اور انسانیت دیکھ کر دُڑانی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ دُڑانی موٹر سائیکل سے اتر کر اپنے بیٹے کو سنبھالنا، دو تین موٹر سائیکل سوار رک چکے تھے۔ ان میں سے ایک نے آ کر اس کے بیٹے کو اٹھالیا تھا اور اسے سائڈ میں فٹ ہاتھ پر لے آیا تھا لہذا دُڑانی بھی اپنی موٹر سائیکل سائڈ پر لے آیا۔

ڈرائی کے موٹر سائیکل کھڑی کرتے کرتے دس بارہ موٹر سائیکل سوار اور دوسرے لوگ وہاں جمع ہو چکے تھے۔ ہر شخص اس کے بیٹے کا حال پوچھ رہا تھا، اس کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس سے معلوم کر رہا تھا کہ اسے چوٹ تو نہیں لگی۔ اسے پھر تو نہیں آ رہے۔ اسے مٹکی وغیرہ تو نہیں ہو رہی ہے۔

یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ درانی کا بیٹا سو فیصد ٹھیک ہے لوگ وہاں سے روانہ ہونے لگے مگر ان میں سے ایک شخص اس وقت تک وہاں زکار جا رہا تھا کہ ڈرائی اپنے بیٹے کو موٹر سائیکل پر بٹھا کر وہاں سے روانہ نہ ہو گیا۔

یہ واقعہ ڈرائی کیسے بھولی سکتا تھا۔ یہ لوگ، یہ ماحول یہ منظر، یہ دنیا... بسبب اس کی اپنی تھی۔ وہ ان میں شامل تھا۔

☆

آج ڈرائی اپنے گھر سے اس عزم کے ساتھ روانہ ہوا تھا کہ اپنی مرداگئی اور غیرت کا بھرم رکھتے ہوئے آج چاہے اسے اپنے قرض نادہندہ کا کریبان ہی کیوں نہ پکڑنا پڑے، وہ اس سے اپنی رقم وصول کر کے لائے گا۔ کیوں کہ گھر میں اس کی بیوی نے طعنے دے دے کر اس کا کچھیا چھنی کر دیا تھا۔ وہ اس کی شرافت اور نیک بینی کو بزدلی کہتی تھی۔ اس کا کہنا تھا۔ ”جب تمہارے دوست کو پیسے لوٹانے کی شرم نہیں تو تم بھی بے شرم بن جاؤ اور اپنے پیسے واپس لاؤ۔“

”اگر اس کے پاس تنگدلی ہوگی تو وہ خود ہی دے دے گا۔“ ڈرائی ہمیشہ یہی جواب دیا کرتا تھا۔ ”مجھے مانتے ہوئے شرم آتی ہے۔“

”بھئی پیسے مانتے ہوئے شرم آتی ہے اور مجھے تمہاری اس بھٹیچر موٹر سائیکل پر بیٹھے ہوئے شرم آتی ہے۔“ اس کی بیوی کہتی۔ ”میرے تمام رشتے داروں میں تم ہی ایک واحد شخص ہو جو موٹر سائیکل پر آتے جاتے ہو ورنہ آج کل تو معمولی آدمی کے پاس بھی کار ہے۔ تم دراصل اس سے پیسے مانگتے سے ڈرتے ہو... ارے، مرد، بنو، مرد! اور اپنا حق وصول کر کے لاؤ۔“ بات اس کی بیوی کی بھی صحیح تھی۔ جاوید نامی وہ شخص ڈرائی کا دوست تھا مگر اسے اندازہ نہ تھا کہ وہ اس قدر مصلحتی اور خود غرض نکلے گا کہ قرض وصول کر کے ادا کرنے کا نام ہی نہ لے گا۔

جاوید جب اس سے ادھار مانگنے آیا تھا تو واقعی بہت مصیبت میں تھا، یعنی اس کے بیٹے کے دل کا آپریشن تھا جس کے لیے اسے پیسوں کی شدید ضرورت تھی۔ ڈرائی نے اسی

دنوں کا خریدنے کے لیے دفتر سے دو لاکھ روپے ایڈوانس طور پر حاصل کیے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اس میں کچھ اور ملا کر ایک معقول سی سیکنڈ ہینڈ کار خریدی جاسکتی ہے۔ وہ اس سلسلے میں چند ایک کاریں دیکھ بھی چکا تھا۔ بلکہ ایک کار پسند بھی آگئی تھی جو سینگل ہینڈ ڈیڑھی اور بہت کم چلی ہوئی تھی۔ کار کا مالک اسے بیچ کر امریکا جا رہا تھا۔

ڈرائی کا خیال تھا کہ آج کل میں ملکیت بلا کر ادا کرانی ٹرائی لے کر اسے خرید لے گا مگر درمیان میں جاوید آ گیا۔ ڈرائی نے اپنی ضرورت کو پس پشت ڈال کر دوست کی اہمیت کا خیال کرتے ہوئے وہ دو لاکھ روپے اسے دے دیے تھے۔ اس بات کو دو سال ہو چکے تھے۔ جاوید کا بیٹا نہ صرف صحت یاب ہو چکا تھا بلکہ جاوید کا کاروبار بھی اچھا خاصا چل رہا تھا۔ مگر مانگنے کے باوجود وہی جاوید آج کل آج کل کر کے ٹالے جا رہا تھا اور پیسے واپس کرنے کا نام نہ لیتا تھا۔

آج ڈرائی اسی خیال سے گھر سے نکلا تھا کہ جاوید اس کی وہ اپنی مرداگئی کے زور پر جاوید سے پیسے واپس کرے گا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ جاوید کو اس کی دکان پر ہی پکڑے گا۔ دو چار لوگوں کے سامنے اس کی بے عزتی کرے گا اور پیسے ہی اٹھے گا مگر گلشن کاپل کر اس کر کے وہ جو بی کشن چور کی پاس پہنچا اس کی نگاہوں کے سامنے سارے منظر دھندلا گئے۔

زکا تو ڈرائی حسب عادت بھوم دیکھ کر کسی کی مدد کر کے خیال سے تھا مگر جیسے ہی اس نے اپنی موٹر سائیکل روکی ایک شخص بھوم سے بھاگتا ہوا باہر نکلا۔ اس کا سر پھٹا ہوا تھا اور خون بہہ کر اس کی گردن سے ہوتا ہوا اس کی پیٹھ کو لگا کر رہا تھا۔ ”کیا ہوا؟“ ڈرائی نے پوچھا۔

”وہ... وہ... ہمیں ایسے ہی مار رہے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ اور اس سے پہلے کہ ڈرائی اس سے کچھ اور پوچھتا وہ بھاگ کر دور جا کھڑا ہوا۔

”شاید پولیس والوں نے لاشی چارج کیا ہے۔“ ڈرائی نے سوچا اور اپنی موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے گھر میں گھس گیا۔

وہاں منظر ہی دوسرا تھا۔ سڑک کے تقریباً درمیان میں مرغی سلانی کرنے والا ایک ٹرک کھڑا تھا۔ اس کی چھت پر افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے زرد تھے۔ وہ اترتے ہوئے ڈر رہے تھے۔ سڑک کی بائیں جانب ایک کھڑی تھی جس میں کچھ افراد بیٹھے ہوئے تھے اور کچھ اتر رہے

تھے۔ جب کہ سڑک کے درمیان ایک بیس بائیس سالہ لڑکا پڑا ہوا تھا جو شاید مرغی والے ٹرک کا ڈرائیور تھا اور جسے کو سٹر سے اترنے والے افراد ٹکوں اور لاقوتوں سے بری طرح مار رہے تھے۔ وہ اٹھنے کی کوشش کرتا، مارکھتا اور پھر گر پڑتا۔ اس لڑکے کا سر پھٹ گیا تھا، دانت ٹوٹ گئے تھے اور خون سے رنگین اس کا ہرہ بہت خوف ناک نظر آ رہا تھا۔

ڈرائی کو یہ منظر دیکھا ہلکا ہلکا۔ اسے یاد آ گیا کہ اس نے انٹرنیٹ پر ایک ویڈیو دیکھی تھی جس میں ہندو انتہا پسند ایک مسلمان لڑکے کو ایسے ہی مار رہے تھے۔ وہ اسے اس بری طرح مار رہے تھے جس طرح یہ لڑکا یہاں مارا جا رہا تھا۔

ڈرائی نے احوال کا جائزہ لیا۔ اس نے دیکھا زرد اور سٹے اوئے چہروں والے ایک جیسے مجسموں کی طرح کھڑے تھے۔ کوئی بھی اس لڑکے کو بچانے کے لیے آگے نہیں آ رہا تھا۔ اس کے بجائے یہ لوگ دُور سے تماشا دیکھ رہے تھے۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ قرون وسطیٰ کا لوگ ہیں جو ایک جانور کے مرنے کا تماشا دیکھ رہے ہیں... یا پھر یہ خود کو زمین پر اچاڑنے کا ایک ایسیڈیم میں کھڑے محسوس کر رہے ہیں جہاں ایک غلام کو سزا کے طور پر بے دردی سے مارا جا رہا ہے اور ان کے ہاتھ پیر جو پھانسی پر قیدیم کا وحشی انسان اس نظارے سے تسکین حاصل کر رہا ہے۔

یوں کس طرح رہا تھا جیسے ان کے جسموں سے طاقت نچوڑی گئی ہے۔ وہ جیسے جیسے انسان نہیں بلکہ کسی فلم کے کردار ہیں جو انٹیکسٹر کی مرضی کے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ جیسے ان کا کردار متعین ہے اور وہ اس کی حدود سے باہر نہیں جاسکتے۔ یا پھر وہ انسان کے ہاتھ پیر سے جانور ہو گئے ہیں جو اپنے ہم جنس دوسرے جانور کو شکار اوتے دیکھ کر اس کی مدد کرنے کے بجائے اسے دوسرے جانور کا قتلہ کچھ کر دوسرے بے بس نظروں سے دیکھتا رہتا ہے۔ اور شاید یہ پوچھتا رہتا ہے کہ اس کی باری بھی نہیں آئے گی۔

موب کر ڈی... یعنی ”ظلم بھوم“! درانی کو کہیں پڑھی ہوئی اصطلاح یاد آئی۔

”شاید یہی بھوم کا ظلم ہے جس میں زیادہ لوگ کسی اکیلے شخص کو مار مار کر ادھ موار کر دیتے ہیں مٹی کا تیل ڈال کر جلا دیتے ہیں۔ یا پھر موب کر ڈی اس رول کا نام ہے جس میں ایک کوئی شخص اپنے اوپر یا اپنے ہم درووں پر ہونے والے ظالم یا زیادتی سبب سے جب کسی کم زور مجرم مثلاً کسی جیب کٹر سے یا پھر نیتے ڈاکو کو بے بس دیکھتا ہے تو ان مظالم کا بدلہ

لینے کے لیے، اپنی تسکین کے لیے اس مجرم کو ایک آدھ لات رسید کر دیتا ہے ایک آدھ مٹکا تو جڑ دیتا ہے۔

پر یہ تو موب کر ڈی کا کیس نہیں تھا کیوں کہ بھوم تو خاموش تماشا بنی کھڑا تھا... جب کہ مارنے والا گروہ چند افراد پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ مارکھانے والے نہ تو جب کترے تھے نہ ڈاکو۔ وہ نہ تو دوسرے فرقے سے تعلق رکھتے تھے اور نہ ہی دوسرے مذہب سے۔ وہ تو بھی کی کس کی اور ان کے ہم مذہب لوگ تھے۔ بلکہ یہ تو موب کے بی جی کا کیس تھا۔ کیوں کہ اگر تمام لوگ مل کر ان مارکھانے والوں سے ہم ردی کرتے تو ان مظلوموں کو بچایا جاسکتا تھا۔

مارکھانے والوں کا قصور صرف اتنا تھا کہ غریب مرغی والے ٹرک ڈرائیور سے کو سٹر کو ذرا سی سائیڈ لگ گئی تھی۔ کو سٹر والے چوں کہ تعداد میں زیادہ تھے اور سفید پوش تھے لہذا انھوں نے کو سٹر سے اتر کر ان غریبوں کو مارنا شروع کر دیا تھا۔ ان اس سے کلینے تو زخمی ہو کر بھاگ گیا تھا اور دور کھڑا بے بسی سے آنسو بہا رہا تھا جب کہ ڈرائیور جو ان کے ہتھے چڑھ گیا تھا، زمین پر پڑا مار کھا رہا تھا۔

ڈرائی نے دیکھا کہ مارکھانے والا شخص بالکل انٹرنیٹ کی فلم کی طرح چپ چاپ پڑا مار کھا رہا تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر پھر لڑکھڑا کر گر گیا۔ کیوں کہ اس کی پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ پھر سڑک پر لیٹ گیا۔ بالکل اس زخمی ہرن کی طرح جسے شکار کر رہے ہوں۔

وہ لوگ اسے ٹکوں سے، لاقوتوں سے اور ڈنڈے سے مار رہے تھے مگر وہ چیخ نہیں رہا تھا، جلا نہیں رہا تھا۔ کسی سے مدد کی درخواست نہیں کر رہا تھا۔ بچاؤ، بچاؤ نہیں پکار رہا تھا۔

شاید اسے بھی اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ اس وقت اس کی مدد کو کوئی نہیں آئے گا۔ اسے یوں ہی مار کھانی ہے اور مار کھاتے کھاتے مر جاتا ہے۔ اس نے ساری امیدیں چھوڑ دی تھیں۔ تبھی تو وہ اپنے آپ کو نہیں بچا رہا تھا۔ بس بے جان لوٹھڑے کی طرح زمین پر پڑ گیا تھا۔ ہر نائنمگیا یالات اس میں کچھ حرکت پیدا کرتی، اور وہ پھر وہیں ڈھے جاتا۔

اس کے اطوار سے لگ رہا تھا کہ وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ وہ اس وقت اپنے جیسے انسانوں کے درمیان نہیں بلکہ چلتے پھرتے مجسموں کے درمیان ہے جو مرداگئی اور غیرت سے عاری ہوتے ہیں۔ وہ محض ایسے تماشا بنی ہیں جو یہ تماشا بغیر پیسے خرچ کیے مفت میں اور لا بُد دیکھ رہے ہیں۔ بعد میں نہ صرف وہ اپنے

ایڈ ونچر کے لئے دادہ، ایک بڑا بڑا... اور اس کے، حقیقتاً شہساز
دوسرے کا شوق بہت کم ہے
ان کے سنسنی خیز اینڈ ونچر کے ابتدائی خیالات کو ہونے کے
انہیں کچھ شخص کے متوقع بہت کم ہیں

آفاق ادیب یا رب پتی تاجر ہے۔ جب کہ خواتین، خصوصاً
حسینا کو تو ہمیشہ کیسی میں کینٹ کا چچا کرتی رہتی ہیں تاکہ
اس سے مدد حاصل کر سکیں۔ اگر وہ لوگوں کو نہ بتائے کہ وہ
وہی شخص ہے جو اپنی ذہانت اور بہادری سے لوگوں کو
مشکلات سے نجات دلاتا ہے، تو کوئی کینٹ کو دیکھ کر کبھی
یقین نہ کرے۔ کوئی اپنے مصائب کے حل کے لیے کسی
مدقوق و مخفی ہستی سے کیوں رجوع کرے گا! آپ سوچیں
گے کہ پریشانی سے دوچار خواتین نے کسی جیمس فرڈیا کم از کم
کسی پولیس والے سے رابطہ کیوں نہیں کیا۔ اس کے برعکس
خواتین... اور جیسا کہ میں نے پہلے بتایا، حسینا ہمیشہ
کینٹ کا گھیراؤ کیے رہتی ہیں۔ میرا خیال ہے، اور جیسا کہ
کینٹ کا کہنا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نیویارک جیسے ہنگامہ
پرور شہر میں پیدا ہوئی اور وہیں پلا بڑھا ہے۔ لہذا اپنے نین
نقش، چلیے اور چال ڈھال سے خالصتاً نیویارک کا فرزند لگتا
ہے۔ جب کہ میں نے اب سے ایک سال پہلے تک کی اپنی
ساری زندگی فیئر پورٹ میں گزاری ہے۔ فیئر پورٹ ایک
خوب صورت بندرگاہ ہے۔ تاہم وہ جگہ ایڈونچر کی تربیت
مہیا کرنے کے لیے زیادہ موزوں نہیں ہے۔

ہم دونوں نے ایک ہی موقع پر، ایک ساتھ چھٹیاں لینے کا
اہتمام کر رکھا تھا اور ایسا کینٹ کے اصرار پر ہوا تھا۔ اب مجھے
بے چینی سے تعطیلات کا انتظار تھا اور میرے لیے یہ احساس ہی
بے حد خوش کن تھا کہ کم از کم کچھ دنوں کے لیے جو اس اینڈوربی
اور مسز شا کی اقامت گاہ سے جان چھوٹ جائے گی۔ لیکن جب
کینٹ نے ایک ساتھ تعطیلات پر جانے کی تجویز پیش کی تو میں
شش و پنج میں پڑ گیا کہ بے رخی کا مظاہرہ کیے بغیر کیسے اس کی
پیش کش مسترد کروں۔ پھر جب اس نے نشان دہی کی کہ ایڈونچر
کی تلاش کی ہم میں مجھے اس سے بہتر نہ کوئی نہیں ملے گا تو
مجھے لگا کہ وہ صحیح کہہ رہا ہے۔

”بعض اوقات مجھے لگتا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”کہ میرے

میں نے پختہ ارادہ کر رکھا تھا کہ آئندہ اپنی سالانہ
املاات مہم جوئی پر مبنی سرگرمیوں میں صرف کروں گا۔
مجھ میں جرأت یا جوش و جذبے کی کمی ہے، نہ ہی میں
اس کے اس حصے میں پہنچا ہوں جہاں لوگ گرم رکھنے کے لیے
ان مصنوعی ذرائع سے بچنا چاہتے ہیں۔ میں چند ماہ پہلے ہی
ایک سال کا ہوا ہوں۔ میری انجمن یہ ہے کہ میری اب تک کی
ہی بیجان اور ہنگامہ خیزی سے عاری، بہت سی سادی اور
ارڈنری قمی اور میری شدید خواہش تھی کہ مجھے بھی زندگی
ایڈونچر ورکشاپ ہوں۔

کینٹ کا خیال ہے کہ اپنی اس روکی چکی زندگی کا میں
اسے دار ہوں۔ اس کا اصرار ہے کہ اگر آپ ایڈونچر کے
ایڈونچر کے آپ کو خود ان کے تعاقب میں جانا ہوگا۔
کینٹ کا شریک کار ہے۔ ادنیٰ بیوساٹ تیار کرنے
لے ادارے کے ایڈیٹور کی میں وہ میرے ساتھ والی
ت پر بیٹھتا ہے۔ میں ایشیو گرافر ہوں اور وہ ملکر ہم
اس سزشا کے بورڈنگ ہاؤس میں الگ الگ کمروں میں
ہیں۔ کینٹ مجھ سے صرف ایک سال بڑا ہے لیکن وہ
کی نہ کسی ایڈونچر سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ میں رات
ایک قانون کی کتابیں پڑھتا رہتا ہوں۔ کیوں کہ میری
میں ہے کہ مستقبل میں وکالت کا امتحان پاس کر کے
ت میں مقدمات کی پیروی کروں اور وکلا کی تنظیم میں
ت اختیار کروں۔ اکثر میں مطالعے میں مشغول
ہوں کہ کینٹ دروازے پر دستک دیتا ہے۔ وہ اپنے
پیش آنے والا کوئی حیرت انگیز واقعہ سناتا ہے۔ کبھی وہ
بھانے والی گاڑی کے تعاقب میں آتش زدگی کے
تک پہنچتا ہے اور کئی لوگوں کی جان بچاتا ہے، یا کسی
والے کو بدعاشوں کے نرنے سے بچ نکلنے میں
ہے۔ کبھی وہ ہوٹل تک بوکر میں کسی اجنبی کو دوست
ہے اور بے تکلفی سے بڑے پر پتا چلتا ہے کہ وہ شخص کوئی شہرہ

پھر انھیں دفتر سے دیر نہ ہو جائے۔
ہجوم بڑھتا جا رہا تھا جب کہ مار کھانے والا بالکل ماحول
ہو چکا تھا۔ مارنے والے بھی کچھ ٹھنڈے پڑ گئے تھے اور ان
سے مارنے کے بجائے تھوڑی تھوڑی دیر بعد آکر ایک آدمی
لات رسید کرنے پر ہی اکتفا کر رہے تھے۔ جب کہ باقی لوگ
اوپر چھت پر رہ جانے والے کو لاکار رہے تھے کہ نیچے اترا ہوا
بھی یہی حشر کرتے ہیں۔

ڈزانی نے ایک بار پھر آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر اس
دفعہ ہجوم کے دھکے سے سڑک پر گرا۔ گرنے سے نہ صرف اس کی
کہنیاں پھل گئیں بلکہ پیٹ بھی گھٹنے سے پھٹ گئی۔ اس نے
مڑ کر دیکھا مگر اسنے سارے لوگوں میں وہ دھکا دینے والے
کیسے شناخت کرتا۔
ڈزانی اس دھکے سے اتنا بدحواس ہوا کہ کچھ دیر کو وہ
بدھ ہی بھول گیا۔ اسے پتا ہی نہ چلا کہ اس کے ارد گرد کیا
ہے۔ جب اُس کے حواس بہ حال ہوئے تو اسے محسوس ہوا کہ
جیسے منظر بدل سا گیا ہے۔ نہ صرف پولیس میں کئی
اور پولیس والے ان مارنے والوں کو پکڑ رہے ہیں بلکہ
بھی آگئی ہے جس میں سے رضا کارا تر کر اس لئے
اسٹریچر پر لانا کر ایڈوبلیس میں ڈال رہے تھے۔ جو نہ جانے
ہوش تھا یا مر چکا تھا۔ جب کہ وہ خود ان بوڑھی عورتوں کے ساتھ
کھڑا چلا جا رہا تھا۔

”ہائے، ہائے کیا کر رہے ہو! بس کرو ظالمو۔ اب مار
ہی دم لوگے۔ ظالمو چھوڑ دو اسے۔“
پولیس مجرموں اور ایڈوبلیس کے پولیس کو لے کر چلی گئی تو ان
چھٹنے لگا۔ ڈزانی وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہجوم
کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ”ایک انسان میری نظروں
کے سامنے مر گیا اور میں اس کی جان بچانے کے بجائے اپنی جان
بچاتا رہا۔ تف ہے میری مردانگی پر۔ شاید میں حوصلہ کر کے آگے
بڑھتا تو میری دیکھا دیکھی اور بھی لوگ آجاتے۔... تو اس لئے کہ
حال نہ ہوتا! میری بیوی ٹھیک ہی کہتی ہے۔ میں شاید مرد نہیں
ہوں۔ جیسی تو مجھ ان عورتوں کی طرح ڈزانی آواز ہی نہ نکال رہا۔
مردوں کی طرح ظلم کا ڈٹ کر مقابلہ نہیں کر سکا!

اسے محسوس ہوا کہ نہ صرف ان عورتوں بلکہ ساری قوم
کی طرح وہ زنانہ ہو گیا ہے اور اب ساری زندگی تالیان
پہننا رہا ہے۔

اپنے گھروں، دفاتروں یا دکانوں پر جا کر اس منظر کی تفصیل بنا کر
اس کی سنسنی خیزی کا مزہ لیں گے بلکہ اپنے جذبہ نفقہ کی تسکین
بھی کریں گے۔

ڈزانی نے یہ بھی دیکھا کہ ایک شخص موبائل آن کیے
ہوئے اس منظر کی فلم بنا رہا تھا۔ شاید اپنے لیے، شاید میڈیا کے
لیے... یا انٹرنیٹ پر یوٹیوب پر جاری کرنے کے لیے!
”ارے کم بختو! یہ کیا کرتے ہو!“ ڈزانی نے نہ رہا گیا اور
وہ حوصلہ کر کے آگے بڑھا۔ مگر جب ان میں سے ایک شخص نے
جس کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا اسے گھور کر دیکھا تو وہ سم گیا
اور وہیں رُک گیا۔

کوسٹر میں اب دو چار ہی لوگ بیٹھے تھے۔ زیادہ تر لوگ
نیچے آئے آئے تھے اور نہ صرف چوہا استطاعت لڑکے کو لواتوں
مٹوں یا گالیوں سے نواز رہے تھے بلکہ ٹرک کے ڈرائیور کیسٹن کی
اوپر کی چھت پر محصور دو افراد کو بھی ڈرا دھمکا رہے تھے انھیں نیچے
اترنے کو کہہ رہے تھے۔

چھت پر موجود دونوں افراد ہچکچا رہے تھے جیسے فیصلہ نہ کر پا رہے
ہوں کہ نیچے اتر کر اپنے ساتھی کی مدد کرنے کی کوشش میں ڈبی ہوں یا
پھر اوپر ہی رہ کر اپنی جان بچائیں۔ نیچے اترنے میں نقصان تھا۔ ڈبی
ہونے کا، ہڈیاں ٹوٹنے کا بلکہ جان سے جانے کا خدشہ تھا۔ جب کہ اوپر
رہنے میں شرمندگی تھی، بڑی کاٹھن تھا اپنے ساتھی کی مدد نہ کرنے کی
خفت تھی اور بعد میں جگ بھائی تھی۔

”ارے چھوڑ دو اسے۔ نہ مارو اسے... ارے بھائی، کیا
کرتے ہو! یہ بھی کسی کا بیٹا ہے، تمھارا بھائی ہے۔“ یہ مدد کی پہلی
آواز تھی جو ڈزانی نے سنی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو دو بوڑھی
عورتیں دُور سے ہی چلا کر ان کو سٹر والوں کو ظلم سے روکنے کی
کوشش کر رہی تھیں۔

ڈزانی آگے بڑھا اور مارنے والے ایک شخص کو دھکا دے کر
نیچے پڑے شخص کے اوپر سے ہٹایا۔ پیچھے سے کسی دوسرے شخص نے
ڈزانی کو ایک مکا جڑا تو وہ ہلکا سا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔

پیچھے ہٹ کر اس نے ایک بار پھر ماحول کا جائزہ لیا۔ ہجوم میں
اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ لوگ تجسس میں دوسرے لوگوں کو پیچھے ہٹا کر
آگے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ سب کے سب تماشا نشانی! کسی میں
اس بات کا حوصلہ نہ تھا کہ آگے بڑھ کر مظلوم کا ساتھ دیتا۔

شاید ان کے لاشعور میں یہ بات موجود ہو کہ کہیں وہ
دوسرے کو بچاتے بچاتے خود اس کیس میں نہ پھنس جائیں۔ ان
کی دکان کھٹنے سے نہ رہ جائے، ان کی دیہاڑی نہ ٹوٹ جائے یا

بتائے ہوئے ان واقعات میں سے صرف نصف پر تم یقین کر پاتے ہو۔ میں صحیح کہہ رہا ہوں نا؟“

مجھے ڈر تھا کہ کہیں میرا جواب اس کے جذبات مجروح نہ کر دے۔ میں تذبذب کی کیفیت میں تھا لیکن اس نے حسب معمول میرے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ ”تو اس تقریب کی دورے کے دوران میں تم کینٹ کو اپنی آنکھوں سے مصروف عمل دیکھ لو گے۔ تمہیں میری زبان پر جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تم دیکھو گے کہ کس طرح ایک کے بعد دوسرا ایڈوینچر خود چل کر میری طرف آئے گا اور میرے ہاتھوں انجام کو پہنچے گا۔“

ہماری غلطی آغاز یکم ستمبر سے ہونا تھا لیکن ہم نے اپریل سے ہی کینٹ بندی شروع کر دی تھی جس کا سلسلہ نیویارک سے ہماری روانگی سے ایک روز پہلے تک جاری رہا۔ ہماری مشکل یہ تھی کہ میں نیولینڈ کے شمال میں واقع فیئر پورٹ میں پروان چڑھا تھا اور اب مجھے نمک کی لک سے لب ریز چلی ہوا، ٹھنڈے مارتے سمندر اور بحری جہازوں کی یاد دہی طرح ستا رہی تھی۔ اگرچہ وہاں لنگر انداز ہونے والے اکثر بحری جہاز سنٹ ڈیوے پر مامور ہوا کرتے تھے لیکن میں سمندر کے والی یاد دہی میں، موجوں سے زور آزمائی کے لیے بے تاب تھا۔ کینٹ کا احتجاج کیا کہ وہ جگہ چھٹیاں گزارنے باہم ہونی کے لیے موزوں منزل نہیں ہے۔ وہ فیئر پورٹ کا ذکر سننے کو بھی تیار نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ٹھونکوں اور سپیوں کی تلاش وہاں کہانیاں اس کے لیے کوئی کشش نہیں رکھتی۔ اسے اندیشہ تھا کہ میری مائی گیری کی کشتی کی غرق آبی یا کیکڑوں سے لدا ٹکڑا لوٹنا... فیئر پورٹ میں ہمارے لیے ایڈوینچر سے ہم کنار آنے کے بس یہی مواقع ہوں گے۔ اس کا اصرار تھا کہ ہمیں جہازوں کی طرف جانا چاہیے جہاں قدم قدم پر ایڈوینچر ہمارا استقبال کریں گے۔

جون، جولائی اور اگست کی بے خواب اور جس زندہ میں ہم نے اسی طرح کے اختلافات اور تعطیلات پر بحث کی تھی۔ میں گزاردیں۔ نیویارک سے پانچ سو میل کے اندازے میں کوئی ایسا گرمائی سیاسی مقام نہیں تھا جس پر ہم نے غور و خوض نہ کیا ہو۔ کینٹ نے معلومات کی فراہمی کے سوا کوئی اور نیویارک سے نکلنے والی تمام ریل کمپنیوں کے مکالموں سے حاصل کردہ ریل کے نظام الاوقات، نقشوں

اور تصویری کتابچوں وغیرہ کی پوری لائبریری تیار کر لی۔ ہمارے پاس گرمائی اقامت گاہوں، گولف کلبز، ٹینس کورٹس اور بوٹ ہاؤسز کی دل کش تصاویر کا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ وہ دست یاب کمروں اور سوئٹس کے کرایوں کے موازنے کے لیے ان اقامت گاہوں کے مالکان سے دو ماہ تک خط کتابت کر کے بے پناہ تسکین حاصل کرتا رہا۔

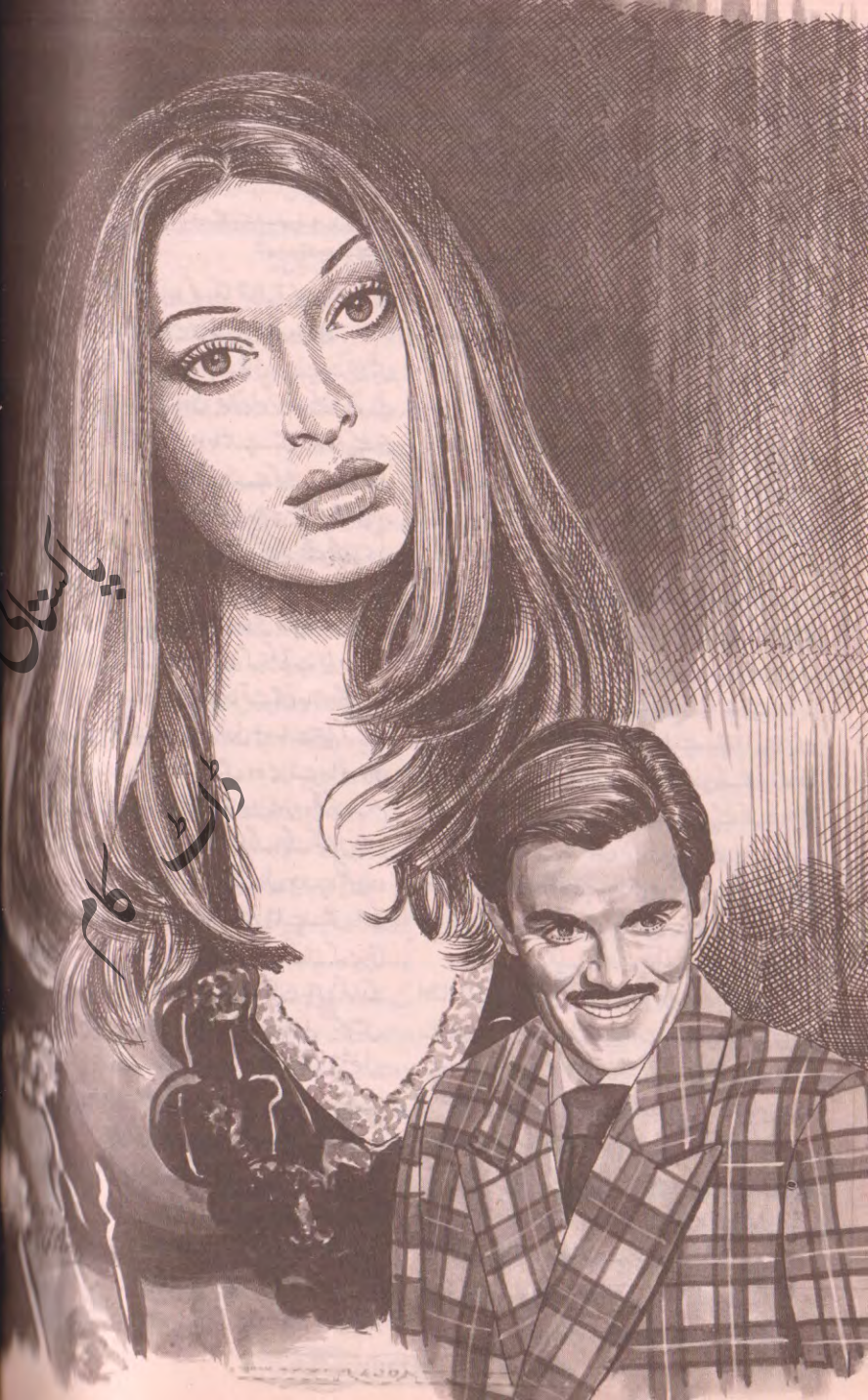
”جہاں تک آؤٹ لگ ہاؤس کا سوال ہے۔“ وہ اعلان کرتا۔ ”وہ کمرے ہشت گاہ اور نجی غسل خانے کے چوبیس ڈالر ماگ رہے ہیں۔ جب کہ بالکل اسی طرح کی اقامتی سہولیات، کارٹر ہوٹل صرف بیس ڈالر میں پیش کرتا ہے۔ تاہم کارٹر ہوٹل میں کوئی ٹینس کورٹ نہیں ہے لیکن دوسری طرف آؤٹ لگ ہاؤس والوں کے پاس گیراج کی سہولت نہیں ہے۔ جب کہ وہاں پائونٹے کمروں میں ساتھ لانے کی اجازت بھی نہیں ہے۔“

میں جانتا تھا کینٹ ٹینس کھیلنا نہیں جانتا جب کہ ہمارے پاس گاڑی بھی نہ تھی اور نہ ہی چوبیس ڈالر۔ لہذا مجھے یہ تفصیلات انتہائی فضول اور بے جا لگی تھیں لیکن کینٹ کو یہ سمجھانے کی کوشش کچھ زیادہ صحت افزا نہ ہوئی۔ کیوں کہ اس کے کہنے کے مطابق اس کی قوت تحلیل اتنی زرخیز تھی کہ وہ خود کو ذہنی طور پر یقین دلا سکتا تھا کہ ایسی چیز اس کے پاس موجود ہے جس کی اس کی زندگی میں کمی ہے۔ نہ صرف یقین دلا سکتا ہے بلکہ اس کی ملکیت کے احساس سے لطف اندوز بھی ہو سکتا ہے۔

کینٹ اپنے لباس پر بے پناہ توجہ دیتا تھا۔ یہ سوال اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا کہ ان تعطیلات کے لیے اسے کس طرح کے ملبوسات کا انتخاب کرنا چاہیے۔ جب میں نے کہا کہ میرے خیال میں اس بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، تو وہ چھٹ پڑا۔

”تمہیں ضرورت نہیں ہوگی۔“ اس نے کہا۔ ”اگر میں تمہاری طرح مائی گیری کی کشتی کھیتے پروان چڑھا ہوتا، میری جلد کی رنگت بھی ریڈانڈین لوگوں کی طرح چمک دار تانے جیسی اور بال گندم کے کپے ہوئے خوشوں کی طرح سنہری ہوتے تو مجھے بھی لباس کی پروا نہ ہوتی۔ مسز شاہتی ہے کہ تم بالکل کسی ایسے انگلستانی نواب جیسے دکھتے ہو، جس نے عام آدمی کا بھیس اپنا رکھا ہو۔“

میں نے بھی کوئی انگلستانی نواب نہیں دیکھا، بھیس میں اور نہ بھیس کے بغیر۔ مجھے اعتراف ہے کہ مجھے دیکھنے



کا اشتیاق ضرور تھا۔

”آخر سبز شا کے اس ہوٹل میں مقیم سب لڑکیاں ماچس ادھار لینے کے لیے صرف تمھارے کمرے میں کیوں دوڑی چلی آتی ہیں؟“ کینٹ نے جواب کا تقاضا کیا۔ ”کیا اس لیے کہ وہ تمھارے لباس کو سراہتی ہیں؟ اگر وہ ملبوسات ہی کی دیوانی ہیں تو ماچس مانگنے میرے پاس کیوں نہیں آتی ہیں؟“

”تم ہر روز رات گئے واپس آتے ہونا!“ میں نے کہا۔ ”تم جانتے ہو کہ یہ درست جواب نہیں ہے۔“ اس نے احتجاج کیا۔ ”اچھا یہ بتاؤ، دفتر کی ٹائپسٹ لڑکیاں پنسل شارپ کرانے لڑھوئے اور مشکل الفاظ کے سچے دریافت کرنے کے لیے ہمیشہ تمھارے پاس ہی کیوں جاتی ہیں؟ دفتر کے کیفیئر یا کی خادما میں ہر روز پہلے تمھیں کھانا کیوں پیش کرتی ہیں؟ کیا اس لیے کہ وہ تمھارے پیرہن سے مسحور ہوتی ہیں؟“

”اچھا؟“ میں نے پوچھا۔ ”میں نے کبھی دھیان نہیں دیا اس بات پر۔“

کینٹ نے تھنے پھڑکاتے ہوئے ہاتھ فضا میں لہرائے۔ ”آہ، جناب نے کبھی دھیان نہیں دیا“ اس نے میرا جملہ دہرایا۔ ”کبھی دھیان ہی نہیں دیا!“

کینٹ نے ان تپکلات کے لیے ایک استعمال شدہ سوٹ کیس خریدا جس پر فرانس اور سوئزر لینڈ کے ہوٹلوں کے لیبل چسپاں تھے۔ ”جو، اگر تم یہ سوٹ ساتھ لے کے گئے تو چلتا پھرتا جھوٹ دکھائی دو گے۔“

کینٹ کا پورا نام جوزف فوربز کینٹ ہے لیکن اس نے اپنا ابتدائی نام جو ترک کر دیا ہے کیوں کہ اس کے مطابق اعلیٰ سماجی حلقوں میں یہ نام بہت کم سنہ سنہ میں آتا ہے اور آج کل صرف قدیم تحفوں میں پایا جاتا ہے۔ اس نے مجھے کہہ رکھا ہے کہ اسے فوربز کے نام سے پکارا کروں۔ لیکن چوں کہ میں اسے شروع سے جو کہا کرتا تھا، لہذا اب یہ بات بھول جاتا ہوں۔

”میرا نام جوزف نہیں ہے۔“ اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ”اور مجھے استعمال شدہ سوٹ کیس استعمال کرنے کا بھی اتنا ہی حق ہے، جتنا سنہ کا۔ یہ سوٹ کیس کہتا ہے کہ یہ یورپ ہو کر آیا ہے، یہ سوٹ کیس یہ نہیں کہتا کہ میں، یعنی فوربز وہاں جا چکا ہوں۔“ لیکن غالباً تم یہ بات لوگوں سے کہہ کر رو گے، اور اگر کوئی ایسا شخص تمھیں مل گیا جو وہاں جا چکا ہو تو۔“

”میری بات غور سے سنو۔“ کینٹ نے حکم دیا۔ ”اگر تم

ایڈوچر کی خواہش رکھتے ہو تو اس کے لیے تمھارا کوئی اہم ہستی ہونا ضروری ہے۔ کوئی بھی شخص میں ڈالری ہفتہ کمانے والے کلرک جو کینٹ کو اپنے ایڈوچر میں شریک نہیں کرے گا۔ لیکن یورپ پلٹ سوٹ کیس اور ہارورڈ یونیورسٹی کا رین لینے ہیٹ والے فوربز کینٹ۔“

”اوہ، تو تمھارے ہیٹ کے گرد لپٹا زرد رین ہارورڈ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے کا عکاس ہے؟“

”ہاں!“ کینٹ نے اعلان کیا۔ ”اور میرے پاس بالے یونیورسٹی اور ایک گالف کلب کے رین بھی ہیں۔“ اس کا لہجہ گرم ہوتا جا رہا تھا۔ ”مزید سنو، میں نے ٹینس کا ایک ریکٹ اور گالف اسٹکس سے بھرنا ایک بیگ بھی مستعار لیا ہے۔ اور تم اپنے کام سے کام کرکو، مجھ پر اپنی مرضی ٹھونسنے کی کوشش نہ کریا کرو۔“ ”مجھے صاف نظر آ رہا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تم ہمیں زبردست مشکلات میں پھنسانے والے ہو۔“

”میں سوچ رہا تھا۔“ کینٹ نے قدرے نظر آہٹوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر پہلے ہفتے تم میرے لیے بن کر رہو اور دوسرے ہفتے میں تمھارا تو ہمیں اپنے مقاصد حصول میں خاصی مدد مل سکتی ہے۔“

بعض اوقات مسٹر جو اس کاروباری دورے پر جاتے ہوئے مجھے پرائیویٹ اسٹوڈیو گرافری حیثیت سے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور دفتری دعوالات سے یہ تبدیلی میرے لیے کافی خوش گوار ہوتی ہے، تاہم مجھے اس تجویز میں کوئی وزن نظر نہیں آیا کہ اپنی تپکلات کا ایک ہفتہ میں کینٹ کی خط کتابت کرتے گزار دوں۔

”تمھیں غلط نہیں لگنے پڑیں گے۔“ اس نے وضاحت کی۔ ”لیکن جب میں لوگوں کو بتاؤں گا کہ تم میرے پرائیویٹ سیکریٹری ہو تو اس طرح مجھے خود ایک خاص اہمیت حاصل ہو جائے گی۔“ ”اگر تمھیں اس سے خوشی مل سکتی ہے۔“ میں نے دریاوی دکھائی۔ ”تو تم لوگوں کو بتا سکتے ہو کہ میں ایک انگلستانی نواب ہوں اور میں نے تمھیں بدل رکھا ہے۔“

”اس طرح طنز بازی کی کیا ضرورت ہے؟“ کینٹ نے احتجاج کیا۔ ”میں تو تمھیں ایڈوچر کی طرف پیش قدمی کا ایک راستہ دکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔“

”یہ راستہ تو ضرور ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن ایڈوچر نہیں، جیل کا!“

اگست کا آخری ہفتہ آگیا اور ہم ابھی تک فیصلہ نہیں

ہائے تھے کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔ میں نے تجویز پیش کی کہ اس کا فیصلہ قسمت پر چھوڑ دیا جائے۔ ”سب سے پہلی چیز ہے، اس یعنی شہر سے دور جانا۔“ میں نے نشان دہی کی۔ ”اور دوسری چیز ہے کم سے کم خرچے میں روانگی۔ آؤ ہم ان تمام گرمائی تفریحی مقامات کے ناموں کی پرچیاں بناتے ہیں جہاں تک ریل یا بحری راستے سے دوڑا میں پہنچا جاسکتا ہو۔ پھر ان پر چوں کو ایک ہیٹ میں ڈال کر اس جگہ کے نام کی قرض اندازی کرتے ہیں جہاں ہمیں ہفتے کی سہ پہر روانہ ہونا ہے۔ یہ آئیڈیا اپنی جگہ ایڈوچر سے بھر پور ہے۔“

کینٹ قدرے ہچکچاہٹ کے بعد آمادہ ہو گیا۔ اسے سب سے بڑا اندیشہ یہ تھا کہ نیویارک کے قریب ایسی جگہ جہاں اتنی کم رقم خرچ ہوئے نامکان ڈراما ہو۔ ”مجھے شدید اندیشہ ہے کہ اتنی محدود مالی استطاعت کے ساتھ بڈن دریا کے پار نیوجرسی کا لاسمری پارک ہی ہماری منزل ثابت ہوگا۔“

مجھے کی رات تک ہم روانگی کی کسی بھی مل کر چکے تھے۔ نصف شب کو ہم نے قرض اندازی کا الحاد کیا۔ ہم نے گتے کے ایک ڈبے میں بیس پرچیاں ڈالیں جن میں سے ہر ایک پر کسی مقام کی شناخت گاہ کا نام درج تھا۔ ان میں سے دس کا انتخاب کیا گیا۔ ”خیر، کیا تھا۔ جب کہ باقی دس نام کینٹ نے تجویز کیے تھے۔“ کینٹ نے ڈرامائی انداز میں آستینیں چڑھائیں اور ڈبے میں ہاتھ ڈال کر ایک پرچی نکالی۔ اس نے بلند آواز میں نام پڑھا۔ ”نیو بریڈ فورڈ بڈر نیو بریڈ فورڈ ایٹیم شپ لائن۔“

یہ میری منتخب کردہ سیاحت گاہ تھی۔ ”نیو بریڈ فورڈ!“ کینٹ چلایا۔ اس کے چہرے سے شدید مایوسی عیاں تھی۔ ”یہ تو ایک صنعتی قصبہ ہے۔“ وہ بلبلارہا تھا۔ ”سوٹ کے کارخانوں سے لب ریز!“

”صنعتی قصبہ تو کیا ہوا؟“ میں نے احتجاج کیا۔ ”وہ انتہائی جاذب نظر بندرگاہ بھی تو ہے امریکا کی قدیم ترین بندر گاہوں میں سے ایک! تم وہاں کی گودی پر ویشل کے شکار پر ہانے والے بحری جہاز ان کے مستحکم پرکنداس چوبی جسمے اور اکیری کے تیز سے۔“

”کیا ہم کسی مدون شہر کی ہمدانی کی مہم پر روانہ ہو رہے ہیں؟“ کینٹ نے مداخلت کی۔ ”یا یہ تفریحی دورہ ہے؟ مجھے اکیری کے تیز سے دیکھنے کا شوق ہے ورنہ میں تمھیں قتل کر دوں گا۔“ کینٹ نے جواب دیا۔ ”میں تو زندگی کی

رنگینیاں کھونچنے جا رہا ہوں۔“

بگ ایرو نامی ڈخانی جہاز شام چھ بجے لنگر اٹھانے والا تھا لیکن ہم نیویارک سے جان چھڑانے کے لیے اتنے آتاو لے ہو رہے تھے کہ پانچ بجے ہی سوار ہو گئے۔ ہمارا دو برحقوں والا کینین بیرونی رخ پر تھا۔ ہم نے اپنے سوٹ کیس رکھے اور اسٹیر کے اوپری عرشے کے ایک ٹھنڈے گوشے میں، تہہ ہونے والی دو کرسیاں بچھا کے نیم دراز ہو گئے۔ کینٹ سہ پہر کے تمام اخبارات خرید لیا تھا اور ایک خبر میں خاص دل چسپی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس خبر کے مطابق آئرستانی ریاست آئیوی کا نوجوان ولی عہد بالآخر سبز زمین امریکا پر قدم رکھ چکا تھا۔

گذشتہ چند ہفتوں سے مقامی اخبارات غیر ضروری طور پر نوجوان آئرستانی نواب زادے اور اس مقامی لڑکی مس آلدیج کی خبروں کو نمایاں جگہ دے رہے تھے جس سے شادی کے لیے وہ امریکا آنے والا تھا۔ کینٹ نے سہ پہر کے اخبارات سے اخذ کیا کہ وہ نواب زادہ اپنے خاندانی نام ”میان“ کے ساتھ آج صبح نیویارک شہر کی بندرگاہ پر آ رہا تھا۔ اس کی بہن لیڈی میوا بھی اس کے ہم راہ تھی۔ لیکن جب تک اخباری رپورٹرز ان کی کھوج لگا پاتے، وہ دونوں بندرگاہ سے غائب ہو گئے۔

”مختلف ہوٹلوں سے معلومات حاصل کی گئیں۔“ کینٹ نے از حد مشتاق لہجے میں پڑھ رہا تھا۔ ”لیکن تمام کوششیں ناکام رہیں۔ معزز مہمانوں کا کچھ پتا نہ چل سکا۔ قیاس لگا یا جا رہا ہے کہ وہ دونوں فوری طور پر بڈر نیو بریڈ فورڈ کے آبائی قصبے نیو پورٹ روانہ ہو گئے تھے۔“

کینٹ نے مرحوب انداز میں مار پیٹیانہ نامی بحری جہاز کے سرخ پرچوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ لوگ اس کے ذریعے امریکا آئے تھے۔ کاش، ہم لوگ نیو بریڈ فورڈ کے بجائے نیو پورٹ کا رخ کرتے۔ کیسی کیسی سربراہان و دروہ شخصیات اس شادی میں شریک ہوں گی۔ یہ اس موسم گرمی کا اہم ترین سماجی تقریب ہوگی۔“

میں جہاز میں سامان لا دے جانے کا منظر دیکھنے لگا۔ جب کہ کینٹ عرشے کے چنگلے پر جا کھڑا ہوا۔ اس کی پُرشوق نظریں جہاز میں سوار ہونے والے مسافروں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس نے انتہائی غور و خوض کے بعد لباس کا انتخاب کیا تھا۔ اس نے بالے یونیورسٹی کا سرخ رین لپٹا ہیٹ پہن رکھا تھا۔ لیکن جب اس نے ایک انتہائی خوش پوش نوجوان کو ہارورڈ یونیورسٹی کا زرد رین لپٹا ہیٹ پہنے جہاز میں سوار ہوتے دیکھا تو

وہ تیزی سے اپنے کمین کی طرف لپکا۔ واپس لوٹا تو اس کے سر پر بھی زرد ربن پٹا بیٹھا تھا۔

چند منٹ بعد میں نے کینٹ کو آرام کرسیوں پر اس نوجوان سے محو گفتگو پایا۔ تاہم صاف لگ رہا تھا کہ باتوں کی بیش تر ذمہ داری کینٹ نے اپنے شانوں پر اٹھا رکھی ہے اور وہ نوجوان اس کی باتوں پر ذرہ برابر توجہ دینے پر آمادہ نہیں۔ اس کے بجائے اس کی نظریں مسافروں کے جہاز پر سوار ہونے کے پل پر جمی ہوئی تھیں اور جب اس نے اپنے ہم عمر ایک نوجوان کو ایک لڑکی کے ساتھ جہاز میں آتے دیکھا تو وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑا لیکن پھر کینٹ پر ایک مختلط نظر ڈال کر وہ دوبارہ کرسی میں ہنسنے لگا۔

وہ لڑکی بلا کی خوب صورت تھی۔ قدرتی حسن کا شاہ کار! ایسی کہ جو دیکھنے، دیکھنا نہ جائے۔ فاقہی رنگ کی آنکھیں، کندہن جیسی زلیں۔ مجھے لگا۔ اس کے رعب جمال سے میرا دل رگ جائے گا۔

قدرے تو وقف کے بعد اصلی ہارورڈ ربن والے ہیٹ کا مالک نوجوان اٹھا اور سر کی جنبش سے کینٹ کو الوداع کہہ کر عرشے سے نیچے اتر گیا۔ میں بھی اپنی نشست سے اٹھا اور اس کے پیچھے چل دیا۔ میں سنہری زلفوں والی اس حسینہ کو دوبارہ دیکھنے کی خواہش پر قابو نہیں پاسکتا تھا۔ مجھے یہ مطلوب نہیں تھا کہ وہ بھی مجھے دیکھے۔ میں نے ایسا پہلے کسی نہیں کیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے کسی نے مجھے اتنی بری طرح متاثر بھی تو نہیں کیا تھا۔

اس کی تلاش میں مجھے جہاز کے ایک سرے سے دوسرے تک سرگرداں ہونا پڑا لیکن وہ نہ مل سکی۔ اس دوران میں مجھے ادراک ہوا کہ میرا طرز عمل کتنا غیر شریفانہ تھا۔ یہ احساس ہوتے ہی میں اس ارادے سے تیز قدموں سے اوپری عرشے پر پہنچا کہ خود کو کتاب کے مطالعے میں غرق کر دوں گا۔ اس سے وہ حسین چہرہ میرے ذہن سے اوجھل نہ بھی ہوا تو کم از کم میری گستاخ نظریں اس کے لیے موجب اضطراب تو نہیں بنیں گی۔

میں اس خوش پوش نوجوان کی چھوڑی ہوئی آرام کرسی سنبھالنے لگی والا تھا کہ کینٹ نے مجھے ٹوکا۔ ”خیر وہ مجھ سے گفتگو میں گہری دل چسپی لے رہا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ واپس آئے۔“ مجھے حقیقت معلوم تھی تاہم میں کرسی پر نہیں بیٹھا۔

”اگر یہ نوجوان کوئی رئیس زادہ ثابت ہوا تو مجھے قطعاً حیرت نہیں ہوگی۔“ اس نے کہا۔ ”وہ ہارورڈ کا پڑھا ہوا ہے اور اس کے اطوار انتہائی مہذب ہیں۔“ اس نے مزید وضاحت کی۔ ”ایک خاندانی رئیس کو اسی طرح پہچانا جاسکتا ہے۔ ان کی

باتوں میں تکبر نہیں ہوتا۔ ان کی سماجی حیثیت اتنی محکم ہوئی ہے کہ یہ جودل کہے، گزر گزرتے ہیں۔ مثال کے طور پر کیا تم نے توجہ دی کہ وہ بائپ پی رہا تھا؟“

میں نے کہا کہ میں نے اس بات پر توجہ نہیں دی۔ کینٹ نے ان تھیلیات کے لیے رگڑوں کا بکس خریدنا تھا جو اس کی مالی استطاعت سے کہیں زیادہ منہنگ تھا۔ وہ اس وقت بھی ایسا ہی ایک رگڑ پی رہا تھا اور جیسے جیسے وہ جل کر چھوٹا ہوتا تھا کینٹ اس کے چلتے سرے کے نزدیک لپٹا سنہرا گھیرا احتیاط سے نیچے کھکھاتا رہتا تاہم اب اس نے اپنے رگڑ کو ہیزا نظروں سے دیکھا اور اسے عرشے کے فرش پر پھینک دیا۔

”میری کرسی سنبھالے رکھو میں کمین سے بائپ لے کر آتا ہوں۔“

میں نے کرسی پر بیٹھ کر کتاب پر نظریں گاڑ دیں۔ لیکن مجھے تحریر سمجھ آ رہی تھی اور نہ صفحات دکھائی دے رہے تھے۔ بس وہ من موئی صورت مجھ پر سایہ کیے ہوئے تھی۔ میں نے جھنجھلا کر نظر کتاب سے اٹھائیں تو بے نگارہ گیا۔ وہی لڑکی جسے میں نے پہلے موجودگی بہ مشکل دونٹ کی دوری پر اسی آج جانی تو تھی۔ اس کی طرف بڑھا۔ لیکن میں نے ہر وقت خود کو سنبھال لیا اور سرے ہیٹ اتار کر نظریں اس جھجکا۔ میں وہاں سے رخصت ہونا چاہتا تھا لیکن اس حسینی نظروں نے مجھے کئے کا حکم دیا۔

میری حیران نظریں دیکھ رہی تھی کہ اس کے چہرے پر حیرت اور التفات کے نئے نئے علامات ہیں۔ جیسے وہ مجھے جانتی ہو یا میری شکل اسے کسی ایسے شخص کی یاد دلا رہی ہے جس سے وہ برسوں سے آشنا تھی۔ اگر بعد والا معاملہ وہ شخص اس کا دوست رہا ہوگا کیوں کہ اس کی نظروں میں یگانگت تھی۔ اس نے نیویارک کی ایک فلک بوس عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ بتا سکتے ہیں اس عمارت کا کیا نام ہے؟“

اگر اس کا سوال ثابت نہ کرتا تو اس کا لہجہ بتا دیتا کہ وہ صرف اجنبی، بلکہ آزرستانی بھی ہے۔ اس کا لہجہ نرم، دھیمہ اور دل آویز تھا۔ اس کا پوچھا ہوا اسادہ سا سوال غمزدہ بن کر میرے کانوں تک پہنچا تھا۔ میں نے اسے عمارت کا نام بتایا اور اس کی دریا میں کچھ فاصلہ طے کرنے پر وہ اس سے بھی زیادہ بلند اور عالی شان عمارت دیکھ سکے گی۔ وہ اشتیاق سے میری بات سن رہی تھی۔ دل چسپی بھری چمک دار آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے شرمندگی سی ہونے لگی اور اس خوف سے کہ کہیں اس

کے دل نہ ہورہا ہوں۔ میں نے وہاں سے جانے کے لیے قدم اٹھایا لیکن اس نے ایک اور سوال کر کے مجھے روک لیا۔ مجھے اس کے ایسا کرنے کی کوئی وجہ نظر نہ آئی لیکن لگ بھگ یہی لگا کہ جیسے اس نے صرف مجھے روکے رکھنے کے لیے سوال کیا ہوا۔

”اور وہ عجیب سی کشتی کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔ ”جور یا میں پانی پھینک رہی ہے؟“

میں نے اسے بتایا کہ وہ آگ بجھانے والی کشتی ہے جس کا عملہ اپنے پانیوں اور لوٹیوں کی آزمائش کر رہا ہے۔ جیسے جیسے جہاز دریا میں آگے بڑھنے لگا، میرے اعتماد میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور میں نے اسے جھمے آزادی، گورنر کے جزیرے اور بروکلین کے پل سے متعارف کرایا۔

پھر مجھے پتا چلا کہ اس کے لیے قطعاً پریشان کن نہیں تھی کہ وہ ایک اجنبی سے، غلام ہے۔ جیسے پتا چلا کہ لوگ اس سے اکھڑ رویہ اپنائی نہیں سکتے نہ ہی اس کی بے تکلفی سے کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوں گے۔

میں نے اسے اپنا نام بتانے کے لیے اسے رے میں سوچا۔ پہلے تو یہ خیال حسب تہذیب محسوس ہوا۔ پھر مجھے لگا کہ یہ خود کو اس پرچوٹنے کے مترادف ہوگا کیوں کہ وہ صرف نیویارک کے رہائشی نہیں تھے بلکہ وہاں کے باشندے تھے۔

بروکلین نیوی یارڈ سے گزرتے ہوئے میں نے وہاں لنگر اٹھایا۔ جہازوں کے بارے میں اتنے پرجوش انداز میں تفصیل سے معلومات منتقل نہیں کی کہ مٹر مٹر لوگاں میں سمندر میں ہی بلا بڑھا ہوں۔ ”کیا تم بحری فوج میں ملاح ہو؟“

یہ ذاتی نوعیت کا پہلا سوال تھا۔

”میں مانی گیری کی کشتی چلایا کرتا تھا۔“ میں نے بتایا۔ ”میں جو اس اینڈ کارٹی مینی کے دفتر میں کام کرتا ہوں۔“

مجھے لگا، میرے جواب نے اسے تذبذب اور حیرانی سے دوچار کر دیا ہے۔ اس نے شک بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”تم دفتر میں کام کرتے ہو؟“ اچانک اس کی آنکھیں چمک اٹھیں جیسے اُس نے میری چوری پکڑ لی ہو۔ ”تو تم خود کو اتنا توانا اور جاق چوند کیسے رکھتے ہو؟“ اس نے بلا جھجک پوچھ لیا جیسے کوئی مرد کی دوسرے مرد سے پوچھا کرتا ہے۔ مجھے بخوبی احساس تھا کہ یہ سوال کرتے ہوئے اس کی نظریں میرے جسم کی پیمائش کر رہی ہیں... جیسے اندازہ لگا رہی ہوں کہ مضبوط شانوں والا یہ ایسا تازی کتا وزن کھینچنے کی استطاعت رکھتا ہے۔

”میں نے کچھ ہی عرصہ پہلے دفتری کام شروع کیا ہے۔“

مزاح پارے

1980

بیٹی: ”ماں! میں جینز پہنوں گی۔“

ماں: ”نہیں بیٹا، لوگ کیا کہیں گے؟“

2008ء

بیٹی: ”ماں! میں مٹی اسکرٹ پہنوں گی۔“

ماں: ”پہن لو بیٹی! کچھ تو پہن لو!“

☆...☆...☆

”ڈاکٹر صاحب! میرا علاج کریں۔ میرے ہاتھ

بہت زیادہ کانپتے ہیں۔“

”کیا تم بہت زیادہ شراب پیتے ہو؟“

”نہیں، زیادہ تر گر جاتی ہے۔“

☆...☆...☆

”میرا جگر دوست آ رہا ہے۔ یہ سونے کی چین کہیں

اندر چھپا دو!“

”کیوں، کیا تمھارا دوست چور ہے؟“

”نہیں، وہ اسے دیکھے گا تو پوچھ لے گا!“

☆...☆...☆

”آپ تو آج ڈاکٹر کے پاس جانے والے تھے!“

”یار! کل جاؤں گا۔ آج ذرا طبیعت ناساز ہے۔“

☆...☆...☆

تھکانا ڈاکٹر احمد نصیر

میں نے بتایا۔ ”اس سے پہلے میرا زیادہ تر وقت بیرون خانہ سرگرمیوں میں گزرتا تھا۔ کشتی رانی، سپیوں کی تلاش میں غوطہ خوری، پیراکی اور فٹ بال سمیت تمام کھیل۔“

میں دیکھ سکتا تھا کہ میری وضاحت اس حسینہ کے لیے کوئی خاص معنی نہیں رکھتی لیکن اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کہہ پاتا میں نے اس نوجوان کو اس طرف آتے دیکھا جس کے ساتھ یہ خاتون جہاز میں سوار ہوئی تھی۔ ایک اجنبی کے ساتھ اسے جو گفتگو کا کردہ ذرا بھی چراغ بان نہیں ہوا بلکہ وہ رک کر مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ خوش گواری کی مکمل طور پر ہم اور پرانگندہ تھی۔ اس کے ساتھ گزراے ہوئے چند منٹوں کے دوران میں مجھے ایسی کوئی علامت نہیں ملی جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ مجھ سے مل کر دلی طور پر مسرور ہوا ہے۔ یہ مسکراہٹ اس کے

جذبات کا اظہار نہیں، محض چہرے کا ایک رسی تاثر بھی جیسے کسی فوٹو گرافر نے کہا ہو ”ڈراما کر ایسے“ اور وہ مسکرا دیا ہو۔

وہ ہمارے پاس پہنچا تو خاتون سے اس کے تعلق کے خیال سے میں نے سر سے ہیٹ اتار لیکن وہ شاید اس طرح کا رسی اظہار نظم ضروری نہیں سمجھتا تھا اس نے ہاتھ بدستور پتلون کی جیبوں میں رہنے دینے نہ ہی تمباکو نوشی میں غفلت آنے دیا۔ حسینہ سے مخاطب ہو کر اس نے جو جملہ کہا وہ مجھے چونکا نے کے لیے کافی تھا۔ ”کیا تمہارے کمرے میں موجود مسہری پیتل کی ہے؟“ خاتون نے اثبات میں جواب دیا۔

”میرے کمرے میں بھی ہے۔ یہ لوگ اچھی آسائش فراہم کرتے ہیں، ہیں نا؟ وہ بھی صرف تین ڈالر میں! یہ کتنی رقم بنتی ہے؟“

”تین کا چار گنا، بارہ ہوا... لڑکی نے حساب لگایا۔ ”بارہ شانگ!“ اس نے گویا موضوع بدلنے کے لیے نوجوان کو میڈیسن اسکوائر سے بلند ہو کر آسمان کو چھوئی دو دھیا عمارت کی طرف متوجہ کر دیا۔ ”یہ نیویارک کی سب سے بلند عمارت ہے اسٹینس!“

وہ مسکرایا، گویا کسی اجنبی سے اس کی پہلی ملاقات کرائی جا رہی ہو۔ تاہم اس نے دل چسپی کا قطعاً اظہار نہیں کیا۔ ”اچھا!“ اس کے لہجے سے لگ رہا تھا اگر خاتون نے وہ ایک خرگوش ہے کہا ہوتا تب بھی اس کا کبیر رُخ مل ہوتا۔

اسی اثنا میں اصلی بارورڈرین والا نوجوان اچانک آن ڈکا۔ اس کا مزاج خاصا برہم دکھائی دے رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اسٹینس نے سنہری زلفوں والی حسینہ پر نظر ڈالتے ہوئے ہنکارا بھرا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا جیسے چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔ ”اوہ خدایا!“ وہ چلا یا۔ ”یہ اب کس بات پر پھرتا ہوا ہے؟ اس نے کہا تھا کہ جہاز چلنے کے بعد میں عرشے پر آ سکتا ہوں۔“

حسینہ میری طرف مڑی اور مٹھی سی مسکراہٹ کے ساتھ سرخم کر کے اسٹینس کو ساتھ لیے اس نوجوان سے ملاقات کے لیے آگے بڑھی۔ وہ انہیں اپنی طرف آتا دیکھ کر ٹھہر گیا۔ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو وہ ان سے خامی ناراضی بھرے لہجے میں بات کرنے لگا اور مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی کہ وہ اس دوران میں کھا جانے والی نظروں سے مسلسل مجھے گھورے جا رہا تھا۔

عین اسی وقت کینٹ نے میرا بازو کھینچا۔ ”نیچے چلو۔“ جوش اور ہیجان کی شدت سے اس کی آواز بھڑائی ہوئی تھی۔

”ہمارے سنسنی خیز ایڈیٹر کا آغاز ہو چکا ہے۔“ اس نے سرگوشی کی۔

کینٹ جانے کس سنسنی خیز ایڈیٹر کے بارے میں بتانے والا تھا، میرا ایڈیٹر تو پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ اس حسین خاتون سے ملاقات میری زندگی کا سب سے دلور انگیز واقعہ تھا اور اگرچہ کینٹ اور میں نے ایک دوسرے کو ہر ایڈیٹر میں شامل کرنے کا وعدہ کیا تھا تاہم میں اس معاملے کے بارے میں اسے ایک لفظ بھی بتانے کا روادار نہ تھا۔ مجھے بس تنہائی کی شدید طلب ہو رہی تھی جہاں میں اس سرخوشی سے پوری طرح محفوظ ہو سکوں۔ اپنے ذہن میں وہ ساری گفتگو دہراؤں کہ اس نے کیا کیا تھا اور میں نے کیا جواب دیا تھا۔ میں کسی کو اس میں شریک نہیں کر سکتا تھا۔ یہ سب بہت ہی محرک چیز تھا، تنہائی مقدس!

لیکن کینٹ اتنی آسانی سے جان چھوڑنے والا نہیں تھا۔ وہ مجھے کھینچتا ہوا ہمارے کمبل میں لے گیا اور دروازہ قفل کر دیا۔ ”میں معذرت چاہتا ہوں۔“ اس نے بات شروع کی۔ ”لیکن میں تمہیں اس ایڈیٹر میں شریک نہیں کر سکتا۔“ اس کا کٹہرہ میری سوچ سے اتنا مشابہ تھا کہ اچانک میرے دل میں

نا پسندیدہ خیال پیدا ہوا کہ شاید وہ بھی اس حسین خاتون میں دل چسپی لے رہا ہے، تاہم اس نے فوری میری غلط فہمی دور کر دی۔ ”میں نے کچھ سراغ دے کی ہے۔“ اس کی آواز دھیمی اور لرزش آمیز تھی۔ ”اور میں نے ایک حقیقی ایڈیٹر کی کھوج لگالی ہے۔ کچھ دھوکہ کی بنا پر میں تمہیں شریک نہیں کر سکتا لیکن یہ جیسے جیسے آگے بڑھے گا تم اس سے آگے بڑھو تو جاؤ گے۔“ وہ شاید نہ چاہتے ہوئے بھی بولے جا رہا تھا۔ ”وہ مجھے پہلے میں اپنا پاپ لینے آیا تھا۔ کڑی کھلی ہوئی تھی۔ باہر وہ ٹیبلٹ امریکی لڑکا موجود تھا جس نے مجھ سے دوتی کا گننے کی کوشش کی تھی۔ عین اسی وقت وہ سنہرے بالوں والی انگلستانی حسینہ اس دوسرے لڑکے کو ساتھ لیے وہاں آ گئی۔“ کینٹ نے اچانک اپنے آپ کو روکا۔ ”تم ابھی اسی سے بات کر رہے تھے نا؟“

کینٹ کی زبان سے اس لڑکی کا ذکر مجھے کھل رہا تھا لہذا اس کی زبان بند کرنے کے لیے میں نے مختصر کہا۔ ”وہ مجھ سے سنگر بلڈنگ کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔“

”اچھا؟ ہاں تو میں کہہ رہا تھا، یہ دونوں اشخاص ہمارے کمبل کی کڑی کے قریب کھڑے تھے۔ میں نے اپنے پاپ کی تلاش کے دوران میں اس امریکی لڑکے کی آواز سنی وہ کافی عرصے اور جوش میں کہہ رہا تھا۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا ہر سستی جہاز اور ریلوے

ایٹشن کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ تم لوگ اس وقت تک محفوظ نہیں ہو جب تک نیویارک سے دور نہیں چلے جاتے فوراً اپنے کمبلوں میں پہنچو اور وہیں تک محدود رہو۔“ اس پر انگلستانی لڑکے نے کہا۔ ”میں اس آنکھ بھولی سے تنگ آ چکا ہوں۔“

کینٹ نے اپنی بات میں ڈرامائی تاثر پیدا کرنے کے لیے توقف کیا۔ ”اچھا۔“ میں نے کہا۔ ”تو پھر اس میں کیا ہے؟“

”تم پوچھ رہے ہو اس میں کیا ہے؟“ وہ رحم بھری نظروں سے مجھ دیکھتے ہوئے چلا یا۔ ”اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ تم بھی ایڈیٹر سے دوچار نہیں ہوتے۔ یہ تو بالکل سامنے کی بات ہے۔ لوگ مفروضہ جرم ہیں۔ خصوصاً یہ انگلستانی لڑکا جسے لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھنے کوشش کی جا رہی ہے۔“

مجھے صرف اس پیاری سی لڑکی کی فکر تھی تاہم میں نے پوچھا۔ ”تمہارا مطلب وہ آئرستانی ہے اسٹینس کہتے ہیں؟“

”اسٹینس!“ کینٹ تقریباً چیخ کر کہنے لگا۔ ”کتنا عجیب نام ہے؟“

انتعجب کہ یہ حقیقی ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ کون جھلی نام ہے؟ کینٹ کی طرف سے آئرستانی خاتون کے ساتھیوں پر الزام تراشی مجھے بہت بری لگی۔ ان کی جگہ کسی اور کو بھی مورد الزام ٹھہرا جاتا تو میں فوری طور پر اس کی مخالف کرتا، لیکن یہ لڑکی ہے برا فرض نہ ہونا آسان نہیں تھا۔ میں کیسے فراموش کر سکتا تھا کہ وہ بے چارہ خود اپنے کھل کا غلام ہے جو اس کے ساتھ شعبہ بازی کرتا ہے اور اسے دوڑاتا رہا ہے۔ اب اگر وہ اسے معصوم لوگوں کے جرم ہونے کا یقین دلاتا ہے تو دوسری طرف زیر زمین ترین میں کسی خاتون کے لیے اپنی نشست چھوڑنے والے کینٹ کو یہ اعتقاد بھی عطا کرتا ہے کہ وہ خاتون دراصل ایک عظیم ہستی، ایک سماجی رہنما ہے جو غربت زدہ ملاقوں کے دکھ درد بانٹنے کے لیے جا رہی ہے۔

”یار جو!“ میں نے احتجاج کیا۔ ”وہ لوگ جرم نہیں ہیں۔ میں نے اس آئرستانی لڑکے سے بات کی ہے۔ اس میں اتنی قفل نہیں ہے جو کسی کو جرم بننے کے لیے درکار ہوتی ہے۔“

بلاتشبہ میں نے اس بات پر توجہ دی تھی اور مجھے یہ بھی یاد تھا کہ اسٹینس نے اس حسینہ کو کہا تھا۔ ”یہ اب کس بات پر پھرتا ہوا ہے؟ اس نے کہا تھا کہ جہاز چلنے کے بعد میں عرشے پر آ سکتا ہوں۔“

یہ الفاظ انہی باتوں کی تصدیق کر رہے تھے جو کینٹ نے سنی تھیں لیکن میں وہ سب بتا کر اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ”ہو سکتا ہے، وہ عدالت میں طلبی کا حکم نامہ وصول کرنے سے بچنا چاہتا ہو۔“ میں نے رائے پیش کی۔ ”شاید وہ یہ حیثیت گواہ مطلوب ہو۔ ممکن ہے، یہ دیوانی استغاثہ ہو یا اس کے ڈرائیور نے کسی کو گھر مار دی ہو۔“

کینٹ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”معاف کرنا۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن مجھے ڈر ہے کہ تم قوت خیل سے بے بہرہ ہو۔ وہ دونوں افراد بدعاش ہیں۔ خطرناک جرم اور وہ عورت ان کی ساتھی ہے۔ میں نہیں جانتا انھوں نے کس واردات کا ارتکاب کیا ہے لیکن میں پہلے اتنا کچھ جان چکا ہوں جو انھیں مشکوک کرداروں کی حیثیت سے گرفتار کرانے کے لیے کافی ہے۔“ لمحہ بھر کے توقف کے بعد اس نے ڈرامائی لہجے میں کہا۔ ”سنوٹان میں سے ہر ایک کے پاس اپنا عالی شان کمرہ ہے۔ امریکی کے کمرے کا نمبر چوبیس ہے۔ اس کی کڑی کھلی ہوئی تھی اور بستر پر ایک سوٹ کپڑے رکھا تھا۔ اس سوٹ کپڑے پر مالک کے نام کے ابتدائی الفاظ ایچ بی اے درج تھے۔ میں نے اپنے فرضی دوست کی تلاش کے بہانے جہاز کے مہتمم کے پاس موجود مسافروں کی فہرست کا جائزہ لیا تو چوبیس نمبر کمرے میں میٹھے شخص کا نام جیمز پریسٹن درج تھا۔ اب تم بتاؤ۔“ اس نے مطالبہ کیا۔ ”ان میں سے ایک فرضی نام کے عقب میں اپنی شناخت کیوں چھپا رہا ہے اور دوسرا لوگوں کی نظروں میں آنے سے کیوں بچنا چاہتا ہے؟“ اس نے حسب معمول میرے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ ”میں مسٹر ایچ بی اے عرف پریسٹن سے بات کرتا رہا ہوں۔“ اس نے بات جاری رکھی۔ ”میں نے پریسٹن کے سامنے اپنے آپ کو ایک اہم شخصیت ظاہر کیا ہے۔ میں نے اشارہ بتایا کہ میرے پاس بہت دولت ہے۔ اس کا مقصد...“ اس نے جلدی سے بات آگے بڑھائی۔ ”یہ ہے کہ میں ان کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتا تھا کہ وہ مجھ پر اپنے جتھہ کٹنے آزماں مجھے لوٹنے کی کوشش کریں تاکہ میں ثبوت حاصل کر سکوں۔ مزید یہ کہ...“ اس نے قدرے شرمندگی سے بتایا۔ ”میں نے اسے بتایا کہ تم بھی خاطر خواہ امیر اور قدرے اہم شخصیت ہو۔“



”مجھے ہولناک اور تباہ کن ہتھیار نظر آ رہے ہیں“

”ہم یہی تو جانا چاہتے ہیں۔“ آڈلرچ نے دانت کلکنا کر کہا۔ ”ہر حال، ہم نے آج رات کے لیے تم لوگوں کا ناک روک دیا ہے۔ تم کل پولیس کے سامنے اپنی صفائی پیش کر سکتے ہو! اور وہ تمہارا دوست...“ اس نے طعن بھرے لہجے میں کہا۔ ”وہ اس جہاز پر ہر ایک سے کہتا پھر رہا ہے کہ تم لاڈ آئیوی ہو۔ خود اپنے بارے میں بھی اس نے بے تحاشا دروغ گوئی کی ہے جو یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ وہ خود بھی جعل ساز ہے۔“

میری سمجھ میں پوری بات آگئی تھی دل چاہ رہا تھا کہ اپنے گھونٹوں سے معاملہ منشاؤں لیکن وقت کا تقاضا یہ تھا کہ اس احمق کینٹ کی جان بچانے کے دماغ استعمال کروں۔ میں نے بظاہر بے فکری سے قہقہہ لگایا اور ہتھم کی طرف مڑا۔ ”اوہ اچھا تو یہ بات ہے! مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا کہ یہ کینٹ کا کیا دھرا ہے۔“ تب میں آڈلرچ کی طرف مڑا۔ ”میرا دوست ہمیشہ مجھے علمی مذاق کا نشانہ بناتا رہتا ہے۔ وہ آپ سے بھی مذاق کر رہا ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ آپ لوگ کون ہیں۔“

”کیا واقعی؟“ آڈلرچ دھاڑا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کاغذ کا ایک پڑ نہ نکالا۔ ”نہ دیکھو۔ وہ اسے میری طرف لہراتے ہوئے چیخا۔ ”یہ اس وائرلیس پیغام کی نقل ہے جو میں نے ابھی نیو بریڈ فورڈ کے پولیس چیف کو بھیجا ہے۔“

وہ اطمینان بھرے لہجے میں بے آواز بلند پڑنے لگا۔ ”اس جہاز پر دو جعل ساز موجود ہیں جن میں سے ایک خود کو میرے ہونے والے بہنوئی لاڈ آئیوی کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے جب کہ دوسرا اس کا سیکرٹری بناؤا ہے۔ جب کہ عزت مآب لاڈ آئیوی بذات خود جہاز پر موجود ہیں۔ جہاز کے کنارے لگتے ہی ان گھنٹوں کی گرفتاری یقینی بنائی جائے۔ ہم خود استغاثہ دائر کریں گے۔ ہنری فلپ آڈلرچ۔“

کے ایک اہل کار نے پیغام دیا کہ جہاز کا ہتھم مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں ہتھم کے دفتر پہنچا تو اسٹپس اس کے امریکی دوست جہاز کے شینہ نگہ دار اور ہتھم کو وہاں جمع پایا۔ میرے پہنچنے پر اڈیٹر عمر ہتھم نے سر ہلا کر امریکی نوجوان کو بولنے کا اشارہ کیا۔ ”میرا نام ہنری فلپ آڈلرچ ہے۔“ اس نے جوشیلے اور اکھڑے لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ ”کیا تم اپنا نام بتاؤ گے؟“

اس کا لہجہ مجھے کچھ اچھا نہیں لگا۔ جب کہ ایک اجنبی کی طرف سے باز پرس کے لیے یوں مجرم کی طرح ہتھم کے دفتر میں طلب کیا جانا بھی مجھے سخت گراں گزرا تھا۔ ”آخر کیوں؟“ ”کیوں کہ...“ آڈلرچ نے کہا۔ ”ہمیں پتا چلا ہے کہ تم کئی ناموں کے مالک ہو۔ جن میں سے ایک نام اس معزز شخص کا بھی ہے۔“ اس نے اسٹپس کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ ان کا نام کیوں بتا دیا کر رہے ہو؟“ میں نے اسٹپس کی طرف دیکھ کر اس نے مجھے اسی ہتھم مسکراہٹ سے نوازا جو وہ عادتاً چہرے پر سجائے رکھتا۔ لیکن آڈلرچ کی طرف سے سرزنش بھری نظروں سے گھورے جانے پر اس نے غصے سے ہونٹ سکڑ لیں۔

”میں نے اپنے ذاتی نام کے علاوہ کبھی کوئی اور نام استعمال نہیں کیا۔“ میں نے کہا۔ ”اور مزید یہ کہ...“ میں نے خود کو گوار لہجے میں بات آگے بڑھائی۔ ”اگر مجھے کوئی نام بتھیا تو وہ ہوتا تو وہ کم از کم اسٹپس جیسا مضحکہ خیز نام ہرگز نہ ہوتا۔“

آڈلرچ کا تو جیسے کسی نے سانس کھینچ لیا ہو۔ ”ان کا نام اسٹپس نہیں ہے!“ وہ زہری سے چیخا۔ ”یہ آئیوی ریاست کے جانشین ہیں۔“

اسے توقع رہی ہوگی کہ میں بے سن کر بھونچکا رہ جاؤں گا اور مجھے واقعی حیرت ہوئی تھی۔ میں نے دل چسپی بھری نظروں سے آڑستانی نواب زادے کو دیکھا۔ آڈلرچ نے میری خاموشی کا غلط مطلب نکالا اور فاتحانہ لہجے میں جس میں خوش گواری کی جھلک تک نہیں تھی، مجھے جھڑکا۔ ”تو کچھ سمجھ میں آیا تمہارے؟“ اس نے اپنے مخصوص انداز میں دانت کوسے۔ ”اگر تمہیں آئیوی کے ولی عہد کا نام ہی چرانا تھا تو کم از کم جہاز تو کوئی اور منتخب کرنا چاہیے تھا۔“

معاملہ اتنا عجیب و غریب تھا کہ میرے غصے پر حیرت غالب آگئی۔ میں نے قہقہے سے کہا۔ ”لیکن مجھے لاڈ آئیوی کا نام اپنانے کی ضرورت کیا ہے؟“

میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اگر تم اپنے طور پر ایک ایڈیٹر کی خواہش رکھتے ہو تو اس کے ساتھیوں کی گرفتاری کے دوران میں اسے فرار ہونے میں مدد دے سکتے ہو۔“ ”تمہاری طرف سے اس کے لیے مجرموں کی ساتھی کی اصطلاح استعمال کرنے پر مجھے سخت اعتراض ہے۔“ میں چیخا۔ ”اور بالفرض محال اگر وہ لوگ مجرم ہیں بھی تو انہیں گرفتار کرانے سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟“

کینٹ کی نظریں جوش سے چمک اٹھیں۔ ”ذرا اخبارات کے بارے میں سوچو اس گرفتاری کی خبروں سے بھرے ہوئے ہوں گے۔“ اس کا خیال اسے اخبارات کی شہ سرخیاں دکھا رہا تھا۔ ”ذہانت آمیز کارنامہ... نیویارک پولیس کی آنکھوں میں دھول بھونک کر فرار ہونے والا مجرموں کا مشہور گروہ فوربز کینٹ کی حاضر دماغی کے نتیجے میں گرفتار!“ اس کے لہجے میں حسرت نمایاں تھی۔ ”ہو سکتا ہے، وہ میری تصویر بھی چھاپ دیں۔“ مجھے کینٹ پر شدید غصہ آنا چاہیے تھا لیکن درحقیقت اس کی ذہنی کیفیت پر دم آ رہا تھا۔ میں اسے ایک سال سے جانتا تھا اور اس دوران میں مجھے ادراک ہوا تھا کہ اس کی آزمائشی ہمیشہ معصوم ہوا کرتی ہے۔

”جو!“ میں نے کہا۔ ”تم اپنے آپ کو بہت بڑی مشکل میں ڈالنے والے ہو۔ اگرچہ میں تمہارے اس ایڈیٹر میں شامل نہیں ہوں تاہم تم جانتے ہو کہ اگلے تمہاری کوئی مدد کر سکا تو ضرور کروں گا۔“

اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔ وہ دلال نے جہاز کی طعام گاہ کا رخ کیا۔ وہاں ہمیں ایک قریبی بیڑ پر وہ جہاز اسٹپس اور امریکی نوجوان سمیت براہمن نظر آئی۔ ”مجھے یہاں سے لے لوں پرا ایک بائپر مسکراہٹ نمودار ہوئی تاہم اب اس کے ہتھم میں شک و شبہ کی جھلک تھی۔ جب کہ اس کے برعکس امریکی نوجوان کے ذہن میں کبھی بھی طرح کا اشتباہ باقی نہیں تھا۔ وہ دانت کوسے خوں خوار نظروں سے مجھے اور کینٹ کو گھور رہا تھا جیسے موقع ملے ہی بھاڑ کھائے گا۔“

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد کینٹ میرے روکنے کے باوجود امریکی نوجوان سے گپ شپ کرنے پہنچ گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس کی زبان کھلوانے کی کوشش کرے گا۔ شاید کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔ میں انہیں ایک ساتھ بیٹھا چھوڑ کر اپنے کیمین میں آ گیا۔

لگ بھگ ایک گھنٹے بعد جب میں کیمین میں تباہ تھا جہاز

مجھے اس لڑکی کا خیال آیا اور شرمندگی نے مجھے گھیرے میں لے لیا۔

”تم نے بہت غلط حرکت کی۔“ میں چلایا۔ ”تمہیں ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ تمہاری غلط بیانی ہم دونوں کو کسی ناخوش گوار صورت حال سے دوچار کر سکتی ہے۔“ ”تم کسی بھی طرح اس معاملے میں ملوث نہیں ہو۔“ کینٹ نے احتجاج کیا۔ ”نیو بریڈ فورڈ پہنچنے پر تم جہاز سے کھسک جانا اور ہول میں میرا انتظار کرنا! ان بد معاشرلوں سے نمٹ کر میں تم سے آن ملوں گا۔“

”نمٹ کر؟“ میں چلایا۔ ”تم ان کے ساتھ کیا کرنے والے ہو؟“ ”انہیں گرفتار کرواؤں گا۔“ کینٹ نے ٹھوس لہجے میں بتایا۔ ”جیسے ہی ہم گودی پر پہنچیں گے، پولیس ان کی منتظر ہوگی۔“ ”تم ایسا نہیں کر سکتے!“ میں نے کہا۔

”میں ایسا کر چکا ہوں!“ کینٹ نے جواب دیا۔ ”انہیں گرفتار سمجھو۔ میں نے نیو بریڈ فورڈ کے پولیس چیف کو اطلاع بھیج دی ہے...“ اس کے لہجے میں بلا کا تقاضا تھا۔ ”کہ گودی پر مجھ سے ملو۔ میں نے وائرلیس کا استعمال کیا ہے۔ یہ رہا میری طرف سے بھیجا گیا پیغام!“

اس نے جیب سے ایک زقہ برآمد کیا اور بلند ڈرامائی لہجے میں پڑھنے لگا۔ ”بگ ایرو جہاز کی آمد کے وقت گودی پر مجھ سے ملو۔ نیویارک پولیس سے فرار ہونے والے دو معروف مجرم جہاز پر موجود ہیں۔ میں ذاتی طور پر ان کے خلاف الزامات عائد کروں گا۔ فوربز کینٹ۔“

میں حیران کے ریلے سے ابھر تو سخت احتجاج کیا۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اس کا طرز عمل حد درجہ نامعقول اور اشتعال انگیز ہے اور اس طرح کے سطحی بیوقوف کی بنیاد پر اتنے سنگین الزامات عائد کر کے وہ دہشت گردیوں کو دوسرے دے رہا ہے۔

یہ سب سن کر وہ ذرا بھی نہ گھبرا یا۔ ”تو میں یہ سمجھوں۔“ اس نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ ”کہ تم ان کے خلاف کارروائی میں حصہ نہیں لینا چاہتے!“

”ان حقائق سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ تمہیں اس نیک دل خاتون کو پریشان کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اپنی خیریت چاہتے ہو تو ابھی پولیس کو بتا کر وہ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔“ ”میں ان محترمہ کو گرفتار کرانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔“ کینٹ نے سخت لہجے میں کہا۔ ”میں نے اپنے پیغام

مجھے ادراک ہوا کہ یکے بعد دیگرے دو عدد سنی خیز پیغامات کی وصولی اور علی الصباح چھ بجے بسز چھوڑ کر گودی پر جہاز کے استقبال کی زحمت نے پولیس چیف کی ذہنی حالت اتنی ابتر کر دی ہوگی کہ کسی کو بھی گرفتار کر کے جیل میں پھینکنے سے گریز نہیں کرے گا۔ اور اس حوالے سے اس کا انتخاب یقیناً میں اور کینٹ ہوں گے۔ لاکھ احقنا نہ ہی لیکن یہ سب ہمارے لیے شدید شرمندگی کا باعث بن سکتا تھا۔ لہذا میں لاارڈ آئیوی سے مخاطب ہوا۔ ”یہ سب سراسر غلطی کا نتیجہ ہے۔ آپ مسٹر کینٹ کو بلاو! میں تب تک میں معاملے کی وضاحت کرتا ہوں۔“

لاارڈ آئیوی نے جو اس دوران میں شدید بیزاری کا شکار ہو چکا تھا، مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔ لیکن آڈریج کوئی گنجائش چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے طنز بھرا قہقہہ لگایا۔ ”مسٹر کینٹ اپنے عین میں ہیں جب کہ ایک اہل کار دروازے اور کھڑکی کی نگرانی کر رہا ہے۔ تم کل پولیس کے سامنے وضاحت کر سکتے ہو۔“ میں برہم ہو کر ہتھم کی طرف مڑا۔ ”کیا تم نے مسٹر کینٹ کو کیمن میں قیدی بنا کر رکھا ہوا ہے؟ کیا تم جانتے ہو جس بے جا کے بارے میں قانون کیا کہتا ہے؟“

”انہیں وہاں پابند نہیں کیا گیا ہے۔“ ہتھم نے دفاعی لہجے میں کہا۔ ”جب انہیں پتا چلا کہ اہل کار ان کا پیچھا کر رہے ہیں تو وہ اپنے کیمن میں چلے گئے۔“

”میں ابھی جا کر اس سے ملتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اور اگر میں نے کسی کو اپنا پیچھا کرتے پکڑ لیا تو اٹھا کر پانی میں پھینک دوں گا۔“

کسی نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ انہیں یہ خوبی علم تھا کہ میں فرار نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ لوگ تو میری روانگی سے خوش دکھائی دے رہے تھے۔ میں کیمن میں پہنچا۔ کینٹ برتھ کے کنارے پر بیٹھا تھا اور اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے ایک دل سو آواز کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ اس کی آنکھوں سے ہلکی مسکینی چیخ چیخ کر اٹھ کر رہی تھی کہ میں اس پر غصہ نہ اتاروں۔ اس نے فریاد کے انداز میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے بات شروع کی۔ ”مجھے کیا غیب سے پتا چلا کہ وہ سرخ بالوں والا چھوٹا لاارڈ آئیوی اور وہ لمبی لڑکی ایڈیویا ہے؟“

”آخرو کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔ کینٹ نے اس وقت بھی بیٹھ پکڑ رکھا تھا۔ اس نے وہ سر سے اتار کر زمین پر پٹخ دیا۔ ”یہ سب اس لعنتی بیٹ کا کیا دھرا ہے۔“ وہ چلا۔ ”یہ درست سہی کہ یہ رہن بارورڈ یونیورسٹی

کا ہی ہے، لیکن مجھے یہ یوں بتانا کہ اسے یونیورسٹی کی کشتی رانی کی ٹیم کے ارکان ہی پہن سکتے ہیں؟ میں نے بھانپ لیا کہ آڈریج اسے انجمن بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے اور جب اس نے کہا۔ ”اچھا، تو تم یونیورسٹی کی کشتی رانی کی ٹیم میں ہو؟ تو میں نے اندازہ لگایا کہ اس کے کہنے کا مطلب کیا ہے۔ میں نے کہا۔ ”میں پچھلے سال کی ٹیم میں تھا، میری بد قسمتی دیکھو وہ خود گزشتہ سال کی ٹیم میں نہ صرف شامل تھا بلکہ اس کا کپتان تھا۔ اس بات نے اسے مشکوک کر دیا اور کھانے کے بعد اس نے مجھ پر سوالات کی بوچھا کر دی۔ میرے جوابات یقیناً غیر اطمینان بخش رہے ہوں گے کیوں کہ وہ اچانک اچھل کر کھڑا ہو گیا اور مجھے دھوکے باز اور جعل ساز جیسے القابات سے نوازنے لگا۔ میں نے جوابی کارروائی کرتے ہوئے کہا کہ وہ خود مجرم ہے اور میں ایک سراغ رس، نیز میں نے اس کی گرفتاری کے لیے بد ذریعہ وائرلیس نیو بریڈ فورڈ پیغام بھجوادیا ہے۔ اس نے مجھے قہقہے کیا کہ میں سراغ رس ہونے کا ثبوت پیش کروں جو ظاہر ہے میں پیش نہیں کر سکا۔ اس نے دو اہل کاروں کو کر کے انہیں مجھ پر نگاہ رکھنے کو کہا اور خود ہتھم کے پاس چلا گیا۔ نگرانی میں رہنا میری طبیعت پر گراں گزرتا ہے، لہذا میں یہاں چلا آیا۔“

”تم نے اسے کب کہا کہ میں لاارڈ آئیوی ہوں؟“

وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ”یہ جہاز کی روانگی سے پہلے کی بات ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”یہ شخص ایک مذاق تھا۔ وہ میری باتوں میں دل چسپی اٹھانے لے رہا تھا، میں نے سوچا کہ اگر میں خود کو لاارڈ آئیوی کا دوست بتاؤں تو میرے دل میں آجائے گا۔ اسی وقت تم میرے سامنے سے گئے۔ تم نے لہجہ انداز یا دماغ سازش کہا کرتی ہے کہ تم انگلستانی نواب زادے لگتے ہو۔ چنانچہ میں نے تمہاری طرف اشارہ کر کے کہا۔“

”میرا دوست لاارڈ آئیوی!“ میں نے خود کو تھاراکس لڑی بتایا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اب میری بات گہری دل چسپی سے سن رہا تھا، اور۔۔۔ اس نے مسلسل لہجے میں بات آگے بڑھائی۔ ”میں کچھ زیادہ ہی یوں لگا تھا۔ مجھے افسوس ہے، تمہیں خواہ وہ شدید مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا۔“ اچانک اس کی آنکھوں میں امید کی کرن چمکی۔ ”لیکن اگر ہم فرار ہوں تو میں کامیاب ہو جائیں تو جان بچ سکتی ہے۔“ اس نے سرگوشی کی۔

”میں کچھ میں بھی سوچ رہا تھا لیکن یہ خیال خاصا بے فائدہ تھا اور ناقابل عمل بھی۔ میں جانتا تھا ہم طلوع آفتاب تک

متحرک جیل میں مقید ہیں جس کے بعد ہمیں ایک بے حد شرمناک اور توہین آمیز سب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اخبارات لاارڈ آئیوی سے متعلق کسی بھی بات کو خبر کا روپ دے کر نمک مرچ لگا کر شائع کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ بھیا یک شہ سرخیاں میرے ذہن میں گردش کرنے لگیں۔ فیئر پورٹ میں میرے والدین کیا سوچیں گے میرے دوست کیا رائے قائم کریں گے؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جو اس اینڈ کاربی والے کیا کارروائی عمل میں لائیں گے؟ جعل سازی کی حیثیت سے گرفتاری کے بعد میرے باہر قانون اور دھوکا کی انجمن کا مرکز بننے کے بھلا کتنے امکانات باقی نہیں گے؟ تاہم مجھے احساس ہوا کہ مجھے فی الوقت سب سے زیادہ قلق اس بات کا ہے کہ وہ عورت شامل خاتون مجھے جیل باز یا کم از کم بے وقوف سمجھے گی۔ اس خیال نے مجھے ہڈت اضرب سے آہستہ پختہ ہو کر دیا۔

رات گرم اور کمرزدہ تھی۔ اگر کینٹ کو مجھے چھوڑ جانا ممکن ہوتا تو میں جہاز سے چھلانگ لگا دیتا اور تیرتا ہوا تانہ منارے تک پہنچ جاتا۔ بچپن سے جوانی تک کا تمام عرصہ، کسی بھی طرح پانی میں گزارنے والے مجھ جیسے شخص کو یہ مختصر سفر جگہ کا غسل محسوس دیتا۔ لیکن میں کینٹ سے پہلو تہی کے بارے میں سوچ بھی نہیں کرتا تھا۔

”کیا تم سکتے ہو؟“ میں نے موہوم امید کے سہارے

پوچھا۔ ”ہرگز نہیں!“ میں نے رنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ”مزید برآں، ہمارے سوٹ کیسوں پر ہمارے اصل نام درج ہیں، انہیں انہیں ساتھ نہیں لے جاسکتے اور انہیں پتا چل جائے گا کہ ہم کون ہیں۔“ اچانک اس کے لہجے میں جوش و بے تابی آئی۔ ”لیکن اگر ہم جہاز کی دوکریوں سے منسلک جان ہانے والی کشتیوں میں سے کوئی ایک پڑائیں۔۔۔ ہم اپنے ساتھ کیس اس میں چھپا دیں گے، اور جب سب لوگ سو جائیں گے تو ہم اسے پانی میں اتار کے۔۔۔“

جہاز پر موجود سب سے چھوٹی کشتی بھی پچیس افراد کا بوجھ اٹھانے کی استطاعت رکھتی تھی اور کرین چلا کر اسے پانی میں اتارنے کا مطلب پورے جہاز کو بیدار کرنا تھا۔ میں نے کینٹ کا ہاتھ دھس دیا۔

”اعتراضات نہ اٹھاؤ۔“ کینٹ نے جھنجھلاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ اس کی سیمائی فطرت ایک بار پھر بیدار ہو رہی تھی۔ ”یہ شدید خطرے کے احساس نے گویا اس میں نیا ولولہ پیدا

کر دیا تھا۔ ”سوچو!“ اس نے حکم دیا۔ ”کوئی ایسی ترکیب کوئی ایسا راستہ جس کے ذریعے ہم نیو بریڈ فورڈ پہنچنے سے پہلے جہاز سے فرار ہو سکیں۔ ہر صورت میں! ہمیں کسی قیمت پر گرفتار نہیں ہونا ہے۔ یہ ہمارے لیے بے حد تباہ کن ہوگا۔“

مجھی اس نے بیجان آمیز نغزے کے ساتھ اپنی ہی بات کاٹ دی۔ ”مجھے راستہ مل گیا۔“ اچانک اس کی چیخ سرگوشی میں بدل گئی۔ ”میں آگ لگنے کا الارم بجادوں گا، عملے کے ارکان رہائشی کمروں کی طرف دوڑ پڑیں گے، کشتیاں پانی میں لٹکانی جائیں گی۔ ہم ان میں سے ایک کی رسی کاٹ کر پانی میں گرا دیں، وہ جہاز سے الگ ہو کر بہنے لگے گی۔“ افراتفری میں۔۔۔

اس کی قوت تخیل خدا جانے کیا نقشہ کھینچنے والی تھی لیکن عین اسی وقت جو کچھ وہ منامو آواز افراتفری سے بھی کچھ بڑھ کے تھا۔ پہلے تو ہم نے ایک دہشت بھری انسانی چیخ سنی۔ پھر بہت سے چیخنے چلائے، تو ادیلہ چچائے لوگوں کے دوڑتے قدموں کا شور ابھرا۔ پھر جہاز کو اتارنے زور کا دھچکا لگا کہ ہم فرش پر گر پڑے۔ تین دھات اور لکڑی کے ٹکڑے، گڑھانے اور ٹوٹنے کی مہیب کڑکڑاہٹ، چرچاہٹ اور گڑگڑاہٹ سارے شور پر غالب آ گئی۔ یوں لگا کوئی جلتی ہوئی بلند فطرت زمیں یوں ہو گئی ہو۔ اگلے ہی لمحے کسی جہاز کے اگلے سرے پر نصب ضخیم چوبی بانس کھڑکی کے راستے ہمارے کیمن میں گھس آیا۔ کیمن میں بس اتنی جگہ باقی بچی تھی کہ میں کینٹ کو بوج کر دروازے سے نکل سکوں۔ وہ ابھی تک گھٹنوں کے بل پڑا تھا۔ میں اسے کھینچ کر راہ داری میں لے گیا۔ اس نے ایستادہ ہوتے ہی دونوں ہاتھوں سے سر ختم کیا۔ ”میرا ہیٹ کہاں ہے؟“ وہ چلا یا۔ میں سن سکتا تھا کہ جہاز کے زیریں عرشوں میں پانی بھرتا جا رہا ہے اور اپنی راہ میں آنے والے سامان اور ٹوکوں کو دھلیانے آگے بڑھ رہا ہے۔ ایک جنگل میں بندھا گھوڑا اہل بال کسی انسان کی طرح چلا رہا تھا۔ جب کہ بہت سے انسان بالکل جانوروں کی طرح چیخ پکار کر رہے تھے۔ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوتے ہی مجھے سب سے پہلے اسی دل آرام حسینہ کا خیال آیا۔ میں نے کینٹ کا بازو چھوڑا۔ شور و غوغا اتنا بلند تھا کہ اس کے کانوں تک آواز پہنچانے کے لیے مجھے بھی چننا پڑا۔ ”لاارڈ آئیوی کا کیمن کہاں ہے؟“ اس نے نہ سمجھنے والی نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا۔ ”تم نے بتایا تھا کہ اس کی بہن کے کیمن کے ساتھ ہے۔ مجھے وہاں لے چلو۔“

ایس فیض سے ہم نے ایک دفعہ یہ ضرور پوچھا تھا کہ اپنے میاں کو ہر وقت حسناؤں اور مداحوں کے جھرمٹ میں دیکھ کر وہ رشک و حسد کا شکار تو ضرور ہوتی ہوں گی مگر ان کا کہنا تھا ”حمید! شاعر عشق نہیں کرے گا تو کیا ورنہ رش کرے گا؟“

پرسش احوال از حمید اختر مطالعہ: اسلم ملک

چغتائی آواز سنائی دی۔ ”میں کہے دیتا ہوں۔“ کوئی چیخ رہا تھا۔ ”تم لوگوں کو لاارڈ آئیوی کو تلاش کرنا ہوگا۔ اگر لاارڈ کو کچھ ہوگا۔“ ”بھاڑ میں گیا تمہارا لاارڈ۔“ کسی نے اکھڑا مری کی لہجے میں کہا۔

لیڈی مویانس پڑی۔ ”نچلے عرشے پر چلیں۔“ میں نے زور دے کر کہا۔ ”میں رشتہ لینے جا رہا ہوں۔“ میں نے جنگلے سے اترتے ہوئے لاارڈ آئیوی کی آواز سنی۔ ”میں دل کو تلاش کر کے تمہیں ملتا ہوں۔“ میں جنگلے کے راستے نچلے عرشے پر اترتا اور پانی میں چھلانگ لگادی۔ دو چار لمبے ہاتھ مار کے میں تنک تک پہنچ گیا اور جسم جھلا کر بازوؤں کے زور پر اس کے اندر اتر گیا۔ میں نے چپو سنبھالے اور اسے بگ ابرو کی طرف کھینے لگا۔ میں عقبی دنبالے کے نیچے پہنچا تو کینٹ کی لاکر سنائی دی۔ ”خواتین پہلے۔ میرا مطلب ہے عزت مآب خاتون پہلے۔“ اس نے اپنی تکی کی۔

اپنے خیال کے مطابق ایک ڈوبتے جہاز سے رخصت ہوتے ہوئے بھی کینٹ اخلاقی آداب فراموش نہیں کر سکا تھا لیکن عالی نسب آلڈریج بظاہر اپنی اقدار پس پشت ڈال چکا تھا۔ میں نے اسے بے قراری سے چیختے سنا۔ ”میں اہت بھیجتا ہوں ان کی لاائی ہوئی کٹی پر۔“

میں نے لیڈی مویا کے ہنسنے کی آواز سنی۔ ”اگر نہیں جاؤ گے تو ڈوب جاؤ گے۔“ اس نے کہا۔ میں نے جنگلے پر ایک سیاہ ہولا معلق دیکھا۔ ”کشتی کو ساکت رکھو۔“ اگلے ہی لمحے وہ کسی ہلکی ہلکی گہری کی طرح کشتی میں کودی اور لڑکھڑا کر میری ہاتھوں میں سا گئی۔

ایک بار پھر آلڈریج کی غصے بھری آواز سنائی دی۔ ”ان

لائف جیکٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ ڈھیر ہو گیا۔ عین اسی وقت مجھے بہت قریب سے کسی کا جھیمکا لیں۔ ”شان دارشانہ عین بدف پر۔“ تمہیں یہ سب دفتر میں کھینے کا موقع بھی نہ مل پاتا۔“

میں نے پلٹ کے دیکھا تو چند قدم کے فاصلے پر لیڈی مویا دکھائی دی۔ میں نے لائف جیکٹ پناہ گزین خاتون کی طرف اچھال دی اور ایسی بے باکی سے جیسے میں ساری زندگی سے اسے جانتا ہوں لیڈی مویا کا بازو دیکڑا اور اسے اپنے عرشے کی طرف کھینچ کر لے جانے لگا۔ ”تم میرے ساتھ چلو۔“ مجھے احساس ہوا کہ میں لرز رہا ہوں اور فکر کا بھاری بوجھ میرے سر پر تھا۔ مجھے ادراک بھی نہیں تھا میرے ثنائوں سے اتر گیا۔ ”اور یہ کہ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے جسے میں کھینچنے جا رہا ہوں۔“ ”خدا شکر ہے!“ میں نے کہا۔ ”میں سمجھا تھا میں تمہیں کھو بیٹھا ہوں۔“

”مجھے کھو بیٹھے ہو!“ لیڈی مویا نے میری بات پر اٹھ کر کہا۔ ”تاہم اس نے مزید تبصرہ نہیں کیا۔“ مجھے اپنا بھائی تلاش کرنا ہے۔“

”تمہیں ہر صورت میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“ میں نے حکم دیا۔ ”میں اپنے عرشے پر مسٹر کینٹ کے پاس پہنچوں۔ میں ایک کشتی کے قریب دنبالے کے نیچے لاؤں گا۔ تمہیں اس میں چھلانگ لگانی ہوگی۔“

”میں اپنے بھائی کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔“ لیڈی مویا نے بے چلک لہجے میں کہا۔ اس کی بات ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اس میں کھم کھم گھٹا بگم بجوم نے اچانک لاارڈ آئیوی عرف ٹیس کو اگل کر ہماری طرف دھکیل دیا۔ اس کی بہن کے حلق سے اطمینان بھری چیخ برآمد ہوئی۔

”اسٹپس نے اپنا توازن بحال کیا اور ہٹیکے بے کی طرح لڑکھڑائی۔“ ”میں تو سمجھا تھا کہ زندہ نکل نہیں پاؤں گا۔“ اس نے ہل انگاری سے تبصرہ کیا۔ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ”میں مجھے یقین وہاں مہم سرگاہٹ کھیل رہی ہوگی۔“

اس کی بہن نے کشتی کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ شریف اڈی اس کشتی کو یہاں لاکر ہمیں یہاں سے نکال دے جائے گا۔“ اس نے کہا۔ ”میں جلد از جلد جہاز چھوڑ دینا چاہیے۔“

”بالکل ٹھیک!“ اسٹپس نے ہڈ جوش لہجے میں کہا۔

لیکن دل کا کیا ہوگا؟ وہ میرے آس پاس ہی کہیں تھا۔ اسٹپس کا جملہ پورا ہوتے ہی چند قدم کے فاصلے سے ایک

تین ارکان ایک چھوٹی کشتی عرشے سے پانی میں اتارنے والی دے۔ انھوں نے چھوڑ کی دو چوڑیاں اور بادبان کشتی میں پھینکا اور ان تینوں میں ایک پھسل کر اترنے لگا۔ عین اسی وقت مال بردار جہاز نے مست ہاتھی کی طرح زوردار ہچکولہ لگایا۔ تینوں ملاح بری طرح بدحواس ہو گئے اور انھوں نے ہمارے جہاز کے زیریں عرشے پر چھلانگ لگادی۔ ان کی اتاری ہوئی کشتی لاوارث ہو کر دونوں جہازوں کے درمیان ہلکورے لپٹ گئی۔ میرے ساتھ یہ منظر دیکھنے والے کینٹ نے میرا ہاتھ جکڑ لیا۔ ”یہی ہے!“ اس نے ہجیان آ میز لہجے میں سرگوشی کی۔ ”یہی ہے ہمارے فرار ہونے کا موقع!“

میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ کشتی دو تو کیا، تین افراد کا بوجھ بھی آسانی سہا سکتی ہے اور میں پہلے ہی ذہن بٹا چکا تھا کہ وہ تیسرا مسافر کون ہوگا۔

”تم یہیں ٹھہرو۔“ میں نے کہا۔ بگ ابرو جہاز پر بہت سے غیر ملکی پناہ گزین بھی تھے جنہیں اسی سہ پہر راست سے رہا کیا گیا تھا۔ ان تینوں میں سے جہاز سے اتارے جانے سے پہلے ہی ان پر قابض ہو گئے تھے۔ کشتیاں صرف خالی حالت میں ہی پانی میں اتاری جاسکتی تھیں، لہذا جہاز کے عملے نے انھیں کشتیوں سے اتارنا چاہا۔

حقیقت سے ناواقفیت کی بنا پر وہ سمجھ کر آدھ پیکار ہو گئے۔ دیگر مسافروں کی جان بچانے کے لیے انھیں قربانی کا بکرا بنایا جا رہا ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی جان بچانے کے لیے لڑ رہا تھا۔ کشتی میں نے دیکھا کہ دو خواتین اس کھینچا پانی کے درمیان زمیں بوس ہو چکی ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں پل کر ہلاک ہو جاتیں، میں نے انھیں کھینچ کر باہر نکال لیا۔ تاہم ان دونوں میں سے کوئی بھی وہ کشتی نہیں تھی جسے میں تلاش کر رہا تھا۔ نیم تاریکی میں میری نظر ایک بے گناہ پناہ گزین پر پڑی جو اپنی ایک ہم وطن خاتون سے لائف جیکٹ چھیننے کے لیے زور آزمائی کر رہا تھا۔ اسی اثنا میں جہاز کے اگلے میں کوئلہ ڈالنے والا ایک مشیندہ کہیں سے دوڑتا آیا اور ان دونوں سے لائف جیکٹ اُچک کر جنگلے کی طرف پکا۔ میں نے آگے بڑھ کے جیکٹ اس سے چھین لی۔ وہ مجھ سے طاقت آزمائی کرنے لگا۔ وہ اس دوران میں مسلسل جھلا رہا تھا۔ ”اپنا ہاتھ سب کی اپنی ڈس داری!“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے غصے اور جوش سے کہا۔ ”تو اسے آپ کو بچاؤ۔“ اگلے ہی لمحے میرا گھونسا اس کی ٹھوڑی پر پڑا۔

کینٹ نے ہاں میں سر ہلایا اور ایک راہ داری میں دوڑنے لگا جو ایک برآمدے میں کھلتی تھی۔ سامنے تین کیمین دکھائی دیے۔ تمام دروازے کھلے ہوئے تھے۔ میں نے باری باری اندر جھانکا۔ میں نے دیکھا کہ کیمین خالی ہیں اور کسی نے بستر وں کو چھوا تک نہیں ہے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ ابھی تک اوپری عرشے پر ہوگی۔ مجھے ہر قیمت پر اسے ڈھونڈنا تھا۔ ہم دونوں عرشے پر جانے والے ایک زینے کی طرف دوڑے۔

”سب سے پہلے خواتین اور اطفال“ کینٹ آواز لگا جاتا رہا تھا۔ ”خواتین اور بچے کا پہلا حق ہے۔“ ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے وہ مشینی انداز میں دہرائے جا رہا تھا۔ عین اسی وقت برقی قمتے بجھ گئے۔ تیل کے لیمپوں کے علاوہ پورے جہاز پر اندھیرا چھا گیا۔ بہت سے افراد جو بستر پر جا چکے تھے اب عجیب و غریب حلیوں میں اپنے کیمینوں سے برآمد ہو رہے تھے۔ انھوں نے زندگی بچانے والی جنگلیں اور پکڑوں سے بھرے بیگ ہاتھوں میں اٹھا رکھے تھے۔ ایک شخص نے بائیں ہاتھ میں اسٹف کا گھیرا اور دائیں ہاتھ میں چھتری اٹھا رکھی تھی جس سے وہ راستے میں حامل مسافروں کو پیٹا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے ایک خاتون کے سر پر ضرب لگائی تو مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ میرے گھونٹنے نے اسے ڈھیر کر دیا۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اوپلا کرنے لگا۔

ہم بالائی عرشے پر پہنچے تو وہاں قیامت صفری پچاتی۔ جہاز کے دنبالے پر مسافروں کا ہجوم پرچم برقی سے چٹنا ہوا تھا۔ جہاز کا عملہ کیمینوں کی مدد سے کشتیوں کو دونوں طرف کے جنگلوں کے اوپر سے اٹھا کر جہاز کے پہلووں سے نیچے اتارنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن تمام کشتیوں کو جونی افراد کے غول کے غول گھیرے میں لیے کھڑے تھے۔ وہ دیوانہ وار آپس میں ہاتھ پائی اور دھینکا مشقت میں مگن تھے۔

جہاز کے عرشے کے دفنی جنگلے کے اوپر چار مستولوں والے ایک مال بردار جہاز کا سامنے والا حصہ سا مگن تھا۔ وہ دیو قامت جہاز پورے زور سے ہمارے جہاز سے ٹکرا رہا تھا اور اس کے اگلے حصے میں اتنا بڑا سوراخ دکھائی دے رہا تھا جس سے اچھی خاصی بڑی کشتی گزاری جاسکتی تھی۔ اس رخنے سے پانی تیزی سے جہاز میں داخل ہو رہا تھا اور صاف نظر آ رہا تھا کہ اسے غرق ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ اس کا عقبی دنبالہ پہلے ہی جھٹکنے لگا تھا۔

اس جہاز پر لہراتی ایک لائین کی روشنی میں مجھے عملے کے

”یہ بات سمجھ لو۔“ وہ ہانپتے ہوئے چلا یا۔ ”میں احتجاج کے تحت یہاں آ پا ہوں، وہ بھی تمھاری اور اسٹیمپس کی حفاظت کی

انداز کے مطابق ٹیکنیکل تین میل سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا اور اگر وہ ہندو نہیں کم راہ نہ کر پانی تو ہم گھنٹے بھر میں ساحل تک پہنچتے۔ میں پرفین تھا کہ یہ ہم جہین یہ خیر و عافیت خشکی پر قدم رکھ سکے گی۔ یہ ایک طرح سے خود غرضی تھی لیکن میں کینٹ کی مہیا میں اس جہاز سے جان چھڑانے پر بہت مسرور تھا، جو ہمیں اہل

ہماری کشتی جیسے جگہ ابرو سے دور تھی مگر اوپر ہم اس کی
بیٹھوں کی حد ساعت سے باہر نکلے، ہم مکمل طور پر سستوں کا تعین
کھو بیٹھے۔ ممکن ہے، ایڈری مویانے چوراسنچا لے میں اپنا ماری
پین کا شیوہ دیا ہو۔ ہوسکتا ہے، آلدیج اس قسم کی کشتی کے
چوچہ چلانے کی مشق نہ رکھتا ہو اور اس نے اپنے دائیں طرف
زیادہ زور لگائے رکھا ہو جبہ جوشی رہی ہو بہت جلد ہم پوری
طرح کم ہو چکے تھے۔ مزے کی بات یہ کہ اس دوران میں ہم
ہاں تنہا نہیں تھے۔ رات کے اندھیرے میں وقفہ وقفہ سے
ہند میں انتخاب کرنے والے ہارن بیٹیاں، گھنٹیاں نیز انجھوں
وراشمیروں کے انجھوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دے جاتی تھی لیکن

وہ ایک بار بھی ہمارے اتنے قریب نہیں ہو پائے کہ ہم انھیں اپنی طرف متوجہ کر پاتے اور جب ہم نے ان کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تو وہ سائلے کی گود میں گھسے۔

دو گھنٹے بعد کیٹ اور اسٹپس چپے سنبھالنے پر اصرار کرنے لگے۔ لیڈی سویا شی کے اگلے حصے کی طرف چلی گئی۔ ہم نے اسے اپنے کوٹ پیش کیے اس نے ان کا گد اہناتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ سو رہی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ سو پائی یا نہیں لیکن وہ خاموش پڑی رہی۔ تین بے زار کن تھکا پنے والے گھنٹے مزید گزر گئے۔ ہم باریاں بدلتے اور ادا گھتے رہے جب کہ ہماری کتھی پانی کے رن پر بے سمت ہتی رہی۔ اب صبح کے پانچ بج رہے تھے اور دھند پھسکی پڑنے لگی تھی۔ اب ہم ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ سکتے تھے۔ وقفے وقفے سے ہارن بجاتے جہاز اور کشتیاں اب بھی ہمارے آس پاس سے گزر رہے تھے۔ لیکن ہماری نظروں سے یہ دستور خفی تھے۔ آلڈریج اس صورت حال سے حد درجہ برہم ہو چکا تھا۔ وہ ہر بار زور زور سے چیچا پکار کر کے ان جہازوں کو متوجہ کرنے کی ناکام کوشش کرتا تھا جب کہ لیڈی سویا اور اسٹپس بھی اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ تاہم اس شور و غوغا میں میری اور کیٹ کی شرکت کچھ زیادہ قابل ذکر نہیں تھی۔ ہم بھلا کیوں اس طرح ”بجائے جانے“ کے آرزو مند ہوتے؟ جو بھی جہاز یا کشتی میں اٹھائی، وہ ہمیں کسی نہ کسی معروف گودی پر اتارتی، جہاں ہم سیکینہ پر خود اس آلڈریج کے رحم و کرم پر ہوتے۔ ہمارے لیے اس کشتی میں میسر آزادی اور دھند کی تحفظ ہماری چار زیادہ قابل ترجیح تھی۔ ہماری خاموشی آلڈریج سے مخفی نہیں تھی۔ وہ کچھ دیر سے لیڈی سویا سے کانپھوسی میں مصروف تھا۔ بالآخر وہ اچھا لڑا۔ ”میں نے اٹھنا تھا نا! ان لوگوں نے اس کشتی میں اس لیے راہ فرار اختیار کی تھی کہ یہ ڈوبنے سے نہیں بچھ سے خوف زدہ تھے۔ اگر انھیں ڈرنہ ہوتا انھیں اس دھند میں رات بھر ادھر ادھر بھٹکائے رکھنے میں فنی گہری دل چسپی کیوں ہوتی؟ یہ دونوں ان جہازوں کو روکنے میں ہمارا ساتھ کیوں نہیں دیتے؟“

لارڈ آئیوی اچانک پھٹ پڑا۔ ”یکواس!“ وہ کرا۔ ”یہ اگر تم سے خوف زدہ ہوتے تو تمھیں اپنے ساتھ پلے کو کیوں کہتے؟“

”انھوں نے مجھے نہیں کہا۔“ آلڈریج بجا طور پر فاقنا نہ لچے س چٹا۔ ”انھوں نے لیڈی سویا اور تمھیں اغوا کیا تھا۔ کیوں کہ یہ راج رہے تھے اس طرح تم سے برابری کی بنیاد پر معاملات آگے بڑھ سکیں گے۔ لیکن یہ میری موجودگی کے خواہش مند نہیں تھے۔“

میرے لیے اب خاموش رہنا ممکن نہیں تھا۔ ”ہم اب بھی تمہاری موجودگی کی خواہش نہیں رکھتے۔“ میں نے کہا۔ ”کیا تم اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتے... میں خود پر قابو پانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔“ کہ ہم لاڈ آئیوی بلکہ تمہارے سامنے بھی معاملے کی وضاحت کرنے کے لیے بے قرار ہیں۔ لیکن ہم پولیس کے سامنے صفائی پیش نہیں کرنا چاہتے۔ میرا دوست تم لوگوں کو چوری چھپے فرار ہونے کی کوشش میں مصروف مجرم سمجھا تھا۔ جب کہ تم لوگ ہمیں مفروضہ مجرم سمجھتے رہے۔ تم دونوں...“

آلڈریج نے تضحیک بھرے لہجے میں بات کاٹ دی۔ ”اچھی کہانی گھڑی ہے۔ لیکن تم اسے پولیس کے سامنے دہرانے کی جرأت نہیں رکھتے۔“

کشتی کے اگلے حصے سے لکار سنائی دی، لیڈی مویانے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”فل، مجھے تم سے سخت چڑھوس ہو رہی ہے۔“ وہ بچہ چلانے میں مصروف کینٹ کی طرف بڑھی۔ ”اپنی جگہ مجھے دے دو میں اپنے بھائی کے ساتھ اکثر کشتی چلاتی ہوں۔“

اب وہ میرے اتنے قریب بیٹھی تھی کہ براہ راست میری آنکھوں میں جھانک سکتی تھی۔ وہ بچہ چلانے کے لیے جھکتے ہوئے مسکرائی۔ ”اب ہمیں پوری بات بتاؤ۔“

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہہ پاتا اس کے عقب میں اچانک تیز روشنی نمودار ہوئی جیسے کوئی پردہ کھینچ کر ایک طرف کر دیا گیا ہو پانی سے ابھرتے قمری سورج نے دھند چیر کر دنیا کو جگمگا دیا۔ سڑت اور استغاب کے مارے لیڈی مویانے پڑی۔ باقی لوگوں کی بھی کچھ ایسی کیفیت تھی۔ لیڈی مویانے میرے عقب کی طرف اشارہ کر کے خوشی سے تالی بجائی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ ہم سے پچاس گز سے بھی کم فاصلے پر ایک اٹھلا ساحل تھا اور پتھروں سے بنائی گئی ایک چھوٹی سی گودی۔ گودی سے تیس چالیس قدم آگے انگور کی بیلوں سے ڈھکا ایک چھوٹا سا گھر تھا جس کی چننی سے نکلنے والا بل کھاتا دھواں ہمیں زندگی کا نشان لگا۔ دیہی طرز کے مکان کے عقب میں قدرے فاصلے پر نیم دائرے کی شکل میں بچھے ساحل کے ساتھ ساتھ موسموں کی مار کھائے، کھیریل کی چھتوں والے چھوٹے بڑے مکانوں کی قطاریں دکھائی دے رہی تھیں۔ میل بھر کے فاصلے پر جہازوں کی رہنمائی کے لیے ایستادہ ایک قمری مینار نور دکھائی دے رہا تھا۔

گودی پرگی کشتی میں تبا کووشی کرتے ایک ماہی گیر اور اسی کی طرح دھواں اگلنے مکان کے علاوہ پورا گاؤں خوابیدہ دکھائی

دے رہا تھا۔ چار اطراف اسن قناعت اور قدرتی حسن کی فراوانی تھی۔ ”واہ!“ لیڈی مویانہ خوشی سے چلا اٹھی۔ ”کتنی دل آویز جگہ ہے۔ سحر انگیز!“

منزل کو اپنے قریب پا کر ہم دیوانہ وار بچہ چلانے لگے۔ سبھی کشتی سوار جوش و مسرت بھرے نعرے لگا رہے تھے۔ دھند چیر کر ابھرتی، بہہ پراسرار آوازیں سن کر ماہی گیر چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ معرکین لہذا ترنگا ہٹا کٹا آدی تھا۔ چھری ڈاڑھی اور دھوپ سے سکی ہوئی تانبے جیسی رنگت۔ وہ اتنے تعجب سے ہمیں گھور رہا تھا جیسے اس نے حال میں کوئی جل پری پکڑ لی ہو۔ اچانک اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”تم لوگ بگ اریو کے مسافر ہونا؟“

ہم سب نے یک زبان ہو کر اس کی تائید کی۔ لاڈ آئیوی نے اس کی کشتی کے پہلو میں اپنی کشتی لگا دی۔ اس اثنا میں وہ شخص گھر کی طرف رخ کر کے، تھیلیوں کا بھونپو بنا کر پکار رہا تھا۔ ”مار تھا... مار تھا ڈوبنے والے جہاز کے کچھ مسافر آئے ہیں۔ کافی تیار کرو۔ اور انڈے، گوشت... تمام سب کچھ لے لو۔“

”خدا اس پر رحمت رکھے۔“ لیڈی مویانہ محبت بھرے لہجے میں بولی۔ تاہم آلڈریج نے کچھ کہنے کے بجائے پیمان اور اشتیاق کے عالم میں جیب سے ایک نوٹ نکال کر لہرایا۔ ”کیا تم دس ڈالر ماننا چاہو گے؟“ اس نے ماہی گیر سے پوچھا۔ ”بھاگ کر جاؤ اور گاؤں کے کاشٹیل کو بلا لو!“

لیڈی تلخ لہجے میں ہنکاری لاڈ آئیوی نے زیر لب گالی دی، کینٹ نے ایک سر دہا بھری اور میرے بازوؤں میں ڈھیر ہو گیا۔

”اب یہ سب بے فائدہ ہے مسٹر آلڈریج۔“ میں نے کہا۔ ”پر بیٹھے بیٹھے کہا۔ میں باقی لوگوں کی آڑ میں ہونے کی بجائے ماہی گیری کی نظروں سے بچا رہا تھا لیکن اب اٹھ کھڑا ہوا تو اس نے مجھے دیکھ لیا۔ میں نے اس کے بازو پر آویزاں دھاتی پلے کی طرف اشارہ کیا۔“ ”خود گاؤں کا کاشٹیل ہے۔“ میں اپنی حسین ہم سفر کی طرف متوجہ ہوا۔ ”لیڈی مویانے سے ملو یہ میرے والد ہیں۔“ اس کے بعد میں نے انگور کی بیلوں سے ڈھکے مکان کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور وہ ہے میرا گھر!“ اس کے بعد میں نے غنودہ گاؤں کی طرف رخ کیا۔ ”وہ رہا میرا گاؤں فیئر پورٹ جس کا میں تر حصہ میرے والد کی ملکیت ہے۔ میں آپ سب کو تہہ دل سے خوش آمدید کہتا ہوں۔“



گنج دھنچیا

فارسہ سسرود

ایک عرصہ پہلے ایک چٹیا اسٹور کے لیے ایک چٹیا جو کہ...

چٹیا جو کہ...

پستو اور...

جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ وہ غیروں کے قبضے میں تھا۔ نینک، کلا شکوف، سنسنائی ہوئی گولیاں، لاشیں، آئسو، لوٹ مار عزت دار لوگوں کی عزتوں سے کھیلنا... یہ تمام برے رنگ وہاں پھیلے ہوئے تھے۔ ان تمام نے مل کر مجھے خوف زدہ کر دیا۔ دوسرے ہم وطن تو پناہ کی خاطر ہمسایہ ملکوں کا رخ کر رہے تھے لیکن میں یہاں اٹلی چلا آیا۔ اب یہاں میں سکون سے بھی ہوں اور میں اپنے ہمسایہ ممالک میں بنے ہوئے مہاجر کیپوں کی بد حالی اور شدید ترین سردی کا شکار بھی نہیں۔ یہاں میں کسی کے آگے دامن بھی نہیں پھیلاتا کہ مجھے آنا، چھینی یا بل دو۔ نہ ہی یہاں اس اذیت کا شکار ہوں کہ میرے کسی ہم وطن کا بچہ سردی یا بیماری سے مر رہا ہو اور مجھے اس کی بے بسی کا دکھ ہو۔ بلکہ یہاں تو میری شاہانہ زندگی ہے۔ اور پھر میں یہاں ہر لحاظ سے مطمئن ہوں۔

نفسہ کا ٹیلی فون ہر رات مجھے خوف زدہ کرتا ہے۔ میں جب بھی رات کو اپنے کام سے تھکا ہوا واپس آتا ہوں تو اس کے ٹیلی فون کی کھنٹی پر میری جان نکل جاتی ہے۔ اکثر میں سوچتا ہوں کہ اسے آئندہ ٹیلی فون کرنے سے منع کر دوں گا... لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا۔ بیش تر اوقات یہ بات بھی میرے دل میں آتی ہے کہ میں ریسپورنڈنٹ نہیں تھاؤں گا... لیکن پھر میں یہ سوچ کر ایسا نہیں کرتا کہ نہیں یہ فون اس اسٹور کے مالک کا نہ ہو جہاں میں کام کرتا ہوں۔ اور پھر اگر میں بھی ریسپورنڈنٹ بھی تھاؤں تو نفسہ اس وقت تک فون کرتا نہیں چھوڑتی جب تک میں اسے جواب نہ دوں۔

اس وقت میں اٹلی میں قیام پذیر ہوں۔ یہاں میں اپنی دلوانش پر آیا ہوں۔ لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ یہاں مجھے اپنی مسائیت لے آئی تو بھی مجھے انکار نہیں۔ کیوں کہ وطن عزیز میں

اچھی ملازمت اور رہنے کے لیے اچھا فلیٹ۔ سب کچھ ہے میرے پاس۔ میرے اسٹور کا مالک پشتو بولنے والا ایک سفید ریش شخص ہے جسے ہم سب حاجی آغا کہتے ہیں۔ حاجی آغا اور اس کی بیوی بہت عرصے سے یہاں رہ رہے ہیں۔ بد قسمتی سے ان کی کوئی اولاد نہیں۔ وہ دونوں بہت مہربان ہیں، مل کر اپنا سنور چلاتے ہیں۔ انھیں مجھ پر بہت زیادہ بھروسہ ہے۔ اپنے کام کے متعلق مجھ سے مشورے بھی لینے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں تو میں خوابوں کی دنیا میں رہ رہا ہوں۔

اب نفیسہ کے کابل سے آنے والے ٹیلی فونوں کے ساتھ ساتھ ایک اور عذاب مجھے آ لیتا ہے۔ حالات مجھے کسی لائق طرح گھماتے ہیں اور مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے یہاں مجھ پر زندگی تنگ ہوئی جارہی ہے۔ کیوں کہ یہاں کی پولیس اب مجھے آئے دن طلب کرتی ہے۔ مجھ سے پوچھ گچھ کرتی ہے اور کئی کئی روز تک مجھے پولیس اسٹیشن میں قید رکھتی ہے۔ بلکہ شروع کے دنوں میں تو مجھ پر تشدد بھی کیا گیا۔ مجھے برف پر لٹایا، آٹنا لٹکا یا، سونے نہیں دیا گیا اور نوپے سے میرے جسم سے بال اور گوشت تو چا گیا۔ جو بدترین عذاب مجھ پر گزرا ہے، اس کا اندازہ صرف میرے خدائی کو ہوگا۔

پولیس کا کہنا ہے کہ تم دہشت گرد ہو لیکن ان کے پاس اس کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں۔ بہ ہر حال، اب یہ ایک معمول ہے کہ وہ لوگ مجھے طلب کرتے ہیں اور میں فوراً وہاں پہنچ جاتا ہوں۔ وہاں مجھ سے بہت ساری باتیں پوچھی جاتی ہیں اور میں مجبوراً ہر سوال کا جواب دیتا ہوں۔ میں جب بھی پولیس اسٹیشن جاتا ہوں تو اس پریشانی کا بھی شکار ہوتا ہوں کہ یہ لوگ آج پھر کیا بات پوچھیں گے اور میرے کیا جوابات ہوں گے۔ اور خدا نخواستہ اگر میں کسی سوال کا جواب نہیں دے سکا تو کیا میں واقعی ان کا مجرم بن جاؤں گا؟

میرا تصور یہ ہے کہ میرے فلیٹ کا سامی بم دھماکے کے الزام میں پکڑا گیا۔ اگرچہ وہ عرب تھا اور میں غیر عرب، ہمارے درمیان ماسوائے سلام دعا کے کوئی شناسائی بھی نہیں تھی۔ پھر میں اپنے کام پر دن کو جاتا تھا اور وہ رات کو۔ ہمیں ملنے کا موقع بھی نہیں ملتا تھا اور ہم دونوں کو کبجا بھی فلیٹ کی یوٹیٹی مالکن نے کیا تھا جو ہم سے اس کمرے کا علیحدہ علیحدہ کرایہ لیتی تھی۔ جب کہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ عرب بے گناہ تھا۔ البتہ اسے فلسطینیوں کی حالت زار کا دکھ تھا اور اس کا کمران بے شمار فلسطینی بچوں کی تصویروں سے بھرا تھا جو اسرائیلی مظالم کے ہاتھوں ہلاک ہوئے تھے۔ اور میرا خیال ہے کہ مظلوموں نے ہم دردی رکھنا کوئی جرم نہیں۔ لیکن پولیس نے اسے تفتیش کے دوران جان سے مار دیا۔ وہ اس کے کمرے سے ان

تمام بچوں کی تصویریں بھی لے گئے۔ مجھے خبر نہیں کہ وہ کیا راز تھے جو پولیس اس سے پوچھ رہی تھی اور وہ انھیں نہیں بتا رہا تھا۔ لیکن پولیس اس کے قتل کو مافیہ سے نہ اس کے جسم پر تشدد کے بہت سارے نشانات کو۔ بلکہ ان کا کہنا ہے کہ اس نے تو حوالات میں خودکشی کی اور چوں کہ وہ دہشت گرد تھا، اس لیے اس کا جسم لڑائی جھگڑے کے زخموں سے بھرا ہوا تھا۔ بہ ہر حال، اب پولیس کو یہ شک ہے کہ میں اس کا ساتھی تھا، اس کے بہت سارے رازوں کو جانتا ہوں اور ہمارا تعلق تیسری دنیا کی ایک خاص دہشت گرد تنظیم سے ہے۔

نفیسہ کا فون اب بھی ہر رات کو آتا ہے اور میری پریشانی میں اضافہ کرتا ہے۔ لیکن میں کیا کروں۔ نفیسہ کو تیار کرنے والی بہن ہے، میں کیسے اس کا دل توڑ دوں۔ اگرچہ وہ مجھ سے عمر میں چھوٹی ہے لیکن اس کے غلوں کا کوئی جواب نہیں۔ اٹلی آنے سے پہلے جب میں گاؤں میں تھا تو وہ ہانگ پین کی حد تک میرا خیال رہتی اور پھر جب اس کی شادی ہوئی تو بھی میری فکر اسے لائق رہتی اور جب میں اٹلی آ رہا تھا تو اس نے اپنا سارا زور فوج کر کے اور میرے بہنوئی کو مقروض بنا کر میرے نکاح اور باقی اخراجات کا بندوبست کیا۔ میں اپنے بہنوئی کا عجیب سا مندر ہوں گا جس نے یہاں آنے میں میری بھرپور مدد کی۔

افغانستان کی طویل لڑائی کے باوجود ہمارا گاؤں پہلے جنگ سے بچا ہوا تھا لیکن اب نفیسہ کہتی ہے کہ طیارے آئے، انھوں نے آسمان سے آگ برساتی اور ہمارے ایک عزیز کے بچے اس میں مر گئے۔ یہ کیا...! طیارے اب ہر رات ہمارے گاؤں پر بمباری کرتے ہیں اور اس میں لاتعداد لوگ مرتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ماں اور میرے چھوٹے بھائی اب تک محفوظ ہیں۔ یہ تمام امر کی طیارے ہوتے ہیں۔ نفیسہ کہتی ہے کہ ماں ہر وقت روتی ہے اور کہتی ہے کہ وہ کہ میں تمہیں دیکھنے بغیر مر جاؤں۔ کاش ایک بار دیدار ہو جائے۔ میرا امریکا کو بھی بدعا میں دیتی ہے کہ اسی کی وجہ سے ہمارے بہن و دلیں میں جنگ آئی۔ اسی کی سازشوں کی وجہ سے یہ خوب صورت دیں کھنڈرات میں بدلا اور اب ان بڑے حالات میں بھی وہ ہمیں سکون سے جیسے نہیں دیتا۔ آخر ان مصیبت زدہ لوگوں کی امریکا سے کیا دشمنی ہے کہ وہ انھیں اتنے بڑے اور خوف ناک وزنی بموں سے ہلاک کر رہا ہے۔ میں نفیسہ کو سمجھتا ہوں کہ یہ جنگ آخر کا ختم ہو جائے گی۔ کیوں کہ بڑی طاقتیں اس وقت اس بات پر متفق ہیں کہ اس خونی کھیل کو اب ختم ہونا چاہیے جس نے لاکھوں انسانوں کی جان لی۔ اس لیے اب یہ تو میں اس مشکل کام کو ختم کر کے ہی چھوڑ دیں گی اور ان کے علاوہ کوئی اور یہ کام کر بھی نہیں سکتا۔

ایک صبح ایک میٹھی سی آواز پر میری آنکھ کھلی۔ کیا دیکھتا ہوں میرے فلیٹ کی کھڑکی میں ایک ننھی سی چڑیا بیٹھی ہے جو بہت ہی دل کش انداز میں چھچھارہا رہی ہے۔ یہ چڑیا مجھے جانی پہچانی لگی۔ اس کے خاکی پر مجھے کچھ یاد دلاتے محسوس ہوئے۔ میں فوراً اپنے بستر پر اٹھ بیٹھا۔

”کہیں یہ بھی چڑیا تو نہیں؟“ میں نے خود سے سوال کیا۔ مجھے فوراً اپنا گاؤں یاد آیا گیا۔ میں جب چھوٹا تھا تو میری چڑیوں سے سخت دشمنی تھی۔ میں ان کے گھونسلوں پر حملے کرتا۔ چڑیوں کے یہ گھونسلے ہمارے گھر، محلے کے درختوں، ہمارے کمروں کی چھتوں کی درزوں اور گاؤں کے اندھے کنوؤں میں ہوتے۔ میں پتھروں اور چھڑیوں کی مدد سے انھیں مارتا، ہلاک کرتا۔ اس خونی اور وحشی کھیل میں مجھے مزہ آتا۔ اسی چڑیوں میں ایک ننھی چڑیا بھی ہو کرتی جو مجھے ہاتھ نہیں لاتی۔ میں اس کے دورے پر ہوتا کہ یہ کب میرے ہاتھ آئے۔ کبھی چڑیا پہلے ہی نہیں تھی۔ وہ تو بہت ہی نازک، خوب صورت اور مست چڑیا تھی کہ میں لیکن ایک دن میرا بچہ کا ہوا پتھر اس کے سر کے قریب سے اسیا گزرا کہ وہ توجہ گئی لیکن اس کے سر کے تمام بال اڑ گئے۔ یوں وہ بھی ہو گئی۔ یوں سارا دن ہمارا خوف ناک کھیل جاری رہتا۔ میرے ہاتھ میں ٹیلی ہوتا۔ کبھی میں اس کے پیچھے چھت پر چڑھتا، کبھی درختوں پر اور کبھی ہوا میں۔ لیکن اس کے پروں میں ایسی طاقت تھی کہ وہ ہر مرتبہ میرے سر پر چڑھ جاتا۔ حالانکہ میں گاؤں کے لڑکوں میں سب سے اچھا نشان باز ہوا کرتا۔ اس طرح میرے بڑے ظالمانہ خیالات ہوتے۔ میں خود کو طاقت ور اور فروع بھٹاتا اور تمام چڑیوں کو کمزور۔ یوں کبھی چڑیا پر مجھے غصہ بھی سخت آتا کہ طاقت ور تو میں ہوں، یہ مجھ سے کیسے بچ جاتی ہے اور میرے ہاتھ کیوں نہیں آتی۔

”کہیں یہ بچ ہمارے گاؤں کی چڑیا تو نہیں! اور اگر واقعی ایسا ہے تو یہ اب تک زندہ کیسے ہے اور پھر یہاں کیسے آ گئی؟“ میں سخت حیرت کا شکار تھا۔ میں غیر محسوس انداز میں چڑیا کے قریب پہنچا اور اسے غور سے دیکھا۔ وہ واقعی گاؤں کی ننھی چڑیا جیسی تھی۔ وہی گنجائش وہی خاکی پر... اور پروں پر ویسے ہی کالے دار...! مجھے اپنے قریب دیکھ کر وہ ڈر گئی اور فوراً اڑ گئی۔ میری نظریں دیر تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ وہ بڑی اور اونچی عمارتوں کے درمیان اڑتی رہی دور ہوئی رہی۔ اس کا وجود یہ تدریج چھوٹا ہوتے ہوئے آخر کار نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس چڑیا کی وجہ سے بہت عرصے کے بعد مجھے اپنا گاؤں بُری طرح یاد آیا تھا۔ نہ جانے کیوں میں بہت بے چین ہو گیا۔

میری آنکھوں سے آنسو نکل بہہ نکلا۔ اچانک فلیٹ کے دروازے پر خوف ناک دھڑ دھڑاہٹ ہوئی۔ یہ پولیس تھی جو کی طوفان کی طرح اندر داخل ہوئی تھی۔ ایک بار پھر میرے گھر کے چنے چنے کی تلاشی لی گئی اور اسے خوب کھنگالا گیا۔ کوئی اور شے تو ان کے ہاتھ آئی نہیں۔ البتہ امریکی ہوائی حملوں سے ہلاک ہونے والے افغان بچوں کی تصویریں جن میں نے اپنے کمرے کی دیواروں پر آویزاں کیا ہوا تھا ان کی نظروں میں آ گئیں۔ ان سب نے میری طرف یوں دیکھا جیسے میں کوئی بم بنانا ہوا ہوا پکڑا گیا ہوں یا کسی دہشت گرد کو نہاد دینے کا جرم کیا ہو۔ وہ مجھے تصویروں کے ساتھ اپنے ہمراہ لے گئے۔

اُس دن پولیس کا رویہ میرے ساتھ بہت سخت تھا۔ اُن کی پوچھ گچھ میں بہت جارحیت تھی۔ وہ مسلسل مجھ سے پوچھتے رہے کہ ان بچوں کی تصویریں تمہارے پاس کیوں آئیں؟ اور تمہارے امریکا کے بارے میں کیا خیالات ہیں؟ میں نے انھیں سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ میرے کوئی سیاسی عزائم ہیں نہ اختلافات، مگر وہ مطمئن نہیں ہوئے۔ رات گئے گلوغلا صبحی کے بعد جب میں دوبارہ اپنے فلیٹ پہنچا تو میری آنکھوں سے نیند بالکل غائب تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے اس پولیس آفسر کا غصے بھرا سرخ اور بدنام چہرہ گھوم رہا تھا جو اس سے پہلے ایک بار مجھ پر تشدد بھی کر چکا تھا۔ میرے دل میں خوف پیدا ہو گیا۔ کہ میرے فلیٹ کے ساتھی کی طرح کہیں یہ لوگ مجھے بھی قتل نہ کریں۔ کیوں کہ اسے بھی ان لوگوں نے ناکامی کی صورت میں مارا تھا۔ میں تنہا کیسے اس بات پر غور کرنے لگا کہ مجھے جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں پھولوں کے اس دہسے سے کیسے جاؤں جہاں ہر جگہ سے میرے خوابوں اور آرزوؤں کی تھمپاں چٹنی رہتی ہیں۔ بہت عرصہ پہلے ہمارے گاؤں کا ایک شخص اٹلی میں رہا کرتا تھا، وہ جب بھی گاؤں آتا تو میں اس سے روم کے تاریخی شہر کے بارے میں سوالات پوچھتا۔ یوں میں یہاں کی تاریخی عمارتوں کے خواب دیکھتا اور مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میں ہزاروں سال پہلے کے قدیم روم کا باسی ہوں اور یہاں سنگ مرمر اور خوب صورت پتھروں کے محلات میں گھوم رہا ہوں جو سرسبز درختوں، رنگین اور خوش بودار پھولوں اور غواروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہی میرا وطن ہے اور میں یہاں کی تاریخ اور ثقافت کا حصہ ہوں۔ اسی لیے یہ جگہ میرے خوابوں کا مرکز تھی... اور اب میں حیران تھا کہ اس جنت سے کیسے علیحدہ ہوں گا۔ مجھے اپنے چاروں طرف اندر اندر نظر آ رہا تھا۔

آج رات نفیسہ نے مجھے یہ خبر سنائی کہ طیاروں کے حملے میں

ہمارے گاؤں کے ایک اور شخص کا گھر تیار ہو اور اس میں اس کے دو جوان بیٹے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اور یہ کہ افغان ایک باہر ایک دوسرے کو بے دردی سے قتل کرنے لگے ہیں اور جنگجو مرد ہر سرے امر کی ڈال رہا اور اسلحے سے مال دار ہو گئے ہیں۔ آج جاں نے بھی مجھ سے فون پر بات کی۔ وہ ان دنوں نفسہ کے گھر کا بل آئی ہوئی ہے۔ وہ مجھ سے رور و کہہ رہی تھی کہ میں فوراً گھر پہنچوں۔

”خدا غارت کرے یورپ کو! لعنت ہو ان سفید فاموں پر، ہم سب کو انھوں نے تباہ کیا۔ ہمیں انھوں نے ہی اسلحہ لا کر دیا، انھوں نے ہی ہمیں ورغلا کر آگ میں جھونکا۔ اور تم ہو کہ ابھی تک ان کے قدموں میں بیٹھے ہو... گھر ہی نہیں آ رہے۔“

پھر کچھ دیر بعد خود ہی کہتی ہے۔ ”ابھی گھر مت آنا۔ اس وقت وطن جلتی ہوئی دوزخ کی طرح ہے۔ اور کوئی بھی ماں یہ نہیں چاہتی کہ اس کی اولاد آگ میں جلے۔“

ماں کی یہ ذہنی کیفیت اور پاگل پن مجھے حیران کر دیتا ہے۔ میں اسے سمجھتا ہوں اور تسلی دیتا ہوں کی یہ جنگ آخر کار ختم ہو ہی جائے گی۔ آپ خود دیکھیں گی کہ بڑی بڑی طاقتیں اس جنگ کو کیسے ختم کرتی ہیں۔ لیکن ماں پوچھتی ہے کہ کب؟ ہمیں تو مدتوں سے یہ بزر باغ دکھائے جا رہے ہیں لیکن ایسا ہوتا نہیں۔ اس رات جب میں سونے کے لیے لیٹا تو بہت خوف زدہ تھا۔ پھر جب بے وقت تمام مجھے نیند آئی تو کئی بار میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے روم کے تاریخی شہر میں وہاں کے قدیم بادشاہوں کی ناراض روئیں میرے سر ہانے لڑی ہیں۔ سفید لکڑی پینڈو اور اپنے مکروہ چہروں، بھیڑیوں جیسے لمبے تیز دانتوں اور آدم خوروں کی طرح خون آکھوں سے جہاں مجھے ڈرا رہی ہیں وہاں ہزاروں انسانوں پر رور رکھے گئے اپنے ظلم اور زیادتی پر ماتم بھی کر رہے ہوں۔ اور اس وقت تو میرے خوف کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے خواب میں دیکھا کہ اچانک روم کے شہر کو آگ لگ جاتی ہے۔ سرخ سرخ شعلے آسمان تک بلند ہونے لگتے ہیں اور وہ خوف ناک رومیں زیادہ ہڈت سے پیچھے اور چلائے لگتی ہیں۔

اگلے دن پھر میں چڑیا کی آواز پر جاگا۔ دیکھا تو وہی کل والی چڑیا کھڑکی میں بیٹھی گا رہی تھی۔ میں اس کمزور اور نازک چڑیا کو بہت دیر تک دیکھتا رہا۔ مجھے پریشانی لاحق ہو گئی کہ اس میں اور ہمارے گاؤں کی چڑیاں اتنی زیادہ مماثلت کیوں ہے۔ حاجی آغا کو پوری صورت حال کا علم تھا۔ اُس روز جب میں نے اسے بتایا کہ اب میرے صبر کا پیمانہ بڑھ چکا ہے، کیوں نہ

میں کسی کیل سے قانونی مشورہ لوں... تو انھوں نے کہا۔ ”تم خاموشی سے اٹلی سے نکل جاؤ۔ تم خوش قسمت ہو کہ اب تک بچے ہوئے ہو اور ابھی تک کسی کیل میں گرفتار نہیں کیا گیا۔ امریکا اس وقت ساری دنیا میں اپنے مفادات کا کھیل کھیل رہا ہے۔ وہ غریب اور کمزور ملکوں کے تیل، وسائل اور زمینوں پر قبضہ کر کے انھیں لوٹا چاہ رہا ہے۔ جب کہ دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے وہ اسے دہشت گردی سے جنگ کا نام دے رہا ہے۔ اور یوں اس لوٹ مار میں اٹلی بھی اس کا ساتھی بننا پڑے۔ اسی لیے تو یہاں کی پولیس تم سے اتنی زیادہ پوچھ گچھ کر رہی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں پولیس تمھیں امریکا کے حوالے نہ کر دے۔ پھر تم ساری زندگی امریکیوں سے اپنی جان نہیں بچھڑا سکو گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تم پر اتنا زیادہ تشدد کریں کہ تم جان سے ہاتھ دھو بیٹھو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ تمھیں کیوبا کے نزدیک اپنے مخصوص جزیرے میں قید کر دے۔ یوں اگر تم وہاں مر بھی جاؤ تو کسی کو تمھاری موت کا پتہ نہیں چل سکے گا۔“

میں سچ سچ پریشان ہو گیا۔ میں اٹلی سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن سخت مجبوری کے عالم میں کچھ عرصے کے لیے وہاں سے نکل جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جس وقت میں اپنے فلیٹ کو چھوڑ رہا تھا تو میرا دل بہت دکھ رہا تھا۔ اُس وقت شہر کی سڑکوں پر بڑے بڑے جلوس نکل رہے تھے۔ ان میں ہزاروں لاکھوں لوگ شامل تھے۔ ان سب نے ہاتھوں میں امریکا مخالف پلے کارڈز اٹھا رکھے تھے اور امریکا کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کر رہے تھے۔ تیسری دنیا سے ملنے والی اس کی لوٹ مار کی پالیسی پر احتجاج کر رہے تھے۔ امریکا کو افغان نشان پر قبضے کے بعد اب عراق پر حملے اور قبضے سے منع کر رہے تھے۔ بہت سوں کے پاس امریکی صدر کے خوف ناک اور ڈراؤنے ماسک تھے...

لوگوں کا خون پینے والا امریکی صدر!

میں قریبی ملک اپنے ایک گھر کے دوست کے گھر جانے کے لیے زمین دوز ریل گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سفر کے دوران میں اُس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے ریل گاڑی میں بھی اسی چڑیا کو موجود پایا۔ وہ یہاں بھی کھڑکی میں بیٹھی مجھے تنگ رہتی تھی۔ میں حیران تھا کہ یہ یہاں کیسے آئی! ایک اور تعجب خیز بات یہ تھی کہ کسی بھی مسافر کو اس کی پروا نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی اور کو نظر ہی نہ آ رہی ہو۔ کیا صرف میں ہی چڑیا کو دیکھ سکتا ہوں؟ میں نے سوچا۔ کیا یہ صرف مجھے ہی نظر آ رہی ہے؟ مجھے اس سے کچھ خوف سا محسوس ہوا۔ پھر لمحہ بھر میں وہ چڑیا

یوں غائب ہو گئی جیسے اس نے سلیمانی ٹوپی پہن لی ہو۔

اس رات روم کا شہر پھر مجھے خواب میں نظر آیا جو سرخ شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ البتہ اب کے وہاں لوگوں کا ایک جم غفیر اس آگ کو بجھانے کی خاطر اس پر پانی پھینک رہا تھا لیکن آگ بجھنے کے بجائے شعلے مزید بلند ہو رہے تھے۔ اس آگ میں بے شمار ننھے ننھے بچے جل رہے تھے جو درد، جلن، زخموں اور دہشت سے بلبلارہے تھے۔ ایک نظارہ اس سے بھی زیادہ عبرت اثر تھا! دور ایک شخص ان تمام باتوں سے بے نیاز بیٹھا بائسری بجا رہا تھا۔ روم جل رہا تھا لیکن اس شخص کو اس کی پروا نہیں تھی۔ مجھے اس شخص کی بے بسی پر بہت غصہ آیا۔

اپنے وقت کے فلیٹ میں جب میں سو کے اٹھا وہاں بھی اُس چڑیا کودیکھا۔ یہ کیا اسرار ہے؟ میں نے خود سے پوچھا۔ کیا جادو ہے؟ یہ چڑیا کیوں میرا چچا کر رہی ہے؟ میرے اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ میری آنکھیں کچھ نہیں کھلتی تھیں۔ چڑیا آج مجھے عجیب ہی انداز سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے بہت محسوس ہوئی۔ ایسا لگا جیسے وہ مجھ پر ہنس رہی ہو مگر نہ کہہ رہی ہو۔

”کیوں ایسا کر رہی ہے؟“ میرے اندر سے ایک چیخ اُبھری۔ آج مجھے یوں محسوس ہوا جیسے چڑیا بول رہی ہو۔ مجھے میرا بچپن یاد آیا۔ روم اور پھر پوچھ رہی ہو کہ اُس وقت تو تمھیں اپنی بہادری اور طاقت پر ناز تھا۔ اب بتاؤ کہ بہادری تم ہو یا میں؟

بالآخر میں کی منتوں نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں گھر روانہ ہو جاؤں۔ وہ کہتی ہے میں نہ آیا تو مجھے اپنا حق نہیں بخشے گی۔ دراصل روم میں بسنے والے ہمارے گاؤں کے چند لوگوں نے کابل میں اپنے رشتے داروں کو ٹیلی فون پر یہ بتایا تھا کہ پولیس مجھے تلاش کر رہی ہے تا کہ مجھے گرفتار کر کے مجھ پر مقدمہ چلائے۔ ان لوگوں سے یہ بات کسی نہ کسی طرح ماں تک پہنچ گئی۔ دوسری طرف خود میں بھی خوف زدہ تھا... اور پھر اخبار کی اس خبر نے تو مجھے مزید پریشان کر دیا تھا کہ اٹلی کی پولیس ان ایشیائی دہشت گردوں کو یورپ بھر میں ڈھونڈنے کی جواب اٹلی سے فراہم ہو گئے ہیں۔

مجبوراً میں نے اُس محبت کو اپنے دل سے دُور پھینک دیا جو میں اٹلی سے محسوس کرتا تھا... اور وطن واپسی کا ارادہ کیا۔ جس جہاز میں میں سوار تھا اُس میں بھی مجھے چڑیا کے پروں کی پچھر پچھر اڑت سنائی دی۔ پھر ایک دن میری سیٹ کے

سامنے آکر بیٹھ گئی۔ اب میں اور وہ ایک دوسرے کو مسلسل دیکھ رہے تھے۔ آج مجھے چڑیا پر بہت پیارا رہا تھا۔ ”پیارا چڑیا!“ میں نے اُس سے کہا۔ ”بابا خوب کہتے تھے... سانپیر یا کی سردتریں ہوں میں چل رہی ہوں یا سہی کی جون جولانی کی مار دینے والی گرمی ہو، تمام پرندے وطن چھوڑ کر فرار ہوجاتے ہیں لیکن وفادار چڑیا اپنا وطن نہیں چھوڑتی! تو بہادر اور طاقت ور میں نہیں تم ہو۔ کیوں کہ وطن میں نے چھوڑا تھا تم نے نہیں۔“

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہوائی جہاز کے طویل سفر میں بیٹھے بیٹھے مجھے نیند آگئی اور میں سو گیا۔ اس دوران میں نے اپنا گزشتہ خواب دوبارہ دیکھا۔ چاروں طرف آگ لگی ہوئی تھی...

بہت سارے لوگ آگ پر پانی پھینک رہے ہیں لیکن آگ بجھ نہیں رہی۔ بلکہ اس میں مزید ہڈت آ رہی ہے۔ آگ سے بے پروا بائسری بجانے والا شخص بھی وہاں موجود ہے۔ پھر یہ دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوتی ہے کہ وہ بے حس شخص اور کوئی نہیں بلکہ میں خود ہوں... اور آگ میں جلنے والا شہر روم نہیں بلکہ میرا اپنا گھر ہے... وہی ہمارا گاؤں والا گھر جسے میں نے جنگ کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا۔ وہی اس کا سفید دروازہ اور زیتون کی شاخوں سے سجے ہوئے برج۔ میں بڑبڑایا۔ جب میں نے لوگوں کو دیکھا تو حیران رہ گیا... کیوں کہ وہ سب اجنبی اور غیر تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پانی سے بھرے برتن تھے اور وہ چیخ رہے تھے کہ جلدی کرو، آگ بجھاؤ ورنہ مزید تباہی پھیل جائے گی۔

اپنے گھر کی محبت مجھے ایسا اندھا کر دیتی ہے کہ میں آگ کے سرخ شعلوں کی پروا کیے بغیر گھر کے اندر دھس جاتا ہوں... اندر پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہاں سب کچھ تباہ ہو چکا تھا۔ سب وہاں سے چلا گئے تھے۔ وہاں جو اکلوتا ذی نفس موجود تھا وہ وہی تھی چڑیا بھی جو ایک سوکھے درخت کی شاخ پر پریشان بیٹھی تھی... اور جس نے گھر نہیں چھوڑا تھا۔ چڑیا نے جب مجھے دیکھا تو خوش ہو گئی۔ اس نے اپنے پوں کو ہوا میں مارا، اڑ اڑ کر میری طرف آئی اور والہانہ مجھ سے چمٹ گئی۔ میں نے بھی اپنی بائسری دُور پھینک کر اسے خوب چوما۔ ہم دونوں بری طرح رورہے تھے... اور اس شدت سے رورہے تھے کہ ہمارے آنسوؤں سے تمام حوالی بھر گئی۔ پھر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہمارے آنسوؤں کے سیلاب سے وہ بے قابو آگ بجھنے لگتی ہے جسے باہر کھڑے لاتعداد اجنبی بجھانے کی کوشش کرتے نظر آ رہے تھے لیکن وہ بجھ نہیں رہی تھی!



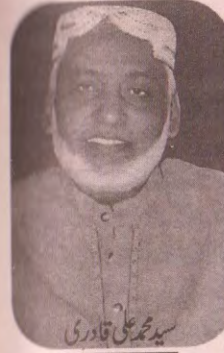
تَبْرَكَ الَّذِي جَعَلَ فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَجَعَلَ فِيهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُنِيرًا

آپ کے ستارے کیا کہتے ہیں؟

آپ کیلئے کون سا سال 'مہینہ' دن، ہفتہ رہے گا؟ محبت، دولت اور دیگر معاملات میں کب کامیابی ملے گی؟

معروف ماہر فلکیات سید محمد علی قادری سے راہنمائی حاصل کریں۔

اس کے علاوہ قادری صاحب آپ کے دنیاوی مسائل کا حل قرآنی آیات اور اساء الحسنی سے پیش کرتے ہیں۔



سید محمد علی قادری

جہاں آپ چاہتی ہیں وہاں امکان بہت کم ہے۔

☆ میں نے ایف ایس سی کیا ہے اب میں بی ایس سی کروں یا بی بی اے؟ کیا مستقبل میں نوکری کر سکوں گی؟ بیرون ملک جانے کا امکان ہے شادی کب ہوگی؟

☆ موجودہ صورتحال واضح نہیں ہے۔ بی بی اے کے مضامین کو ترجیح دیں آپ کی طبیعت میں ٹھہراؤ کم ہے۔

☆ شادی سے یکسوئی کی ضرورت ہے زیادہ باریک بینی سے تجزیہ مت کیا کریں، ذہین ہیں امتحان میں کامیابی ہو سکتی ہے۔ شادی کا امکان اپریل 2010ء تا دسمبر 2011ء میں اپنوں میں ہے۔ ممکن ہے آپ کو نوکری نہیں کرنا پڑے بیرون ملک سفر کا امکان ہے۔

☆ شادی کب ہوگی بندش وغیرہ نہیں ہے (شاذیہ، گجرات)

☆ شادی سے منسلک برج کمزور ہے۔ بندش وغیرہ نہیں ہے اب صورت حال تبدیل ہو رہی ہے خود اعتمادی سے کام لیں، اگلا ڈیڑھ سال اہم ہے ممکن ہے اس دوران آپ کی شادی ہو جائے۔

☆ لاہور میں رہائش زیادہ بہتر ہے یا کراچی میں؟ (یعقوب لاہور)

☆ لاہور زیادہ بہتر ہے۔

☆ قادری صاحب! میری دو بیٹیاں آپریشن سے ہوئی

☆ بھائی کی شادی "ش" نام کی لڑکی سے ہونی چاہیے کیا یہ

رشتہ مناسب ہے شادی کب تک ہوگی۔ (نازیہ، ضلع انک)

☆ آپ کے بھائی کیلئے "ش" کا رشتہ مناسب ہے آپ کا بھائی ضدی طبیعت کا ہے آئندہ وقتی طور سے معاش پریشانی ہو سکتی ہے اخراجات کو قابو میں رکھیں بھائی کی شادی کا امکان اگلے ڈیڑھ سال میں ہے۔

☆ ایم بی بی ایس ڈاکٹر بننے کی بہت خواہش ہے کیا

میری یہ خواہش پوری ہو سکے گی؟ (اشتیاق علی خان۔ کراچی)

☆ انشاء اللہ آپ کی خواہش پوری ہوگی مگر اس کے لیے سخت محنت کرنا پڑے گی۔

☆ میں کافی عرصے سے بیمار ہوں صحت یابی کب ہوگی

میرا مکان کب تک مکمل ہوگا، خاوند توجہ نہیں دیتے۔

(سہلی اختر، ساہیوال)

☆ منفی رجحانات کو نظر انداز کرنے کی کوشش کریں اپنی

صحت کا خیال رکھیں مارچ 2011ء تا نومبر 2012ء

اہم ہے آپ کی صحت یابی ہو سکتی ہے۔

☆ شادی کب ہوگی؟ اپنوں میں یا غیروں میں؟ یہ بھی

بتائیں کہ جہاں میں چاہتی ہوں ہو پائے گی یا نہیں؟

(شیراز، کراچی)

☆ اسی سال کے آخر تک ہے اپنوں میں زیادہ امکان ہے

جب کوئی حج سے لوٹے تو یہ دعا دین: قَبْلِ اللَّهِ حَجَّكَ وَغَفَرَ ذُنُوبَكَ وَأَخْلَفَ نَفَقَتَكَ

ترجمہ: اللہ تمہارے حج کو قبول فرمائے تمہارے گناہ معاف فرمائے اور جو کچھ تم نے خرچ کیا اس کا بدلہ تمہیں عطا کرے۔

تصویریں تھیں اور اب وہ مجھ کو بلیک میل کر رہا تھا اور مجھ سے پیسوں کا مطالبہ کر رہا تھا، میں سخت ٹینشن کا شکار تھی میرے شوہر کو اس بارے میں پتہ چل جاتا تو میری پوری زندگی تباہ ہو جاتی۔ پھر میں نے آپ کو فون کیا اور آپ نے ایک نقش بنا کر دیا! اللہ کا شکر ہے جب سے وظیفہ پڑھنا شروع کیا ہے اس کا کوئی فون وغیرہ نہیں آیا اور مجھے بہت سکون حاصل ہے۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اور لمبی عمر دے! (فرزانہ راو پلنڈی)

☆..... بیٹی اللہ کا شکر ادا کریں! وظیفہ مکمل ہو جائے تو فون کر کے مطلع کیجیے تاکہ آپ کو آگے کی ہدایات دی جاسکیں۔

☆..... سائیں! اولاد ورنہ کے لیے آپ سے نقش بنوایا تھا، کیونکہ میری چار بیٹیاں تھیں اور لڑکا کوئی نہیں تھا

میرے شوہر نے دھمکی دی تھی کہ اب کے لڑکے ہوئی تو میں تجھے طلاق دے دوں گا! سائیں! اللہ نے مجھے ایک لڑکا

عطا کر دیا ہے، میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں

دن رات آپ کے لیے دل سے دعا کرتی ہوں کہ اللہ

آپ کو سلامت رکھے اور آپ لوگوں کے مسائل اسی

طرح حل کرتے رہیں (آمین)! (طاہرہ پرانا سکھر)

☆..... بیٹی! اللہ کا شکر ادا کریں اور دو رکعت نماز شکرانے کی

ادا کریں! اللہ آپ کو اور خوشیاں عطا فرمائے (آمین)۔

☆ قادری صاحب! میں نے اپنی بیٹیوں کی شادی کے

لیے آپ سے نقش بنوایا تھا! اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ایک

بیٹی کی نسبت طے ہو گئی ہے جس کے بارے میں آپ

سے استخارہ بھی کر دیا تھا! آپ نے مناسب بتایا تھا اب

اگلے ماہ اس کی شادی ہے وظیفہ ختم ہونے والا ہے، لوح کا

اب کیا کرنا ہوگا؟ (زرین اختر، گلشن اقبال)

تھیں ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اب آپ کے پاس صرف ایک

چانس ہے کیونکہ اس کے بعد آپریشن میں بہت خطرہ

ہے۔ میں چاہتی تھی کہ میرے ایک بیٹا ہو جائے کسی نے

آپ کا نمبر دیا! آپ سے بات کر کے دل کو بہت تسلی ہوئی

آپ نے ایک نقش مبارک اور سعد پتھر تجویز کیا تھا، میں

نے آپ کی ہدایت کے مطابق وظیفہ پڑھنا شروع کیا اور

مبارک پتھر لٹاؤ گھی میں غڑ کر پہن لیا! اللہ کا شکر ہوا کہ

پہلے مہینے ہی امید سے ہو گئی! اب بے تابی بڑھتی جا رہی تھی

مجھ سے صبر نہیں ہوا اور میں سے کچھ پانچویں مہینے میں ٹیسٹ

کر لیا جس سے مجھے پتہ چلا! اللہ نے میری دعا سن لی

ہے اور میں ایک لڑکے کو جنم دینے والی ہوں! میری خوشی کی

انتہا نہیں رہی سب سے پہلے میرے دل کی گہرائیوں سے

آپ کے لیے دعا نکلی تھی! اللہ کرے آپ یونہی دیکھی

اسلام کی مدد کرتے رہیں! اللہ آپ کو ہمیشہ سلامت

رکھے! اللہ بچے کی پیدائش کے بعد میں اور میرے شوہر

آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ (یاسمین، اوٹھوہی)۔

☆..... بیٹی! اپنا بہت خیال رکھیں دعا ہے اللہ تعالیٰ سے

کہ آپ کے سب کام خیر خیریت سے ہو جائیں۔

پیدائش کے بعد لوح کو ٹھنڈا کر دیا بیجے گا اور وظیفہ پڑھنا

بھی بند کر دیجیے گا۔ اور شکرانے کے دو نقش پڑھنا نہیں

بھولیے گا۔ نماز کی پابندی کا بھی خیال رکھیں۔

☆..... قادری صاحب! میرا مسئلہ یہ تھا کہ شادی سے

پہلے میری ایک لڑکے سے دوستی تھی، مگر وہ شادی کے

بارے میں ٹال مٹول کر رہا تھا اس عرصے میں کہیں اور

سے میرے لیے رشتہ آ گیا اور گھر والوں نے میری شادی

کر دی۔ مسئلہ یہ ہوا کہ اس کے موبائل میں میری کچھ

21 روپے خیرات کر دیجیے گا۔

☆.....شاہ صاحب! میں نے اپنی بھانجی کی شادی کے لیے نقش بنوایا تھا شاہ صاحب! نقش لینے کے بعد ورشتے آئے مگر ہمارے معیار کے مطابق نہیں تھے! آپ دعا کریں کہ کوئی اچھا رشتہ جلد آجائے! (میمونہ ساہیوال)

●.....بیٹی! انسان بہت ناشکرا ہے پہلے آپ نے کہا تھا کہ بالکل رشتے آتے ہی نہیں ہیں اب رشتے آنا شروع ہوئے ہیں تو آپ بجائے اللہ کا شکر ادا کرنے کے معیار کے پیچھے پڑ گئے ہیں! اب کوئی رشتہ آئے تو فوراً فون کر کے بتائیے گا تا کہ میں استخارہ کر کے آپ کو یہ سب کچھ کہہ یہ آپ کے لیے بہتر ہے یا نہیں!

☆.....قادری صاحب! میں نے کسی کے ساتھ مل کر کاروبار کیا تھا لیکن اس نے میرے ساتھ دھوکا دیا! اب حال یہ تھا کہ میرا بال بال قرض میں جکڑ گیا تھا! آپ کو اپنا مسئلہ بیان کیا تو آپ نے مجھے لوح غنی بنا کر دی اور اس کے ساتھ ایک وظیفہ بھی پڑھنے کے لیے دیا۔

قادری صاحب 61 دن وظیفہ پڑھنے کے بعد مسئلہ بہت مایوس ہو گیا تھا کہ حالات جوں کے توں تھے! آپ سے دوبارہ فون پر رابطہ قائم کیا تو آپ نے 31 دن مزید وظیفہ پڑھنے کا کہا میں نے اللہ کا نام لے کر دوبارہ شروع کیا! ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ میرا ایک بوٹہ جو 5 سال سے رکھا ہوا تھا لگ گیا! جس سے میرے کافی حد تک مسئلہ حل ہو گئے! قادری صاحب اب یہ بتائیے کہ وظیفہ کے 31 دن ابھی پورے نہیں ہوئے تو اب نقش اور وظیفہ کا کیا کرنا ہے؟ (عدنان علی، گوجرانوالہ)

●.....”اللہ تعالیٰ کی ذات سے مایوس نہیں ہونا چاہیے“

● بیٹی جب وظیفہ کی مدت ختم ہو جائے تو فون کر کے آگے کی ہدایات لے لیجیے گا! اللہ آپ کی دوسری بیٹیوں کے لیے بھی جلد انتظام فرمادے (آمین)۔

☆ قادری صاحب! میں ایک لڑکے کو پسند کرتی تھی لیکن کچھ عرصے سے اُس نے مجھ سے بات چیت کرنا بالکل ختم کر دی تھی! آپ نے بتایا کہ کوئی اُسے اپنے بس میں کرنے کے لیے عملیات کروا رہا ہے! اور آپ نے مجھے ایک نقش اور اس کے ساتھ وظیفہ پڑھنے کے لیے دیا! قادری صاحب میں آپ کی بے حد مشکور ہوں اور زندگی بھر آپ کے لیے دعا کرتی رہوں گی کیونکہ اب وہ میری طرف پلٹ گیا ہے اور رشتے کے لیے اپنے والدین کو کچھ دنوں میں بھیجنے والا ہے۔ وظیفہ کے کچھ دن ابھی رہتے ہیں، نقش کا کیا کرنا ہے۔ (صائمہ لاہور)

● بیٹی! اللہ کا شکر ادا کریں اور دو رکعت نماز شکرانے کی ادا کریں وظیفہ شادی ہونے تک جاری رکھیں! اس کے بعد نقش کو دریا یا سمندر میں ٹھنڈا کر وا دیجیے گا۔

☆ بابا سائیں! میں نے آپ سے لوح تحفہ خاص بنوائی تھی مسئلہ یہ تھا کہ میرا وزیر انہیں لگ رہا تھا بہت عاملوں سے کام کروایا مگر بات نہیں بنی پھر کسی نے آپ کے بارے میں بتایا! آپ نے نقش اور وظیفہ پڑھنے کے لیے دیا! اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ وظیفہ کی مدت ختم ہونے سے پہلے ہی میرا کام بن گیا! اللہ کرے آپ اسی طرح لوگوں کی مدد کرتے رہیں (آمین)۔ (توقیر احمد آزاد کشمیر)

●.....بیٹا! اللہ کا شکر ادا کریں اور دو رکعت نماز شکرانے کی ادا کریں وظیفہ کی مدت ختم کر کے نقش کو ٹھنڈا کر وا دیجیے گا۔ نماز کی پابندی رکھیے گا اور جمعرات والے دن

یہی بات کہی تھی جب آپ نے مجھے فون کیا تھا اور نتیجہ آپ نے خود دیکھ لیا! اللہ آپ کے دیگر مسائل بھی حل کرے (آمین)۔ وظیفہ ابھی جاری رکھیے اور مدت ختم ہونے کے بعد مطلع کیجیے۔

☆.....السلام علیکم، قادری صاحب! آپ سے مشورہ کر کے ٹرانسپورٹ کا کام شروع کیا ہے! اللہ کے فضل اور آپ کی دعا سے کام اچھا چل رہا ہے اور گھر کے مالی حالات بھی بہتر ہو گئے ہیں۔ اللہ آجائے ترقی دے اور آپ کو نئی لوگوں کی دعائیں لیتے رہیں لوح کے بارے میں بتا دیں کہ اس کا کیا کروں؟ (فیض علی، کراچی)

●.....اللہ کا شکر ادا کریں اور دخل شکرانے کے پڑھیں۔ لوح کو ٹھنڈا کر دیں وظیفہ کی ایک ایک تسبیح صبح و شام چلائیں۔

☆.....بابا سائیں! السلام علیکم! میں زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوں شادی سے پہلے دکان بنائی اور اپنا کام شروع کر دیا! گزارے لائق کام چل پڑا پھر اللہ نے 4 بیٹیوں سے نوازا! بیٹیاں نہیں ہوا! میں اکیلا کمانے والا اور دکان سے بھی اتنی آمدنی نہیں ہوتی تھی بس جب بڑی بیٹی نے میٹرک کیا تو اس کو گھر بٹھالیا۔ اس طرح 2 بیٹیاں میٹرک کے بعد گھر بیٹھی تھیں! میں اور میری بیوی ہر وقت یہی سوچتے کہ 4 بیٹیوں کی شادی کیسے ہوگی؟ جبکہ معمولی پڑھی لکھی ہیں۔ ایک بار ایک میگزین پڑھنے کا اتفاق ہوا تو آپ

کے کالم پر نظر پڑی! میں نے مکمل یقین اور اعتماد کے ساتھ پڑھا اور اس پر توکل کر لیا! اللہ کے فضل و کرم سے اور آپ کی دعا سے 2 بیٹیوں کے رشتے اچھے لوگوں میں طے ہو گئے ہیں اب کیا کروں! آگے رہنمائی کر دیں! آپ کی دعاؤں کا طالب! (لیاقت علی، شیخوپورہ)

●.....میرے کام میں لوح کو اس وقت تک رکھیں جب تک باقی دو بیٹیوں کے رشتے طے نہیں ہو جاتے اور وظیفہ کی تسبیح و شام کر دیں! اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

☆ قادری صاحب! میرے کپڑے کی دکان تھی شروع کے دو سال بہت اچھی چلی مگر پچھرا ہستہ ہستہ گاہک آنا بند ہو گئے جو آتے بھی تھے تو سودا طے نہیں ہو پاتا تھا میں بہت مشکل میں آ گیا تھا حتیٰ کہ دکان کا کرایہ نکلتا بھی مشکل ہو گیا تو میں نے آپ سے فون پر رابطہ کیا! آپ نے کہا کہ ”بندش“ کروائی گئی ہے جس کے لیے آپ نے ایک نقش مبارک اور سعد پتھر ارسال فرمایا! اب وظیفہ مکمل ہو چکا ہے! 50 فیصد کامیابی ہوئی ہے تقریباً مزید ہدایت فرمادیں! (ارسلان، کراچی)

●.....بیٹا! آپ 31 دن مزید وظیفہ پڑھ لیں! انشاء اللہ حالات اور بہتر ہو جائیں گے۔ وظیفہ ختم ہو جائے تو فون کر کے مطلع ضرور کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے رزق میں اضافہ فرمائے (آمین)۔

○.....○.....○

نوٹ: خط لکھتے وقت اپنا نام، اپنی والدہ کا نام، تاریخ پیدائش اور وقت پیدائش ضرور لکھیں۔ براہ راست جواب کے لیے جوابی لفافہ ساتھ بھیجیں۔

911-A، سیکٹر B-11، ناتھ کراچی، نزد ٹیلی فون ایکسچ، کراچی۔ موبائل: 0300-2756587
E-mail: mashal_e_raah@yahoo.com / mashal_e_raah1@hotmail.com

گناہ محبت

عافیہ احمد

شعاع کا سینہ سرکھٹے دل کے لیے ایک پتھر کے آئینے کا آئینہ

اس کے سیاہ کار کے اندر ایک روشن شخص تھا۔ ایک شخص کے لیے ایک روشن شخص کا نام نہیں چاہا

وہ کتنی البرقی... کسی حسین تھی۔ چلتی تھی تو باوصا ساتھ رکھتی تھی۔ ہمارے گاؤں میں بس بڈل اسکول تھا۔ وہ شہر میں اپنے ماموں کے گھر رہ کر کالج تک پڑھ آئی تھی۔ ساتھ میں نہ جانے کتنے کورس کیے تھے کہ گاؤں کی لڑکیاں اس کے آگے پیچھے بھرتی تھیں... کچھ نہ کچھ سیکھنے کے بہانے۔

وہ میرے تباہ زاد بھائی کی منگ تھی... عادل کی... میں اور عادل، ہم دونوں ہی گمراہ جوان تھے۔ گاؤں میں کوئی ہم سائیں نہیں تھا۔ عادل تو خیر الگ طبیعت کا تھا۔ لیکن مجھے شکار کا بہت شوق تھا... ہر طرح کے شکار کا۔ سو میں نے کافی لڑکیوں سے راہ رسم کر رکھی تھی۔

میں نے اسے دیکھا... میری تو پیسے پچان ہی گر گئی میرے جنگل میں۔ میرے چار سو خواہشوں کے، نت نئے خوابوں کے درندے غرانے لگے۔ اور میں... میں کسی درخت کی آڑ ڈھونڈتا پھرتا تھا۔



مریم کو حویلی بہت اچھی لگتی تھی۔ شہر میں بھی وہ اسے یاد کرتی تھی۔ بچپن میں عادل کے ساتھ اس کی کبھی نہیں بنی تھی۔ ہمیشہ ان کے درمیان تکرار ہوتی تھی۔ ہمیشہ کھیل لڑائی پر ختم ہوتا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ کھیلتے ساتھ ہی تھے۔

پھر شعور آتے آتے اسی حویلی کی بھول بھلیاں میں نہ جانے کب وہ عادل کی اسیر ہو گئی۔ کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ کم عمری میں آدمی دل سے کیسا بے خبر ہوتا ہے۔ اور جب خبر ملتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ یہ تو برسوں پرانی خبر ہے۔

پھر نہ جانے کیسے، بڑوں کے درمیان بات چلی اور ان کے حق میں فیصلہ بھی ہو گیا۔ پھر

شنا جا رہا تھا کہ چند ماہ بعد عادل کی تاریخ پکی ہونے والی ہے۔ مریم کے ساتھ۔ میں کئی بار ان کا نام زادی تھا... عادل کی طرح۔ لیکن میں کہیں بات نہیں کرتا تھا۔ اپنے گھر میں بھی نہیں کہہ رہا تھا۔ بڑے بچے اور محبت والے تھے۔ مجھ میں اور عادل میں بہت فرق تھا۔ میں اندر سے سیاہ تھا اور وہ اندر سے روشن۔ کون سا کون سا ماننا کہ روشنی مل جائے تو میں بھی اندر سے روشن ہو سکتا ہوں... عادل سے بھی زیادہ روشن!

سو میں ان دنوں انگاروں پر چلتا تھا، اور آبلے دل کے تلوں میں پڑتے تھے۔ میں تو کبھی تڑپا ہی نہیں تھا۔ طلب کی شدت سے آشنا ہی نہیں تھا۔ شکار میں لطف ہی نہیں تھا۔ نہ ہرنیوں کے پیچھے بھاگتا پڑتا تھا، نہ بندوق تان کر نشانہ لینا پڑتا تھا۔ وہ تو مجھے دیکھتے ہی ڈھیر ہو جاتی تھیں۔ مگر مریم... آہ مریم!

جو شدت، جو تڑپ میرے اندر سے مریم کے لیے پھوٹی تھی، وہ میرے لیے بالکل نئی تھی۔ اس میں ناکامی کا خوف بھی

تھا... اور زندگی کے پہلے پہل خوف میں لذت بھی عجیب تھی۔ بہت دن میں نے اس پر نظر رکھی۔ آخر ایک دن اسے تنہا پا کر میں نیکر کے درخت کے پیچھے سے نکل آیا۔

مریم خالص گاؤں کی لڑکی نہیں تھی، شہر میں رہ کر آئی تھی۔ پھر حویلی کی باسی تھی۔ وہ تو نو ذرا سکتی تھی اور نہ ہی ڈھیر ہو سکتی تھی۔ البتہ وہ چونکی ضرور ہوگئی۔

”مریم، تم اس شادی سے انکار کر دو۔“ میں نے بکھرتے لہجے میں اس سے کہا۔

وہ ہلکی سی ہنسی۔ اس نے بہت رمان سے استفسار کیا۔

”کیوں؟“

”کیوں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں... بہت زیادہ۔“

”تم اور محبت؟ ہنہ... میں نے بہت چرچے سنے ہیں تمہاری محبتوں کے۔“

”وہ... وہ محبت نہیں تھی۔ محبت تو مجھے اب ہوئی ہے۔ میں تمہارے بغیر جی نہیں سکتا۔“

”تم تو محبت کو سمجھ بھی نہیں سکتے۔“

”کیوں نہیں سمجھ سکتا۔ جب ہوئی نہیں تھی تو سمجھنا بھی نہیں تھا۔ اب ہوگئی ہے تو سمجھنا بھی ہوں۔“ میں نے بے حد عاجزی سے کہا۔

”خیر... مجھے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔

”بس تم اس شادی سے انکار کر دو۔ میں تمہیں دکھا دوں گا کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ اور محبت کو کتنا سمجھتا ہوں۔“

وہ ایک دم برہم ہوگئی... جیسے انگارہ۔ اور بھی خوب صورت ہوگئی وہ۔ ”جو اس مت کرو!“

”دیکھو تو، میرا کیا حال ہو گیا ہے۔ میں ایسا تو نہیں تھا۔“

”میں رشتے میں تمہاری بھائی بن گئی ہوں۔ شرم کرو!“

”بھائی تو جب لگو کہ میں عادل کو بھائی سمجھوں۔ میں تو اُسے رقیب سمجھتا ہوں۔“

”رقیب ہونے کے لیے بڑا دل، بڑا ظرف چاہیے۔ تم تو اشتہار بنے پھرتے ہو۔ کیا مجھے تمہارا پتا نہیں چلا اتنے مہینوں میں۔“

”پتا بھی ہے کہ میں کیا سے کیا ہو گیا، تو اس کا ہی کچھ خیال کرو۔ میں ایسا تو نہیں تھا۔“

”اسی سے تو پتا چلا کہ تمہیں محبت کرنی آتی ہی نہیں۔“ وہ کس طرح بھی پک نہیں رہی تھی۔

”برسوں سے جانتی ہو کہ میری عادت ناگنا نہیں، لیکن لینا ہے۔“ میں نے اپنی عاجزی نہیں چھوڑی۔ ”مگر یہ معاملہ میرے لیے کچھ عجیب، کچھ نیا ہے۔ اسی لیے تمہارے دروازے پر ہاتھ دیا۔“

”میں بس سا ہو کر کھیت کی منڈ پر بیٹھ گیا۔“

”تم کسی بھول میں نہ رہنا۔ مریم، عادل ہی کی ہے۔ اور رہے گی۔“ وہ تنقید کرتی واپس مڑ گئی۔

”یہ انگلیوں کو کیا کر لیا تم نے؟“ عادل گتے لے کر آیا تھا اور اُس سے پوچھ رہا تھا۔

”زردہ پکا رہی تھی۔ آپ کو دیکھا تو دل کے رنگ انگلیوں پر چڑھ گئے۔“ یہ کہہ کر وہ جھپٹ سے پھر باورچی خانے میں چلی گئی۔

عادل کو زردہ سے ایسی رغبت نہیں تھی۔ لیکن جو زردہ دل کے رنگ انگلیوں پر چڑھا دے، وہ کھانے سے کون باز رہ سکتا ہے۔ اس نے چچی کو پکارا۔ ”چچی... زردہ ضرور کھاؤ۔“

”یہ کہہ کر وہ برآمدے کی طرف چل دیا۔“

کانک کے مہینے میں شادی طے پاگئی!

حویلی تو سب کی مشترک تھی۔ زمین جائیداد تینوں بھائیوں کی تھی۔ عادل کے والد حشمت سب سے بڑے تھے۔ مریم کے ابو وجاہت سب سے چھوٹے تھے۔ انہوں نے اپنی زمین بڑے بھائی کے ہاتھ فروخت کر کے شہر میں کاروبار جما لیا تھا، اور اس میں بہت کام یاب رہے تھے۔ دلاور کے والد شجاعت بیٹے کی بد معاشیوں کی وجہ سے آئے دن تھانے کچہری میں الجھ رہے تھے۔ ان کی اچھی خاصی زمین بک چکی تھی۔ لیکن خاندان میں اتفاق تھا۔ لہذا گھر کی بات گھر میں ہی رہی تھی۔ بڑے بھائی انہیں کوئی کمی نہیں ہونے دیتے تھے۔

حویلی مشترکہ تھی۔ مگر بیٹی کی بات پکی ہونے کے بعد وجاہت نے اپنے حصے میں دیوار کھینچوا دی تھی۔ جب کہ حشمت اور

شجاعت کا صحن اب بھی ایک تھا۔

عادل گھر کا بڑا بیٹا تھا۔ حویلی میں جیسے خوشیاں ابھی سے اتر آئی تھیں۔ مریم ہفتے میں دوبار شہر جاکر خریداری کرتی۔ عادل کا بھی یہی حال تھا۔

حویلی میں ہر وقت چہل پہل رہتی تھی!

میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تو نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ میرا نام دلاور تھا، اور میں نام کا ہی دلاور نہیں تھا۔ یار دوستوں کی کمی نہیں تھی، اور میں ہمیشہ ان کے کام آتا رہتا تھا۔ کون تھا جس پر میرے احسان کا بوجھ تھا؟

یاروں کو ضرورت پڑے تو کام آتے ہی ہیں۔ انہیں میرے کام تو آتا ہی تھا۔ حویلی کی کچھ گلیں اور وہ سوگ وار ہوگئی کیسی شادی، کہاں کا کیا ہ۔ عادل ہسپتال میں پڑا تھا۔ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ اب وہ عمر بھر لنگر لگا کر چلے گا۔ کبھی نارل نہیں ہو سکے گا۔

اور میں نے تو ابھی مریم کے نام کا صرف ایک تیر چلایا تھا۔ ترکش تو بھرا ہوا تھا!

اس خوشی میں میرے ذمے بڑے پرچش ہو رہا تھا۔ یار لوگوں نے شہر کے راگنی کو بلوایا تھا۔ سنا تھا، وہ ناچتی ہے تو کائنات جھومتی ہے۔ شہر کے ناچنے لگتی ہے۔ بڑے چرچے تھے اس کے۔ اور وہ موقع سے بڑھ کر ہی ثابت ہوئی۔ چنانچہ ہم سب منہور تھے۔ جشن عروج پر تھا کہ فضل بابا ہاتھ پاندھے ہال میں چلا آیا۔ مجھے اپنی محفل میں مداخلت ہمیشہ بری لگتی تھی۔ میں نے کڑے تیوروں سے اسے دیکھا۔

”چودھری جی، کوئی عورت آپ سے ملے آئی ہے۔“ وہ گڑگڑایا۔

اس وقت... اور کوئی عورت! ”کون ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم مالک۔ وہ برقع میں ہے۔“

”کہہ دو، کی اور وقت آئے۔“

”وہ کتنی ہے مالک اگر آپ باہر نہیں آئے تو وہ خود اندر آجائے گی۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ دلاور کو ایسا پیغام بھجووانے کی ہمت کون عورت کر سکتی ہے۔

”جاؤ یارا... تمہارے تو مزے ہو گئے۔“ ایک دوست نے چٹکی لیتے ہوئے کہا۔

مگر مجھے تشویش بھی تھی اور تجسس بھی۔ میں ہال سے نکلا۔ وہ برآمدے میں کھڑی تھی۔ ”کون ہو تم؟“ میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

”تمہیں بھی میرے تعارف کی ضرورت ہے چودھری دلاور؟“ آواز نئی کہ سانپ کی پھونکار۔

میرا سا رشتہ برن ہو گیا۔ ”تم یہاں کیوں آئی ہو؟“ میں اس کے سامنے پھر عاجز بن گیا۔

”تم جو بھی کر سکو، کرلو۔ میں بھی مریم ہوں۔ بتاؤ، ہماری حویلی سے آج تک کوئی عورت ڈیرے پر آئی ہے؟ کوئی نہیں نا! لیکن میں مریم ہوں۔ کہانا، میں مریم ہوں۔ اس بار تمہاری فکر برابر کی ہے۔ تم نے مجھے شاد، نازی اور مسرت کی طرح سمجھ لیا جو تمہارے پیچھے پیچھے پھرتی ہیں۔ نہیں، میں وہ نہیں ہوں۔ ذرا سوچو، میں آج سب کے سامنے تمہارا نام لے دوں تو تمہارا کیا ہو۔ مگر میں تمہیں موقع دے رہی ہوں۔ کچھ رشتوں کا پاس کرو۔ آنکھوں پر ہوس کی چٹی چڑھا کر اندھا دھند نہ دوڑو۔ سنبھل جاؤ۔ آئندہ کبھی عادل کے رستے میں نہ آنا۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“

میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ انکار کرنے کی، مگر نے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی اس نے۔

”اور شکر کرو کہ فضل بابا کے سامنے نقاب نہیں اٹھائی میں نے۔“ یہ کہہ کر وہ آندھی کی طرح اسے شرمندگی میں اڑا لے گئی۔

مریم سب کے ساتھ آتی اور عادل کی حالت دیکھ کر روتی رہتی۔ اس کی ٹانگ پر پلاسٹر چڑھا تھا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ پلاسٹر اتار کر پھینک دے، اور اس کے زخموں پر اپنی کھال کی پٹیاں لپیٹ دے۔

”یہ سب ہوا کیسے؟“ سب لوگ عادل سے پوچھتے۔

”غلطی میری ہی تھی۔“ وہ نظریں جھکا کر کہتا۔

”پھر بھی، کچھ بتاؤ تو... کیا ہوا تھا؟“

”مجھے کچھ پتا ہی نہیں کہ کیا ہوا ہے میرے ساتھ۔“ وہ بے بسی سے کہتا۔

”یہ کیسے ممکن ہے! تمہاری آنکھیں تو کھلی ہوئی تھیں نا؟“

کھلی ہوئی تھیں نا؟

اس پر اور بعد کے تمام سوالات پر وہ چپ ساہہ لیتا... آنکھیں بند کر لیتا۔ ایک دن اکیلے میں مریم کو موقع مل گیا۔ اس نے اس سے وہی سب کچھ پوچھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔ چند لمحے بعد اس نے کہا۔ ”تم یقین نہیں کرو گی۔“

”کیوں نہیں کروں گی۔ تمہاری تو ہر بات پر یقین ہے مجھے۔“

”میں تمہارے لیے شاپنگ کر کے لوٹ رہا تھا۔ تمام چیزیں میں نے ساتھ والی سیٹ پر پھیلا کر رکھ دی تھیں۔ پھر میں تصور میں وہ سب کچھ تمہیں پہنا کر دیکھنے لگا۔ مجھے تو اب بھی لگتا ہے کہ وہ بس ایک لمحہ تھا۔ ہاں، شاید کچھ زیادہ طویل ہو گیا تھا۔ ایک دھماکا ہوا۔ اور مجھے کچھ پتا نہیں۔ آنکھ کھلی تو میں اسپتال میں تھا۔“

”عجیب آدمی ہو۔ جو تمہارا بوچکا ہے، اس کے تصور میں بے خود ہوجاتے ہو۔“ مریم نے بڑی محبت سے کہا۔

مجھے پہلی بار پتا چلا کہ بعض اوقات تیرے لئے بھی چل جاتے ہیں۔ ٹانگ عادل کی ٹوٹی تھی... مگر دل تو میرا جمہ گیا تھا۔ میں نے ہی سے تڑپتا تھا کہ یہ کیا ہو گیا۔ میری چال الٹی کیوں ہو گئی۔

وہاں تو اندھیر چ گیا تھا۔ مریم اپنے ماموں کے گھر میں مقیم تھی۔ ہر روز وہ عادل سے ملنے اسپتال جاتی... ہر روز اس سے محبت بھری باتیں کرتی۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کہاں جاؤں۔ نڈیرے میں دل لگتا تھا نہ یاروں کے درمیان۔ ”ارے... میں دلاور ہوں!“ میں مٹھیاں پیچ کر سوچتا۔ ”میں دلاور ہوں۔“ خف ہے مجھے پر! میں خود کو مرد کہتا ہوں۔ کیا ہو گیا تھا اس رات میری مردانگی کو۔ ارے... اٹھا کر پٹخ دیتا اسے اندر سہری پر۔ یہ دلاور حاصل کا زہر تو نکل جاتا میرے اندر سے۔ اس کے بار سانی کا زعم بھی ختم ہو جاتا۔

مگر اسی لمحے تو بہت کچھ میری سمجھ میں آیا۔ اس سے پہلے میں سینے کی طرف نگاہ کرتا تو وہاں مجھے گہرا... گہرا اندھیرا دکھائی

دیتا۔ لیکن اس لمحے وہاں روشنی کا ایک بہت چھوٹا سا نقطہ ہلکا ہلکا تھا۔ اسی لمحے تو پہلی بار میں نے محبت کو سمجھا۔ اگرچہ پوری طرح نہیں سمجھ سکا... اچھی طرح نہیں سمجھ سکا۔ پھر بھی میں نے اتنا سمجھ لیا کہ اس رات وہ سب کچھ بہت آسان تھا۔ لیکن میں کہ نہیں سکتا تھا۔ اس سے پہلے ہی مر جاتا۔

پھر بھی وحشت اتنی آسانی سے کہاں ختم ہوتی ہے۔ آگ کو سرد ہونے میں وقت تو لگتا ہے۔ میں اپنی ہی آگ میں جھلتا جلتا پھر رہا تھا۔ گھٹنوں ٹیوب ویل کے پانی میں نہاتا۔ پانی کی ٹھنڈ میری روح میں اتر جاتی۔ مگر ختم اسی طرح شعلوں میں گھر رہتا۔

ایک دو بار میں اسپتال بھی گیا۔ لیکن مریم جس طرح مجھے گھورتی تھی... آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی تھی، اس کی دیدہ دلیری نے مجھے... دلاور کو خوف زدہ کر دیا۔ اس کی نظریں دیکھتا تو میرا جی چاہتا کہ کیڑے کوڑوں کی طرح زمین پر ریڑھ لگتا شروع کروں۔ ایسی تحقیر... ایسی ذلت!

پھر مجھے اسپتال جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔

ہفتے، ماہ کے پرین کر اڑ گئے۔ گاٹوں میں تو موسم سرما ویسے بھی جلد ہی اپنی جھب دکھلاتا ہے۔ شامیں منڈیر پر زکٹیں، مگر ان کا ہاتھ تھامنے والا کوئی نہ تھا۔ مریم بولائی بولائی پھرتی۔ اب تو عادل کی محبت اور بھی گہری ہو گئی تھی۔ وہ تو مفروضہ بھی ہو گئی تھی اس کی۔ اسی کی وجہ سے تو دلاور نے یہ حملہ کیا تھا عادل کی جان پر۔ اگر خدا نکلا ہوتا... اس سے آگے اس سے سوچا نہ جاتا۔ بس وہ کچکا کر رہ جاتی۔

اسے فنگنگ سے بڑی دل چسپی تھی۔ وہ بڑی چاہت سے عادل کے لیے سویٹر بن رہی تھی۔ سویٹر کے ایک ایک گھر میں اس کی چاہت اور دعا تھی... عادل کی زندگی کے لیے۔ ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ اگلے ہفتے عادل کو ڈس چارج کر دیا جائے گا۔ نہ اسے گاٹوں میں چین تھا، نہ ماموں کے گھر میں۔ اس کا ایک بھائی کاروبار سنبھالتا تھا۔ دوسرا قانون پڑھ رہا تھا۔ والد نے تعلیم حاصل کرنے کے باوجود

اپنی زمین... اپنی روایات کی پاس داری کی تھی۔ مریم کو ابھی وہ آور پڑھانا چاہتے تھے۔ لیکن حشمت تایا کو شادی کی جلدی تھی۔ اس سے وہ مجبور ہو گئے۔

عادل نے بھی بی اے کے دوران ہی اس وقت پڑھائی چھوڑ دی تھی جب حشمت تایا کو بلکا سا ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا، بلکا بھاری کچھ نہیں ہوتا، ہارٹ اٹیک تو بس ہارٹ اٹیک ہوتا ہے۔ یہ سننے کے بعد عادل پڑھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اسے باپ کو ذمہ داریوں سے نجات دلانی تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ گاٹوں میں زمینوں کے معاملات خود سنبھالے۔ البتہ اس کے بھائی... اقصیٰ اور زویب اب بھی شہر میں اپنی پڑھائی میں مصروف تھے۔

خاندان میں سبھی نے تعلیم حاصل کی تھی۔ شجاعت صاحب کا البتہ سر جھکا رہتا تھا۔ دلاور نے میٹرک تو رو پیٹ کے کر لیا تھا۔ لیکن پھر انٹر میں تین سال ضائع کرنے کے بعد ہارٹ اٹیک لے لی تھی۔ بار کیا مان لی تھی، وہ اس میں خوش تھا۔ بس وہ تھا اور گاٹوں تھا... اور شکار! کبھی جنگل میں تو کبھی ڈیرے پر!

حدی حد ہوتی ہے کوئی۔ میں پہلی بار جان رہا تھا کہ میں جاہل ہوں۔ کوئی بے گنی کی بے گنی تھی۔ سارے شغل بے اثر ہو گئے تھے۔ شراب نشے سے عروسی اور شادیاں رنگینوں سے پہلی بار پتا چلا تھا کہ نشہ تو خون میں ہوتا ہے، شراب محض بہانہ ہے۔ اور رنگینی نظر میں ہوتی ہے، شراب محض ایک خاکہ ہوتا ہے۔ ہونٹ وہی تھے لیکن ہنسی نہیں تھی۔ یاروں کی باتیں کم سنائی پڑتی تھیں اور جو سنائی پڑتیں، وہ سمجھ میں ہی نہ آتی تھیں۔ کوئی بے زاری ہی بے زاری تھی۔ یار دوست تدبیریں کرتے کرتے ہار گئے میری بے زاری نہ دور کر سکے۔

پھر میں اکیلا بیٹھنے لگا۔ ٹھنڈی بڑی لگنے لگیں۔ میں جو اکیلا کبھی رہا ہی نہیں تھا۔ میں جو کہتا تھا کہ اکیلا تو میں مردوں کا بھی نہیں۔ اب اکیلا پن اچھا لگنے لگا۔ اکیلے بیٹھ کر سینے میں جھانکنا اچھا لگتا تھا۔ وہاں اندھیرے میں وہ روشن نقطہ

بھی تھا۔ کبھی وہ جھگڑتا کہ ٹھنڈک کا احساس دلاتا۔ مگر پھر اندر کی وحشت زور کرتی تو وہ چنگاری لگنے لگتا... جو پورے جنگل کو جلانے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ وہ روشن نقطہ نہ بڑھتا تھا، نہ مٹتا تھا۔ مجھے اس سے چڑھنے لگی۔ وہی تو میری زندگی تبدیل کر رہا تھا۔ اس نے مجھے عیش کی سبز وادی سے نکال کر بے کیفی کے صحرائں لایا تھا۔

حویلی میں آج صدقات دیے جا رہے تھے۔ عادل کو اسپتال سے آئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی۔ میں اس کا استقبال کرنے والوں میں سب سے آگے تھا۔ مریم کی نفرت اور حقارت بھری نگاہیں بھی مجھے نہیں ہٹا سکیں۔ عادل کو اب تمام عمر ایک اسٹک کے سہارے چلنا تھا۔ سب خواتین کی آنکھیں چھلک رہی تھیں۔ مرد حضرات عادل کو دلاسارے رہے تھے کہ جان ہے تو جہان ہے۔ اقصیٰ اور مریم نے رو رو کر اپنا برا حال کر لیا تھا۔ ایک میں ہی خوش تھا۔

اس کیفیت کی خوشی میں بھگ کر میں نے اندر جھانکا تو سینے کا وہ روشن نقطہ بجھا ہوا تھا۔ میں اور خوش ہو گیا۔ مدت کے بعد میں نے خود کو پہلے جیسا محسوس کیا۔ اور فوراً ہی شکار پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جنگل مجھے بلارہے تھے۔

وہ اقصیٰ کے ساتھ عادل کے پاس آئی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں اُداس سا بیٹھا تھا۔ وہ دونوں اس سے ہلکی پھلکی گفتگو کرتی رہیں۔ لیکن اس کی اُداسی کے خول کو نہ توڑ سکیں۔ وہ تو جیسے مسکرانا بھی بھول گیا تھا۔

اقصیٰ سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ بہانہ کر کے چلی گئی۔

”کچھ بولو نا۔“ مریم نے کہا۔

”ہاں، بولنا تو ہے۔ یہی تو سوچ رہا ہوں۔“

”مجھ سے بات کرنے کے لیے سوچنا بھی پڑتا ہے۔“

”ہاں، اب تو ایسا ہی ہے۔“

”اب ایسا کیا ہوگا؟“

”دیکھ تو رہی ہو، میں اب نارمل نہیں رہا۔“ عادل نے اُداسی سے کہا۔

مریم نے اسے سر سے پائوں تک گھورا۔ ”بہ ظاہر تو اب نارمل نہیں لگتے۔“

”اب ایسا کیا ہوگا؟“

”مذاق مت کرو۔ میں سنجیدہ ہوں۔“
مریم بھی سنجیدہ ہو گئی۔ ”تو چاہتے کیا ہو؟“
”تم اپنا راستہ بدل لو۔ میں ابا جان سے بات کرنے والا ہوں۔“
”کیوں... مجھ میں کوئی کمی واقع ہو گئی؟“
”کمی تو مجھ میں ہے۔ تم میں کمی کہاں...“
”تو یوں کہو کہ مجھ میں کمی دیکھنا چاہتے ہو۔“
”کیا مطلب؟“
”تمہارے بغیر تو میں پوری ہی کم ہو جاؤں گی۔“

وہ تڑپ گیا۔ ”دیکھو، تم...“
”سیدھی سی ایک بات پوچھتی ہوں تم سے۔ جواب سچا چاہیے۔ اگر یہ حادثہ میرے ساتھ ہوا ہوتا تو کیا تب بھی تم...“
عادل نے بے ساختہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”ایسے نہ کہو پلیز!“
”میری محبت کوئی اچانک ہونے والی چیز نہیں۔ اس کی بنیادیں تو شعور کے ساتھ ساتھ گہری ہوئی ہیں۔ تم نے سوچا بھی کیسے...“
وہ اس کا ہاتھ تھام کر رو دی۔ ”میں تمہارا سہارا بنوں گی۔ تم ایک قدم اٹھانا، دوسرا میرا دل بن جائے گا...“
عادل محبوبیت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

میرے تو گمان میں بھی نہ تھا کہ میں شکار پرنگوں کا اور میرے پیچھے مریم اور عادل کی شادی ہو جائے گی۔ شادیاں ایسے کب ہوتی ہیں! پھر ہمارے خاندان میں تو وہ پہلی شادی تھی۔ میں نے شکایت کی کہ مجھے اطلاع بھی نہ دی۔ لیکن شکایت بھلا جواز تھی۔ شکار کے دوران میرا کوئی ایک ٹھکانا تو ہوتا نہیں تھا۔ اور میری چارج نہ ہونے کی وجہ سے میرا تیل خوں بھی بند ہی رہتا تھا۔

اس پرستم یہ کہ میں واپس آیا تو وہ ایک دن پہلے ہی مون

کے لیے نکل چکے تھے۔ بنی مون!
”شادی کے اگلے دن ہی وہ روانہ ہو گئے بابا جان؟“ میں نے حیرت ظاہر کی۔
”دراصل عادل مجھ بجھا تھا۔ اب شادی کر کے تو خوش ہونا چاہیے بندے کو۔“
”تو؟“
”ڈاکٹر نے کہا، ماحول تبدیل ہوگا تو بہتری آئے گی۔“
”اور وہ گئے کہاں؟“
”شمالی علاقوں میں۔“
”نہنہ... عادل کوئی بی بی ہے کیا کہ ماحول کی تبدیلی سے فرق پڑے گا۔ ڈاکٹر تو پاگل ہیں۔“ میں نے نفرت سے کہا۔
بابا جان حیرت سے مجھے دیکھنے لگے۔

شمالی علاقے... ارضی جنت، جیسے خوب صورت خواب! پھر مریم کا ساتھ۔ فرق تو پڑنا ہی تھا۔ عادل کا دل بہل گیا۔ وہ تو سب سے روٹھی ہوئی مسکراہٹیں لوٹ آئیں، جیسے موسم کی سختی سے گھبرا کر کوچ کر جانے والے پرندے موسم بدلتے ہی اپنے ٹھکانوں کا رخ کرتے ہیں۔

وہ نسبتاً آسان ٹریک پر جاتے۔ عادل کا اعتماد بھی بحال ہونے لگا اور ان کی خلوتیں اتنی حسین اور خواب ناک ہوتیں کہ ان کے سامنے نارن کا حُسن ماند پڑ جاتا۔ اور مریم اس پر نثار ہوتی۔ اس کی وارفتگی سے عادل کو لگتا کہ رنگ، روشنی اور خوش بوئیں اسے اوڑھ لیتی ہیں۔ وہ جب بھی اسے چھوتا، وہ پہلچھڑی بن جاتی۔ وہ سوچتا، اس کے جلنے بجھنے کے ڈھنگ جگنو کیا جانیں، اس کے روشن رنگ ستارے اور چاند کیا جانیں۔
وہ دونوں ہی فلاح تھے، دونوں ہی مفتوح۔ جذیبوں کا مالِ غنیمت جتنا وہ لفافے، اتنا ہی بڑھتا...

حویلی کی روایت تھی کہ ہر ہفتے تینوں بھائیوں کی فیملیز رات کا کھانا تاپا ابوکے گھر کھاتیں۔ میں اب اس میں ضرور

شریک ہوتا۔ اُن کی خیر خیر مل جاتی۔ عادل کا تو تیل نمبر میرے پاس تھا۔ سنا تھا، اس نے مریم کو بھی تیل فون گفٹ کیا ہے مگر اس کا نمبر کسی کے پاس نہیں تھا۔ عادل کا نمبر بھی کبھی نہیں ملا۔ شاید وہ بند رکھتا ہوگا۔ کیوں؟ اس خیال سے ہی میرے سینے پر سانپ لوٹ جاتے۔

ان کے پاس وقت اور وسائل کی کیا کمی تھی۔ پہاڑوں میں جتنا عرصہ بھی رہتے، کم تھا۔ میرے لیے مگر ایک ایک دن بلا تھا، ایک ایک رات قیامت تھی۔

گاؤں میں نازلی کی شادی ہوئی۔ وہاں بڑی من موچی کی۔ گھڑی دو گھڑی دل بہل گیا۔ مگر پھر ایک رات مریم کو خواب میں دیکھ لیا تو رات کو اٹھ کر اتنے بڑے محن میں سردی کے باوجود پھر تار پڑ گیا۔

”اگر تم نہ ملتے تو میرا کیا ہوتا؟“ مریم نے سرشاری سے کہا۔
”تمہارا تو مجھے نہیں پتا... لیکن بھئی، میں تو بہت پچھتا رہا ہوں۔“ عادل نے سرد آہ بھرتے ہوئے سرگوشی کی۔

”پچھتا رہے ہو؟“ مریم کو جیسے کرنٹ لگا۔ وہ تیزی سے اس سے دُور ہو گئی۔

”بس مامو، اور ساری عمر پچھتاؤں گا کہ اتنی زندگی تمہارے بغیر کیوں گزاری۔“
عادل نے دوبارہ اسے لپٹا لیا۔
”بڑے بکواسی ہو تم“ وہ ناز سے بولی۔
”تم نہ بھی ملتیں، میں نے پھر بھی تمہیں ہی پانا تھا۔ یاد ہے، بچپن میں کتنا لڑتی تھیں تم مجھ سے۔“

”یاد ہے۔ لڑتے تو تم تھے۔“
”میری ہر چیز پر قبضہ جمالیتی تھیں...“
”اور اب تم پر... پورے تم پر میرا قبضہ ہے۔“ وہ اس کے چہرے پر جھکی اور ہلکے سے کاٹ لیا۔

”ظالم بھی ہو۔“ وہ کراہا۔
”وہ تو ہوں۔“ مریم نے دوسری طرف سے بھی کاٹ لیا۔

”پتا ہے، جب تم اپنے ماموں کے گھر رہنے

گچھرے

...اپنے چہرے پر مسکراہٹ کا میک اپ اس خوب صورتی سے کرو کہ چہرے سے دھکوں اور غموں کی دھول کسی کو نظر نہ آئے۔

...زندگی کی مصیبتیں کم کرنا چاہتے ہو تو زیادہ سے زیادہ مصروف رہو۔

...سب سے محبت کرو مگر کسی سے محبت کی توقع نہ رکھو۔
...فکر کرنے سے کیا فائدہ... اپنی فکر کو روڑی کی نوکری میں پھینک دو اور مسکراؤ۔

...لوگوں سے اس طرح میل جول رکھو کہ اگر تم زندہ رہو تو تم سے ملنا چاہیں اگر مر جاؤ تو تمہارے لیے روئیں۔

...کسی کو دل کی گہرائیوں سے مت چاہو کیونکہ اب اس زمانے میں یہ بھی سی محبت نہیں رہی۔

...زندگی محبت کے لیے کم ہے نہ جانے لوگ نفرت کے لیے وقت کہاں سے نکالتے ہیں۔

...زندگی میں اچھے کام کرو... موت کے بعد یاد رہو گے۔
...تم مسکراتے رہو، زندگی خود بخود مسکرائی نظر آئے گی۔

ابنِ حسن عثمان آبادی کے کلمے

چلی گئیں تو مجھے تمہاری کمی محسوس ہونے لگی۔ اس کمی نے میرے اندر ایک احساس جگایا۔ جب بات سمجھ میں آئی تو میں نے ابا جان سے بات کی...

”کیا کیا تم نے...“ مریم نے اس کے ایک مکا جڑا۔ ”کیا سوچا ہوگا تاپا جان نے؟“

”کچھ بھی نہیں سوچا۔ کہنے لگے، یہ تو میری بھی خواہش ہے۔ اب اپنا گھرانا تو تم جانتی ہو نا کہ بے بی مثالی۔“

مریم کو میرا خیال آیا۔ مگر وہ کچھ بولی نہیں۔ وہ عادل سے اس کا تفاخر چھیننا نہیں چاہتی تھی۔ چپ چاپ اس کے سامنے وجود کی سپر ڈال دی۔

بادل زمین پر اتنے بوئے تھے، اور وہ اُن کے

درمیان اٹھلاتی پھر رہی تھی۔

”بیٹھ جاؤ اور سنجیدگی سے میری بات سنو۔“ عادل کے چہرے پر گھمبیرتا تھی۔

وہ کچھ ڈر سی گئی۔ ”کیا بات ہے؟ خیر تو ہے؟“ اُس نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”خیر تو بس اس میں ہے کہ مجھے ایسے بچے چاہئیں۔“ عادل نے کچھ فاصلے پر کھیلنے سرخ و سفید مقامی بچوں کی طرف اشارہ کیا۔

مریم کا چہرہ تمنا اٹھا۔ ”مٹا دھو رکھو۔“

”اور پہلے بیٹا۔“ وہ اور شریر ہوا۔

”عادل، باز آجاؤ۔“

”ابھی موڈ نہیں ہے تو پھر انہیں ہی ساتھ لے چلو۔“ وہ بہلا باز آنے والا تھا۔

”نہیں... ابھی موڈ نہیں ہے۔“ اس نے جیکٹ کی زپ بند کرتے ہوئے کہا۔

”چلو... اچھا ہے۔“ عادل نے پیلٹرا بدلا۔

”ابھی میرے اور تمہارے بیچ کوئی تیسرا نہ آئے۔“

”وہ تو آ بھی گیا۔“ مریم نے رخ پھیرا اور گنگنائی۔

”سچ! کیا کہا؟“ وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”وہی... جو تم نے سنا۔“ وہ انگلیوں سے وکٹری کا نشان بناتی واپسی کے راستے کی طرف پلٹی۔

راستے جو بہت حسین تھے... ہم سفر جو بہت پیارا تھا۔ محبت ساتھ ہو تو کچھ بُرا ہو سکتا ہے بہلا۔

حویلی میں آج پھر جشن کا سماں تھا۔ تین ماہ بعد وہ دونوں لوٹ آئے تھے۔ ان دونوں پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ قربتوں سے لبالب بھرے ان کے وجود... ان کی نئی نئی درود پوار کے سانے ختم کر دیے تھے۔

”بہت مبارک ہو عادل اور مریم۔“ میں بھی ان کی طرف لپکا۔

”یونہی خالی ہاتھ مبارک باد۔“ عادل نے مجھے چیخا۔

”جی، وہ تو ادھار رہا۔ تم نے چپکے سے شادی کر لی۔“

بتائے بغیر ہی۔

”چلو اگلی بار بتا کر کریں گے۔“ عادل کھلکھلایا۔ پہاڑی دواؤں سے بچ کر اس آگئی تھی۔ ”مگر اب تو ہم آگئے ہیں۔“

”آئے بھی بغیر بتائے ہو۔“ تھو تھو جی مل جانے کا... میں نے کہا۔ پھر مریم کی طرف مڑا۔ ”تم کیسی ہومریم... ٹھیک ہونا؟“

”نام نہ لو میرا۔ اب میں تم سے بڑی ہوں رشتے میں۔ اب بھائی کہا کرو مجھے۔“ اس کے لہجے کو صرف میں ہی سمجھ سکتا تھا۔

”کیوں بھی، تم بڑی کیسے ہو گئیں مجھ سے؟“

”عادل تم سے بڑے ہیں نا، اور اب میں سسر عادل ہوں۔“

”اوہ... مگر مجھے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ میں نے نخوت سے کہا۔

ذرا دیر بعد عادل ادھر ادھر ہوا تو میں نے مریم کو کچھ کہنے کا موقع دے بغیر کہا۔ ”بڑا روپ آیا ہے تم پر۔“

وہ فوراً ہی ڈٹ گئی۔ ”محبت کا کرشمہ ہے۔“ اس نے کہا اور فوراً ہی جوابی حملہ کیا۔ ”اور تمہارا روپ رخصت ہو رہا ہے۔“

خامسے خزاں رسیدہ لگ رہے ہو۔“ مجھے چپ ہوتے ہی بن پڑی۔

مگر وہ رکنے والی کہاں تھی۔ ”وہی سوال کیا تھا، خود ہی جواب بھی دے دیا۔“ یہ ہوں کا کرشمہ ہے نا، یہ کہہ کر وہ تیزی سے اٹھ کر طرف چلی گئی۔

میں نے نہیں سوچا تھا کہ اذیت کو تو اور بڑھ جائے گا۔ وہ دونوں دور تھے تو محض تڑپ ہی تھی۔ اب تو میرا روم بوم جلتا تھا۔ کوئی نہ کوئی ان کا تذکرہ کر رہی دیتا۔ ایک ساتھ کتنے اچھے لگتے ہیں... کتنے خوش ہیں... عادل ٹانگ کی محرومی سے بھی بے نیاز ہو گیا ہے۔

ہمارا سخن بھی مشترک تھا۔ رات کو دیر تک ان کے بیڈروم میں زیر و کباب لب روشن رہتا، اور اس کی روشنی مجھے کہانیاں سناتی۔

اب وہ باتیں کر رہے ہوں گے... اب باتوں میں ہاتھ ہوگا... اب وہ عادل کے سینے پر ہوگی... اب... اب... اور یہ اب اب کی گردان مجھے پاگل کر دیتی... میں وحشت سے نڈھال ہو جاتا۔ اپنا سینہ نوچتا رہتا۔

پھر ان راتوں میں کئی بار میں شادو سے اور مسرت سے ملا۔ عجیب حال تھا میرا۔ کتنی تو انہیں چھوئے کو بھی دل نہیں

چاہتا۔ یونہی رخصت کر دیتا۔ وہ مایوس ہوتیں۔ اور کبھی انہیں اس شدت سے برتا کہ وہ سسکے لگتیں۔

مگر خوشی اور لذت کا کوئی زاویہ بھی نہیں تھا۔

مریم کے سیل فون کا نمبر میں نے اس چالاکی سے حاصل کیا کہ کسی کو پتا بھی نہیں چلا۔ اس کے لیے خاص طور سے ایک

بسم بھی حاصل کر لی۔ اس بسم سے اکثر اسے حب حال اشعار سینڈ کر دیا کرتا تھا۔ جواب تو کہاں آتا تھا۔ بس دل کی شورش کچھ کم ہو جاتی تھی۔ سینے کی آگ کچھ ماند پڑ جاتی تھی۔ سرد ہونے

والی تو خیر تھی نہیں۔ یہ جانتا تھا کہ وہ جاتی ہے کہ شعر بھیجے والا کون ہے۔

عادل کو خرم... کتنی بھی میں اٹھتی تھا اس لیے وہ زویب اور اقصیٰ کے ساتھ کچھ دن کے لیے شہر چلا گیا کہ چپک اپ وغیرہ کرانے میں آسانی ہوگی۔ مریم کو پتا نہ چلا کہ اس کے

ساتھ جانے نہیں دیا کہ پہلا پہلا معاملہ ہے۔ ایسے میں احتیاط ضروری ہوتی ہے۔ پھر ان کی پہلی ڈاکٹر دوسرے دن اسے چپک کرنے کے لیے آتی تھی۔ حالانکہ ابھی ایسی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مگر ناز برداری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

”دو دن بھر آسمان صاف رہا تھا۔ لیکن شام کو کالی گھٹا گھبرا کر ان کو ہم سے شروع ہوئی اور اس کے بعد جل تھل کر ڈالا۔“ میں خوش ہو گیا۔ سمجھو، آج تو میری لاٹری نکل گئی۔ آج تو چاند میری دست رس میں تھا۔

دروازہ لاک نہیں تھا۔ ہر رات وہ عادل کا انتظار کرتی تھی۔ اس موسم میں بھی اس نے آس نہیں چھوڑی تھی... رنجوں کو ہرا کرنے والے، پرانے رنجوں میں سیسے جگانے والے اس موسم میں بھی اس نے یہ نہیں سوچا کہ یہ موسم خواہشوں کو بے لگام کر دینے والا بھی ہوتا ہے۔

میں نے مین سوچ بند کر دیا تھا۔ برسات کی وجہ سے بجلی تو ویسے ہی غائب تھی۔ مگر وہ غلط وقت پر آ بھی سکتی تھی۔ اور یہ میں نہیں چاہتا تھا۔ میرا ڈیل ڈول عادل جیسا ہی تھا۔ اور آواز کی مشابہت بھی۔ اگر میں سرگوشی میں بات کرتا تو مریم فرقی نہ کر پاتی۔ صبح جو ہوتا سو ہوتا۔ بات تو اب کی تھی... اس شب کی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھی۔ ”ایسے موسم میں تم کیسے آگئے عادل؟“

”بس آ گیا تمہارے لیے۔“ میں نے سرگوشی کی۔

”کچھ کھاؤ گے؟“

”تم ہی کافی ہو۔ اور کچھ نہیں چاہیے۔“ میں نے اس کا

ہاتھ پکڑ لیا۔

”ڈاکٹر نے کیا کہا؟“

”کچھ نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔ بس تھک گیا ہوں۔ اپنی پوروں سے میری ٹھکن چن لو۔“ میں نے کہا۔

پھر میرا ضبط جواب دے گیا۔ میں دیوانہ وار اس کا ہاتھ چومنے لگا۔ کیسا سٹھاس تھا اس کا... تیلیوں کے پروں جیسا۔ کیسی خوش بو تھی اس کی... چپا جیسی۔ میں تو اس کی مہک سے ہی مدھوش ہو گیا۔ اس ایک لمحے میں کتنے سانس لے لیے... کتنی عمر جی لی میں نے!

مگر جب میں نے اسے بازوؤں میں بھرنا چاہا تو اسے کرنٹ سا لگا۔ وہ ایک دم بیڈے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”تم... تم... تم... دلاور! تمہاری یہ جرأت...! اس کی آواز کا پٹنے لگی۔

”ہاں، میں... بد نصیب دلاور۔ تم دن کے اجالے میں نہیں ملتی تھیں۔ اب پتا چلا کہ تم رات کے اندھیرے میں بھی نہیں ملتی ہو۔“ میں اس کی طرف بڑھا۔

”رُک جاؤ... ورنہ میں شور مچا دوں گی۔“

”میں تو ہوں ہی بدنام۔ عزت والی تو تم ہو۔“

”تم مجھے گولی مار دو۔ مگر میں تمہاری کینٹی فطرت کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالوں گی۔“

”تمہیں مارنا کون بد بخت چاہے گا...“

”دیکھو... میرے ہاتھ کے پاس اسٹاکم ہے دلاور...“

وہ ہلک ہلک کر رونے لگی۔ ”کیوں خاندان کو توڑنے پر تلے ہو۔“

نکل جاؤ میری زندگی سے۔“

میں ساکت کھڑا رہی اسے اسے دیکھتا رہا۔

”دلاور... دروازہ کھول دلاور...“

ماں کی آواز نے مجھے دہلا دیا۔ اب یہ کیسے ممکن تھا کہ دروازہ نہ کھولتا میں۔ ”ماں... تم...!“

”ہاں... میں ماں ہوں تیری۔ سارے تیور پہچانتی ہوں تیرے۔“ نکل یہاں سے۔“

میری تو سندھ بدھ ہی جاتی رہی۔ پیاس اور غصے سے کھولتا، میں اسے کمرے میں آیا۔ اور چیخ چیخ کر رونے لگا۔

سارے کمرے کو بھس بھس کر دیا میں نے۔ کوئی چیز سلامت نہیں رہی۔

ماں مریم کے ہی کمرے میں رک گئی تھی شاید...

مریم کئی دن بستر سے نہ اٹھ سکی۔

265

فروری 2010

پھر ان راتوں میں کئی بار میں شادو سے اور مسرت سے ملا۔ عجیب حال تھا میرا۔ کتنی تو انہیں چھوئے کو بھی دل نہیں

264

فروری 2010

خوف اس کے دل میں بیٹھ گیا تھا۔ اوپر سے ہاتھ ناپاک ہونے کے وہم میں مبتلا ہو گئی۔ بار بار جاتی اور ہاتھ دھوتی۔ عادل پریشان ہو گیا اس کی طرف سے۔

وہ کسی کو کچھ بتا نہیں سکتی تھی۔ ایک تو چھوٹی تائی کا احسان تھا اس پر۔ انہوں نے ہی تو اسے بچایا تھا، ورنہ... دوسرے وہ زبان کھولتی تو خاندان کا شیرازہ بکھر جاتا۔

پورا گھر پریشان ہو گیا اس کے لیے۔ تائی اماں صدقہ خیرات کرتی رہتیں۔ آخر یہی طے پایا کہ اسے شہر والے گھر شفٹ کر دیا جائے۔

اس سے بہت فرق پڑا۔ وہاں مریم بڑی حد تک بہل گئی۔ شام کو وہ عادل کے ساتھ پارک چلی جاتی۔ عادل نے بہت کُریدا مگر اس نے کچھ بتا کر نہیں دیا۔ اس کی طبیعت کے پیش نظر عادل نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔

عادل کے حادثے کے بعد سے میں نے کبھی دوستوں سے مدد نہیں لی تھی۔ مریم کی بات میں دیے بھی کسی سے نہیں کر سکتا تھا۔ اس واقعے کے بعد تو میں دوستوں سے دُور ہی ہو گیا۔ کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔

تجہائی مجھ میں تبدیلی لائی۔ میں سوچنے والا جانور بننے لگا۔ سینے میں جھانکتا تو وہ روشن نقطہ جیسے منہ چڑاتا کہ نہیں مٹا سکے نا مجھے تم! مٹا بھی نہیں سکو گے۔ کچھ بھی کرلو۔

اس پر میں نے غور کرنا شروع کیا۔ مریم میں ایسی کون سی بات ہے جو مجھے اپنی طرف ہینچتی ہے۔

ایک بار سوچا تو ریل گاڑی سی چل پڑی۔ شاید اس کی وفادار... اس کا کردار... اس کی پاکیزگی! ہاں، وہ مجھ ل جائے۔ ایک بار مل جائے تو میں کتنا اچھا ہو جاؤں۔

میں نے پروردگار کے سامنے سر جھکا دیا۔ پہلی بار میں دعا کر رہا تھا۔ اے میرے رب... تو ہر قدرت رکھتا ہے۔ دل میں ایک روشن نقطہ ڈالتا ہے تو پورا سینہ ہی روشن کر دے۔ تو مجھے اچھا بنا دے۔ تیری ایک بندی مجھے اچھائی کی جھلک دکھاتی ہے۔ تُو

چاہے تو میں اندر باہر سے دھل جاؤں... پاک ہو جاؤں... روشنی میں نہا جاؤں۔ دیکھ تو، کیسا اندھیر چاہے۔ وہ میرے دُور سے درپردہ رہے، اور میں مرد ہو کر گھر میں محصور ہوں۔ اے یہ

گاؤں کی زندگی، سب رشتے ناتے کتنے عزیز ہیں۔ مگر میری وجہ سے... صرف میری وجہ سے وہ محروم ہو گئی ہے۔

میں نے اپنا پاس پورٹ نکالا، دل میں ایک ارادہ کیا اور یورپ کی طرف نکل گیا۔

یورپ میں کیا نہیں تھا... حُسن، ادائیں، بے باکی... مگر سب کچھ سستا تھا... بہت سستا۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ سستی چیزوں سے دل بھر گیا تھا، نہ کہیں دل کشی تھی، نہ رعنائی، نہ رنگینی۔ پردل کا ارادہ کیا تھا۔ اب واپس نہیں جانا۔

میں نے ایک بار اپنے اندر جھانکا تھا، اور وہاں مریم کی شکل میں سچائی کی رمت... روشنی کا نقطہ پایا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ کسی اور نے میرے سینے میں نہیں جھانکا تھا۔ اُنھیں... سب کو تو باہر سے اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا۔ اب اندر کون جھانکے... اور جھانکنے بھی کون دے۔ میں نے تو خود بھی جھانکنا چھوڑ دیا تھا۔

عادل اور مریم دونوں کی دل کشی ہو گئی تھی۔ انکے ننھا پھول سجاد ان کے گلشن میں کھل چکے تھے۔

تھا۔ زندگی مسکرا اٹھی تھی۔ انہی دنوں اقصیٰ کی بات اپنے ماموں زاد کے ساتھ پکی ہوئی، اور منگنی بھی ہو گئی۔

حویلی بھری رہتی تھی۔ مریم کی تو باری ہی نہیں آتی تھی سجاد کو لینے کی۔

سب کی آنکھ کا تار کھینچا وہ خاندان بھر کا پہلا بچہ جو تھا۔

”عادل، بس اب مجھے پکڑا دے میں نے دوپہر سے نہیں لیا۔“ مریم فریاد کرتی۔

”تم ایسا کرو، نیا لے آؤ۔“ عادل اسے چھیڑتا۔

”یہ بازار میں نہیں ملتے ہیں۔ پور پور بنانا پڑتا ہے اپنے اندر... اپنے لہو سے، اپنے گوشت سے۔“

”تو پھر سنو۔ وقت کی بچت کیوں نہیں کرتیں۔“

”کیا کہہ رہے ہو؟“

”یہی کہ اس بار Twins کا سوچو۔“ مریم نے بھٹا کر اس کے بازو میں دانت گڑ دیے۔

”جنگلی بلی... اپنے سجاد کو کاٹو۔“

”کیوں کاٹوں؟ وہ تو میرا بیٹا ہے۔“

”تو میں بھی تو کسی کا بیٹا ہوں۔“

مریم نے بالآخر سجاد کو اس سے چھین لیا۔

”جانتی ہو، یہ سجاد کیا ہے۔“ عادل نے کہا۔

”میں تو جانتی ہوں۔ پر تم کیا جانو۔“

”بھلا بتاؤ تو۔“

”یہ میرا دل بھی ہے اور دھڑکن بھی، آنکھ بھی ہے اور نور بھی، چاند بھی اور ستارہ بھی۔ میرے ایک جسم سے میں ہزار لمس ہوتے ہیں اس کے لیے۔ اس کے رونے سے، مسکرانے پر مجھے سمجھ نہیں آتی کہ میں کیا کر لوں خود کو... اس پر نہ چاور ہو جائوں... یہاں اسے لے کر، دُور کسی جزیے پر چلی جائیں۔“

”اور میں مومو، مومو کرتا تمہیں ڈھونڈتا ہوں... ہے نا!“ عادل قریب آکر دونوں کو بائوں کے گھیرے میں لے لیتا۔

اب وہ چلا گیا تھا تو مریم کا ڈرنکل گیا تھا۔ حویلی کے دو بڑے کمرے اس نے اپنے لیے مخصوص کر کے گاؤں کی لڑکیوں کے لیے ایک ادارہ بنادیا تھا، جہاں وہ سلائی، کڑھائی، نٹنگ اور کمپیوٹر سیکھتیں۔ یہ سب کام وہ فی سبیل اللہ کر رہی تھی۔ اس کا عقیدہ تھا کہ جتنا وہ دوسروں کے کام آئے گی، اتنی ہی سجاد کے لیے آسانیاں ہوں گی۔

جتنی وہ خوشیاں بانٹے گی، اتنی ہی سجاد کو خوشیاں ملیں گی۔

اتنی مصروفیت تھی۔ مگر وہ سجاد سے ایک پل کو بھی غافل نہ ہوتی۔ زندگی کچھ ڈھب پر آئی تھی۔ سجاد ایک سال کا ہو چکا تھا۔ وہ چلتا تو مریم کو اس کے قدم اپنے دل پر پڑتے محسوس ہوتے۔ وہ اس کی طرف لپکتا تو وہ نہال ہو جاتی۔ اس کا لمس اسے کئی جہانوں کی سفیر کرا دیتا۔

ان مصروفیات کی وجہ سے کبھی عادل اس سے روٹھ جاتا۔ وہ گلہ کرتا کہ وہ اسے بالکل وقت نہیں دے رہی ہے۔ اور جب ایسا ہوتا تو وہ سب کچھ بھول کر اُس کے آگے پیچھے پھرنے لگتی۔ وہ تو تھی ہی محبتوں کی سفیر... سب کا خیال رکھنے والی، کیا اپنے کیا پرائے!

پھر دو تین دن بیمار رہ کر میری ماں چل بسیں۔ بے چاری، خالی دامن لیے رخصت ہو گئیں۔ اپنے کسی بچے کی تو انہوں نے خوشی دیکھی ہی نہ تھی۔ مریم کے اور ان کے درمیان کبھی میرے بارے میں بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ جب تک زندہ رہیں، اس پر مریم کی شکر گزار رہیں۔ جب کہ مریم تو کسی کو اپنے سامنے شرم سار دیکھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ یہ اس کے باپ کی تربیت تھی۔

دلاور کو اس سانحہ کی اطلاع دے دی گئی!

میں نے کبھی ماں سے معافی بھی نہیں مانگی تھی۔ ماں، جو محبت کرنے والے خدا کی ایک جھلک بھلاتی ہے۔ محبت کا یہ حصہ تو سبھی کو ملتا ہے، تاکہ دنیا میں کوئی خود کو بدقیب نہ کہے۔ لیکن مجھ سے میرا وہ حصہ بھی چھین گیا۔

میں پردیس میں تھا، اکیلا تھا... اور ویسے ہی خاموش تھا کہ وہاں کی خوشیوں کو ٹھکرائے بیٹھا تھا۔ میں تو اپنے طور پر وہاں اپنے جرائم کی سزا کاٹ رہا تھا۔ وہ کالا پانی تھا میرے لیے۔

سواں کالے پانی میں میرے لیے کوئی کندھا نہیں تھا کہ جس پر سر رکھ کر میں رو لیتا۔ کوئی سینہ نہیں تھا جس میں بھگودیتا۔ میں اپنی تنہائی میں ماں کی تصویر چومتا رہا... روتا رہا۔

گھر سے رقم منگانی تو کب سے روک دی تھی۔ ایک اسٹور میں جاب کرتا۔ عیاشیاں ترک کرنے کے بعد اخراجات کچھ بھی نہیں تھے۔ کھانے پینے کی اشیاء وہاں سستی ہی ہوتی ہیں۔ جاب سے جملتا، وہ ضرورت سے زیادہ ہی تھا۔ بچت بڑھتی رہی میری۔

کئی دن میں سوچتا رہا... جاؤں کہ نہ جاؤں۔ ارادہ تو اب بھی وہی تھا، اور پکا تھا۔ لیکن ماں پکارتی۔ دیدار نہیں ملا، نہ سبھی، اب ماں کی قبر پر ہی تو ڈال دے آکر۔

آخر وہ پکار جیت گئی۔ ایک دن بے سوچے سمجھے میں نے وہی کانگٹ کرا لیا۔



رقابی ادارہ اچھا خاصا چل نکلا تھا۔ اقصیٰ بھی اس کا ہاتھ بنادیتی تھی۔ زندگی چین سے گزر رہی تھی کہ ایک دن پھر پلچل مچل گئی۔

دلاور پھر آہنچا تھا!

سبھی لوگ اُس سے ملے۔ سبھی نے اُس سے تعزیت کی۔ مگر مریم نہیں ملی۔ اور اس کا ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔

وہ بہت بدل گیا تھا۔ لوگ کہتے، نگاہ نیچی کر کے بات کرتا ہے۔ کبھی نظر اٹھاتا ہی نہیں۔ کم گو بھی ہو گیا ہے۔ لیکن مریم ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتی۔ ایک افسانہ نگار تو ہر شخص میں چھپا ہوتا ہے۔ ایک پرتھما دو بس، تو اسے کوا بنادیں۔

ہر روز وہ قبرستان جاتا۔ دیر تک ماں کی قبر کے پاس بیٹھا رہتا۔ سب دوستوں سے بھی ملاقاتیں ہوتیں۔ ڈیرے پر پھر محفلیں سجنے لگیں... مگر صرف دوستوں کی، صرف دوستوں کے لیے۔ وہ ان میں شریک نہیں ہوتا تھا۔

ایک دن شجاعت صاحب نے اپنے ماموں زاد کی بیٹی سے اُس کی نسبت کی بات شروع کی تو وہ مرجھا گیا۔ ”نہیں ابا جی...“ ”تو کہیں اور چاہتے ہو؟ دیکھو، گھر تو بسانا ہی ہوگا۔ تمہاری ماں کے بعد سونا ہو گیا ہے گھر۔“

”ابھی نہیں ابا جی... کہیں بھی نہیں۔ بس ماں کا غم تازہ ہے ابھی۔ کچھ اچھا نہیں لگتا۔“ لیکن بات صرف ماں کی نہیں، دل کی بھی تھی۔ مریم کے سوا تو سب کھلونے تھے... دل بہلانے کے۔ اور گھر کی مالکن! یہ کونا تو خالی ہی رہے گا۔ جسم و جاں کے کچھ کونے مخصوص لوگوں کے نام ہوتے

ہیں۔ یہ بات صرف وہی سمجھ سکتا تھا، کوئی اور کیسے سمجھتا کہ جیسے وہ مریم کو چھونا چاہتا تھا، ویسے کسی اور کو کیسے چھوسکتا ہے! وہ اپنے جسم کے ایک ایک ریشے سے اس پر فدا ہو جانا چاہتا تھا۔ وہ کہتی تو وہ اپنی آنکھیں نکال کر اُس کے سامنے رکھ دیتا۔ وہ اشارہ کرتی تو وہ جاں بقیہی پر رکھ کر اسے پیش کر دیتا۔ اور عادل میں کیا کمی تھی۔ اسے تو بہت لڑکیاں مل جاتیں۔ نہ تو مریم کے ملنے سے وہ کچھ اچھا ہوا، اور نہ مریم کے نہ ملنے سے اس کا کچھ بگڑتا۔ مگر دلاور کو تو سٹورنا ہی صرف مریم کے ہاتھوں سے تھا۔ اس نے بگاڑ تو دیکھ لیا... سٹورنے کی گنجائش نہیں دیکھی۔ کبھی ٹٹولا ہی نہیں۔ ارے ٹٹول کر دیکھا تو ہوتا۔ کچرے کے ڈھیر کے نیچے سے ہاتھ نکال کر خزانوں کے سامنے تو دنیا کے خزانے ہوتے ہیں۔

وہ بس آہ بھر کر رہ گیا۔ ”نہیں ابا جی... ابھی نہیں۔“

اب اقصیٰ کی شادی کا ہنگامہ تھا۔ برات شہر سے آنا تھی۔ انتظار بہت زیادہ تھے۔ ملازموں کی کمی نہیں تھی لیکن کام نمٹ ہی نہیں پار رہے تھے۔ مریم کے ادارے کے سب لڑکیاں بھی ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ رات ہوتی تو سب ڈھولک لے کر بیٹھ جاتیں۔

تایا ابو نے اسے کسی کام سے بلوایا۔ وہ ان سے ملنے کے لیے نکلا تو مشترکہ صحن میں وہ سچی سکوری، بکستی مسکراتی نظر آگئی۔ جب سے وہ آیا تھا، آج پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا۔ کون کہتا ہے... محبت بھول جاتی ہے... زخم سل جاتی ہیں... داغ بھر جاتے ہیں... محبت تو محبت ہے۔ نارسا ہو تو دیمک بن جاتی ہے۔ اور وہ سودا ہی کیا جو دماغ سے نکل جائے۔

اس نے حیرت سے دیکھا۔ وہ آج بھی اتنی ہی جاذب نظر تھی... اتنی ہی حسین... اتنی ہی بے نیاز... حد درجہ بے نیاز۔ اسے پہلی بار یہ ادراک ہوا کہ اس کی تمام رسائیوں سے بڑی... بہت بڑی... وہی ایک نارسائی تھی!

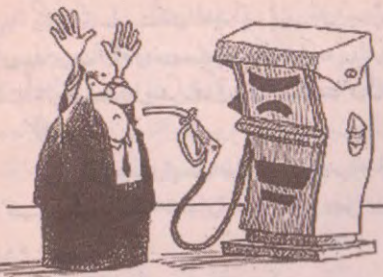
منہدی کی شب میں کپڑے تبدیل کرنے اپنے کمرے میں آیا تو حیران رہ گیا۔ سجاد میرے بند پر سو رہا تھا۔ سجاد... میری مریم کے وجود کا ایک حصہ، اس کے دل کا ٹکڑا! جانے کون اُسے یہاں لایا گیا تھا، یادہ خود ہی آکر سو گیا تھا۔

منہدی کی روتی دیکھ کر سینے میں دیکھا تو میری روتی... روتی... نقطہ غائب تھا۔ وہاں تو پورا سینہ ہی جگمگا رہا تھا۔ ایسی روتی کہ اس میں چند ہیسا جائیں۔ سینے میں محبت کی روتی کا پورا سمندر مومیں بند رہا تھا۔ میں نے کسی چھوٹے... کو بھی نہیں اٹھایا تھا۔ اتنے نازک ہوتے ہیں بچے... اور میں سخت پتھر جیسا۔ ڈر لگ رہا تھا۔ لیکن دل تھا کہ کسی طرح مان ہی نہیں رہا تھا۔ ڈرتے ڈرتے بہت نزاکت سے اٹھایا اور نرمی سے اسے بازوؤں میں بھر کر خوب پیار کیا۔ سوتے میں بچے اور خوب صورت ہو جاتے ہیں۔ وہ میرے بوسوں سے کسمایا۔ مگر نیند گہری تھی۔ سوتا ہی رہا۔ اس کی نیند کی وجہ میرے کمرے کا گہرا سکون تھا جو گھر میں قدرے بہت کر تھا۔

میرا وجود سجاد کے لپس سے قطرہ قطرہ پھٹنے لگا۔ کمرالاک کر کے، اسے اپنے سینے پر لپکا کر میں گاؤ تکیے پر سر ٹکا کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ وہ ایسی خوشی تھی کہ جس نے نارسائی کے ہر احساس کو مٹا دیا تھا۔ اب مجھے کیا چاہیے تھا۔ پھول نہیں ملا، خوش ہو تو مل گئی۔ چاند نہیں ملا، چاندنی تو مل گئی۔ کتنے لمحے گزر گئے۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔ میرے ارد گرد تو مریم کی مہک کی کھنٹی بج رہی تھی۔ اور میں مدہوش سا مدہوش تھا۔

پھر اچانک مجھے واہنریش کا احساس ہوا۔ میں چونکا۔ سیل فون اٹھا کر دیکھا۔ کال تو ختم ہو چکی تھی۔ اسکرین پر گیارہ مس کالز چمک رہی تھیں۔ چمک کیا تو حیران رہ گیا۔ سب کی سب مریم کی تھیں۔ یہ... یہ... کیا...؟ ابھی میں سوچنے بھی نہیں پایا تھا کہ میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ شاخ شجر بار کو بستر پر لٹا کر میں اٹھا اور دروازہ کھول دیا۔

سامنے سوچی ہوئی لال سرخ آنکھیں...



”تم نے سجاد تمہارے پاس ہے؟“ اس نے پوچھا۔ ”ہاں ہے۔“

”تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے۔“ وہ مجھ پر جھٹی میرے چہرے پر کئی خراشیں پڑ گئیں۔

”ہوا کیا ہے؟“ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ”تم نے سوچا، سجاد کے بدلے مجھے حاصل کر لو گے۔ ہے نا؟ تو غلط سوچا۔“ اب میرے بال اس کی مٹھیوں میں تھے... وہ مجھے بولنے کا موقع بھی نہیں دے رہی تھی۔ اور میں بولتا

بھی کیا۔ میری سمجھ میں ہی کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ”میں تم سے رحم مانگنے نہیں آئی سجاد کے لیے۔ یاد رکھو، مریم تمہارے لیے خیر منع ہے اور رہے گی۔ تم کچھ بھی کر لو۔“ اب بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہ میں کیساں رہا ہوں! کہاں تک سوں گا!

”تم تو اپنی ماں کے سامنے بھی شرم سار نہیں ہوئے تھے، اب کیا ہو گے۔ نام کے دلاور ہو۔ چھپ چھپ کر وار کرتے ہو۔ اور کتنے وار کرو گے!“ اس نے بال پھوٹے، گریبان تھا اور میری قمیص چیر کر رکھ دی۔ دل اور روح پر کہاں کہاں چرے کے لگے تھے، کون جانتا... کون دیکھتا!

”مریم، تم نے جو کہا، سچ کہا۔ تم بھلا غلط ہو سکتی ہو... میں نے محبت اور عاجزی سے کہا۔“ چلو، تم میرے پاس آئیں تو۔ مجھے چھو تو، چاہے منہ نوچنے کے لیے ہی سہی۔ گریبان تار کیا۔ مگر اب وہاں سینہ کہاں... وہاں تو کرچیاں ہی کرچیاں ہیں۔ تم تو آنکھوں والی ہو۔ دیکھ سکتی ہو۔ تمہیں میری آنکھوں میں ہوں تو نظر آگئی تھی دو سال پہلے۔ اب کی بار محبت نظر نہیں آئی... کوئی پاکیزہ نظر نہیں آئی... ہاں، تم ہمیشہ کی طرح ٹھیک ہو۔“ لہجہ میں محبت اور عاجزی کے سچ دیوانگی داخل ہوئی تو

میری آواز بلند ہو گئی۔

سجاد کو رکھ بیٹھا اور گہرا کر رونے لگا۔

لیکن مریم نے اسے نہیں اٹھایا۔ ایک پل... بس ایک پل اس نے میرے خراشوں سے بچے چہرے کو، اور ایک پل میری تار تار قیص کو دیکھا۔ پھر پلٹ کر بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔



عادل اسے اپنے پرآمدے میں ملا۔
”کہاں تھیں تم؟ تمہارا سیل فون بھی بیڈ روم میں ہے۔“

وہ کوئی جواب نہیں دے سکی۔

”فضل بابا ملا تمہیں؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”وہ اپنے کوارٹر میں سو رہا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ سجاد شور سے گھبرا رہا تھا، سو نہیں پارہا تھا۔ اور تم اقصیٰ کے ساتھ تھیں۔ تو اس نے سجاد کو دلاور کے کمرے میں سلا دیا تھا۔“

وہ کچھ سن ہی نہیں رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے ہوش و حواس جواب دے گئے۔ وہ وہیں ڈھے گئی۔



کتنے اعزاز مل گئے... کتنے تمغے جگ گئے میرے وجود پر۔ یہ خراشیں تو نہیں، اُس کی انگلیاں، اُس کی ہتھیلیاں ہیں... میرے دُکھتے ہوئے سر پر... کتنے بونے بالوں پر... میرے سینے پر اس کے منہ... ارے، کوئی ایسے بھی مالا مال ہوتا ہے... اتنی شدتوں کے ساتھ!

میری پھٹی کی قیص میرے لیے خزانہ تھی۔ کبھی میں اسے منہ پر رکھ لیتا، کبھی بولا سا بنا کر سینے پر رکھ لیتا۔ کبھی میں ہنس دیتا... اپنے اعزاز پر۔ کبھی میں رو دیتا اپنی تذلیل پر۔ اور اُس کی باتیں، اُس کے طعنے، اُس کے لہجے کی نفرت، حقارت... مجھے محبت کرنی بھی نہیں آتی تھی، اور نفرت بھی نہیں کر سکا تھا۔ میں ہوس میں بھی ہار، عشق میں بھی ذلیل ہوا۔ درود یوار بھی مجھ پر نہ تھے۔ آئینہ میرا مذاق اڑاتا تھا۔ میں اپنے قدموں میں کھرا ہوا تھا۔ ہزاروں کرچیوں کی صورت... ارے میں شیشہ تو نہیں تھا۔

فضل بابا آیا... نہ جانے کیا کرنے آیا۔ میرے وصل کی پوچھی... میرے سجاد کو پُچرانے آیا تھا۔ میرے اتنے ارفع پل،

جو سجاد کے ساتھ گزرے تھے، وہ پُچرانے آیا تھا۔ ”میرا کیا کیا پُچراؤ گے تم لوگ؟ کیا کیا...؟“ میں نے میرا لٹ دی۔ درازیں پلٹ دیں۔ پھر ہوش و حواس میں جو آخری چہرہ میں نے دیکھا، وہ تاپا یا لہکا تھا۔



اس حویلی کو خوشیاں راس کیوں نہیں آتیں۔ سب لوگ اُداس تھے۔ اقصیٰ کی رخصتی ہو گئی تھی۔ مریم ٹھیک تھی مگر چپ چاپ۔ اور دلاور اسپتال میں تھا۔ جب بھی ہوش میں آتا تو چیخ پکار شروع کر دیتا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا ہوا۔ فضل بابا کو کچھ کچھ اندازہ تھا۔ مگر مالکوں کے معاملات میں نوکر کب زبان کھولتے ہیں۔ یہ تو گستاخی ہوتی۔ البتہ اسے دلاور سے ہم دردی تھی۔

اور مریم چپ تھی۔ وہ سوچتی تھی، میں لبالب بھری ہوں عادل کی محبت میں... اس کی سنگت میں۔ جو میرے پاس آئے گا، وہ خود ہی چھلکے گا... اپنے کناروں سے بہے گا۔ وہ جس نے میرے عادل کو چھڑی کا محتاج بنایا... جس نے سجاد... میری زندگی کو مجھ سے جدا کیا۔ وہ نفرت سے سوچتی اور آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں غور کرتی...



”تاپا ابو، اگر آپ خوشی سے اجازت دیں تو ہم مستقل طور پر شہر شفٹ ہو جائیں۔“ وہ ان کے کندھے سے جھول گئی۔ یہ بات منوانے کا اس کا پرانا انداز تھا۔

”نہیں پُتری، ابھی نہیں۔ ابھی کون سی سجاد کی پڑھنے کی عمر آئی ہے۔ پھر دلاور کی بھی فکر ہے۔ اقصیٰ بھی رخصت ہو گئی۔ زویب باسٹل میں رہتا ہے۔ اور تمہارا باپ... وہ تو کتاب کا کیڑا ہے، کتابوں میں جیتا ہے۔ ہم نے بھی تو جینا ہے نا۔ میرا نہیں تو اپنی تائی امی کی تنہائی کا خیال کرو۔“

وہ بے دلی سے اٹھ کر وسیع لان میں آگئی۔

کتنے رنگ رنگ کے پھول کھلے تھے۔ ہر سُو بہار تھی۔ مگر دل خزاں کے پتے کی طرح لرزتا رہتا تھا۔ کہنے کو تو اس رات کی آزمائش میں وہ سجاد سے دست بردار ہو گئی تھی۔ لیکن اگر دلاور سجاد کو... اس کے بعد وہ سوچ نہ پائی اور بے تابی سے سجاد کو خود میں سمیٹ لیا... اس کا روم روم چوم لیا۔ اللہ مجھے بادل بنادے، میں جی بھر کر سجاد پر برس جاؤں۔ مجھے گلستاں کردے، میں پتی پتی بوکر اس پر نچھاور ہو جاؤں۔ مجھے گہنی چھائوں بنادے کہ میں سجاد پر دھوپ نہ آنے دوں... اللہ میرے اللہ... سجاد... میرا اجداد۔ اس کے اندر بس یہی دو نام رِدم بن گئے تھے۔



شجاعت صاحب کا بہت برا حال تھا۔ بیوی بھی ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ اب جوان گبرو بیٹا دیوانگی کے عالم میں مینٹل ہاسپٹل میں پڑا تھا۔ نوجوانی میں اُن سے بڑی لغزشیں ہوئی تھیں۔ کس سے نہیں ہوتیں۔ مگر انہوں نے اپنے خاندان اور اپنے گائوں کی عزت کا ہمیشہ پاس رکھا تھا۔ اس لیے تو تینوں بھائیوں کی دُور دُور تک دھاک تھی۔ عزت شرافت ان کی شان تھی۔ وہ گز گڑا کر اللہ سے بیٹے کی صحت اور سلامتی کے لیے دعائیں کرتے۔ لیکن شاید دعا کے لیے اٹھنے والے ہاتھوں کو دیر ہو گئی تھی۔ شاید وقت نکل گیا تھا۔



سات ماہ بعد دلاور کہیں نارمل ہوا۔ لیکن یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ بہتری بس ظاہری ہے۔ اندر تو بس ایک ہی منظر چلتا رہتا تھا... سجاد کے ننھے منے وجود کا الوہی لمس... شاید وہ اس کے لیے عبادت تھا۔ پھر اگلا منظر، مریم کی آمد... اور اس کے بعد... وہ سب کچھ اس کے ذہن میں بار بار ری وائڈ ہوتا اور بار بار پلے ہوتا۔ وہ تڑپتا، بے حال ہوتا۔ کبھی حظ اٹھاتا تو کبھی نڈھال ہوتا... اور

کبھی مخمور ہوجاتا۔ چاک گریباں والی قمیص کبھی اس کے پہلو سے جدا ہی نہیں ہوتی تھی۔ بال وہ سلگورتا ہی نہیں تھا کہ کہیں لمس نہ مٹ جائیں۔ چہرے کی خراشوں پر کم از کم ہوش میں تو وہ مریم لگواتا ہی نہ تھا۔ اور جب ہوش میں ہوتا تو مریم کو یوں ہٹاتا کہ خراشیں پھر سے تازہ ہوجاتیں۔



”تم میں کتنی شدت آگئی ہے مومو“ عادل حیران ہو کر اٹھ بیٹھا۔ ”تم تو شبنم تھیں۔“

مریم کو کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اس نے یونہی بات کرنے کی غرض سے پوچھا۔ ”اور اب؟“

”اب تم آبشار ہو... تندر تیز آبشار۔ بہا کر لے جاتی ہو مجھے۔ ایسا تو اوائل کی راتوں میں بھی کبھی نہیں ہوتا تھا۔“

عادل سوچتا رہا۔ ”برا تو نہیں لگتا۔ لیکن اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔ تم کسی سے خائف ہو... کیوں... کچھ تو بے جو میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔“

مگر مریم نہ کچھ سن رہی تھی، نہ سمجھ رہی تھی۔ اس کی دیوانگی عروج پر تھی۔ وہ اسپر محبت تھی تو عادل اسپر قریب۔ وہ کہاں تک ضبط کرتا، کہاں تک ہوش سے کام لیتا۔

آبشار اور بادل باہم ایک ہو گئے تھے!

”ابا جان، مجھے کچھ پیسے چاہئیں۔“ دلاور نے کہا۔

اور شجاعت جیسے پھر سے جی اٹھے۔ ”کتنے میری جان؟“ بیٹے نے کتنی مدت بعد انہیں پکارا تھا۔ وہ جان بھی مانگ لیتا تو کم تھا۔ اپنے پیاروں کو کسی لاش کی

صورت، ہوش و حواس سے بیگانہ دیکھنا، جیتے جی مرجانے کے برابر ہوتا ہے... اور وہ بھی اکلوتا بیٹا!

”یہ تو مجھے نہیں معلوم۔“ دلاور نے کھوٹے کھوٹے لہجے میں کہا۔

ابا جان نے بغیر گنے، نوٹوں کی بہت بھاری گڈی اس کی جیب میں ڈال دی۔

وہ دو دن میرے لیے بہت سخت تھے۔ مجھے خود کو نارمل ثابت کرنا تھا۔ اس کے لیے سب کچھ بھول جانا، کچھ یاد نہ کرنا ضروری تھا... اور یہ ایسا تھا جیسے سانس روک لینا۔ لیکن مقصد بڑا ہو تو آدمی کچھ بھی کر سکتا ہے۔

تیسرے دن موقع پا کر میں ہاسٹل سے نکل آیا۔ ذہن میں سب کچھ واضح تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے، کب کرنا ہے اور کیسے کرتا ہے۔

بازار جا کر سوٹ لیا، اور وہ بھی ڈھالا والا۔ بال ترشوائے، شیو بنوایا، ایک ہوٹل میں کمر لیا۔ وہاں جی بھر کے نہایا۔ سوٹ پہن کر باہر نکلا اور دوبارہ بازار کیا۔ اس بار دیکھوں کی ورائٹی نکلائی۔ جو کچھ بھی مریم کے قابل لگا، بغیر بھاؤ تاؤ کے خرید لیا۔ پھولوں کے زیور اور نازک چوڑیاں اس کی کلائی میں کتنی جتنی تھیں، اور کتنے اس کے پیروں میں۔

سب کچھ لے کر ٹیکسی میں بیٹھا اور دو گھنٹے میں گاؤں پہنچ گیا۔

رات گہری ہو چلی تھی۔ گاؤں میں تو راتیں ویسے بھی گہری نیند سوتی ہیں۔ میرا کمرالاک تھا۔ مخصوص اوزار سے دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔ وہاں سے کلو رو فارم لے کر نکلا اور عادل کے کمرے کی طرف گیا۔ اسی انداز میں اس کا دروازہ بھی کھولا اور اندر چلا گیا۔

وہ ٹانگیں میں تھی اور عادل کے ساتھ سو رہی تھی۔ وصل کے بعد کی نیند تو بہت ہی گہری ہوتی ہے۔ اس منظر پر حسرت نے کتنی آہوں کا کی۔ پھر میں نے عادل کو بے ہوش کیا اور آخری بار سجاد کو چوما۔ پھر مریم کو کسی گڑیا کی طرح اپنے مضبوط ہاتھوں پر اٹھالیا۔ ایک ہاتھ منہ پر جمادیا تاکہ وہ جیت نہ سکے۔

وہ جاگ گئی۔ کتنا سُرور، کتنا نشہ بھرا ہوا تھا وصل کا اس کی آنکھوں میں۔ میرے اندر پھر کچھ مام سا ہوا۔ لیکن فرصت کہاں تھی۔ وہ بے کار ہاتھ پاؤں چلاتی رہی۔ اسے اپنے

کمرے میں لے جا کر میں نے پردے برابر کیے۔ اسے بیڈ پر بٹھا کر اس کے منہ پر ٹیپ لگا دیا۔ ”آج تمہیں بولنا نہیں ہے۔ بس سنا سنا ہی سنا ہے۔“

اس کی آنکھوں میں خوف سے زیادہ حیرت تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ آج تو اسے باتیں ہی انوکھی سننی ہیں۔

آنکھ ایک غیر معمولی احساس کے تحت کھلی... پر آنکھ کھلی تو مریم نے دیکھا کہ وہ تو غیر معمولی سے بھی آگے کی سچویشن ہے۔ نائٹ بلب کی روشنی میں بھی اس کا چہرہ واضح تھا۔ اور وہ اس کے ہاتھوں پر تھی۔ اس نے چیخنا چاہا۔ لیکن اس کا ہاتھ منہ پر جما تھا۔

مریم نے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس پر وحشت نہیں تھی، سکون ہی سکون تھا۔ اس نے گھبرا کر بیڈ کی طرف دیکھا۔ عادل اور سجاد دونوں ہی خیریت سے تھے اور گہری نیند سو رہے تھے۔

وہ اسے لے کر دروازے کی طرف چلا تو اس نے ہاتھ پائوں چلائے۔ پہلی بار اسے اندازہ ہوا کہ وہ کتنا طاقت ور ہے۔ پہلی بار اسے اپنی وہ جرأت مندی حماقت لگتی ہے جب عادل کے حادثے کے بعد وہ دندناتی ہوئی اس کے ڈیلے پر پہنچ گئی تھی۔ اگر اس دن وہ اپنی اس طاقت کا مظاہرہ کرتا تو...؟ اس سے آگے وہ سوچ نہیں سکی۔ اس کے اندر تشکر ابھرا۔ دلاور نے ایسا کیا بھی نہیں تھا۔

لیکن اب کیا بوربا ہے... کیا ہونے والا ہے؟ دلاور نے اسے بیڈ پر بٹھایا اور منہ پر ٹیپ چپکا دیا۔ ”آج مجھے تمہارے چیخنے کا ڈر نہیں ہے۔ بس میں چاہتا نہیں ہوں کہ تم کچھ بولو۔ آج تمہیں صرف سنانا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ کھڑکی کی طرف گیا اور پردے برابر کر دیے۔

مریم کے ہاتھ کھلے تھے اور پائوں بھی۔ مگر نہ تو اس نے ٹیپ توچا اور نہ ہی دروازے کی

طرف لپکی۔ عورت کے دل میں ایک انتہینا ہوتا ہے جو کبھی غلط سگنل نہیں دیتا۔ اس نے جان لیا تھا کہ اس کی عزت کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔

وہ واپس آکر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ بدن چُرانے لگی۔ اس کی نائٹی بہت مختصر تھی۔ لیکن عجیب بات تھی کہ وہ خود بھی اس سے نظریں چُر رہا تھا۔ اس نے اس کے سامنے لباس ڈال دیا۔ ”مومو... جائو“ یہ لباس پہن کر آئو۔ بہت جلدی...“

وہ ڈھنچکا والا جوڑا تھا۔ لیکن اس کے سامنے اس نائٹی میں آنے سے بچنے کے لیے تو وہ کچھ بھی پہن سکتی تھی۔ وہ کپڑے لے کر ڈریسنگ روم کی طرف چلی گئی۔

دل کے سگنل تو اب بھی پہلے جیسے ہی تھے لیکن عروسی جوڑا پہن کر وہ اندیشوں کا شکار ہونے لگی۔ ایک پل کو اس نے سوچا کہ ٹیپ اُکھانے اور شور مچا دے۔ مگر پھر سوچا، تعجباً اسے یہ بھی یاد آ سکتا ہے۔

وہ واپس آئی تو اس کا چہرہ سپید ہو رہا تھا۔ قد آدم آئینے میں اس نے دیکھا، وہ کام دار لہنگا اس پر بہت سج رہا تھا۔

”آئو... بیٹھو۔“ دلاور نے کہا۔ وہ بیٹھ گئی۔ وہ بڑی چابست سے اسے پھولوں کے زیور پہنانے لگا۔ وہ خوف زدہ تھی۔

میں نے اسے پھولوں کا زیور پہنایا۔ ان کانوں نے کبھی میری مدد بھری سرگوشیاں نہیں سنی تھیں، کبھی میری آہوں کا بھی نہیں کی تھی، جنہیں میں پھولوں کے آویزے پہناتا تھا۔ پھر میں نے اسے چوڑیاں پہنائیں اور بیٹھا دیکھا کیا۔ ”بات نہیں بنتی...“ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”دھن تو مجھے مکمل ہی چاہیے۔“ میں نے اس کے ہونٹوں پر سے ٹیپ ہٹا دیا۔ ”لیکن تم یہی سمجھنا کہ ٹیپ موجود ہے۔“ پھر میں نے اس کے ہونٹوں پر خود ہی لپ اسٹک لگا لی۔

اب وہ مکمل تھی۔ میں اسے دیکھے جارہا تھا۔ میں اسے جتنا

دیکھنا چاہتا تھا، اس کے لیے ایک عمر بھی کم تھی۔ مگر پھر مجھے ایک خیال نے چونکا دیا۔ میں پھر خود غرض بن رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”سجادرات کو دودھ کے لیے اٹھاتے؟“

مریم اس کی بات سن کر چونکی۔ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ یہ اس کے لیے اچھا موقع تھا۔ دلاور نے جس انداز میں اس سے یہ بات پوچھی تھی، اس سے پتا چلتا تھا کہ یہ اس کے لیے نجات کا راستہ ہے۔ اسے یقین تھا کہ اگر وہ اسے اثبات میں جواب دے گی تو شاید وہ اسے چھوڑ دے گا۔ لیکن اسے یہ احساس بھی ہو گیا کہ اس ساعت میں جھوٹ بولنا بہت بڑا گناہ ہوگا۔ اس کے سینے میں موجود عورت کا دل اسے یقین دل رہا تھا کہ اسے کوئی ضرر نہیں پہنچنے والا ہے۔ اس نے سمجھ لیا کہ یہ سچائی کی رات ہے۔

وہ جواب طلب نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

مریم نے نفی میں سر ہلادیا۔ اس کی حیرت دیدنی تھی!

میں حیران بھی ہوا اور شکر گزار بھی۔ میں نے تو اسے جھوٹ بولنے کی دعوت دی تھی۔ مگر وہ سدا کی جی تھی۔ ”تو میں تمہیں اور دیر تک دیکھ سکتا ہوں؟“ میں نے خوشی سے کہا۔

اس نے سر جھکا لیا۔

”مریم، میں تمہارے ساتھ جی نہیں سکا... مر تو سکتا ہوں نا۔“ میں نے کہا۔

اس کی خوف زدہ نظریں اور خوف زدہ ہو گئیں۔ ”تمہیں اس روپ میں دیکھ لیا، حسرت پوری ہو گئی۔ تم معتبر ہی رہو گی۔ تمہاری پاکیزگی اور حرمت پر میں آج نہیں آنے دوں گا۔ میں تمہیں اپنے نفس کی تسکین کے لیے یہاں نہیں لایا...“

مریم نے چونک کر مثولتی نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر وہ مطمئن نظر آنے لگی۔ اب اس کی نگاہوں میں کھلا تشکر تھا۔

بٹیوں کے بل گھوما، اور زہری شیشی کو ہونٹوں سے لگالیا۔ اگلے ہی لمحے سرج الاثر دہر میرے حلق سے اتر رہا تھا۔ وہ میرے قدموں میں آگری۔ میں لڑکھڑایا... سنکھلنے کی کوشش کی، جان نکل رہی تھی۔ قدموں میں سہا نہیں تھی۔ میں بھی گر گیا۔ آخری دید کے لیے میں نے آئینے میں دیکھا۔ پتا نہیں، آئینہ دھندلا رہا تھا۔ میری آنکھیں... مگر آخری دید تو آخری تھی۔ وہ کیسا اونگھا منظر تھا۔ ایک مردہ دھماکے قدموں میں گری ہوئی دلہن کتنی خوب صورت لگ رہی تھی...

مریم نے اُس کا چہرہ دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ لیکن وہ مرجکا تھا۔ اس نے بڑے احترام سے اُس کی کھلی ہوئی آنکھوں کو بند کر دیا۔ پھر وہ اتھ کھڑی ہوئی۔ دلاور نے اس کی عزت، اس کی پاکیزگی اور حرمت کا... اس کے اعتبار کا بھرم رکھ لیا تھا۔ لیکن اب باقی کام اسے کرنا تھا۔ وہ جھکی اور اس نے دلاور کی پیشانی پر بولٹ رکھ دیے۔ وہ ایک طویل بوسہ تھا۔ پھر وہ روائے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے ہاتھ میں اپنی ناٹھی تھی۔

اپنے بچے دروازہ بند کر کے وہ اپنے کمرے میں گئی۔ دروازہ بند کر کے اس نے سجاد کے پورے چہرے کو بوسوں سے بھگودیا۔ وہ بوسے اس کے نہیں تھے۔ وہ تو بس اسے دلاور کی امانت پہنچا رہی تھی۔

پھر اس نے عروسی لباس اتاکر اپنی ناٹھی پہن لی۔ عروسی لباس اس نے پھولوں کے زیور کے ساتھ اپنی الماری کے سیف میں رکھ دیا۔ اب یہ سیف محبت سے مہکتا رہے گا۔ الماری بند کر کے وہ بستر پر عادل کے پہلو میں لیٹ گئی۔ لیکن نیند اس کی آنکھوں سے دُور تھی۔ ایسے میں کوئی سوسکتا ہے بھلا، آنکھوں میں تو مرنے والے کی دید تھی... پھر آنسو بھی اُمڈ آئے۔

صبح ہونے والی تھی!

”...میں دل کی رانی بنا کر لایا ہوں تمہیں۔“ میں کہتا رہا۔ اس کے ٹکڑے کچھ تلانی تو کر دی تھی۔ ”میں تو تمہاری زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل گیا تھا۔ اتنی کا دکھ مجھے پہنچ لایا... دوبارہ۔ واپس آ کر میں تمہاری راہ کا پتھر تو نہیں بنا تھا۔ سچی تم نے پھر بھی میرے پہلے تاثر کو آخری تاثر بنائے رکھا۔ تم نے معاف ہی نہیں کیا مجھے۔“

اب وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر رہی تھیں۔

”کبھی سوچا تم نے کہ میں نے تمہارے لیے کیا کیا کیا... کبھی ایک... صرف ایک لمحہ بھی تم میرے لیے سوچ سکتی تھیں تو شاید آج میں ایک اچھا انسان ہوتا۔ اللہ نے تمہارے وجود میں میرے لیے ہدایت اور نیکی بھیجی تھی۔ مگر تم نے نکل گیا۔ وہ ہدایت، وہ روشنی تم نے مجھ پر خرچ ہی نہیں کی۔ مجھے اصلاح کا موقع ہی نہیں دیا۔ یہ زہر دیکھ رہی تھی... اور میں نے کہا نا کہ تم ساتھ جی نہیں سکتے، لیکن مرنے سے ہیں نا ساتھ...“

اس کے ہونٹ لرزے۔ وہ کچھ کہنے والی تھی۔

مگر میں نے اسے بولنے نہیں دیا۔ ”تم مت بولنا۔ سمجھ لو تمہارے ہونٹوں پر ٹیپ لگی ہے۔ تمہیں بولنا نہیں ہے، صرف سننا ہے۔ تم نے تو میرے ساتھ نکل گیا۔ لیکن سجاد نے... تمہارے بیٹے نے لمحوں میں مجھے انسان بنا دیا۔ آج یہ زہر ہم دونوں نے پینا تھا۔ لیکن جاؤ، تمہیں سجاد کی خاطر معاف کیا... ایک لمحہ دے رہا ہوں کہ زندگی میں بھی کوئی دلاور جیسا مل جائے تو اسے سزا دو... دھکارت دینا...“

اس اس سے آگے میں کیا بولتا۔ اس کے بعد تو میں زار زار رہا۔ کبھی اسے نہ دیکھنے پر روکا کرتا تھا... اور آج دیکھ کر بھی رو رہا تھا۔

مریم نے ہاتھ باندھے معافی کے لیے... میں نے زپ کر چدا کر دیا۔ بادشاہ لوگ تو کرم کرتے ہیں، ظلم کرتے ہیں کمال کرتے ہیں۔ معافی تو زیب نہیں دیتی انہیں۔ یہ تو ہم جیسوں کا وصف ہے... ضبط کرنا، ظلم سہنا، بادشاہوں کے کسی کمال کا منتظر ہونا... اور پھر نا کردہ گناہوں کی نجی معافی مانگ لینا۔ تم تو میری بادشاہ ہو مومو۔“

میں پھر کھٹکی باندھ کر اسے دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا... دیکھتا رہا۔

پھر میں نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے کھڑا کیا اور اسے سرتاپا دیکھا... الوادعی نگاہ! پھر میں آگے بڑھا... بڑھتے بڑھتے رُکا...